

حکیم محمد یٰسین
وزیر برائے آب پاشی و فلڈ کنٹرول جموں و کشمیر

بہتر آب پاشی — زیادہ فصل

غذائی پیداوار میں خود کفالت حاصل کرنے کے لئے زرعی زمین کے لئے آب پاشی سے بڑھ کر کوئی اور مؤثر ذریعہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہماری ریاست میں جہاں آب پاشی کے کافی وسائل موجود ہیں۔ اس شعبہ کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ اس ضمن میں حکومت کی کوششوں کے پیش نظر وہ دن دور نہیں جب بنجر زمین بھی لہلہاتے زرعی کھیتوں میں تبدیل ہو جائیں گی اور اس طرح خوش حالی کی منزل تک پہونچنے کے علاوہ زرعی شعبہ میں خود کفالت حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

شعبۂ زراعت کو فروغ دینے کے لئے بھرپور توجہ کے نتیجے میں غذائی پیداوار میں اضافہ ہونا تب ہی ممکن بن گیا ہے جب زیادہ سے زیادہ زمین کو آب پاشی کی سہولیات فراہم کی گئیں۔ گوناگوں جغرافیائی اور موسمی حالات کے پیش نظر ریاست میں آب پاشی کا مسئلہ میدانی علاقوں کے مقابلے میں پیچیدہ ہے۔ ان مسائل سے نمٹنے کے لئے اور کنڈی، خشک، کرلوہ دور افتادہ اور پسماندہ علاقوں کو آب پاشی

ماہنامہ

تعمیر

سری نگر

اپریل۔مئی سنہ ۱۹۷۸ء

جلد ۹ ــــــــ شمارہ ۳،۴

مضامین کے متعلق خط وکتابت کا پتہ

مدیر ماہنامہ تعمیر نظامتِ اطلاعات مقبول شیروانی روڈ سرینگر کشمیر

شائع کردہ :۔

نظامتِ اطلاعات حکومتِ جموں و کشمیر

سے مارچ ۱۹۸۵ء تک ۱۲ کروڑ ۸۴ لاکھ روپے کے مصارف آنے کی توقع ہے۔ مارچ ۱۹۸۶ء کے اختتام تک ۱۷ ہزار ہیکٹر اراضی سیراب کی گئی ہے۔ جب کہ رواں مالی برس کے آخر تک یہ سہولیات ۲۰۳۰۰ ہیکٹر اراضی رقبہ تک بہم پہونچانے کی توقع ہے۔

چھوٹی آب پاشی کی اسکیمیں

ریاست میں اس وقت ۷۴۵ چھوٹے درجے کی آب پاشی کی اسکیمیں زیر تکمیل ہیں۔ سال رواں کے دوران ان اسکیموں پر ۱۱ کروڑ ۵۶ لاکھ روپے صرف ہونے کی توقع ہے۔ ان اسکیموں کے طفیل اب تک ۱۶۴۴۳۰ ہیکٹر کے لئے آب پاشی کی صلاحیت پیدا کی گئی جب کہ ۱۹۸۴ء کے آخر تک ۱۱۴۴۶۰ ہیکٹر اراضی کو یہ سہولیت بہم پہنچائی گئی۔

زراعت کو فروغ دینے کے لئے آب پاشی کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت اس شعبہ کو ساتویں منصوبہ کے دوران اعلےٰ ترجیح دے رہی ہے۔

تمت

کتابت :- بشیر احمد، غلام محی الدین

تعداد :- ایک ہزار

مطبوعہ :- گورنمنٹ پریس سرینگر

تعمیر میں چھپنے والی نگارشات
میں ظاہر کی گئی آراء سے حکومت جموں وکشمیر کا
متفق ہونا ضروری نہیں ہے!

سرورق :- پھر بہار آئی نئے پھول کھلے
عمل :- موہن رینہ (آرٹ ایڈوائیزر)

ترتیب

اظہار

اُردو کے مشہور نقاد کلیم الدین احمد نے آج سے کئی برس پہلے تنقید کی بے بضاعتی کا اظہار کیا تھا۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ اُردو میں تنقید کا وجود محبوبہ کی کمر کی طرح موہوم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تنقید کی بے مائیگی کا احساس آج بھی پہلے کی طرح موجود ہے۔ تنقید کا ایک عمومی اور روایتی انداز یہ ہوتا ہے کہ تخلیقی فن کاروں کے نجی، تاریخی یا عصری حالات و واقعات کی چھان بین کی جائے۔ اور کچھ خارجی حقائق کا رشتہ اُن کے کلام سے جوڑا جائے۔ عام طور پر ہماری تنقیدات اسی محور کے گرد گھومتی رہی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد مارکسی تنقید کے زیر اثر تنقیدی نظریات تخلیقی اور جمالیاتی جوہر سے محروم ہو کر صحافتی سطح پر اُتر آئے۔ نتیجے میں تنقیدی شعور و ادراک کو پنپنے بڑھنے کا موقعہ نہ ملا۔ یہ صحیح ہے کہ حالیہ برسوں میں چند نئے نقاد سامنے آئے ہیں۔ جو تنقید کے تخلیقی کردار سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اور وہ متقدمین اور معاصر فنکاروں کو نئے تناظر میں پرکھنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بنیادی سوال اپنی جگہ پر قائم ہے کہ موجودہ صدی میں عالمی ادب میں تنقیدی شعور کے فروغ کے باوصف، اور اس کے نظریاتی واقفیت کے باوجود، ہمارے نقاد تنقید میں نظریہ سازی یا اصول سازی میں پیچھے کیوں رہے ہیں؟ یا تو یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ اُردو میں کوئی قد آور ناقد پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ اگر اس بات کو جھٹلانے کے لئے حالی، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، یا شمس الرحمان فاروقی کا نام لیا جائے۔ تو ہمیں اس کا جواب کہیں اور ڈھونڈنا ہوگا۔ ہمارے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ

ہم نے اپنے عظیم فنکاروں کی تخلیقات کا اس نقطۂ نظر سے ابھی مطالعہ نہیں کیا ہے کہ وہ تنقیدی اصول سازی کے لئے سرچشمۂ فیض کا حکم بھی رکھتے ہیں۔ کیا میرؔ، غالبؔ یا اقبالؔ کے کلام میں وہ تنقیدی نظریے اور اصول موجود نہیں ہیں۔ جو ہمارے تنقیدی فکر و نظر کی اساس بن سکتے ہیں۔ اس طریقہ نقد سے کشمیری ادب کی قدر سنجی میں بھی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ کشمیری شاعری تخلیقی اعتبار سے کافی وقیع ہے۔ ہم بلاشبہ شیخ العالمؒ، للہ دید، رسول میر، شمس فقیر اور مہجور کے کلام سے تنقیدی روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے نئے نقاد اپنے تخلیقی ورثے کو صحیح تنقیدی نظریات کی روشنی میں پرکھیں۔ اس سے یقیناً خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

ہم نے تعمیر میں نمائندہ کشمیری منظومات کے ترجمے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ قارئین نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنے قلم کاروں کے تعاون کی ضرورت ہے۔

ریاستی کلچرل اکیڈمی نے سنہ ۱۹۷۰ء میں مختلف زبانوں میں لکھی گئی بہترین تصنیفات پر ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اس سال اُردو، کشمیری، ہندی، پنجابی، انگریزی، ڈوگری کے علاوہ لداخی اور گوجری زبانوں کے ادیبوں کو بھی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ اس سے بلاشبہ ادب کی ترقی اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ادارۂ تعمیر کو بے انتہا مسرت ہے کہ تعمیر کے صلاح کار، اور اُردو کے اہم نقاد اور شاعر ڈاکٹر حامدی کاشمیری کو اُن کے شعری مجموعے "نایافت" پر دو ہزار رُوپے کا ایوارڈ دیا گیا۔ ہم حامدیؔ صاحب کی خدمت میں مُبارکباد پیش کرتے ہیں۔

جی، ایم، بابا

• شیخ محمد عبداللہ

کچھ اس طرح سے طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر چلے



ہمارا ملک حصولِ آزادی کے بعد سے اب تک بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اور ہمیں سیاسی، اقتصادی اور سماجی شعبوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ گو ہم سے غلطیاں بھی ہو چکی ہیں۔ پھر بھی ہم نے غربت اور افلاس کے خلاف جنگ میں ضرور کچھ پیش قدمی کی ہے۔ سیاسی لحاظ سے بھی ہم بہت حد تک آگے بڑھ چکے ہیں۔ چنانچہ عوام نے اپنی سیاسی پختگی اور دُور اندیشی کا ثبوت دیکر جمہوریت میں اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ گذشتہ برس کے انتخابات نے سیاسی قنوطیوں کے اندیشوں کو غلط ثابت کر دیا۔ رائے دہندگاں نے کروڑوں کی تعداد میں اپنے حق کا استعمال کر کے ملک کو ایک نیا پروگرام اور ایک نیا انتظامیہ دیکر اسے ایک نئی سمت عطا کی۔

اس عمل میں ریاست جموں و کشمیر بھی کسی سے پیچھے نہ رہی اور یہاں بھی جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم میں یقین

تعمیر

رکھنے والی قوتیں پنپ اُٹھیں چنانچہ جولائی کے انتخابات میں یہاں کے عوام نے کثرت رائے سے جمہوریت میں اپنے مکمل اور پختہ یقین کا جو مظاہرہ کیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لوگوں نے آزادانہ طور اپنے ووٹ کا استعمال کرکے اپنے نئے نمائندوں کو منتخب کیا۔ اس طرح ریاست کی تاریخ میں پہلی بار گذشتہ برس ۱۰ جولائی کو ایک ایسی وزارت قائم ہوئی جو صحیح معنوں میں لوگوں کی منتخب کی ہوئی ہے۔

نئی حکومت نے فوری طور اُن وعدوں کو پورا کرنے کے لئے کوششیں شروع کیں جو نیشنل کانفرنس کے منشور میں لوگوں کے ساتھ کئے گئے تھے۔ ایسے پروجیکٹوں پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے جن کا مدعا سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا معیار حیات بہتر بنانا ہے۔ اِن میں پینے کے پانی کی فراہمی، بجلی کی پیداوار بڑھانے، زرعی ترقی، ہاؤسنگ اور صنعتی ترقی کے پروجیکٹ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اِن پروجیکٹوں پر جس سُرعت اور شدومد سے عمل ہو رہا ہے۔ اُس کے پیش نظر ہم یہ اُمید کرتے ہیں کہ ہمارے غریب اور پسماندہ طبقوں کے لوگوں کو عنقریب ہی ریاست میں ہو رہی ترقی کا احساس ہوگا۔ اور مجموعی ترقی کے فوائد سے وہ بھی مستفید ہو جائیں گے۔

حکومت اُن سکیموں کو اوّلین ترجیح دے رہی ہے جن کا مقصد زرعی اور صنعتی شعبوں میں پیداوار بڑھانا ہے، اس سمت میں جو بھی پیش قدمی ہوگی، اُس سے ہمیں بے روزگاری کے مسئلے سے نمٹنے میں بہت مدد ملے گی۔ حکومت چھوٹے صنعتی یونٹوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے قرضے اور دیگر مراعات بھی فراہم کرتی رہی ہے۔ تاکہ روزگار کے نئے وسائل پیدا کئے جا سکیں، بڑے صنعتی اداروں کو بھی ریاست میں سرمایہ کاری کی طرف راغب کیا جا رہا ہے۔ اس بات کا ردعمل حوصلہ افزا رہا ہے اور بہت سے کارخانہ دار اس پیشکش کا جائز فائدہ اُٹھانے کے لئے آگے آ رہے ہیں۔

دیہی ترقی کی طرف زیادہ توجہ اس سلسلے میں اپنائی گئی قومی پالیسی سے بالکل ہم آہنگ ہے، دیہات کی ترقی اقتصادی سوچ کی بنیاد ہے۔ ہماری حکومت نے یہی اصول اپنایا ہے اور وہ اسی سمت میں کام کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم قدم اختیارات اور منصوبہ بندی کی غیر مرکوزیت ہے چنانچہ ضلع سطح پر سنگل لائن ایڈمنسٹریشن کا طریقہ کار اس ضمن میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس نظام کے تحت ڈپٹی کمشنروں کا نام بدل کر ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ کمشنر رکھا گیا ہے، اور اُنہیں مزید اختیارات تفویض کئے گئے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ ضلع کی اقتصادی ترقی کے لئے زیادہ سرگرمی سے کام کریں

تعمیر

گے۔ اس کے ساتھ ہی ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ کمیٹیاں بھی قائم کی گئی ہیں۔ جو ریاست کے مجموعی منصوبے کے حصے کے طور پر ضلع سطح کے منصوبے مرتب کیا کریں گی۔ اس اقدام کے سلسلے میں لوگوں کا بہت ہی صحت مند ردعمل رہا ہے۔ اور اُن میں زبردست جوش و خروش پیدا ہوا ہے۔ عوام اور خاص کر دیہی علاقوں میں رہنے والے لوگوں میں اس اقدام سے یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ اب اُنہیں بھی ترقیاتی معاملات میں فیصلے لینے کا موقعہ دیا گیا ہے۔ اس غرض سے ریاستی کابینہ نے دسمبر ۱۹۷۹ء تک سری نگر، اننت ناگ، بارہمولہ، ادھم پور، کٹھوعہ اور ڈوڈہ کے اضلاع کا دورہ بھی کیا۔ اگلے مالی سال کے دوران ریاستی حکومت ایسی سکیموں پر زیادہ زور دے رہی ہے جن کی بدولت سماج کے ایسے طبقوں کو براہ راست راحت ملے گی جو اب تک نظرانداز کئے گئے ہیں۔ منصوبے میں ایسی کئی اسکیمیں شامل کی گئی ہیں جن کا تعلق لوگوں کی اکثریت کی بنیادی ضرورت سے ہے۔ پلاننگ کمیشن کے ساتھ گفتگو میں ریاستی حکومت نے ۸۰-۱۹۷۹ء کے لئے ایک ارب ۴ کروڑ روپے کا منصوبہ تجویز کیا ہے یہ گزشتہ برس کے ۹۰ کروڑ کے منصوبہ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ حال ہی میں بعض حلقوں سے کچھ ایسی آوازیں اُٹھائی گئیں جن میں آزادی اور جمہوریت کے بنیادی اصولوں اور اقدار کے بارے میں ہماری حکومت کے اعتقاد پر شبہ ظاہر کیا گیا لیکن اس سلسلے میں اپنے اور موجودہ سرکار کے مکمل اعتقاد کو میں پھر سے دہرانا مناسب سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا موقف کسی بھی صورت میں مختلف نہیں ہو سکتا، زندگی بھر ہم نے انہی اصولوں اور اقدار کے لئے جدوجہد کی ہے، اور طرح طرح کے مصائب برداشت کئے ہیں۔ یہ اقدار ہماری زندگی ہیں، تحریر و تقریر کی آزادی ہماری پالیسی کی بنیاد ہے اور اس کو کسی صورت میں کوئی زک پہنچانے کی اجازت نہیں دی جائیگی۔ یہاں پر ریاستی حکومت کی اس پالیسی کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ مرکز کے ساتھ یہ اچھے تعلقات قائم رکھنا چاہتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کشمیر کو ایک قومی معاملہ سمجھنا چاہیئے۔ اور اس سے سیاسی فائدے حاصل کرنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کی جانی چاہیئے۔ جموں و کشمیر ہندوستان کے ملے جلے تمدن اور سیکولر روایات کا ایک تابندہ علامت ہے۔ ہمیں اس کے عظیم ماضی کی روایات کو قائم و دائم رکھنا ہوگا۔

اس لئے میں اپنے ہم وطنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اُن اصولوں اور نظریوں کیلئے اپنے آپ کو وقف کریں۔ جو راشٹر پتا نے ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ اس لئے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم ملک سے غریبی اور پسماندگی کو دور کرنے کا ایک بار پھر عہد کریں۔

تعمیر

مرزا محمد افضل بیگ



امدادِ باہمی — جمہوریت کی بنیاد

سماجی اور اقتصادی ترقی کے معاملے میں امدادِ باہمی کا طریقہ کار سب سے زیادہ کارآمد اور مؤثر ثابت ہوا ہے، خاص کر ہماری جیسی ترقی پذیر سوسائٹی اور دیہی معیشت کو استوار بنیادوں پر کھڑا کرنے کا تو یہ ایک اہم ذریعہ ہے۔ امدادِ باہمی کی تحریک کے معرضِ وجود میں آنے کے چاہے جو بھی وجوہات ہوں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سماج کی خوشحالی اور خودکفالت کے لئے اسے ایک بنیادی ضرورت تصور کیا جانے لگا ہے۔ امدادِ باہمی کا مطلب جیسا کہ ہم جانتے ہیں، دستیاب ذرائع کو یکجا کر کے مشترک کوششوں سے مسائل کا سامنا کرنا ہے۔

لیکن یہ محض ایک خیال ہے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے فعال اداروں کی ضرورت ہے گو ہماری ریاست میں ایسے ادارے عرصۂ دراز سے موجود ہیں لیکن ان کی حالت خستہ ہو کے رہ گئی ہے۔ جس کی خاص وجہ ان اداروں کا جمہوری طور طریقوں سے انحراف اور سیاسیات میں دخل یابی ہے۔ اس طرح یہ ادارے صحیح معنوں میں امدادِ باہمی کی کوئی اچھی مثال قائم نہیں کر پاتے، تاہم حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے ہیں۔ کواپریٹو انتخابات کرانے سے ان اداروں کو چلانے کے لئے خود اپنے نمائندے منتخب کئے ہیں اور یہ بات دیہی ترقی کے کام میں خاصی اہمیت رکھتی ہے۔

ہماری ریاست میں کواپریٹو اداروں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، قرضہ جات کی فراہمی اور تیار اشیاء تعمیر

کی مارکیٹنگ کے علاوہ اِن اداروں کی طرف سے دیہی آبادی کو کافی سہولیات مہیا ہوتی ہیں لیکن یہ ادارے ابھی بھی خود انحصار کہلانے کے قابل نہیں ہوئے ہیں چنانچہ مالی امداد، قرضہ جات اور تکنیکی جانکاری جیسے معاملات میں ان اداروں کو ابھی حکومت پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ہماری ریاست میں "کواپریٹو" کا باضابطہ طور ایک محکمہ بھی قائم ہے، جو امداد باہمی کی تحریک کو بڑھاوا دینے اور اسے موثر اور فعال بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے تاکہ اس تحریک کی بدولت ہماری تمام سماجی اور اقتصادی ضرورتوں کو بآسانی پورا کیا جا سکے، اس سمت میں بہت حد تک پیش قدمی بھی ہوئی ہے، ہمارا کواپریٹو نظام کئی سطحوں پر مشتمل ہے۔ بنیادی سطح پر ابتدائی کواپریٹو سوسائٹیاں ہیں اور درمیانی سطح پر سنٹرل کواپریٹو بنک آتے ہیں جب کہ ان کے اوپر ایپیکس بنک کام کر رہا ہے۔ گذشتہ برسوں کے دوران امداد باہمی کی سوسائٹیوں میں اضافہ کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی رہی۔ لیکن اب ان سوسائٹیوں کو مستحکم اور کار آمد بنایا جا رہا ہے اور انہیں ایک دوسرے میں مدغم کر کے نئی تشکیل دی جا رہی ہے۔ اس طرح خستہ حال اور ناقابل کار سوسائٹیوں کو بند کر کے قابل کار سوسائٹیاں مزید مستحکم بنائی جا رہی ہیں۔ سال ۱۹۷۵-۷۶ء میں ریاست میں ان سوسائٹیوں کی مجموعی تعداد ۱۱۷۹ تھی، جسے گھٹا کر پانچویں منصوبے کے آخر تک گیارہ سو کر دیا گیا۔ حالانکہ ایسی خستہ حال سوسائٹیوں کو بھی دوبارہ صحت مند بنیادوں پر باعمل بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ جن کے پھر سے قابل کار بننے کے امکانات ہوں۔ نیز ریاست میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تحریک امداد باہمی کے دائرے میں لایا جا رہا ہے۔ سال ۱۹۷۵-۷۶ء میں اس تحریک کے دائرے میں ۶۰ فیصد لوگ لائے گئے اور اندازہ ہے کہ پانچویں پانچسالہ منصوبے کے آخر تک ساری کی ساری دیہی آبادی کو اس تحریک کے ساتھ وابستہ کیا جائے گا۔ قرضہ جات فراہم کرنے کے شعبے میں بھی اطمینان بخش ترقی ہوئی ہے۔ ۱۹۷۶-۷۷ء کے دوران کواپریٹو محکمے کی طرف سے ریاست کے لوگوں کو دو کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کے قرضے فراہم کئے گئے۔

ریاست میں کیمیائی کھاد کی تقسیم کا کام پہلے جموں و کشمیر کواپریٹو فیڈریشن انجام دے رہی تھی، لیکن اب یہ کام ایپیکس مارکیٹنگ سوسائٹی کے سپرد کیا گیا ہے۔ ایپیکس مارکیٹنگ سوسائٹی نے جو جموں و کشمیر مارکیٹنگ فیڈریشن کے نام سے موسوم ہے، فوڈ کارپوریشن آف انڈیا سے ۶ کروڑ ۴۳ لاکھ روپے کی مالیت کی کھاد جس کی کل مقدار ۲۴۳۴۴ میٹرک ٹن تھی ریاست میں درآمد کی ہے اور اس نے سال ۱۹۷۶-۷۷ء کے دوران کسانوں کو ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے کی مالیت کی کھاد فراہم کی

تقسیم

جبکہ سال ۱۹۷۵-۷۶ء میں صرف دو کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کی کھاد کسانوں کو مہیا کی گئی تھی، کھاد کے نظام تقسیم کو آسان بنایا گیا ہے، تاکہ کسان وقت پر اپنی ضرورت کے مطابق اسے حاصل کر سکیں۔

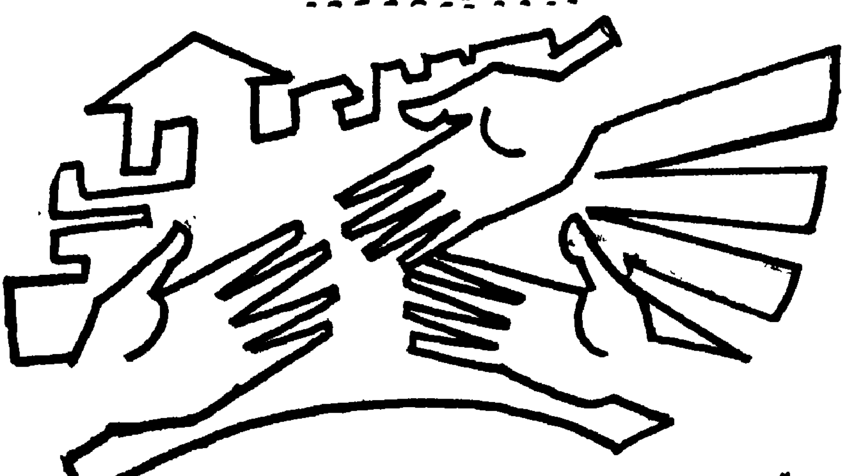
اسی طرح صارفین کو اشیائے ضروریہ فراہم کرنے کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ تاکہ دیہی اور شہری آبادی کو وافر مقدار میں ضروری اشیاء فراہم کی جا سکیں۔ اس سلسلے میں ضلع ہیڈکوارٹروں پر ڈسٹرکٹ کنزیومر کوآپریٹو سٹور قائم کئے گئے ہیں۔ ان سٹوروں کو حکومت کی طرف سے مالی امداد دی جاتی ہے، جس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں بھی پرائمری سٹور چالو کئے گئے ہیں۔ جو طلباء کو کتابیں، سٹیشنری اور دیگر ضروری اشیاء مناسب قیمتوں پر مہیا کر رہے ہیں۔ سال ۱۹۷۶-۷۷ء کے دوران ریاست میں لوگوں کو کوآپریٹو سٹوروں سے ۸ کروڑ روپے کی مالیت کی اشیاء کنٹرول نرخوں پر فراہم کی گئیں، شہر بازاروں کی طرح دیہی آبادی کو بھی پرائمری مارکیٹنگ سوسائٹیوں کے ذریعے دیگر اشیاء کے علاوہ کھانڈ، کپڑا اور مٹی کا تیل کنٹرول نرخوں پر فراہم کیا جاتا ہے۔

کوآپریٹو اداروں کو ریاست میں خوراکی اجناس کی خوش خرید کا کام بھی سونپ دیا گیا ہے۔ اور یہ ادارے اس سلسلے میں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے ایجنٹوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ سال ۱۹۷۶-۷۷ء کے دوران ان اداروں نے صرف جموں ڈویژن میں ایک لاکھ پچاس ہزار کوئنٹل گندم اور ۴ لاکھ ۱۲ ہزار کوئنٹل شالی خوش خرید کے طور پر حاصل کی۔ گذشتہ ایک یا دو برسوں کے دوران کسانوں اور خاص طور پر سبزی اگانے والوں کو کولڈ سٹوریج کی سہولیات فراہم کرنے کی طرف بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ نشناہ جموں میں حال ہی میں اس قسم کا ایک سٹور قائم کیا گیا جس پر ۹ لاکھ روپے لاگت آئی ہے۔ اس کے علاوہ جموں و کشمیر کے ڈویژنوں کے لوگوں کو عام سہولیات بہم پہنچانے کا ایک ایک مرکز قائم کرنے کی بھی پہل کی گئی ہے۔ ان مرکزوں کے قیام کا مقصد کسانوں کو جدید طریقہ کاشت سے روشناس کرانا ہے، تاکہ پیداوار کو بڑھایا جا سکے۔ پہاڑی اور پسماندہ علاقوں میں نئے طرز کے کوآپریٹو مراکز قائم کئے جا رہے ہیں۔ یہ مرکز وہاں پر سوسائٹیوں کے طور پر کام کریں گے۔ اب تک ایسے ۱۶ مرکز پہاڑی اور پسماندہ علاقوں میں قائم کئے جا چکے ہیں۔ مرکزی امداد سے شروع کی گئی اسکیموں کو بھی روبہ عمل لایا گیا ہے۔ تاکہ کوآپریٹو نظام کو مستحکم بنایا جائے۔ ان اسکیموں میں کمزور کوآپریٹو بنکوں کو پھر سے صحت مند بنانے، زرعی قرضہ جات کے لئے رقوم فراہم کرنے، جنتا دکانیں کھولنے اور ڈیپارٹمنٹل سٹور قائم کرنے سے متعلق اسکیمیں شامل ہیں۔

اس طرح میووں کی تجارت میں درمیانہ داری کو ختم کرنے کی غرض سے میوہ اُگانے والوں کو بھی کواپریٹو کے دائرے میں لایا جارہا ہے۔ اور اس سلسلے میں اُنہیں ہر ممکن حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ ریاست میں اب تک میوہ اُگانے والوں کی کئی کواپریٹو سوسائٹیاں قایم کی جاچکی ہیں۔ یہاں پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کواپریٹو اداروں نے سماج کے کمزور طبقوں کو رہائیشی مکانات کی سہولت بہم پہنچانے کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی ہے جس کے نتیجے میں ان لوگوں کو سستے اور کم لاگت کے مکان فراہم کرنے کی غرض سے کئی ہاؤسنگ کواپریٹو سوسائیٹیاں قایم کی گئی ہیں۔ اس طرح کی ایک ہاؤسنگ سوسائیٹی جو کہ اننت ناگ (کشمیر) میں قایم ہے مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

حکومت کے زیرِ غور اس وقت ایک اور اہم کواپریٹو سکیم ہے۔ یہ سکیم امداد باہمی کی ایک آزمودہ کار شخصیت مرزا غلام قادر بیگ نے مرتب کی ہے اور اس کی رُو سے کشمیر میں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ کواپریٹو بستیاں تعمیر کرنا مطلوب ہے۔ اس سکیم کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے۔

ریاست میں امداد باہمی کی تحریک کو مزید بڑھاوا دینے اور مختلف کواپریٹو اداروں کو زیادہ مؤثر اور کار آمد بنانے کی کوششیں بدستور جاری ہیں۔ تاکہ جس مقصد سے ان اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، اُسے صحیح معنوں میں جلد از جلد حاصل کیا جاسکے۔



تعمیر

عبدالاحد رفیق



مُلا محمدؐ اسماعیل بنیش کشمیری

کشمیر کے آسمانِ ادب پر جو ہستیاں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکی ہیں۔ ان میں مُلا محمد اسماعیل بنیش کشمیری کا نام بھی شامل ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ کشمیر کے اس مایہ ناز فارسی شاعر سے عوام تو درکنار بہت سے پڑھے لکھے لوگ کم ہی واقف ہیں۔ کشمیر کے فارسی شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنے خونِ جگر سے جو لالہ کاری کی ہے۔ اس کے سامنے ایرانی فن کاروں کی گُل کاریاں بھی بعض اوقات ماند پڑ جاتی ہیں۔ بنیش کشمیری شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہدِ حکومت کے مشہور و معروف فارسی شاعر ہو گذرے ہیں۔ مُلا بنیش کشمیری کا ذکر جن تذکروں میں ملتا ہے۔ اُن کے نام یہ ہیں:۔ تذکرہ شعرائے کشمیر مرتب راشدی، تاریخ حسن حصہ چہارم، کلمات شعراء، تذکرہ شعرائے معتقدین، تذکرہ ہمیشہ بہار، ریاض الشعراء، مجمع النفائس، آتش کدہ، صحف ابراہیم، نتائج الافکار، صبح گلشن، پارسی سرایانِ کشمیر، مخزن الغرائب[1]، فارسی ادب بہ عہدِ اورنگ زیب۔ ان سب تذکروں کے مطالعے کے باوجود ایسے نامور شاعر کی زندگی کا کوئی پہلو نمایاں نہیں ہوتا ہے، بلکہ اکثر تذکروں کی عبارت حرف بہ حرف ملتی جلتی ہے۔

آپ کا نام محمد اسماعیل ہے، تخلص بنیش، مُلا، لقب، آباواجداد کا وطن ایران، آپ کشمیر میں ہی تولد

[1] نتائج الافکار اور صبح گلشن میں ان کا نام جعفر بیگ بتایا گیا ہے۔ جو غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جعفر بیگ سلطان حسین صفوی کا معاصر تھا۔ (۱۰۷۲ھ ۱۶۶۲ء) نتائج الافکار ص ۱۰۹، سید حسن علی خان صبح گلشن بھوپال ۱۲۹۰ ہجری، ص ۷۵!

ہوئے تھے، تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ آپ نے شاہ جہان کا دور بھی دیکھا[1] اور اورنگ زیب کا عہدِ حکومت بھی[2]
علوم و فنون کی تحصیل و تربیت کشمیر میں ہی حاصل کی تھی۔ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ دہلی، پنجاب، خاص کر لاہور کی سیر کرتے رہے،[3] اورنگ زیب کے دور میں کشمیر کے چوٹی کے فارسی شعرا میں شمار ہوتے تھے،[4] عنایت خان آشنا کے ہم عصر تھے[5] صحف ابراہیم میں ان کے متعلق یوں بیان کیا گیا ہے۔

"ملا بینش کشمیری، اسمش محمد اسماعیل، گویند وطن آبائیش ایران است، واو در کشمیر نشو و نما یافته در زمان پادشاه عالمگیر خلد مکان از مشاہیر سخن وران کشمیر بود، در مجمع النفائس آمده که غالباً معاصر عنایت خان آشنا باشد، چه اکثر بجواب غزلهای او در پرداخته است، در اشعارش بلا قصور یافته شد، مثنوی در تعریف اماکن کشمیر بخوبی در سلک تحریر کشیده و کلامش مدون و سخنور معنی یاب است، راقم اثم ابیاتش را از مجمع النفائس و بعض سفاین گرفته درین اوراق اثبات ساخته[6]

---

[1] صحف ابراہیم
[2] نشیر عشق، بانی پورہ، نمبر ۱۴۱۲ ص ۲۸۵
[3] صحف ابراہیم و آتش کدہ بمبئی ۱۲۹۹ ہجری
[4] آتش کدہ بمبئی ۱۲۹۹ ہجری
[5] مرزا محمد طاہر ملقب بہ عنایت خان تخلص آشنا ظفر خان صوبیدار کشمیر کا لڑکا تھا۔ اس کی ماں بزرگ خانم ممتاز محل کی بڑی بہن ملکہ بانو کی لڑکی تھی۔ شاہجہان نے اس کو بہت ہی کم عمری میں یعنی جب وہ صرف سات سال کا تھا منصب عطا کیا۔ اور جب سن شعور کو پہنچا، تو ہزار و پانصدی کے منصب پر مامور کیا اس کے ساتھ داروغہ حضور بنایا گیا۔ شاہجہان کے آخری دور میں شاہی کتب خانہ کا داروغہ تھا۔ آشنا نے اپنی عمر کا آخری حصہ کشمیر میں گذارا، عالمگیر کے زمانے میں اس کو ۲۴ ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ ملتا تھا، بڑا اچھا جوان تھا، طبیعت میں شوخی تھی، ابوطالب کلیم اور دوسرے شعرا کو اپنے گھر میں بلاتا، اور کھانے کی چیزوں میں نشہ آور چیزیں ملا دیتا، مجھ پر بھی وہ مہربان تھا۔ دو سال ہوئے وفات پائی اور کشمیر میں دفن ہوا۔ تذکرہ نصرآبادی سنہ ۱۰۸۱ م
[6] صحف ابراہیم ص ۹۲، الف)

تیمر

زندگی کا اکثر حصہ لاہور، پنجاب، اور دہلی میں بسر کیا۔ کشمیر میں زیادہ تر کشتی کی سیر کیا کرتے تھے[1] تاریخ وفات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کے اختتام پر وفات پائی تھی،[2] بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ بینش نے ایران کی سیاحت کی تھی، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ انہوں نے اپنی مثنویوں میں ایران کے بعض شہروں اور مقامات کا ذکر کیا ہے، مگر وہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے۔ انہوں نے اکثر کشمیری اور مغل امراء کی تعریف و توصیف دل کھول کر کی ہے، اور قصیدے لکھے ہیں[3] قصیدوں کے مطالعہ سے بعض مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ آپ نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے جن میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی اور مثنوی شامل ہیں۔ ہر جگہ ہر صنف سخن میں ان کی استادانہ شان قائم ہے۔ مگر مثنوی میں وہ واقعی صاحب طرز شاعر ہیں، وہ حسن کے سچے شیدائی تھے، اور ان کے ہر شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ اصول اپنایا تھا کہ حسن ایک صداقت ہے۔ اور صداقت ایک حسن ہے، ان کی شاعری میں ہر جگہ حسن کی تعریف ملتی ہے، حسن و عشق کا ایک حسین امتزاج[4] کی شاعری میں نمایاں ہے[5] ان کی شاعری میں عشق کی جو سرمستی پائی جاتی ہے، اس کی نظیر کشمیر کے ایک اور فارسی شاعر داراب جویا میں ملتی ہے۔ بینش کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی سادگی اور شیرینی پائی جاتی ہے، ان کے کلام میں صنائع و بدائع کا بہت کم استعمال ہوا ہے۔ ہر جگہ سادگی اور پرکاری دکھائی دیتی ہے۔ حسن و عشق، دل و دماغ اور روح کا ذکر دلکش انداز میں کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عشق کے تیر سے خود بھی گھائل ہو چکے تھے۔ انہوں نے عشق کی وارداتیں حسن اور سچائی کے ساتھ بیان کی ہیں، وہ خیالی معشوق کی تعریف نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس محبوب کی جو ان کے سامنے موجود ہے ؎

چشم گریان مرا، جوش خریداری ہست   چون کہن اشک مرا طالع سرشاری ہست
میکند رو بہ قضا سیر جہان را خورشید   در داش از تو مگر حسرت دیداری ہست[6]

---

[1] آتش کدہ لطف علی خان آذر بمبئی ۱۲۹۹ ہجری ص ۳۶۵، مخزن الغرائب علی گڑھ ورق ۵۸

[2] ہمیشہ بہار، [3] فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب، [4] ایضاً

[5] کلمات الشعراء، مطبوعہ لاہور، [6] تذکرہ شعرائے کشمیر راشدی؛

تعمیر

چمن عشرت من گلشن قایم باشد، — می زنم گل بر سر آندم که خاری هست

....

چمن شگفتا و نرسد هم زهی نیست — میانه و من و گل بی تو آشنائی نیست
بهر کجا که تو منزل کی خوش است مرا — میان چشم و دل عاشقان جدائی نیست
بباغ نرگس و در دشت لاله میگویند — چراغ چشم مرا بی تو روشنائی نیست [1]

... ...

یہ کہنا سراسر لغو اور بے بنیاد ہے کہ دیوان بینش میں صرف حسب ذیل دو شعر عمدہ اور اچھے ہیں [2]

ہر پارۂ دلم چمنی از نگاہ اوست — آئینہ چوں شکستہ شد آئینہ خانہ شد [3]
در راہ وصال تو زبس چشم براہم — چوں جادہ بود خاک نشین نگاہم [4]

بلکہ حق تو یہ ہے کہ ان کا کلام سراپا انتخاب ہے، اور اہل دل نے ہمیشہ ان کے کلام کو سراہا ہے، کشمیر میں جو ایک دو شعر بطور ان کا نام لیا جاتا ہے، محمد افضل سرخوش نے ان کے کلام پر جو رائے دی ہے وہ انصاف پر مبنی نہیں ہے،

بینش کو کشمیر کے فطری حسن اور مناظر کے ساتھ بڑا لگاؤ رہا ہے، یہاں کے برجستہ باغات گل پوش وادیاں اور حسین و جمیل کوہساروں کے نظاروں کا حسن ان کے ہر شعر سے چھلکا پڑتا ہے، وہ بہار کی تعریف میں فرماتے ہیں

بسان تاک در اطراف لبنان — تواں گردید بر گرد درختان!
نمی باشد بگردونش جدائی! — بزرگاں را نیست باہم آشنائی، [5]

کشمیر کے پہاڑوں کی توصیف یوں کی ہے

---

[1] تذکرۂ شعرای کشمیر راشدی، [2] کلمات الشعراء
[3] تذکرہ شعرای متقدین و ہمیشہ بہار بیاض علی باسط،
[4] تذکرہ شعرائے متقدین و بیاض علی باسط، [5] تذکرہ شعرای کشمیر راشدی

تیمر

فلک خم گشتہ پیری درکنارش، بود موی سفید از آبشارش [1]

کوہ پیر پنچال کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

در این کوہسار جوش نوبہار است، کہ قاف قدرت پروردگار است [2]
ہمہ سبزہ گل در کنار است، کہ موئی کلک نقاش بہار است!
بود دیگر ستہ گل این کوہ وال خواہ، کہ پیچیدہ است بر خود رشتہ از راہ!
چو زہر ویندریں کوہ تنومند؛ کہ آنرا بارگش ابر است پیوند،
بیا از بسکہ زنگش میکند جا، شبیہ سنگ پا گردد کف پا،
چو قطع رہ سپہر سیر سازد، مر نورا عصا شمشیر سازد؛

جھیل ڈل کے کنارے کسی عمارت کی تعمیر کے موقعہ پر بینش نے کیا خوب کہا ہے ؎

چنان سنگش بصافی رو نمود، کہ شد از عکس گل آب و گل آلود!

کشمیر میں کوہ ماران اور کوہ سلیمان کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

دو کشمیری جوان گل فروش اند، کہ از ابر بہاری شال پوشند،

جھیل مانسبل کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں ؎

در آبش بستہ عکس کوہ آئین، کشیدہ سرمہ گوئی چشم شیرین،

بینش کا اصل شاہکار اس کی مثنویاں ہیں اور جہاں ان کی کمال ہنرمندی ظاہر ہوتی ہے اور جہاں ان کی استادانہ شان نظر آتی ہے، بینش نے چند مثنویاں لکھی ہیں۔ ان کی تفصیل یوں ہے:۔

(۱) بینش الابصار، یہ مثنوی، مثنوی مخزن اسرار کے جواب میں لکھی گئی ہے، اس کا وزن بحر اور موضوع مخزن اسرار کے انداز میں ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے اورنگ زیب کی مدح سرائی کی ہے، مختلف شہروں کے اوصاف بیان کر کے کشمیر کی نفاست، پاکیزگی اور حسن خداداد کی تعریف کی ہے، اس کے علاوہ شاعر نے ہندوستان کے

[1] تذکرہ شعرائے کشمیر راشدی [2] تذکرہ شعرائے کشمیر راشدی

تعمیر

دریا جمنا کی بھی تعریف کی ہے، دہلی کے خوبصورت چہروں کے ساتھ ساتھ یہاں کے صوفیہ اور اولیاء کی خوب تعریف کی ہے، کشمیر کی تعریف اس مثنوی میں یوں کی ہے ؎

شوخ مرا بلبل تقریر کرد | مدح سرائے گل کشمیر کرد!
زنگ گلشن ریختہ طرح زنگ | سبزہ بہ مژگان فرنگی بہ جنگ ہے

اس مثنوی کا اصلی موضوع اخلاق ہے، اس میں مسرو سخاوت اور قناعت پر عمل کرنے کی تاکید کی گئی ہے،
بینش کی دوسری مثنوی، مثنوی گنج روان ہے، اس مثنوی میں اورنگ زیب اور کشمیر کے امیروں کی تعریف کی گئی ہے، خاص کر مرزا محمد کرانی سے اور سید محمد کاشانی سے کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں، اس مثنوی میں اس کے علاوہ مناظر فطرت کا بیان وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے، کشمیر کے چار موسموں کا عمل اور اثر بیان کر کے شاعر نے خدا کی کاریگری کی خوب داد دی ہے،

ساقی نامہ ایک اور مثنوی ہے، جو عام ساقی ناموں کی طرح بہار کے پر کیف نظاروں اور خوشگوار ہوا کے اثرات کے بیان پر حاوی ہے، یہاں حسن و عشق کی دلکش آمیزش نے شاعر کے جذبات کی خوب ترجمانی کی ہے، مگر پھر بھی شاعر نے اخلاق کا لحاظ رکھا ہے:-

بینش کی ایک اور مثنوی گلدستہ ہے، اس مثنوی میں بینش نے چاند، سورج اور زمین کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ حسن و عشق کی باتیں دلکش انداز میں بیان کی ہیں۔ خاص کر پنجاب، لاہور کی تعریف بھی کی ہے۔ لاہور کے ساتھ ان کو کشمیر کی طرح والہانہ عشق ہے ؎

لاہور جہاں جاوداں است! | پر گلشن و نوجوان است!
آراستہ آں قدر کی شاید، | پیراستہ آں چناں کہ باید!
مشہور بہ خوبی است لاہور، | ہر چشم بدی چو نیب از و دور،

لہ مجموعہ مثنویات بینش ورق ۳۲ [2] ۳۲ سے اورنگ زیب کے دور میں کشمیر کے دو امیر و رمیس ہو گذرے ہیں، اور دونوں یکے بعد دیگرے دیوان کے عہدے پر فائز المرام رہتے،

تیمیر

"شورِ خیال" بینش نے ایک اور مثنوی لکھی ہے، اس میں بنارس کی عشقیہ کہانی بیان کی ہے، جو صداقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بنارس کے حسن کی تعریف کی گئی ہے ؎

بنارس را عجب آب و ہوائی است | برائے عشق بازی طرفہ جائی است
برہمن زادگان فتنہ آئین! | چو گل دارند در بر جامہ پرچین
بتانش از نمک نیکو سرشتند | کہ موج سبزۂ باغ بہشت اند
شد آں روزی کہ ہندوستان گلشن | ز سبزان شد بنارس سنبلستان

"رشتۂ گوہر" بینش کشمیری کی پانچویں مثنوی ہے۔ اس میں ایک سانپ اور گدھ کی کہانی بیان کی گئی ہے کہ ایک گدھ ایک سانپ شکار کرکے لے جا رہا تھا۔ اچانک سانپ اس سے چھوٹ کر زمین پر اُڑتا ہوا آیا اور ایک عورت کو کاٹ کھایا اور وہ عورت تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اس کے آخر میں فرماتے ہیں ؎

رشتۂ گوہر کلام نظم ام | کہ بہ نام تو خمسہ کردم تمام!
یارب ایں خمسہ بی قرین باشد | تا سخن است ایں چنین باشد

"جواہر خانہ" بینش نے ایک اور خمسہ لکھا ہے۔ اس میں اورنگ زیب کی تعریف کی ہے، مرزا محمد تقی بیگ کی بھی مدح کی ہے، مثنوی میں بغداد اور تبریز کے شہروں کی خوبصورتی کو سراہا گیا ہے۔

بینش کی سب سے عمدہ اور اعلیٰ معیار کی مثنوی "صفت سلیقۂ معراج" ہے، اس میں شب معراج کی فضیلت، عظمت، اور قدر و منزلت کو بیان کیا گیا ہے، یہاں شاعر کا قلم رواں چلتا ہے۔ اور پرکاری و ہنرمندی کا ایک اچھا نمونہ ملتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر کا حقیقی میدان ہے، جہاں وہ اشہبِ قلم کو دوڑا سکتا ہے ؎

تازہ شبنمے ز فضائی بہشت | رشک دہ جنت و عنبر سرشت
شب ز صفائی گل نور ز وصل | خرمن صبح دل افروز وصل
نرگس مخمور خوشش کو کجے | خواب ندید است بدنیال شبے
ظلمت شب محو تصور خانہ | چوں بپر امان پر پروانہ

تعمیر

خلد کشادہ در گلزار ہا،   آراستہ گل شد دیوار ہا،

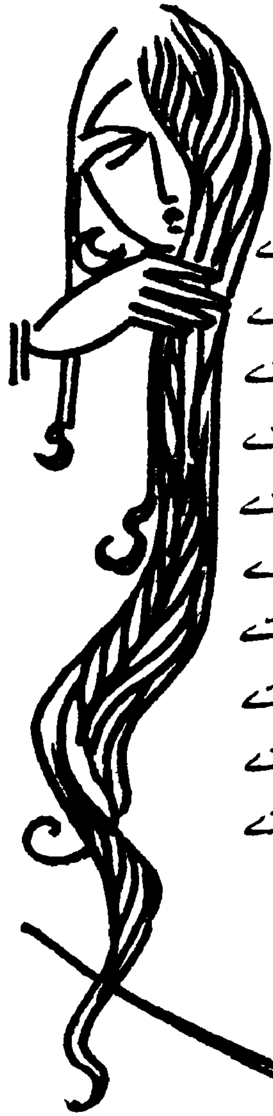
بنیش کا دیوان ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ دیوان اور کلیات کے نسخے ہند و پاک کے اکثر کتب خانوں میں موجود ہیں۔ کلام بنیش کے شائع ہونے کے بعد بنیش کا مقام شاعری خود بخود متعین ہو جائے گا۔

مآخذ

(۱) کلمات الشعراء
(۲) تذکرہ شعرای متقدمین
(۳) ہمیشہ بہار
(۴) ریاض الشعراء
(۵) مجمع النفائس،
(۶) تذکرہ نصرآبادی
(۷) نتائج الافکار،
(۸) صبح گلشن
(۹) آتش کدہ
(۱۰) تذکرہ شعرائے کشمیر ترتیب راشدی
(۱۱) فارسی ادب بہ عہد اورنگ زیب،
(۱۲) تاریخ حسن جلد چہارم
(۱۳) صحف ابراہیم،
(۱۴) نشتر عشق
(۱۵) بزم تیموریہ،

تیمیر

فضا ابنِ فیضی



غزل

قید لفظوں کی اُٹھا دی جائے — یوں معانی کو صدا دی جائے

پھر بہار آئی نئے پھول کھلے — آؤ زخموں کو دعا دی جائے

کون جاگے گا سحر ہونے تک — شمع یادوں کی بجھا دی جائے

جسم کیا، نہ جلا دامن بھی! — اور شعلوں کو ہوا دی جائے

کہیں رُکتے نہیں لمحوں کے قدم — ان کو زنجیر پہنا دی جائے

محتسب خود ہے طرفدار اس کا — کیسے قاتل کو سزا دی جائے

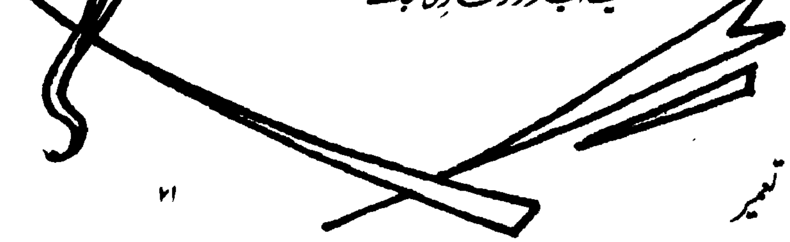
زندگی اور یہ خوابوں کی تھکن — عمر راتوں کی گھٹا دی جائے

پیاس موجوں نے بجھائی کس کی — آگ دریا میں لگا دی جائے

مجھ کو کاغذ پہ نہ لکھ، کیا معلوم — کب یہ تحریر جلا دی جائے

یہی اچھا ہے کہ اب دولتِ فن — کہیں مٹی میں دبا دی جائے

ہم تو جل بجھ کے ہوئے راکھ فضاؔ
کیسے اب دادِ وفا دی جائے



حامدی کاشمیری



اقبالؒ کی نظمیں

غالب کے مقابلے میں اقبال کی شاعری کے مطالعے کی ایک نئی جہت صنفی نوعیت کی ہے۔ یہ صنف نظم ہے جس میں اقبالؒ نے اپنے بیشتر تجربات کا اظہار کیا ہے۔ غالب کے یہاں یہ صنف جیسی ڈھلی اور آگے نہ بڑھی۔ وہ غزل کی روایتی صنف ہی کے اسیر رہے۔ اور اس معاملے میں ایک طرح سے روایت پرست ہی رہے۔ اقبالؒ کے زمانے تک نظم خاصی مقبول اور مروج ہو چکی تھی، لیکن ابھی ایک طاقتور فن کار کا انتظار تھا۔ جو اس کے پوشیدہ امکانات کا استعمال کر سکے، یہ فن کار اسے اقبالؒ میں ملا۔ اور ان کے ہاتھوں اس کی توانائی اور تاثیر کا خوب مظاہرہ ہوا۔ صنفی اعتبار سے نظم کی ساخت غزل سے مختلف ہے۔ غزل کے اشعار میں مختلف اور بعض صورتوں میں متضاد تجربوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ موضوعی اعتبار سے ہر شعر مکمل اور خود مکتفی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نظم میں ایک ہی مرکزی تجربے کا اظہار ہوتا ہے۔ جو ابتدا، وسط، اور اختتام رکھتا تھا۔ اور مجموعی طور پر ایک کلی تاثر کو خلق کرتا ہے۔ غزل کا ہر شعر بجلی کی طرح کوند جاتا ہے لیکن نظم بقول آل احمد سرور "روشنی کا دریا" ہے۔ غزل اور نظم کے اس ہیئتی اختلاف کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں میں سے کسی ایک کے لئے بنیادی شعری لوازم کی پابندی میں کوئی رعایت برتی جا سکتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو صاف اصناف میں ساخت کے تفاوت کے باوجود کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل کے فرد شعر کے مقابلے میں نظم کا دائرہ وسیع تر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا یہی پھیلاؤ یا محدودیت شیکسپیئر کے سانیٹ کو ان کے بھرپور المیہ ڈرامے مثلاً میکبتھ یا کنگ لیئر کے صنفی فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ غزل میں تجربے کا حد درجہ ارتکاز ملتا ہے، جبکہ نظم میں مختلف الاوصاف تجربے ہم آہنگی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ اور خاتمے پر ایک متحدہ تاثر

تعمیر

کو جنم دیتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اقبال نے صنفِ نظم کو کہاں تک اپنی تخلیقی توانائی کا موثر ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ اُن کی نمائندہ نظموں میں مواد کے شعری برتاؤ کے تین طریقے نمایاں نظر آتے ہیں۔ پہلا یہ طریقہ ہے کہ کسی خارجی محرک سے اُن کا شعری شعور متحرک ہوتا ہے۔ اور اُن کی نگاہ میں نظم کی ہیئت تشکیل پذیر ہونے لگتی ہے۔ ایسی نظموں کا بنیادی مواد وہ خیالات فراہم کرتے ہیں۔ جو اُن کے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں۔ اور یکے بعد دیگرے نظم کی ہیئت میں ڈھلنا شروع ہوتے ہیں نظم مکمل ہوتی ہے۔ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر ہمارے قریب ہی ایک طرح کی بہ آوازِ بلند فکر میں محو تھا۔ اور ہمارے حواس پر چھایا ہوا تھا ایسی نظموں میں غزل کی منتشر الخیالی کا اثر صاف نمایاں ہے لیکن اس کے باوجود ان کا نظمیاتی وجود برقرار رہتا ہے۔ یہ بندوں کی ترتیب، آہنگ اور نفسِ کیفیت کی وحدت سے مستحکم ہو جاتا ہے۔ اس قبیل کی نظموں میں تصویرِ درد، شمع اور شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں اور خضرِ راہ شامل کی جا سکتی ہیں۔ تصویرِ درد میں ذیل کا شعر بنیادی محرک کی حیثیت رکھتا ہے

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

اقبال اپنے ملک کی اس عبرتناک صورتِ حال کا سامنا کرتے ہیں۔ جو صدیوں کی غلامی نے عملی اور ریاسی گی کی پیدا کردہ ہے۔ اُن کے دل میں جذبات اور سوالات کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ اِن ہی لہروں کو اقبال نے اس نظم میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو اپنی بے عملی اور پستی کا احساس دلا کر اُن کے عزم و عمل کے جذبے کو تیز کرنا چاہتے ہیں۔ یہی نظم کا بنیادی خیال ہے۔ یہ خیال اقبال کے دل و دماغ پر چھایا ہُوا ہے اور شکلیں بدل بدل کر اُن کی منظومات میں ظاہر ہوتا ہے۔ تصویرِ درد کی بڑی خامی یہ ہے کہ یہ طوالت کی شکار ہے اور بعض خیالات کی تکرار سے بوجھل ہے۔ مثلاً ملک کی حالتِ زار کو دیکھ کر شاعر اپنے داخلی ردِ عمل یعنی رونے کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو نظم کے پہلے ہی تین بندوں میں پانچ بار دُہرایا گیا ہے۔ یہ تکرار تکرارِ محض کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

(۱) ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
(۲) مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا،
(۳) خوشی رُوتی ہے جس کو میں وہ محرومِ مسرت ہوں

تعبیر

(۴) مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی

(۵) دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویائی

شمع اور شاعر بھی ہیئتی اور موضوعی اعتبار سے تصویر درد سے ملتی جلتی ہے۔ یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں شاعر شمع سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے۔

می طپید صد جلوہ در جان تعل فرسود من!

بر نمی خیزد ازیں محفل دل دیوانہ

اس کے جواب میں شمع کی زبانی نو بندوں میں مختلف عصری موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے، یہ خیالات بنیادی طور پر وہی ہیں، جن سے تصویر درد عبارت ہے یعنی ملک کے لوگوں خاصکر مسلمانوں کی موجودہ پستی، عظمت گذشتہ، نئی بیداری انسان کی عظمت اور روشن مستقبل کی بشارت، فرق صرف یہ ہے کہ زیر بحث نظم میں ان خیالات کو وسیع ترکینواس پر پھیلایا گیا ہے۔ دوسرے بند میں البتہ شاعر کے "سوز باطن" کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ نظم بھی طول کلامی کی شکار ہے۔ عام طور پر ایک بند کا مرکزی خیال اس بند کے مختلف اشعار میں دہرایا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شعر پیکر و استعارہ کے اعتبار سے مکمل اور حسیت ہے لیکن غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرکزی خیال ایک ہی ہے جسے دوسرے روپ میں پیش کیا گیا ہے مثلاً ذیل کے بند میں جو سات اشعار پر مشتمل ہے۔ ایک ہی بنیادی خیال یعنی پرانے اہل شوق کے اٹھنے کے احساس غم کی مصوری کی گئی ہے، یہ احساس غم ساتوں اشعار میں موجود ہے۔

تھا جنھیں ذوق تماشا وہ تو رخصت ہو گئے!

لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا!

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے

ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا،

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی

پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا،

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ!
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا،
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہرِ پروانہ تھا،
اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا،

اِس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کئی ایسے اشعار ہیں جو فنی اعتبار سے انفرادی طور پر تکمیلیت اور تازگی رکھتے ہیں، مثلاً:-

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ!
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا،

والدۂ مرحوم کی یاد میں لکھنے کی تحریک اُن کو والدہ کی تصویر دیکھ کر ملی ہے۔ یہ تصویر اُن کے عہدِ طفلی سے متعلق پُرانی یادوں کو جگاتی ہے۔ والدہ کی بے پناہ شفقت کی یاد آکر اُن کی موت کا احساسِ غم تیز ہوتا ہے، اور ایک پورے بند میں موت کی "ارزانی" کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر اُن کے سوچنے میں تبدیلی آتی ہے۔ وہ جسمِ خاکی کی موت کو انسان کا مکمل خاتمہ قرار نہیں دیتے۔ بلکہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ موت کا "رازِ نہاں" کچھ اور ہے:-

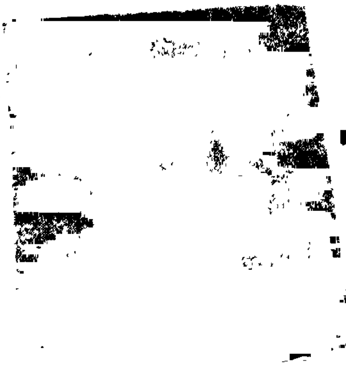
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے،
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے،

موت کی یہ فلسفیانہ تعبیر کرکے اُن کا لہجہ بہجت آمیز ہوجاتا ہے۔ اور وہ صبحِ مسرت کی بشارت دیتے ہیں:-

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح،
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح،

آخری بند میں انسان کے روشن مستقبل کا ذکر کرکے نظم والدہ کے لئے اس پاکیزہ خواہش اور دُعا پر ختم ہوتی ہے:-

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے



نوائے نور

پروفیسر پی۔ این پشپ

شیخ نورالدین نورانی

اور ان کا کلام

شیخ نورالدین نورانی جن کی چھ سویں سالگرہ اس برس ریاست بھر میں منائی جارہی ہے، کشمیری زبان کے اولین شعراء میں سے ہیں۔ اِن کا پیدائشی نام نُندہ سنز تھا۔ بعد میں نند ریشی کہلائے اور سہجا نند بھی۔ بچپن سے ہی حق کی تلاش میں سرگراں رہے۔ ۲۰ سال کی عمر میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ ۱۲ برس گپھا میں خلوت گزیں رہے۔ باہر آئے تو وادی کے کونے کونے میں پیدل چل کر ہی لوگوں پر اپنی بصیرت کا نور برساتے رہے۔ آخری دم تک اسلام کے صحیح عمل اور کردار کی تبلیغ کرتے رہے اور وفات کے بعد چرار شریف میں آسودہ ہوئے۔

نُند ریشی کا کلام شُرک (یعنی شلوک) کے نام سے مشہور ہے۔ صدیوں سینہ بسینہ محفوظ رہ کر ہی قلم بند کیا گیا۔ قلم بند ہونے سے پہلے زبانی روایت کے باعث یہ کلام بہت کچھ بدل بھی چکا تھا اور لل دید کے کلام کیساتھ خلط ملط بھی ہو چکا تھا۔ ویسے بھی لل دید کے واکھ نُند ریشی کو ایک عصری میراث کے روپ میں ملے تھے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ گھُٹی میں ملے تھے۔ کیونکہ نُندہ سنز نے جس فضا میں آنکھ کھولی تھی اُس میں ایک انقلابی تبدیلی انگڑائی اُٹھی تھی۔ کشمیر کا روایتی شیو درشن اسلام

کے نئے نظریئے سے ہم کلام ہونے لگا تھا۔ شروع شروع میں آمنا سامنا ہوا، ٹکراؤ بھی اور ربے نے بھی۔ لیکن دین کی صورت نکل آئی تو ہم آہنگی کا سُر بھی بج اٹھا۔ ہم آہنگی کے اس سُر کی دھڑکنیں لل دید کے واکھوں میں واضح سنائی پڑتی ہیں۔ ان واکھوں میں انسانی قدروں کا جو روح پرور راگ الاپا گیا ہے وہ نُند ریشی کے شرکوں میں بھی گونج اٹھا۔ عصری مانگ کو پورا کرنے کے لئے ان شرکوں نے ایک گنگا جمنی آہنگ اور سرگم کو بھی اپنایا، ایک ایسے سرگم کو جس میں روحانیت کے بنیادی سروں سے ہی نت نئے راگ اور تازہ راگنیاں وجود میں آتی ہیں۔ [redacted] کشمیری زبان کی صوفی شاعری کا نکتۂ آغاز بھی شرکوں میں ہی نظر آتا ہے۔ دونوں عوامی شاعر تھے۔ فی البدیہہ شعر کہا کرتے [redacted] نہیں تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ نند ریشی کے کلام میں ایک ایسی تازگی کا احساس ہوتا ہے جو [redacted] لمحے کی ہوتے ہو [redacted] لمحے کی جان پڑتی ہے حالانکہ لب ولہجہ اکثر ترغیبی یا تبلیغی ہے۔ لیکن ہے نہایت موزوں۔ اسی لئے موثر بھی اور دل پسند بھی۔

موضوع میں زندگی اور موت، عمل اور کردار، تگ و دو اور تقدیر، خیر و شر، عشق اور ہوس آگہی اور جہل، ذکر و فکر، خلوص کی تلقین اور مکر و فریب کے خلاف جہاد، غرض کہ جن مشاہدوں اور تجربوں کو ان شرکوں میں اظہار ملا ہے وہ نُند ریشی کی پُر ریاضت زندگی کا نچوڑ ہیں۔

موضوع اور ہیئت کا ایک خلاقانہ امتزاج بھی ان شرکوں کا خاصہ ہے۔ ترجمے میں (اور خاص کر منظوم ترجمے میں) موضوع اور ہیئت کے لسانی حُسن کو پیش کرنا ممکن تو نہیں، پھر بھی فکری حسن کی ایک آدھ جھلک دکھانا دشوار سہی، ناممکن نہیں۔ ترجمے میں کشمیری کلام کے کئی ایک الفاظ کو (موزونیت کے اعتبار سے) برتا گیا ہے جو اردو میں بھی قابل فہم ہیں۔ محاوروں اور کہاوتوں کو قریب ترین پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اصل کے زور بیان اور شدت تاثر کا اندازہ کرنے میں سہولت ہو۔ پھر بھی ترجمہ بہرحال ترجمہ ہے۔ اصل کی جانب لے جانے میں ممد ہو تو قابل قبول ہے، اصل سے دور لے جائے تو گمراہ کن۔ اسی نظریئے کا سہارا لے کر چیدہ چیدہ شرکوں کا یہ منظوم ترجمہ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

(واضح ہو کہ کلام کی ترتیب موضوع کے اعتبار سے کی گئی ہے)

تیمر

شیخ نور الدین نورانیؒ کے چیدہ کلام کا منظوم ترجمہ

(کشیری)	(اردو)
۱. کُنھ میہ ژےٚ کُنۍ بے مزنیپے	۱. کون ہے مؤمن تجھے پکارے
کس آسہِ دِلس تیُتھ وُسعت	کس کے دِل ایسی وسعت
جنتہٕ کہِ طمعہ تہٕ دوزخہٕ بیۍ	جنت مانگیں ڈریں نرک سے
دیہ چھی کران عبادت	جبھی کریں لوگ عبادت
●	●
۲. نرگنہ، ژٕ روٗپہ دِرتم	۲. ہے نرگن تجھ کو درشن دے
چھس بہٕ چیٚنے ناو سرانہٕ	من ہی من دھرلوں میں دھیان
بھگہ، کیلاس کھارتھ ہتم	ہے بھگوان، کیلاش چڑھائے
چھُہم ژہٕ چھس ژہٕ مہربانہٕ	چت مرے تو مہربان
۳. حضور رسولس کامت ژاٚمی	۳. کُمت گئی حضرت رسول کی
ژےٚ تس سوزتھ سہج قرآنہٕ	بھیجا اُسے سہج قرآن
بھگہ سہ یمہ ریانت پاٚمی	بھگوان، جس نے پریت نبھائی
چھُہم ژہٕ چھس ژہٕ مہربانہٕ	چت مرے تو مہربان!

۲. نرگن : توصیف سے ماورا ۳. کمت : کج فہمی

(کشیری)

۴۔ تمہٕ پدمان پورچہٕ للے
تمہٕ کٔلے امرت پو آ
تمہٕ اِشر ڈیٛٹھ تھلہٕ تھلے
تیٚتھ نے در دِتو دِوآ

●

۵۔ زیٚن میون اوس امرتہٕ گَرفے
تمہٕ اووز سمسار کرِ آ
گوٚ گوٚرس تہٕ ترٚا اٹھا ژروے
تیٚتھ نے در دِتو دِوآ

●

۶۔ توٚت موٚتے موٚذی لوکُم
کنہٕ ہوٚنی گوٚرُم مرٚدار
گیہہ ترٚ آ پھیرٚ پرٚ گیہہ زوگُم
بارخُدایا پاپ نِوار!

●

۷۔ شوگہ ژلہٕ نیرتھ پنزر منٛجُم
لوترلوتہٕ تلگُم بابا کار
آرول پوٚش زٔن بدن شہجُم
بار خُدایا پاپ نِوار!

(اردو)

۴۔ پدماں پور کی اُس للاّ نے
امرت پی ڈالا دُھن سے
جہاں تہاں ایشور دیکھا رے
دیو مجھے بُرا ایسا دے

●

۵۔ زین مرا امرت کلسا تھا
خالی جگ جانا جس سے
بڑھ گیا آگے گرُو سے چیلا
دیو مجھے بُرا ایسا دے

●

۶۔ گرم قلندر موذی بن کر
کُتّا جیوں کھا جا مُردار
گھر تج کر بھی تاکا پر گھر
بار خُدایا پاپ نوار!

●

۷۔ سُوا آڑے پنجر رہ جائے
مجھے دبی سی بابا کار
پھول سا نازک تن مرجھائے
بار خدایا پاپ نوار!

۴۔ پدماں پور: پانپور۔ للاّ: لل دید ۵۔ امرت کلسا: آبِ حیات سے بھرپور گھڑا۔ ۷۔ سُوا: بھگا (طوطا)

تمیر

(کشیری)

۸، ژُو تہ اَوژھے لوَن تہ اوژھے
ژیچھ تہ اَوژھے اَوژھے سار
ییمن پدن مے وچار گوژھے
بار خدایا پاپ نوار!

(اردو)

۸، جان بھی نازک، سانس بھی نازک
چت بھی نازک، نازک سار
ان نکتوں پہ دھیان دھروں تک
بار خدایا پاپ نوار!

●

۹، ڈینٹھس کلکو کالس منزی
ہنزی پاٹھین لوبس تار
وُنی ونت نُندرِ سنزی
بار خدایا پاپ نوار!

۹، کٹھن کٹھور اس کلجگ میں بھی
راج ہنس سا ہُوا پار!
بنتی ہے یہ نُندہ سنز کی
بار خدایا پاپ نوار!

●

۱۰، اکس تالس ماجہ ہندِ پن
تمن دُوے تھووُتھ تہ کیاے
مُسلانن کیاو ہندن
کر بندن توشہ خدایے

۱۰، اک ہی کوکھ جنے بندوں پر
دوئی روا کیونکہ رکھی
مُسلمانوں پر، ہندوؤں پر
بندوں پہ مہر کب ہوگی!

●

۱۱، اَکے خدا ناو چھس لچھ
ذکرِ رزس کانہہ کچھا مو
عمر وینن اکے پچھ
رزقس رزس کانہہ پچھا مو!

۱۱، ایک خدا نام لاکھوں اس کے
ذکر بنا تنکا بھی نہیں
عمر کو اک پچھوار سمجھ لے
بے رزق تو کچھ بھی نہیں

۸، سار: نچوڑ، لب لباب۔ ۹، بنتی: عرضداشت۔ ۱۰، نند سنز: شیخ نورالدینؒ کا اصلی نام
تیمر۔ ۱۱، پچھوار: دو ہفتے کی مدت۔

(کشمیری)

۱۲. خُدا تعالا اوس تہ آسی
شُریتھ آرت گژھِ نہ
نہ کٔس دِین بار ژوٗتری آسی
اُسی تٔس ژٕ ہتس شُراسہ تہ

•

۱۳. سے اوس تہ آسے
سُے سُے کُرِ نمے تہٕ
سُے تہ اندیشہ کاسے
ہے زُو پالِس پیٚتہٕ

•

۱۴. میون گرٕ چھُ انٛد مٕنٛدانس
تونت سیتو کُنہہ نہ لگن تہ
چھُ تتہٕ بیتھرن گژھُن سیپالس
ہے زُو پالِس پیٚتہٕ!

•

۱۵. کنہِ کوز تہ میونے میونے
کیٚنہہ وِتھ نہ تہنز وَنہ
ژٕ نہ کاٗنسہ ہُنٛد کانٛہہ نو چھُنے
ہے زُو پالِس پیٚتہٕ

(اردو)

۱۲. خُدا تعالیٰ تھا، ہوگا بھی
اُس کا کبھی نہ انت کہیں
دیتا کسے نہیں وہ روزی
یاد اُسکو ہم، ہیں نہیں

•

۱۳. تھا بھی وہی، وہی ہوگا بھی
وہی وہی، تو بھیج رے
وہی مٹاوے دُبدھا تیری
ہوش میں آ بندے

•

۱۴. گھر میرا دُور دشت کنارے
ساتھ نہ واں کوئی رے
سہنا واں قیام اکیلے
ہوش میں آ بندے

•

۱۵. رٹے کا ہے کی میرا میرا،
رویا نہ نام اللہ کے
تو نہ کسی کا، کوئی نہ تیرا
ہوش میں آ بندے

---

۱۳. دُبدھا: اندیشہ، تذبذب -

(کشیری)

۱۶ ، منگ گورس بوٚد تہٕ باگےٚ
نہٕ گرٛھک ژ ایردون
کیتھ نہٕ شیطان ژٕنے اٰتھ نگےٚ
سٕہرزٕ کر پیوٚن !

●

۱۷ ، لوٚچھس اکوٚے سیتیٚ گوٚژھم یاد
یارس سیتیٚ دمہ دمہ بہٕ پکہٕ
یارنے ڈلیشن گُل چھم خار
ییٚہ میون یار تہٕ میون مکہٕ !

●

۱۸ ، یارس آسہٕ تہٕ سرٕ تس دزی
یارچھے وزٕ وزٕ پربات
بتلس ژٕ مزٕ تہٕ اُدکہٕ ازی
دفترِ خفتس کرِ زٕ کیات

●

۱۹ ، مہرے کرٕ کھ پوٚش زنٕ تگے
زہرس آسیم قندُک سواد
قہرے کرٕ کھ مےٚ کیا نگے
شراکہٕ تہٕ مازٕ مس چھاواداوا !

(اردو)

۱۶ ، سوچ بوجھ تو مانگ گورو سے
نہیں تو تو مٹ ہی جائے
شیطان تیری تاک میں بیٹھے
اپنا آپا پرکھ تو لے !

●

۱۷ ، اکلوتا ہوں یار کو چاہوں
ہر دم ساتھ نبھے اس کا
گُل بھی خار نہ تجھ کو دیکھوں
یار جہاں ، مکہ اُس جا !

●

۱۸ ، یار پہ سر قربان کر دیجئے
لمحہ لمحہ وہی پربھات
دھرتی میں دب کر کون آئے
سوئے سے کیا تحقیقات

●

۱۹ ، مہر کرے گلزار کھلیگا
زہر لگے میٹھا میٹھا
قہر کرے ، بس اُس پرکھ کا
ناطہ گوشت چھری کا سا !

۱۸ ، پربھات : پوپھٹ ۔

(کشیری)

۱۰۔ یمہِ ہیوٚت تھنہٕ ہرَتل زاگُن

تس ہیٚن شربت پلنے چاوے

چھِس پاتر بیوٚن بیون ترِاکنے ماگُن

رٕ تس توٹھ سے ادِ براوے!

(اُردو)

۱۰۔ در اُس کے جو کرے جاگرن

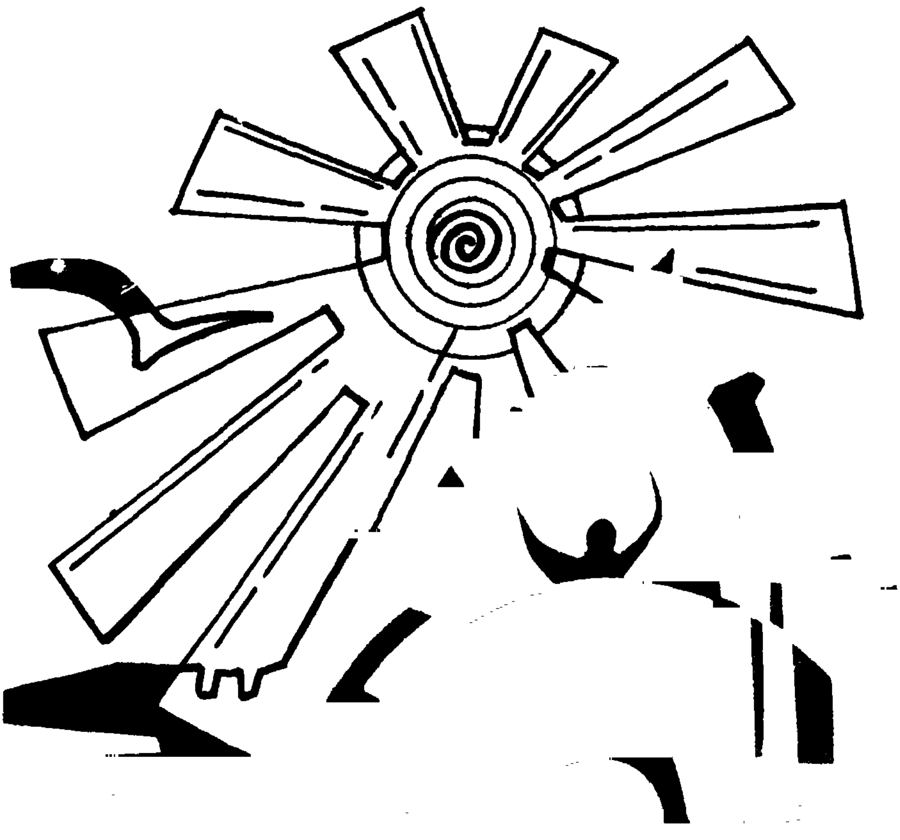
آپ اُسکو شربت وہ پلائے

پاتر الگ الگ اِک ماگن

جس پر مہر کرے سو پائے!

(باقی)

۱۰۔ جاگرن : شب بیداری۔ پاتر : ناٹک کے کردار، ماگُن : وہ نٹ جو موقع محل کے مطابق مختلف کرداروں کا روپ دھار کر سٹیج پر آتا ہے۔



○ غلام نبی خیالؔ

علامہ اقبالؔ اور محمد دین فوقؔ

منشی محمد دین فوقؔ اقبالؔ کے ہم وطن، ہم راز اور ہم عمر (۱۸۷۷ء - ۱۹۴۵ء)○ تھے۔ اقبالؔ کی طرح وہ بھی داغؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں جب انہوں نے اپنا ہفتہ وار اخبار "پنجۂ فولاد" جاری کیا تو اس کے اجراء پر داغؔ نے یہ مختصر سی نظم ایڈیٹر کو لکھ کر بھیج دی ؎

ہُوا ہے پنجۂ فولاد جاری — خریدارو نیا اخبار دیکھو
جنابِ فوقؔ کی گلکاریوں سے — نیا اخبار یہ گلزار دیکھو
سُنا دو مصرعہ تاریخ اے داغؔ — یہ لو اخبارِ جوہر دار دیکھو

○ ایک اور جگہ یہ سن ۱۸۸۷ء اور فوق کا سالِ وفات ۱۹۳۹ء بیان کیا گیا ہے۔ کشمیر کا ایک ممتاز صحافی اور مصنف۔ فوق از علی محمد خان۔ دوماہی شیرازہ سرینگر۔ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۱۲۵۔ لیکن آگے چل کر خان صاحب لکھتے ہیں کہ فوق نے ۱۸۹۴ء میں شاعری شروع کی جب کہ ان کی عمر صرف سات سال تھی۔ یہ بیان کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا (خیالؔ)

تیمم

اقبال نے بھی پنجۂ فولاد کے جاری ہونے پر ایک ماہیانہ قسم کی اشتہاری نظم تحریر کی جس میں اُن کی شاعری سے زیادہ شاعر کے خلوص و رفاقتِ دوست کا جذبہ کارفرما ہے۔

یہ نظم یوں ہے ؎

پنجۂ فولاد اِک اخبار ہے — جس سے سارا ہند واقف کار ہے
دفترِ اخبار ہے لاہور میں — جس کا کوچہ کوچۂ کوئے یار ہے
ہے روش اِس کی پسندِ خاص و عام — واہ واہ کیا معتدل اخبار ہے
غیر سے نفرت نہ اپنوں سے لگاڑ — اپنے بے گانے کا ہر دم یار ہے
سطر سطر اس کی مفیدِ ملک و قوم — کوئی کہہ دے یہ خبر بے کار ہے
دید کے قابل نہ ہو کیوں بزمِ فوق٥ — شمع اس محفل کی یہ اخبار ہے
ضامنِ صحت کا ایسا ہے عمل — وہ ضمانت کے لئے تیار ہے
ہے تجارت کا بھی کالم کیا مفید — یوسفِ معنی کا یہ بازار ہے
وہ لطائف ہیں کہ پڑھتے ہیں جنہیں — لوٹنے میں دل کبوتر وار ہے
کیوں نہ نظم و نثر کا چرچا رہے — جب ایڈیٹر ناظم و سرشار ہے
سٹلمنٹ آفس کا بھی ہے بندوبست — شاہد ان دعووں کا خود اخبار ہے
ہے مدلل رائے اس اخبار کی — ہے وہ کافر جس کو کچھ انکار ہے
رائے زن اس سے نہیں بڑھ کر کوئی — منصفوں کو اس کا آپ اقرار ہے
جتنے بھی ہم عصر دیکھیں غور سے — فقرے فقرے سے ٹپکتا پیار ہے
تین روپے سکّے قیمت سال کی — اس سے سستا اور کون اخبار ہے
اور پھر انعام میں ناول ہیں مفت — واہ کیا سودا ہے کیا بیوپار ہے

---

٥ بزمِ فوق۔ ضامنِ صحت۔ تجارت۔ مذاقِ سخن۔ مشاہیر۔ سٹلمنٹ آفس اس اخبار کے مستقل کالموں کے عنوانات تھے۔

تمیر

آٹھویں دن حاضری دے لیجئے — تابعِ فرمانِ خدمت گار ہے
سیر اس گلشن کی کرکے دیکھئے — ایک گلشن رشکِ صد گلزار ہے
رنگِ آزادی ہے ہر مضمون میں — سرو ہو کر بھی یہ میوہ دار ہے
کون ہے اس بانکے پرچے کا مدیر — بات یہ بھی قابلِ اظہار ہے
لیجئے مجھ سے جوابِ مختصر — یہ معمّا کچھ نہیں دشوار ہے
نام ہے اُس کا محمد دین فوق — عمر چھوٹی ہے مگر ہشیار ہے
شوق ہے مضمون نویسی کا اُسے — طبع گویا ابرِ گوہر بار ہے

گشت کے عالم میں دیکھا تھا اُسے
آدمی ہشیار و واقف کار ہے ○

فوق کے ساتھ اقبال کی قربت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ پنجۂ فولاد کے علاوہ انہوں نے فوق کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے موقع پر بھی یہ قطعۂ تاریخ تحریر کیا ۔

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعۂ اشعار
معلوم ہوا مجھ کو بھی حالِ نظرِ فوق
شستہ ہے زباں جملہ مضامین ہیں عالی
تعریف کے قابل ہے خیالِ نظرِ ذوق
تاریخ کی جو مجھ کو تمنا ہوئی اقبال
ہاتف نے کہا لکھ دے : کمالِ نظرِ ذوق

اسی طرح فوق ہی کی ایک اور تصنیف "شالامار باغ" پر بھی اقبال نے یہ تاریخی قطعہ قلم بند کیا۔ یہ تصنیف سنہ ۱۹۰۱ء میں شایع ہوئی تھی ۔

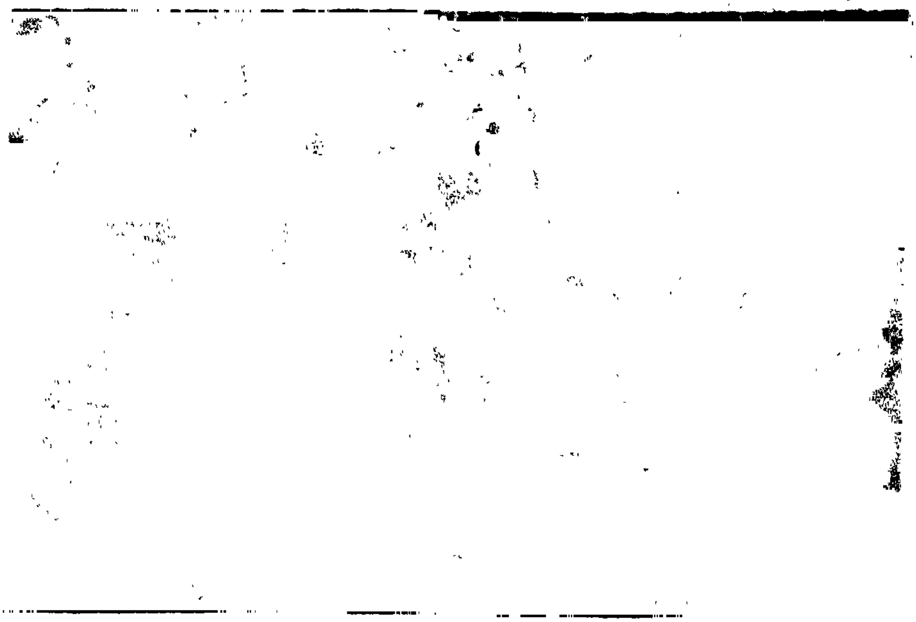
○ سرودِ رفتہ۔ مرتبہ غلام رسول مہر و صادق علی دلاوری۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۵۹ء ص ۲۳۸-۲۳۹



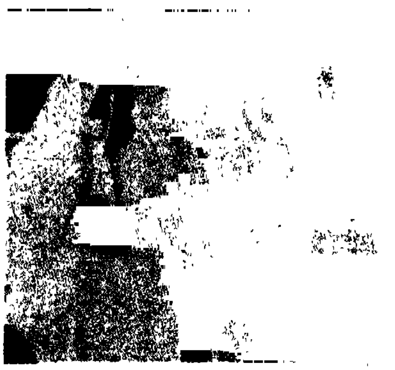
نومبر — وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ، سابق امریکی نائب صدر مسٹر راک فیلر کے ساتھ،



نومبر — نادرن ریلوے ایمپلائز کے کنبوں کے افراد اور ان کے بچے وزیر اعلیٰ کے ساتھ اُن کی رہائش گاہ پر



وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ بیجبہاڑہ میں پنچایت کانفرنس کا افتتاح کر رہے ہیں،





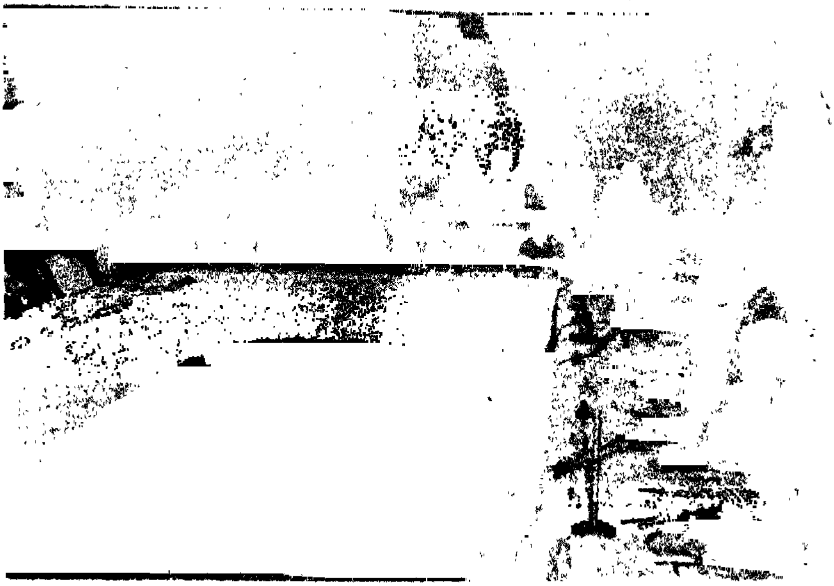
جناب شیخ محمد عبداللہ اور بیگم شیخ محمد عبداللہ چینی مہمانوں کے ایک وفد کے ساتھ محو گفتگو



وزیر اعلیٰ لوئر جہلم ہائیڈل پراجیکٹ کا معائنہ کر رہے ہیں۔ وزیر تعمیرات شری صنم زربو اُن کے ہمراہ ہیں۔

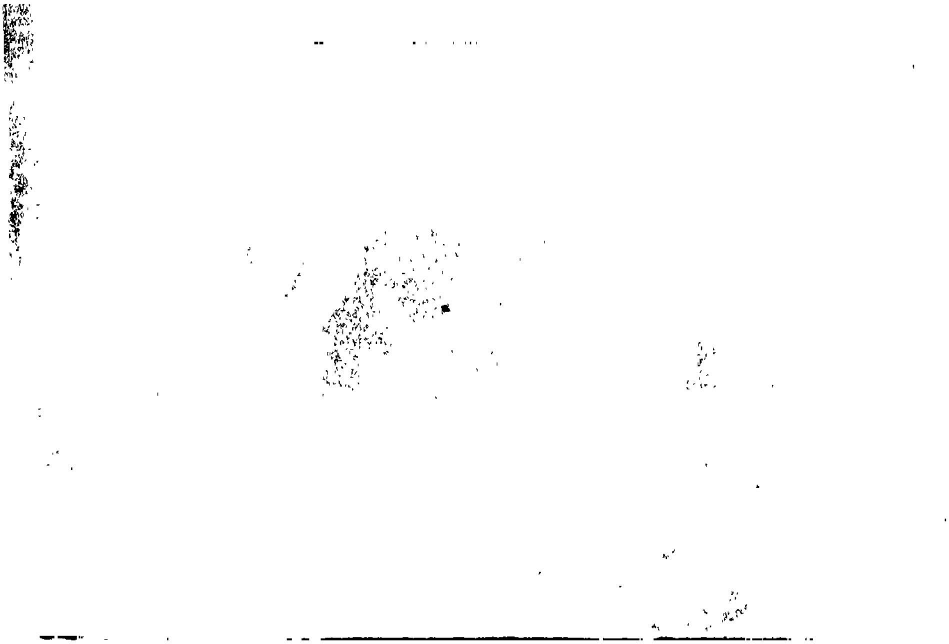


کرالہ پورہ سونگر واٹر سپلائی سکیم چالو کی گئی جس کا افتتاح بیگم شیخ محمد عبداللہ نے کیا۔

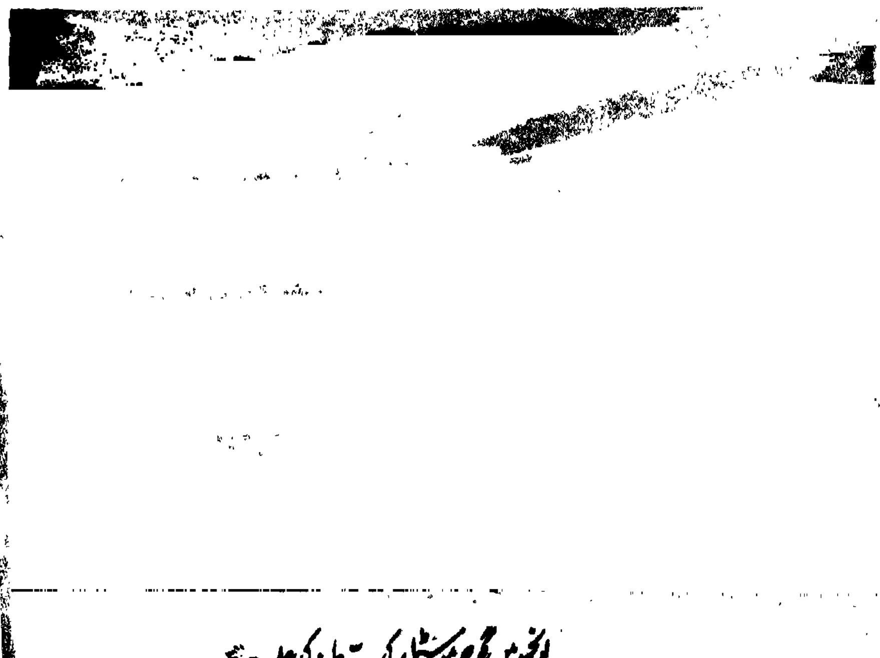


راجوری ضلع میں ریاستی کابینہ کا غیر معمولی اجلاس، ترقیاتی سکیموں پر غور و خوض،

نومبر [illegible] سورن کوٹ کے دور دراز علاقے میں وزیر اعلیٰ کا عوامی اجتماع سے خطاب



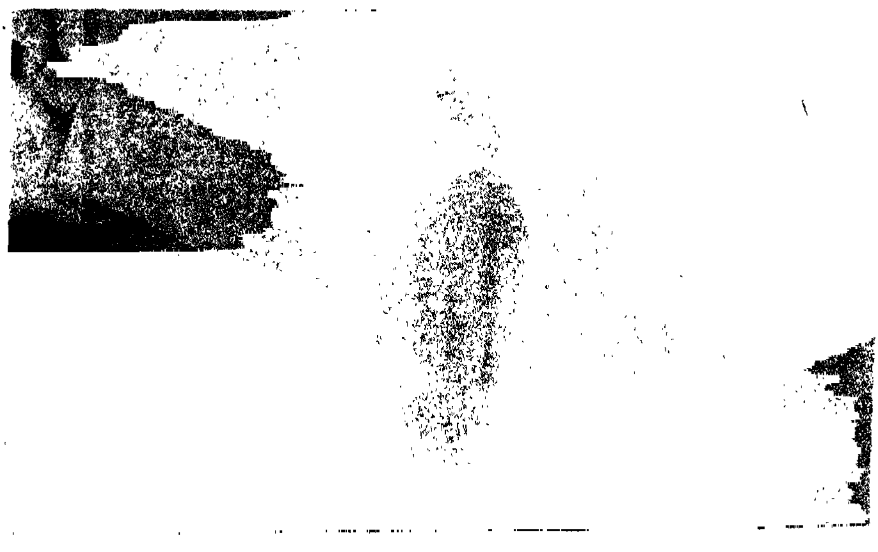
گوجر ہوسٹل پونچھ میں شیر کشمیر کی آمد پر موسیقی کا پروگرام



پونچھ میں گوجر ہوسٹل کی جدید طرز کی عمارت



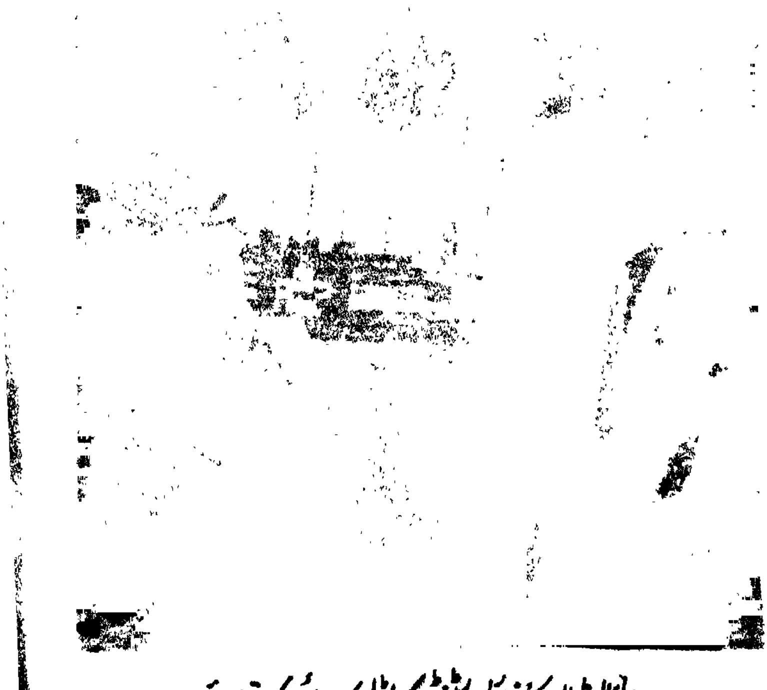
جناب شیخ محمد عبداللہ برزلہ سری نگر میں مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ کے پبلک سکول کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ بھی انکے ہمراہ



وزیراعلیٰ اودھم پور میں ملک ہسپتال کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں۔



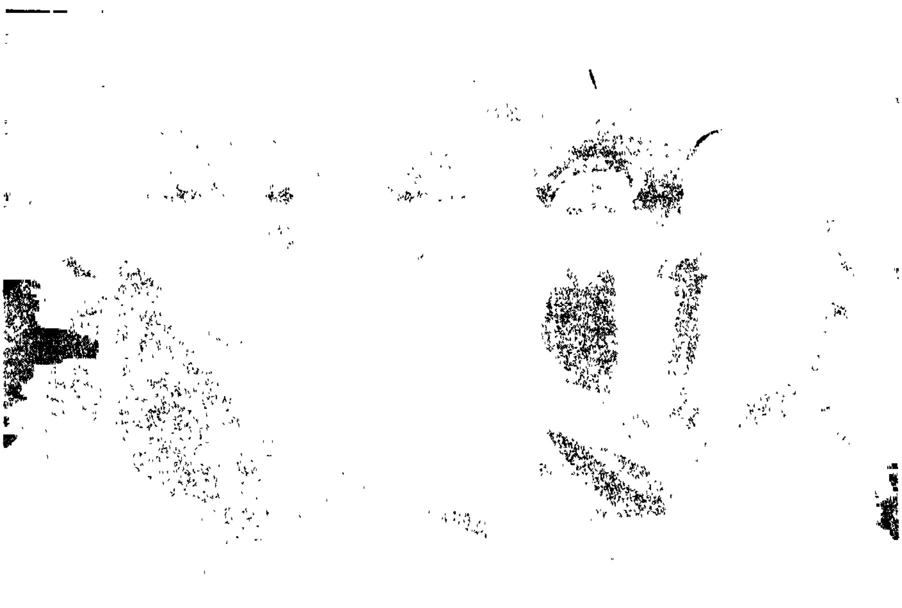
مہاراشٹر کے چیف منسٹر مسٹر پاٹل، جناب شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ اُن کی رہائش گاہ پر



وزیراعلیٰ شالامار کے نئے بس سٹینڈ کے ماڈل کا معائنہ کرتے ہوئے



نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ گاندربل میں اعلیٰ نسل کے گائیوں کے فارم کا معائینہ کر رہے ہیں۔



عوام کا محبوب رہنما دربار کے دور افتادہ علاقے میں عوام کے مسائل سن رہے ہیں۔

حسنِ سعیِ فوقؔ را صد مرحبا
ہست ہر سطرِ کتابش دلربا
از سرِ نازش پئے تاریخ او!
مے سزد "تصویرِ باغِ جاں فزا"

"تصویرِ باغِ جاں فزا" سے صرف ۱۸۵۱ کے اعداد نکلتے ہیں لیکن اِن میں سرِ نازش یعنی "ن" کے پچاس عدد جمع کر لئے جائیں تو ۱۹۰۱ بن جاتے ہیں۔

پنجۂ فولاد کی اشاعت سے پہلے فوقؔ "پیسہ اخبار" میں ملازم تھے۔ پنجۂ فولاد جب سنہ ۱۹۰۶ء میں بند ہوگیا تو فوقؔ نے کشمیری قوم کے کاز کو مشتہر کرنے اور اس کی زبوں حالی کی داستان بیان کرنے کی غرض سے کشمیری میگزین کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا جس کا پہلا شمارہ جنوری سنہ ۱۹۰۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس پرچے میں ولایتی چٹھی کے عنوان سے اقبالؔ کا ایک مضمون شائع ہوا اور اس طرح سے کشمیری میگزین بھی اقبال کے فکر و تخلیق کا ترجمان بن گیا۔ انہی اخبارات میں فوقؔ اقبالؔ کو فخرِ قوم و ملت کے خطابات سے نوازتے رہے۔ کشمیری میگزین میں جہاں مختلف موضوعات پر تبصروں اور شذروں کے علاوہ خاص طور پر کشمیر سے متعلق مقالات اور مضامین حتیٰ کہ خبریں بھی شائع ہوا کرتی تھیں وہاں اسی اخبار کے اپریل سنہ ۱۹۰۹ء کے شمارے میں ایڈیٹر نے "حالاتِ اقبال" کے نام سے اقبالؔ کا ایک سوانحی مضمون بھی قلم بند کیا جس میں وہ لکھتے ہیں "شیخ صاحب کو کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے جس کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے۔ شیخ صاحب کے جدِّ اعلیٰ قریباً "دو سو سال ہوئے کہ مسلمان ہوئے تھے۔ گوت ان کی سپرو ہے۔ اُن کے بزرگوں کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا" اور اس سے قبل بھی فوقؔ نے سنہ ۱۹۰۵ء میں اقبال کی زندگی اور شاعری پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیا تھا۔

محمد دین فوقؔ نے اقبالؔ ہی کی ایما پر ایک رسالہ طریقت بھی نکالا اور سنہ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے اقبالؔ ہی کے کہنے پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو اس غرض کے لئے ایک درخواست پیش کی تھی کہ انہیں سری نگر سے کشمیر

تعمیر

نام کا ایک رسالہ جاری کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس درخواست پر مہاراجہ نے اپنی رائے درج کرتے ہوئے متعلقہ وزیر کو ہدایت کی کہ وہ ایسا قانون بنانے پر سوچ بچار کرے جس کی رُو سے آئندہ اس قسم کی درخواستوں پر کسی قسم کا غور ہی نہ کیا جاسکے۔

۱۹۱۱ء میں فوقؔ نے چند نظمیں تحریر کیں جن میں کشمیر میں آنے والے انقلاب کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ لکھتے ہیں "۳۱ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو میں دو دن کے لئے گھرتل ۵ (سیال کوٹ) گیا تھا۔ اسی تاریخ کو وہاں پانچ بجے شام کے ذہن کشمیر کی طرف منتقل ہو گیا اور ذیل کے اشعار لکھے گئے۔" اس کے بعد جو مختصر نظم فوقؔ نے کشمیر پر درج کی ہے اُس کے یہ دو اشعار قابلِ توجہ ہیں ؎

تُو نے تو گرتی ہوئی قومیں اُٹھائی ہیں بہت
اے فلک اس کے سنبھلنے کی بھی کچھ تدبیر ہے
عن قریب آنے کو ہے کشمیر میں بھی انقلاب
وقت اُستادِ زماں ہے اور زمانہ پیر ہے

۱۹۱۲ء میں فوقؔ نے کشمیری میگزین کو ہفت روزہ اخبار میں تبدیل کر دیا اور اس کا نام بدل کر ... "اخبارِ کشمیری" رکھ دیا۔

فوقؔ نے اقبالؔ کی صحبت میں رہ کر اور اُن سے رہنمائی اور فیضان حاصل کر کے اہلِ کشمیر کی جو قلمی امداد کی ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ خاص طور سے کشمیری نوجوانوں کو تعلیم کی ترغیب دینے کا خیال اُن کے دل میں ہمیشہ جاگزیں رہا اور میگزین کے صفحات پر اُن کی آواز بن کر سامنے آتا رہا۔ میگزین میں اُن کا ایک مضمون "کشمیر کے طالب علموں کو وظائف" چھپا ہے جس میں فوقؔ نے یہ افسوس ظاہر کیا کہ کشمیر کے نوجوان تعلیم و تربیت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے ہیں۔ فوقؔ نوجوانانِ کشمیر کی اس بے حسی کا رونا اس طرح

---

۵ علی محمد خان نے فوقؔ کی جائے پیدائش کوٹلی ہرنرائن (سیال کوٹ) بیان کی ہے۔ دو ماہی شیرازہ سری نگر۔ نومبر ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۲۵

تیمر

سے روتے ہیں۔" انجمن کشمیری مسلمانان لاہور نے وادیٔ کشمیر کے طلبا کو علی گڑھ کالج اور اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے دس روپے ماہوار کے آٹھ وظیفے اور بیس وظیفے ماہوار کا ایک وظیفہ دینے کا اہتمام کیا ہوا ہے لیکن کشمیر کے کسی طالب علم نے ان وظیفوں میں سے کوئی وظیفہ لینے کی درخواست نہیں دی۔ مسلمانانِ کشمیر کی تعلیمی اور اخلاقی حالت پر برسوں سے رونا رویا جا رہا ہے لیکن مصیبت و بے کسی کی داستان وہ اثر رکھتی ہے کہ جب کہو اور جب سنو۔ اس قصۂ کہن میں وہی تازگی نظر آتی ہے۔ باشندگانِ کشمیر کا سب سے بڑا عیب انسان میں تعلیم کا نہ ہونا ہے اور اسی عیب نے اُن کی تمام خوبیوں کو چھپا لیا ہے ؎

تعلیم نہ ہونے سے ہدف سب کا ہے کشمیر
جو چاہے وہ اب تیر ملامت کے چلائے

فوقؔ کی ان مسلسل کشمیر نواز کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان کے عوام جو کشمیر اور وہاں کے حالات سے ناواقف تھے، واقفیت حاصل کرنے لگے اور اس طرح سے ہند کے عوام نہ صرف جذباتی طور پر کشمیر سے وابستگی اور قربت محسوس کرنے لگے بلکہ کشمیریوں کے مسائل پر ہمدردانہ غور بھی کرنے لگے ○

اقبالؔ اور فوقؔ کے علاوہ پنجاب میں کئی ایسے کشمیری آباد تھے جو وہاں آسودہ حالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن انہوں نے انجمن کو کھوٹی کوڑی بھی چندہ کے طور پر نہیں دی بلکہ اس کے برعکس ان میں سے ایک بدبخت نے اقبالؔ کی کشمیر نوازی پر طنز کرتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ وہ "غلیظ۔ گندے اور سہل انگار.. کشمیریوں کو نواہائے جگر سوز سے جھنجھوڑ رہے ہیں"۔ اس سرد مہری اور عدم تعاون کے باوجود اقبال اپنے چند رفیقوں خاص کر محمد دین فوقؔ کو لے کر کسِ ماندہ، دور افتادہ اور مجبور و مقہور کشمیری قوم کے لئے دامے.. درمے اور قلمے سخنے مصروفِ جہاد رہے۔ فوقؔ کے اسی جہدِ مسلسل کے پیشِ نظر اقبالؔ نے اُنہیں "مجدد الکشاورہ" کا لقب دیا۔

○ منشی محمد دین فوق کشمیری۔ از انوار احمد۔ دو ماہی شیرازہ سری نگر۔ جلد ۱۱ شمارہ ۲۔ ص ۴۱-۴۲۔

غلام حسن اعجاز،

کشمیر قانون سازیہ کی تاریخ

جولائی ۱۹۷۷ء کو گورنر راج کے تحت جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی کے لئے جو چناؤ ہوئے، اُس کی پاداش میں جناب شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر کی کوششوں سے قائم کردہ آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کو فقید المثال کامیابی ہوئی۔ اِس چناؤ نے نیشنل کانفرنس کو اِس قابل بنا دیا کہ اُس نے جناب شیر کشمیر کی سربراہی میں حکومت جموں و کشمیر کے لئے ایک انتظامی وزارت کو تشکیل دیا جس نے ریاستی عوام خاص کر "نیا کشمیر" کے دیرینہ خواب کی زندہ تعبیر پیش کی۔ اِس قانون ساز اسمبلی کا قیام کوئی انوکھا اور تعجب خیز واقعہ نہیں بلکہ اِس کی بنیاد اُس دستور ساز اسمبلی میں پاس شدہ آئین ہے، جو اسمبلی ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں قائم ہوئی، اِس موقعہ پر جہاں ریاست بھر میں شادیانے منائے گئے۔ چراغاں کیا گیا۔ سکولوں اور کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں فرطِ مسرت میں اُچھلتے رہے، وہاں دشمنوں کی گردنیں ندامت اور شکست کے احساس سے جھک کر رہ گئیں۔ یہ دستور ساز اسمبلی جناب شیر کشمیر کی برابر ۲۰ سالہ جدوجہد اور شہدائے جموں و کشمیر کی قربانیوں کا حاصل تھی۔ یہ اسمبلی عوام کی خواہشات اور اُمنگوں کی آئینہ دار تھی، ریاستی عوام اپنی آزادی کی خدمت اور تعمیر و ترقی کا معاون و مددگار۔ اِس اسمبلی کو وجود میں لانے کے لئے کشمیری عوام کو جن مشکل منزلوں اور دشوار گذار مرحلوں سے گذرنا پڑا ہے، وہ ایک خونچکاں داستان ہے۔ جس کی انتہا اسمبلی کے حالیہ جمہوری انتخابات ہی ہو سکتی ہے۔

Date…5..7..95

۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے سانحہ کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۳۱ء کو جناب شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں ریاست جموں و کشمیر کے مظلوم و محکوم عوام نے مہاراجہ کشمیر کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک عرضداشت تیار کی۔ اس میں منجملہ دیگر مطالبات کے ریاست کے لئے ایک قانون ساز اسمبلی قائم کرنے کا ایک اہم مطالبہ بھی شامل تھا۔ اس مطالبے کا تذکرہ جناب شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر نے نیشنل کانفرنس کی پیشرو مسلم کانفرنس کے پہلے سالانہ اجلاس منعقدہ ۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء کے اپنے عالمانہ اور فاضلانہ صدارتی خطبہ میں کیا۔ آپ نے فرمایا، ریاست میں لیجسلیٹو اسمبلی قائم کرنے کا مقصد حکومت جموں و کشمیر کے افسروں کو رائے عامہ سے آگاہ کرنا۔ اور ریاست کی قانون سازی اور حکام کے افعال پر تنقید و تبصرہ کرنے میں مہاراجہ کی رعایا کو حصہ دار بنانا ہے۔

مہاراجہ کشمیر نے مجبور ہو کر ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو گلنسی کمیشن کا تقرر عمل میں لایا۔ کمیشن نے مسلمانوں کی عرضداشت پر تحقیقات شروع کی۔ مطالبات کی چھان بین کرنے کے بعد اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ ریاست میں ایک اسمبلی قائم کی جائے۔ رپورٹ میں اسمبلی کے لئے اختیارات کا تعین بھی کیا گیا تھا۔ جو بالکل محدود تھے۔ جناب شیر کشمیر نے مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے خطبہ صدارت میں ان اختیارات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مطالبے میں کہا گیا تھا کہ ستر فیصدی ممبران اسمبلی حکومت کے کسی وزیر پر اگر عدم اعتماد کا ووٹ پاس کریں۔ تو ایسے وزیر کو الگ کیا جانا چاہیئے، مگر گلنسی کمیشن کی رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر موجود نہیں تھا۔ اس کے علاوہ رپورٹ کی رُو سے اسمبلی کو جاگیرداروں کے متعلق کوئی قانون وضع کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ اسمبلی کی صدارت کب تک سرکاری عہدیداروں کے سپرد رہے گی۔ یہ بات بھی وضاحت طلب تھی کہ ریاست کی وزارت منتخب شدہ ممبروں کے لئے کھلی تھی یا نہیں۔ اس کے باوجود مسلم کانفرنس نے مجبوری کی حالت میں مجوزہ اسمبلی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ اس میں شامل ہو کر ہی اس مطلوبہ اسمبلی کے لئے عملی طور اور آئینی جدوجہد جاری رکھی جائے!

اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء سے لیکر اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء تک کا زمانہ مسلم کانفرنس اور اس سے وابستہ عوام کے لئے بڑی مصیبتوں اور پریشانیوں کا زمانہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت چاہتی تھی کہ گلنسی کمیشن کی مجوزہ اسمبلی بھی معرض وجود میں نہ آئے۔ کیونکہ حکومت کو یقین تھا کہ اسمبلی کو جنم دینا جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے کی طرف قدم اُٹھانا ہے۔ حالانکہ اس
تعمیر

اسمبلی کے قیام سے عوام مطمئن نہ تھے، کیونکہ یہ ابھی اُن کے اُس نصب العین سے کوسوں دُور تھی، جو اُنہوں نے ۱۹۳۱ء میں قایم کیا تھا۔ اور جس کو وہ آزاد اور خود مختار اسمبلی کے نام سے پکارتے تھے، مہاراجہ کشمیر کی غیر ذمہ دارانہ حکومت نے اپنا مقصد پُورا کرنے کی غرض سے تحریک حریت کشمیر کی پاداش میں ۳۱ مئی ۱۹۳۳ء کو جناب شیر کشمیر اُن کے رفقائے کار سمیت چوتھی بار گرفتار کر کے جیل میں محبوس رکھا، اِن کی گرفتاریوں نے ریاست کے طول و عرض کے اُفق میں ایسی آگ لگا دی جس پر قابو پانا حکومت کے لئے بہت مُشکل بن گیا کیونکہ اب جناب شیر کشمیر کسی خاص فرد کا نام نہیں تھا، وہ ریاستی عوام کے قایداعظم بلکہ بے تاج بادشاہ بن چکے تھے، اور کانفرنس عوام کی محبوب اور واحد فعال اور نمائندہ تنظیم تھی۔ مجبور ہو کر حکومت نے قایداعظم جناب شیخ محمد عبداللہ کو اگست ۱۹۳۳ء کی ساتویں تاریخ کو رہا کر دیا لیکن دُوسرے رفقائے کار اور کانفرنس کے کارکن سزائے قید بھگت رہے تھے،

اسی دوران میں حکومت نے گلنسی کمیشن کی مجوزہ اسمبلی کے لئے انتخابات کرانے کا انتظام کیا۔ تاکہ قایداعظم کی قیادت میں عوامی تنظیم کی طرف سے کوئی قابل آدمی اسمبلی میں نہ آسکے، رفقائے کار اور کانفرنس کے محبوس کارکنوں کی عدم موجودگی کی کوئی پرواہ کئے بغیر قایداعظم شیر کشمیر نے تنظیم کے بچے کھچے عقیدت مندوں سے مشورہ کیا۔ اور کانفرنس کی طرف سے جموں و کشمیر میں اُمیدوار کھڑے کئے ——— ووٹ ڈالنے کا وقت آیا، عوام میں زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا، حکومت نے اُس وقت مروجہ قانون کے تحت مخصوص لوگوں سے ووٹ لئے۔ پھر بھی ووٹوں کا شمار کرنے کے بعد جس نتیجے کا اعلان کیا گیا۔ اُس کی رُو سے جناب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے کھڑے کئے گئے تمام اُمیدوار ووٹوں کی بھاری اکثریت سے کامیاب رہے، یہ کامیابی جناب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ اور اُن کی تنظیم آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی پہلی شاندار کامیابی تھی۔ اور اِس نے ثابت کیا کہ عوامی تنظیم اور اِس کا رہنمائے اعظم کس قدر ہر دلعزیز اور مقبول ہیں۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اِس اسمبلی کا پہلا اجلاس جموں میں منعقد ہوا۔ کانفرنس کے منتخب ممبروں نے قدرتی طور پر حزب اختلاف کی حیثیت اختیار کی۔ اسمبلی کی کارروائیوں میں حصہ لے کر اِن ممبروں نے دُنیا پر واضح کیا کہ کشمیری عوام جاگیردارانہ نظام کی اِس اسمبلی سے بھی بڑھ کر ایک آزاد اسمبلی کے مستحق ہیں۔
تعمیر

پورے ایک سال کے بعد یعنی نومبر ۱۹۳۴ء میں سوپور میں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں نمائندگان نے ایک تجویز کے ذریعہ اس بات پر زور دیا کہ ریاست میں ایک بااختیار اور آزاد اسمبلی قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ضمنی تجویز کے ذریعہ موجودہ اسمبلی کے جملہ منتخب ممبران کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اس سلسلے میں ایک آئینی یادداشت مرتب کرکے مہاراجہ کشمیر کے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے ایک طرف ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو ریاست بھر میں یوم ذمہ دار نظام حکومت منایا گیا۔ اور دوسری طرف اسمبلی کے ۳۳ منتخب ممبروں سے ۲۹ ہندو مسلم سکھ ممبروں کے دستخطوں سے ایک میموریل تیار کیا گیا جس کو حکومت کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس میموریل میں اس مطالبہ پر زور دیا گیا تھا کہ حکومت اسمبلی کے موجودہ آئین میں تبدیلی کرے تاکہ راعی اور رعایا کی مشکلات کا علی الدوام خاتمہ ہو جائے۔ ایسی تبدیلی بلا تمیز مذہب و ملت عام لوگوں کے مفادات سے وابستہ بھی ہے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق بھی۔ اس میموریل کو موثر بنانے کے لئے ریاست کے کونے کونے میں ہندو مسلم سکھ عوام کے مشترکہ جلسے منعقد کئے گئے۔ جلوس نکالے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست بھر میں عام بیداری پھیل گئی اور عوام ذمہ دار نظام حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے پر کمربستہ ہو گئے!

مارچ ۱۹۳۸ء میں جموں میں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت کا سہرا قائد اعظم جناب شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر کے سر باندھا گیا تھا۔ آپ نے اپنے صدارتی خطبہ میں ریاست کے سیاسی، سماجی، مجلسی، تعلیمی اور اقتصادی حالات پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے بعد اس بات پر زور دیا کہ ریاست کے عوام کی سود و بہبود کی خاطر ذمہ دار اسمبلی قائم کرانے کے لئے ہندو مسلم سکھ عوام مشترکہ محاذ قائم کریں اور یہ اسمبلی عوام کے سامنے جوابدہ بن جائے۔ اس کے ساتھ ہی صاحب صدر نے کہا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم کانفرنس کے آئین اور دستور میں ایسی تبدیلی کی جائے جس کے مطابق ریاست کے غیر مسلم عوام بھی اس تنظیم میں شامل ہو سکیں اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں مشترکہ طور مصروف رہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ ریاست میں آزادی کی جو جنگ لڑی جا رہی ہے، وہ مسلمان اور غیر مسلمان کے مابین نہیں ہے، بلکہ ظالم اور مظلوم کے مابین ہے، جاگیردار اور مفلوک الحال کے درمیان ہے۔ اس لئے مظلوموں کی اس ایک جماعت کا فرض ہے کہ وہ ریاست کے تمام مظلوموں کو ساتھ لیکر آگے بڑھے

تعمیر

سب سے بڑی بات جو اُنہیں مُسلم اور غیر مُسلم عوام کو متحد کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ وہ کانفرنس کا قائم کردہ نصب العین ہے اور یہ نصب العین ذمّہ دار نظامِ حکومت کا قیام ہے۔ چنانچہ کانفرنس کے پروگرام کے مطابق ۵ر اگست ۱۹۳۸ء کو ریاست بھر میں ایک بار پھر "یومِ ذمّہ دار نظامِ حکومت" منایا گیا۔ جگہ جگہ عام جلسے منعقد ہوئے، جلوس نکالے گئے۔ ذمّہ دار نظامِ حکومت کے فوری قیام کے لئے تجویزیں پاس کی گئیں۔ اس موقع پر مہاراجہ کشمیر کی مطلق العنانہ حکومت نے جناب شیرِ کشمیر کو سیاسی تقریریں کرنے سے احتراز کرنے کی وارننگ دی، کیونکہ حکومت چاہتی تھی کہ رہنمایانِ ملک کو متحدہ محاذ کے لئے فضا سازگار بنانے سے باز رکھا جائے، تاکہ ذمّہ دار اسمبلی کا نعرہ دب جائے۔

اس واقعہ کو بہانہ بنا کر حکومت نے ۲۶ اگست ۱۹۳۸ء کو شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کیا۔ اور متعدد ہندو، مُسلم سکھ رہنمایانِ قوم سے دفعہ ۱۰۸ (آر، پی، سی) کے تحت ایک ایک سال کے لئے ضمانتیں اور مچلکے طلب کرنے کی استبدادانہ کارروائی شروع کی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ حالات اس حد تک بگاڑ دیا حکومت کی طرف سے عوام کے جذبۂ حُریت و وطن پرستی اور قیامِ آزاد اسمبلی کو ایک چیلنج تھا۔ عوام نے اس چیلنج کو نہایت بہادری کے ساتھ منظور کیا۔ اگرچہ عوام کی طرف سے بہتری کوشش کی گئی لیکن حکومت صلح و صفائی کی طرف مائل نہ ہوئی۔ اس نے مشرقی اور پولیس کو ہدایت کی کہ وہ عوامی تحریک دبانے کے لئے اپنی تمام تیاریاں مکمل کریں، اگرچہ رہنمایانِ قوم نے صلح پسندانہ رویہ اختیار کیا تھا، لیکن انہوں نے حکومت کے اس شرمناک اور جمہوریت کش سلوک کو برداشت نہیں کیا۔ چنانچہ ۲۹ر اگست ۱۹۳۸ء کو شہر میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے کی غرض سے آزاد پارک امیرا کدل سرینگر میں عوام کے ایک بھاری اجتماع میں رہنمایانِ قوم کی تقریریں ہوئیں جس کی پاداش میں انہیں گرفتار کیا گیا۔

جناب شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ، پنڈت جیا لعل کلم مرحوم، سردار بدھ سنگھ جی مرحوم، پنڈت کشپ بندھو جی اور دوسرے رہنماؤں کی گرفتاری سے ریاست بھر میں زبردست ہلچل مچ گئی اور عام تحریک جاری ہوئی، تحریک کا یہ عالم تھا کہ صرف ڈیڑھ مہینے میں ۵۷۰۹ گرفتاریاں ہوئیں۔ حکومت نے مدافعتی اقدامات کئے، مگر بے سود، حکومت نے تحریک دبانے کے لئے عوام پر تعزیری جرمانے عاید کئے، لوگوں کی جائدادیں، زیورات، کھانے پینے کے برتن، بچوں کی کتابیں، اسبابِ خانہ، فرش، فروش، حتیٰ کہ گھاس کی چٹائیاں اور ٹوٹے کپڑے بھی شامل تھے اثاثۂ منقولہ

تعمیر

تک نیلام کر دیں، کارخانوں میں کام کرنے والے غریب مزدوروں اور صنعت کاروں کو کام سے محروم کر دیا گیا تھا۔ کئی جگہوں پر ملزم کے ہمسایوں کی جائیدادیں تک ضبط کی گئیں۔ کارخانہ داروں کو اپنے کاریگروں کا جرمانہ ادا کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ خاص کر محکمہ ابریشم میں کام کرنے والے اکثر مزدوروں پر سختی کی گئی، انہیں بقایا اجرتوں سے بھی محروم کیا گیا۔ ان لوگوں کا قصور اتنا تھا کہ انہوں نے جلسوں میں شمولیت کی تھی۔ اور ریاست میں آزاد ذمہ دار اسمبلی کے قیام کو اپنا نصب العین بنایا تھا۔

عوام کی یہ تحریک دبانے کے لئے جہاں شخصی مطلق العنان حکومت نے معاندانہ اور متشددانہ پالیسی اختیار کی وہاں ریاست کے تمام چھوٹے بڑے جاگیرداروں، چکداروں، سودخواروں، وڈداروں اور دوسرے مفادِ خصوصی رکھنے والے استحصال پرست لوگوں نے گٹھ جوڑ کیا۔ اور حکومت کو اپنا تعاون دیا تاکہ ان کی لوٹ کھسوٹ برقرار رہے، مگر اس ظلم و جبر کے باوجود عوام کی تحریک اور ذمہ دار اسمبلی کا نعرہ دبانے سے نہیں دب سکا۔ کیونکہ یہ نعرہ عوام کو شخصی نظام کی دراز دستیوں سے محفوظ رکھنے، صدیوں کی غلامی کی زنجیریں توڑنے اور جاگیرداروں کے ظلم و استبداد سے نجات دلانے اور ملک کو سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، معاشی اور معاشرتی بدحالی کو دور کرنے کا ایک زبردست ہتھیار تھا۔ یوں سمجھ لیجئے یہ ایک عوامی تحریک تھی، اور یہ نعرہ ایک اساسی نعرہ تھا جو عوام کے دل کی گہرائیوں سے ابھر آیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ یہ نعرہ حکومت کے اوچھے ہتھیاروں سے دب جاتا۔ اس نعرہ کو جتنا دبایا گیا، اتنا ہی یہ ابھرتا گیا۔

حکومت نے مجبور ہو کر جناب شیر کشمیر اور ان کے رفقائے کار کو چھ مہینے کی سزائے قید کاٹنے کے بعد ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو جیلوں سے رہا کیا۔ ان کی رہائی پر ریاست بھر میں جگہ جگہ خوشیاں منائی گئیں، شادیانے بجائے گئے، جلسے ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ اس طرح سے سیاسی قیدیوں کا استقبال کیا گیا اور ذمہ دار اسمبلی کا نعرہ اب مکمل طور پر عوام کا ایک عام مگر اہم نعرہ بن گیا۔

(باقی آئندہ)

طربیۂ خداوندی

ابوالکلام قاسمی



"طربیۂ خداوندی" دانتے کی وہ طویل نظم ہے جس کو ایک عرصے تک ادبی دنیا میں بالعموم اور عیسائی دنیا میں بالخصوص الہامی کتاب کی سی عزت ملی۔ اب بھی اس کی قدر و قیمت اس قدر سمجھی جاتی ہے کہ اسے بلا تکلف دنیا کی عظیم ترین نظموں کی صف میں رکھا جاتا ہے۔ دانتے چونکہ ایک کٹّر عیسائی تھا اور اس کی شخصیت میں مذہب اس طرح رچا بسا ہوا تھا کہ اس کو عیسائیت کے بغیر بحیثیت سے سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لئے یہ طویل نظم بھی اپنے جلو میں حال کی زندگی کو مستقبل کی زندگی کا پیش خیمہ بنا کر آخرت کا راسخ تصوّر رکھتی ہے۔ دانتے کے زمانے میں عیسائیوں میں مذہب کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ دنیا کے سارے معاملات مذہب کی روشنی میں ہی حل کئے جاتے تھے یورپی ممالک میں اسٹیٹ اور نظامِ حکومت پر براہِ راست یا بالواسطہ مذہب کا ہی اقتدارِ اعلیٰ تھا۔ اس طرح حال ہی مستقبل کے تعلق کو حال اور ماضی کے تعلق پر زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ زندگی کی اس مذہبی تفسیر کے سبب ازمنۂ وسطیٰ میں بیشتر ادبی شہ پارے بھی مذہبی موضوعات کے ہی حامل ہوا کرتے تھے۔ اسی قسم کے فن پاروں

تعمیر

میں سے ایک عظیم الشان اور بے مثال فن پارہ " طربیہ خداوندی " بھی ہے ۔ دانتے نے اور بھی بہت سی نظمیں لکھیں لیکن جو مقام اس نظم کو حاصل ہوا وہ دوسری نظموں کو نہیں ۔

" طربیۂ خداوندی " کا موضوع خواب کا وہ سفر ہے جس میں دانتے مختلف مراحل سے گذرتا ہوا جنت اور دوزخ کی سیر کرتا ہے ۔ یہاں میں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ لکھتا چلوں کہ اس سفر کی روداد بیک وقت حقیقی بیانیہ نظم کی حیثیت سے مذہبی طبقات اور مسلمہ مقامات کے بیانات پر بھی مشتمل ہے اور اس نظم کے نام اور مقامات تمثیلی حیثیت بھی رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کے مختلف شارحین نے الگ الگ انداز سے اس کی شرحیں لکھی ہیں ۔ کسی نے اسے خالص مذہبی نظم بتلایا ہے تو کسی نے اسے تمثیلی نظم کہہ کر اس زمانے کی سیاسی حالات کا آئینہ بتلایا ہے ۔ دانتے کا یہ روحانی سفر جنگل سے شروع ہوتا ہے اور ابتدائی مرحلوں میں ہی شیر بھیڑ اور تیندوا کی مزاحمت کا سامنا کرتے ہوئے دانتے کو ورجل سے جا ملتا ہے ۔ اسے ورجل کی وساطت سے حضرت مریم سنت لوسی اور بیاترچے کی نیک خواہشات کا علم ہوتا ہے ۔ ورجل دانتے کو وہاں کی سیر کراتا ہے ۔ اس لمبے سفر کی روداد کی شکل میں دانتے نے اپنے مذہبی معتقدات کے مطابق الگ الگ حصّوں میں بنی نوع انسان کو بانٹ دیا ہے دانتے خود اپنے زمانے میں مرنے والوں کو بھی کسی نہ کسی طبقے میں دیکھتا ہے پاپایان روم، بادشاہ، امراء اور شعراء غرض ہر طرح کے لوگوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے ۔ نفسانی خواہشات، ظلم، خودکشی، سودخوری اور اس طرح کے بہت سارے گناہوں کا خمیازہ دانتے جہنم کے طبقات میں گناہ کی قدر و قیمت کے اعتبار سے بھگتتے ہوئے دیکھتا ہے ۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا رہنے والے تھے اور ایسے لوگ بھی جو اپنی سزا پاکر عذاب سے جلد یا بہ دیر نجات پانے والے تھے ۔ اس کی ملاقات ابلیس سے بھی ہوتی ہے جو سرتاپا برف میں جما ہوا ہے اور حرکت بھی نہیں کر سکتا ۔ غرض یہ کہ دانتے پورے جہنم کی سیر کے بعد اس پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہنچ جاتا ہے جس پر جنت ارضی واقع ہے ۔ یہاں ورجل دانتے کو بیاتریس سے ملاتا ہے اور اس کے حوالے کرکے رخصت ہو جاتا ہے ۔ بیاترس یا بیاترچے دانتے کو ان تمام حصّوں کی سیر کراتی ہے جن پر ملأ اعلیٰ واقع ہے ۔ ملأ اعلیٰ کے سفر کے دوران وہ سما و السموات تک پہنچ جاتا ہے ۔ جہاں الوہیت کا مرکز ہے ۔ یہاں وہ جمال خداوندی سے فیضیاب

تیمر

ہوتا ہے یہ گو کہ صرف ایک لمحے کے لئے ہوتا ہے مگر اس مختصر سے وقفے میں اس پر دُنیا کے راز ہائے سربستہ کا انکشاف ہوجاتا ہے اور اس طرح دانتے بقول خویش اپنے ارادے کو مشیتِ ایزدی میں مدغم کر دیتا ہے —— اور یہ نظم کا آخری حصّہ ہے۔

ماخذ

چونکہ DIVINA COMMEDIA کی ہزاروں شرحیں لکھی گئیں اس لئے یہ بحث بھی ناگزیر تھی کہ آیا دانتے کے خیالات کی بُنیاد وہ مذہبی معتقدات تھیں جو اس دور میں عیسائی دُنیا میں تسلیم شدہ تھیں یا پھر دانتے نے کہیں اور سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ جہاں تک اس نظم کے بُنیادی تصوّر کا سوال ہے تو یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ دانتے کے سر کسی جدّت کا سہرا نہیں باندھا جا سکتا۔ اس لئے کہ تقریباً سارے ہی آسمانی مذاہب میں جنّت و دوزخ کے تصور کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ یونانی علم الاصنام میں آرفیس وغیرہ کے سفرِ جہنم کی کہانیاں موجود ہیں۔ ورجل کے یہاں دانتے سے پہلے یہ اثرات پائے جاتے ہیں۔ حضرت پطرس یا راہب مرماقس کے سفر بھی اسی انداز کے ہیں۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی تصنیفات یا مسلّمات دانتے سے پہلے بکھری ہوئی شکل میں موجود تھے۔ دانتے نے یقیناً" ان میں سے کچھ کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ دانتے نے طربیۂ خداوندی میں جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ تیرھویں صدی کے عیسائیوں کے عقیدے سے بہت زیادہ مختلف ہیں۔ بہت سے شارحین نے اس کا جواز یہ پیش کیا ہے کہ چونکہ دانتے سے قبل زیادہ تر ایسے خیالات مذہبی صحائف یا تصنیفات میں ملتے ہیں، اس لئے ان سے دانتے کے خیالات کی من وعن مشابہت ضروری بھی نہیں اس لئے کہ دانتے نے ان کچے خیالات کو اپنے تخیل کی بھٹی میں پکا کر شاعری کی شکل میں پیش کیا ہے۔ مگر جلد ہی بعض محققین نے اس تاویل کی تردید کر دی۔ یہ محققین بھی عیسائی تھے اس لئے یہ بھی کھل کے کسی اور مذہب کے اثرات کی نشاندہی نہ کر سکے اور اس طرح ایک عرصے تک دُنیا ان خیالات کو دانتے کے تخیل کی بلند پروازی مانتی رہی۔ بہت دنوں کے بعد ہسپانیہ کے ایک مستشرق میگوئیل آسن نے اس طلسم کو توڑا۔ یہ مستشرق عربی کا پروفیسر تھا۔ اس نے اسلام اور فلسفۂ اسلام کا مطالعہ ایک عرصے تک عربی کتابوں سے کیا۔ اس نے اس بات کی تحقیق پر اپنا بہت زیادہ وقت صرف کیا کہ یورپی تہذیب اور خیالات

تعمیر

کس حد تک اسلام کے رہین منت ہیں۔ اس مستشرق نے پہلی بار یہ بات اپنی کتاب " الرواۃ الالہٰیہ اور اسلام میں آخرت کا تصور" میں مدلل انداز میں لکھا کہ دانتے کی نظم DIVINA COMMEDIA کا تصور معراج کے واقعہ سے ماخوذ ہے۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ یوں تو قرآن کے اس واقعے کی تفسیریں مختلف انداز میں کی گئی ہیں مگر دانتے نے جو تفاصیل بیان کی ہیں وہ محی الدین ابن عربی کی کتاب "الفتوحات المکیہ" کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے ابوالعلی المعری کی کتاب " رسالۃ الغفران)" اور طربیۂ خداوندی کا موازنہ بھی کیا ہے۔ ابوالعلی المعری نے بھی تقریباً "معراج کی ایسی ہی تفصیلیں بیان کی ہیں۔ جہنم کا جو نقشہ دانتے نے پیش کیا ہے وہ ابن عربی کے نقشے سے بہت زیادہ مماثل ہے۔ دانتے نے شیطانی شہر کا ذکر کیا بعینہٖ اسلامی روایات میں بھی ایک آتشیں شہر کا ذکر ملتا ہے۔ جس طرح معراج میں حضرت جبریلؑ رسول اللہ صلعم کی رہنمائی کرتے ہیں اسی طرح جنت میں بیاترچے اس کی رہبری کرتی ہے۔ جس طرح سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جبریلؑ رک جاتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلے آگے جانا پڑتا ہے۔ اسی طرح دانتے کے یہاں بھی وہ مقام آتا ہے جہاں سے آگے بیاترچے بھی نہیں جا سکتی۔

ابن عربی سے استفادہ کی بات کچھ شواہد کی بنا پر منطقی بھی معلوم ہوتی ہے۔ ابن عربی ہسپانیہ کے رہنے والے تھے اور ان کی دو معرکۃ الآرا کتابیں " کتاب الاسراء الی المقام الاسریٰ " اور " الفتوحات المکیہ " طربیہ خداوندی سے اسّی سال قبل لکھی جا چکی تھیں۔ ابن عربی کی کتابوں سے استفادہ کی دلیل دانتے کی ایک اور کتاب " CONVITO " بھی ہے جس پر ابن عربی کی ترجمان الاشواق کا گہرا اثر ملتا ہے۔ طربیۂ خداوندی میں 'اعراف' کے اسلامی تصور کی طرح ایک مقام دکھلایا گیا ہے جسے دانتے LIMBO کہتا ہے۔ اس مقام پر دانتے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے جو فردوس میں داخل ہونے کی خواہش کرتے ہیں اور یہ خواہش پوری ہوتی ہوئی نہیں دکھائی دیتی۔ اسلامی روایات میں جہنم کے سات طبقے بتلائے گئے ہیں جب کہ دانتے نے اسے نو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ مگر اس فرق کا سبب بہت واضح ہے وہ یہ کہ سات کا عدد نہ اسلامی کتب میں بالعموم بہت ہی متعین انداز میں استعمال کیا گیا ہے اور نہ ہی دانتے کے یہاں۔ سات اور ستر کے عدد اسلام میں کثرت کو ظاہر کرتے ہیں اور دانتے نے بھی بہت سی جگہوں پر نو کے عدد کو صرف کثرت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔

دانتے کے جہنم کی ساخت بھی وہی ہے جو اسلامی روایت میں عام تسلیم شدہ ساخت سمجھی جاتی ہے

تعمیر

دانتے اور اسلامی روایت دونوں . . . . ہی جہنم کو ایک مخروطی شکل کی چیز تبلاتے ہیں۔ دونوں ہی جگہوں پر مختلف طبقات خاص خاص گناہوں کے اعتبار سے منقسم ہیں۔ جرم جتنا شدید ہوگا جہنم کی گہرائی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

یہ غیر معمولی مماثلتیں اس کا یقین دلاتی ہیں کہ دانتے نے صرف اہل عرب ہی سے نہیں بلکہ اسلامی روایات کے پورے سرمایے سے کچھ نہ کچھ خوشہ چینی ضرور کی ہے۔ دانتے کی طربیہ خداوندی سے تقریباً چھ سو برس قبل معراج کا واقعہ پیش آیا تھا اور قرآن کی ان آیات " سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ" کی تفسیریں الگ الگ انداز میں مسلسل لکھی جا رہی تھیں۔ مسلمان محدثین، فقہا، فلاسفہ اور شعرا نے اپنے اپنے انداز میں معراج کے واقعے کو پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ان سب انفرادی کوششوں کو ایک نظر میں دیکھا جائے تو طربیہ خداوندی میں سا ری کی ساری چیزیں اسلام سے ہی ماخوذ نظر آتی ہیں۔

ان ساری باتوں کے باوجود بھی دانتے کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دانتے کا اصل جوہر اس کا شاعرانہ تخیل ہے جس نے واقعات کو شعر کی شکل دے دی ہے۔ ایلیٹ نے دانتے کو اس.. اعتبار سے شیکسپیر پر بھی فوقیت دی ہے کہ شیکسپیر صرف انسانی نفسیات کا ماہر ہے۔ جب کہ دانتے انسان کے علاوہ ماورائے انسان میں بھی اپنے تخیل کا بھرپور استعمال کرتا ہے۔ ایلیٹ نے شیکسپیر کے تخیل میں وسعت اور دانتے کے تخیل میں بلندی اور عظمت دکھلائی ہے۔ غرض یہ کہ دانتے کی کتاب "طربیہ خداوندی" باوجودیکہ مواد کے اعتبار سے ماخوذ ہے مگر تخیل کی بلند پروازی کے اعتبار سے دنیا کی چند اہم ترین نظموں میں سے ایک ہے ●●



ظفر احمد



تین نظمیں

تمہاری ہر قربت

لذتوں کے - قفل کھولی“
انیک دواروں کا
بستہ رہتی ہے۔
تمہاری ہر قربت

تاج دیکھتا رہا



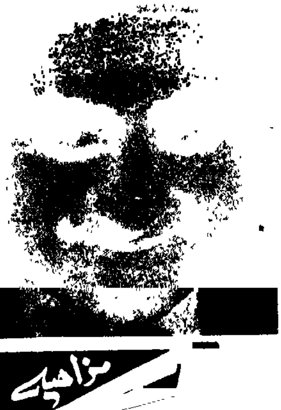
نگ سنگ
نگ سبھوں کے
تہنا رھا ،
تاج دیکھتا رہا ،

مجھے سبز سایہ دو

اس طرح
تپا ہوں
اس طرح
تھکا ہوں
لمس لمس
ترسا ہوں
مجھے سبز سایہ دو ،

تیسر

* این۔ ڈی۔ قاضی



ہنسے مت

مزاحیہ

ایک شام سیوا داس ایڈوکیٹ موٹا چشمہ چڑھائے اپنے دفتر میں کتابوں سے گھرا اپنے آپ کو بے حد معروف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا ایڈوکیٹ ثابت کرنے کے باوجود بھی کسی موکل کو پھنسانے میں اکثر ناکام ہی رہتا۔ اُس کے دفتر کا سارا سامان جو کہ گرد آلودہ رہتا جو چند ٹوٹی پھوٹی کرسیوں جن میں کسی کا بازو، کسی کی ٹانگ اور کسی کی پیٹھ ندارد۔ ایک پچھلی صدی کا پُرانا میز جس کی ٹانگیں ٹیڑھی میڑھی ہو چکی ہیں۔ ایک بابا آدم کے زمانے کی الماری جس میں کبھی زمانے میں شاید شیشے رہے ہوں میں اب چند بوسیدہ کتابیں جھانک جھانک کر سیوا داس ایڈوکیٹ کی خستہ حالی کا کھُلم کھُلا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ میز کے ایک کونے پر دکھاوے کے لیے کنکشن کٹا ٹیلی فون بھی رکھا ہے۔

بے کاری سے تنگ آ کر سیوا داس ایڈوکیٹ اپنا نام نہاد دفتر بند کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک برآمدے میں قدموں کی چاپ سُن کر چونکا اور اپنے آپ کو معروف ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلدی سے ایک موٹی سی کتاب کھول کر چشمہ چڑھا لیا اور مطالعے کرتے ہوئے معروفیت کا مظاہرہ کرنے لگا۔ اُس کے کان قدم کی چاپ جو کہ میز تک آ کر رُک گئی تھی پر لگے ہوئے تھے اور وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ شاید آج کوئی موٹا مرغا پھنس گیا ہے۔ بڑی شان سے اپنا چشمہ اُٹھا کر اُوپر دیکھا پھر دائیں بائیں نظر دوڑائی مگر اُس کی حیرانی

تعمیر

کی کوئی انتہا نہ رہی کیوں کہ اُسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔
"نمستے وکیل صاحب" ایک بچگانہ قسم کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اب سیوا داس کی حیرانی اور بھی بڑھ گئی کیونکہ آواز کے باوجود بھی اُسے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ سہم سا گیا اور گھبراہٹ میں اُس نے پوچھا "آ۔ آ۔ آپ کون ہیں"۔؟
جواب ملا "نٹور لعل ولد بٹور لعل ساکنہ کنی کدل" تذبذب میں سیوا داس نے ٹیلی فون کا چونگا اُٹھایا اور پوچھ لیا
"کیا آپ کنی کدل سے بول رہے ہیں۔"؟
"جناب میں تو آپ کی میز کے پاس سے ہی بول رہا ہوں"۔ جواب ملا۔ "کیا مطلب" اچانک سیوا داس کی زبان سے نکل گیا اور کھڑے ہو کر دیکھا کہ تین فٹ دو انچ کا ایک بشر جو اُسے ایک بچہ نظر آیا۔ سیوا داس نے ڈانٹ کر کہا "تم اندر کیسے آگئے ؟"
آپ کا بورڈ دیکھا۔ دروازہ کھلا دیکھا۔ اندر آگیا"۔ مختصر سا جواب ملا۔ "یہ ایڈووکیٹ سیوا داس کا دفتر ہے کوئی ٹافیوں کی دکان نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہاں بچوں کو آنے کی اجازت نہیں۔" سیوا داس نے غصے میں کہا۔ "جناب میں بچہ نہیں ہوں"۔ نٹور لعل نے ڈرتے ہوئے کہا۔ "میری عمر اٹھائیس سال سات مہینے اور سات دن ہے۔ میری تو شادی بھی ہو چکی ہے اور میں ایک بچے کا باپ بھی بن چکا ہوں۔ میرا نام تو نٹور لعل ہے لیکن میری بیوی مجھے پیار سے نٹو کہتی ہے۔ ہی۔ ہی۔ ہی"۔ ہی۔ ہی۔ ہی دیکھتے نہیں میں بہت معروف ہوں"۔ "جی مجھے۔ وہ۔ نتھی رام نے بھیجا ہے"۔ سیوا داس نے کہا۔ تم اُس فتنے کو کیسے جانتے ہو؟
جی وہ تو میرا لنگوٹیا۔ یعنی بہت ہی پکا دوست ہے"۔ "سمجھا! کیا کام ہے"؟ وکیل صاحب نے اطمینان سے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"جناب میں آپ کو اپنا وکیل مقرر کرنا چاہتا ہوں۔" سیوا داس کی باچھیں کھل گئیں۔ کرسی کی گرد کو جھاڑتے ہوئے اُس نے کہا "تشریف رکھیئے۔ تشریف رکھیئے۔ فرمایئے۔ نٹور لعل جی میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"۔ نٹور لعل جلدی سے کرسی پر بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہو گیا۔ "جناب میں بہت دُکھی ہوں مجھ پر مصیبتوں کا ایک چھوٹا موٹا۔ چلتا پھرتا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔" نٹور لعل کا گلا بھر آیا۔

" گھبرایئے مت" - سیوا داس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ ٹھیک جگہ اور ٹھیک وقت پر پہنچ گئے ہیں سیوا داس ایڈووکیٹ ہر مصیبت کا علاج جانتا ہے۔" " تو پھر میری مصیبت کا فوراً علاج کیجئے۔"

بتلایئے۔ آپ کا کیس دیوانی ہے یا فوجداری "؟

" گھر میں تو ایکدم فوجداری ہے۔ یہاں کیا ہوگا وہ آپکو معلوم ہوگا"۔

" کیا مطلب؟"

" مطلب یہ کہ جناب اُس موٹی بھینس نے مجھے بہت ہی تنگ کر رکھا ہے۔"

" آپ کہنا کیا چاہتے ہیں نٹو رلعل جی" - ؟

" یہی کہ جناب مجھے میری ہاتھی نما بیوی نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ میں بے حد دُکھی ہوں۔ مہینے بھر کا راشن تو ڈیڑھ دن میں ہضم کر جاتی ہے۔ آدھی درجن ڈبل روٹی اور ایک درجن انڈوں کا تو صرف ناشتہ ہی کرتی ہے"۔

" اہو - سمجھا۔ آپ تو واقعی بہت کشٹ میں ہیں۔"

ابھی آپنے سُنا ہی کیا ہے وکیل صاحب۔ آگے سُنیئے! صُبح اٹھتے ہی گرجنا اور برسنا شروع کر دیتی۔ بس حکم چلاتی رہتی۔ میں صُبح اُٹھتے ہی اُس کے لئے ناشتہ تیار کرتا ہوں۔ بچے کا دودھ بناتا ہوں جھاڑو لگاتا ہوں۔ گلی کے نل سے پانی بھر کر لاتا ہوں۔ کپڑے دھوتا ہوں۔ برتن مانجتا ہوں اور یہ پوچھیئے کہ جناب کیا نہیں کرتا؟"

" ہوں ـــ کیس کافی پیچیدہ دکھائی دیتا ہے۔ بہت سٹڈی کرنی پڑے گی نٹورلعل جی۔"

تو جناب پھر جلدی کیجئے۔ اس مصیبت سے میرا پیچھا چھڑایئے۔ میں اُس موٹو کو جلد از جلد طلاق دے دینا چاہتا ہوں۔"

نٹورلعل جی اس موٹی مصیبت سے پیچھا چھڑانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے تو آپ کو موٹی فیس ادا کرنی پڑے گی۔"

جناب میں ہر چھوٹی موٹی فیس ادا کرنے کو تیار ہوں۔ چاہیئے مجھے میری دُکان بھی کیوں نا بیچنی پڑ جائے۔ مگر اُس موٹو سے مجھے فوراً نجات دلایئے۔

اچانک برآمدے میں دھڑام دھڑام کی آواز سنائی دی اور دونوں کی نظریں دروازے کی طرف گھوم گئیں۔ نٹّور لعل کی چھوٹی اور موٹی بیوی کسی نا کسی طرح دروازے میں پھنستے پھنساتے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ننھی رام بھی ننھی ہو کر داخل ہوا جس کے چہرے سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

بیوی کو دیکھتے ہی نٹّور لعل کے پسینے چھوٹ پڑے اور سیوا داس ایڈوکیٹ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نٹّور لعل کی بیوی نے اپنی لال پیلی آنکھیں نکالتے ہوئے پہلے تو نٹّور لعل پر گرج پڑی۔ "اچھا تو میں موٹو ہوں۔ سب راشن کھا جاتی ہوں اور جھگڑا کرتی رہتی ہوں۔ تم اس وکیل کے بچّے کے پاس مجھے طلاق دینے آئے ہو۔ ننھی بھیّا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔" اس نے نٹّور لعل کا کان مروڑتے ہوئے کہا۔ "اب بولو۔ دو طلاق۔" نٹّور لعل کی سٹّی پٹّی گم ہو چکی تھی اور ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ "نہیں نہیں۔ میں طلاق دینے نہیں آیا"۔ نٹّور لعل کے ہوش خطا ہو چکے تھے۔ اس کی بیوی پھر گرجی۔ "اچھا تو میاں اس موٹے وکیل کے پاس ٹافیاں لینے آئے تھے کیا۔ ایڈوکیٹ صاحب اپنی بے ساختہ ہنسی کو نا روک سکے اور کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اس پر نٹّور لعل کی بیوی نے کھا جانے والی نظروں سے وکیل سیوا داس کو گھورا اور گرج کر کہا۔ "ہنسیے مت! ورنہ آپ کا بھرتا بنا دوں گی۔ چلو نٹّو گھر وہاں دلواتی ہوں تمہیں طلاق اور کھلواتی ہوں ٹافیاں۔ نٹّور لعل کو بغل میں دبوچے دروازے میں پھنستی پھنساتی باہر چلی گئی۔ یہ سب دیکھ کر ننھی رام قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ سیوا داس کو موکل کا ہاتھ سے نکل جانے کا بڑا رنج تھا۔ ننھی رام پھر گرج کر بولا۔ "ہنسیے مت"

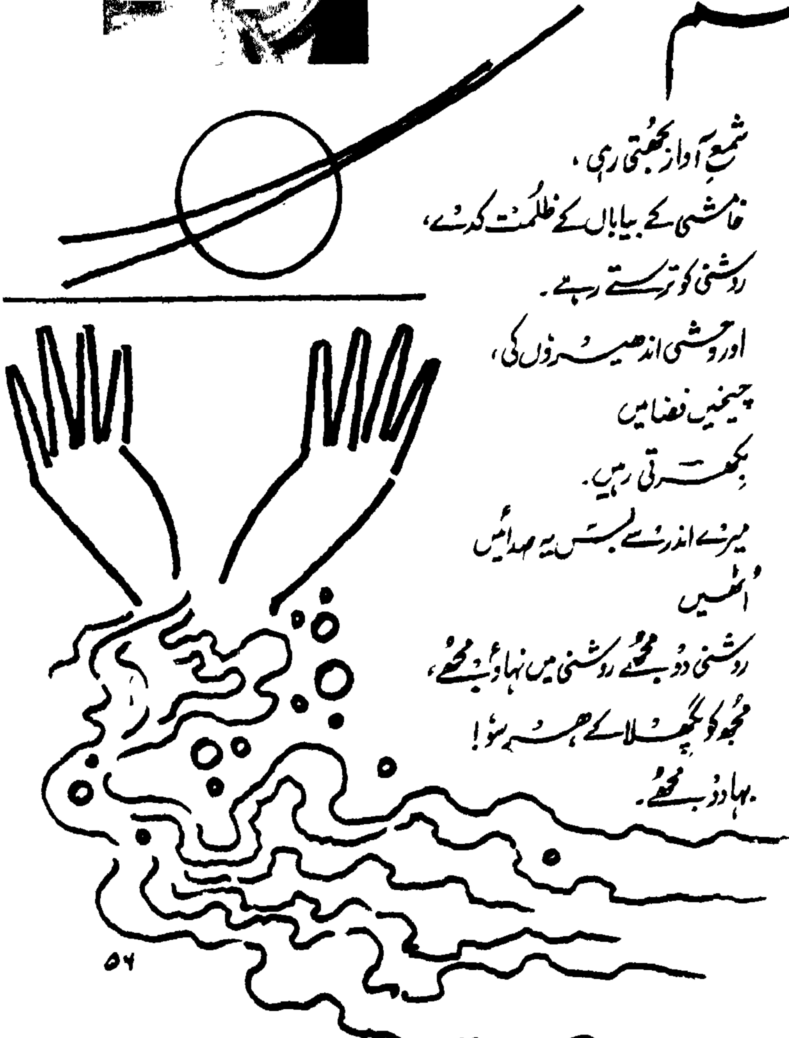


تعمیر

رشید ارشاد قلمدان پورہ سرینگر



نظم



شمعِ آواز بجھتی رہی،
خامشی کے بیاباں کے ظلمت کدے،
روشنی کو ترستے رہے۔
اور وحشی اندھیروں کی،
چیخیں فضا میں
بکھرتی رہیں۔
میرے اندر سے بس یہ صدائیں
اُٹھیں
روشنی دو مجھے روشنی میں نہاؤ مجھے،
مجھ کو پگھلا کے ہر سُو!
بہا دو مجھے۔

تعمیرِ نو

حقیقت چھپ نہیں سکتی

حسن ساہو ۔



ریاست جموں و کشمیر کی بابت کسی طرح کی جانکاری حاصل کرنی مقصود ہو تو سب سے پہلے شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی ذاتِ مقدس کو جاننا اور سمجھنا ضروری اور لازمی امر ٹھہرا۔

ہر ذی حس اور نیک نیت شخص چاہے وہ کسی بھی مکتبۂ فکر کا حامی ہو مجھ سے اتفاق کرتا نظر آئے گا کہ:۔

- شیخ محمد عبداللہ نام ہے ایک تنظیم اور زندہ جاوید ادارے کا۔
- شیخ محمد عبداللہ نام ہے اُس شخصیت کا جو کٹر نیشنلسٹ اور قومی اِتحاد کے علم بردار ہیں
- شیخ محمد عبداللہ نام ہے اس لیڈر کا جو سوشلزم، سیکولرازم اور جمہوریت کی روشن علامت ہے۔
- شیخ محمد عبداللہ نام ہے اُس ہستی کا جو عمل پر یقین رکھتا ہے، اور جس کے عزم کو سخت سے سخت وقت اور تاریک سے تاریک گھڑی بھی متزلزل نہیں کر سکتی۔
- شیخ محمد عبداللہ نام ہے ایک مخلص، ایک صادق، ایک دیانتدار اور صحیح راہنما کا،

جو کشمیری قوم کے وقار کی ضمانت ہیں اور

● شیخ محمد عبداللہ نام ہے اس ذاتِ گرامی کا جو دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے اور ہمیشہ خیر سگالی، بھائی چارہ اور راست کرداری کے اصولوں کی پیروی کرتے رہے ہیں۔

غرض اپنی پینتالیس سالہ سیاسی زندگی میں شیرِ کشمیر نے صرف یہ چاہا کہ کشمیریوں کو بلا لحاظ مذہب و ملت زندگی گذارنے کے مواقع حاصل ہوں۔ خود کو مصائب و مشکلات سے وابستہ کئے۔ انہوں نے .. عوام کی سرداری کو ترجیح دی۔ حصولِ آزادی سے قبل دُہرائے گئے ارشادات میں سے صرف دو کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ان کی وُسعتوں میں کھنگالنے سے اس حقیقت کا علم ہوگا کہ شیرِ کشمیر کس بلند پایہ کے راہنما ہیں اور کشمیری قوم کا درد (بلا لحاظ رنگ و نسل) اُنکی رگوں میں کس انداز سے موجزن ہے۔

(I) ریاستی عوام اُس وقت تک عزت و وقار کی زندگی بسر نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ اپنی منزل خود نہ ڈھونڈ لیں۔

(II) ہمارا مذہب ہم کو بے حد عزیز و محبوب ہے۔ لیکن سیاسی قوت و طاقت حاصل کئے بغیر ہم اپنے مذہب کی حفاظت نہیں کر سکتے

کون نہیں جانتا کہ اس ریاست کے عوام تسبیح کے دانوں کی طرح پراگندہ اور منتشر تھے۔ موقع پرست اور خود غرض قسم کے لیڈران قوم طرح طرح کا روپ دھارے ان دانوں کو اپنی اپنی مالا میں پرونے کی کوشش میں تھے۔ اُس وقت شیرِ کشمیر میدانِ کارزار میں اُترے۔ اُن کا نعرہ اُبھرا کہ کشمیریوں کے وجود کو تسلیم کر کے اُن کی جُداگانہ حیثیت کو برقرار رکھا جائے۔ گو شیخ صاحب کی اس آوازِ حق پر خود غرض عنصر نے انتہائی طور مخالفت شروع کر دی۔ لیکن شیخ صاحب کے عزمِ صمیم میں کسی طرح کا فرق نہ آیا۔ طرح طرح سے وقت وقت پر صعوبتیں برداشت کیں۔ قید و بند کی سختیاں دیکھیں لیکن اصول پہ اڑے رہے اور اپنی قوم سے غداری نہیں کی ـــــ غمِ دوراں اور بدلتے ہوئے حالات نے بہت ساروں کو اپنا یا گیا راستہ بدلنے پر مجبور کیا۔ لیکن شیرِ کشمیر کو زیر کرنے یا دام میں پھنسانے کی ہر کوشش نہ صرف ناکام رہی بلکہ ہر سازش شکست و فاش ہو کر رہ گئی۔

شیرِ کشمیر اِس ریاست کے تینوں حصّوں میں مقبول و محبوب لیڈر یا راہنما کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت لوگوں نے اپنی رائے کا کھُلم کھُلا اظہار کرکے حالیہ اسمبلی الیکشن میں دے دیا۔ اسمبلی الیکشن کے دوران اُن کے زرّیں و اعلیٰ اصولوں کو پامال کرنے کی کوشش ہر لحاظ پر اپنائی گئی۔ لیکن یہ شیرِ کشمیر کا حوصلہ تھا کہ اُن حالات میں بھی طرح طرح کی رُکاوٹوں کے باوجود ریاست کی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہے۔

اِس ریاست میں مختلف فرقوں کے اتحاد کو درہم برہم کرنے اور نیشنل کانفرنس کی حیثیت کو ختم کرنے کی نیّت سے مرکزی سرکار کے اشاروں پر بہت کچھ کیا گیا۔ مرکزی سرکار کے کم و بیش تمام وُزراء نے الیکشن کے دوران ریاست کے مختلف حصّوں کا دورہ کیا۔ اُن میں سے بعض کوتاہ النظری کا ہدف بنے شیخ صاحب کی شان میں گستاخی بھی اپنا گئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نیشنل کانفرنس کے اصولوں کی مخالفت کرنے میں ان حضرات نے دن رات صرف کیے لیکن از راہ مُروّت ایک علیل راہنما کی عیادت پرسی کرنا ضرورت نہ سمجھی۔ یہ افسوس ناک سانحہ اس ریاست کے عوام مشکل سے ہی فراموش کر سکیں گے۔

یہ انقلابِ زمانہ نہیں تو اور کیا ہے کہ بظاہر باپو گاندھی کے اصولوں کی ترجمانی کرنے والے مرارجی بھائی نے بھی شیخ صاحب سے ملنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ حالاں کہ وہ کیا ملک کا ہر فرد اس حقیقت کا اعتراف کرتا نظر آئے گا کہ مہاتما گاندھی کو امن و آشتی کی کرن نئے کشمیر کے نام سے لہرائے گئے جھنڈے کے زیرِ سایہ نظر آئی تھی۔ خیر الیکشن کے نتائج نے یہ ثابت کر دیا کہ شیرِ کشمیر ہی ریاست کے تینوں صوبوں کے واحد قائد ہیں جن کو لوگوں کا اعتماد بھرپور انداز میں حاصل ہے اور حاصل رہے گا۔

● میں اس حقیقت کو طشت از بام کرنا چاہوں گا کہ شیخ صاحب گھٹیا قسم کے سیاست داں نہیں ہیں جو مرکزی حکومت یا اور کسی پارٹی کے اشاروں پر ناچنا گوارا کریں گے .... نہ ہی وہ سابقہ وزرائے اعلیٰ کی طرح مٹی کے مادھو ہیں کہ ہر قدم، مرکزی حکومت کی منظوری حاصل کرنے کے بعد، اُٹھانا چاہیں گے۔ اُن سے یہ اُمید رکھنا کہ کسی بھی طرح قوم کی عزّت و آبرو کا سودا کریںگے نادانی اور کم عقلی ہے۔ ذہانت، دیانت داری، راست کرداری اور ریاست کی بہبودی سے متعلق مادہ شیرِ کشمیر کے اندر کوٹ کوٹ

کر بھرا ہوا ہے ۔ اس عمر میں بھی وہ انتھک کام کیا کرتے ہیں اور گوشہ عافیت میں بیٹھ کر خواب خرگوش کے مزے نہیں لوٹتے ۔

نئے سال کا بجٹ (تخمینہ) اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ سرسری انداز میں بجٹ کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت اُجاگر ہو کے رہتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی و کامرانی کے منازل سُرعت کیساتھ طے کرنے کے لئے جائز انداز میں رقومات اور نشانات مقرر کئے گئے ہیں۔ ریاست کے تینوں حصّوں میں ترقیاتی اُمورات کو بڑھ چڑھ کر پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر ہر ممکن اقدامات اُٹھائے جا رہے ہیں۔ تخمینہ کا سب سے بڑا حصہ زراعت، صنعت، ٹرانسپورٹ اور برقیات کے شعبوں کو بڑھاوا دینے کے لیے وقف کر دیا گیا ہے، کیونکہ ان ہی اکائیوں میں کامیابی حاصل کرنے پر ملک یا ریاست کی فارغ البالی اور خوش حالی کا دارومدار ہوا کرتا ہے ۔

- اس سال لوئر جہلم پاور ہوس کا دوسرا اور تیسرا مرحلہ مکمل ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اوڑی پروجیکٹ پر کام شروع کرنے کی نسبت تیاریاں مکمل کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے ۔

شیر کشمیر نے جب سے زمام حکومت سنبھال لی ہے ہماری ریاست سے وابستہ ہر شعبہ ہر لحاظ سے ترقی کے ساتھ ساتھ استحکامت کی جانب رواں دواں ہے ۔ نظم و نسق میں بہتری آنے لگی ہے ۔

صنعتی اداروں کو موثر انداز میں سود مند طریقہ کار کے تحت فروغ دینے کی بابت اقدامات اُٹھائے گئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ زیر تعلیم طلبا و طالبات کے دل میں احساس ذمہ داری کو اُجاگر کرنے کی کامیاب کوشش اپنائی گئی ۔

- صنعتی اداروں کو مستحکم و صحت مند بنیادوں پر چالو کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کی سفارشات پر عمل درآمد شروع ہونے لگا ہے ۔ یہ ایک مبارک قدم ہے ۔

- اسی طرح محکمہ تعلیم سے وابستہ نظام کو از سرنو جائزہ لینے کی خاطر اعلیٰ سطح پر ایک کمیٹی تشکیل دی جا رہی ہے ۔ جو اس نسبت اپنی سفارشات گورنمنٹ کو پیش کرے گی ۔ شیخ صاحب کو اس بات کا احساس ہے کہ مروجہ تعلیم کے توسط بچوں کی ذہنیت کتابوں کے بوجھ تلے دھب کر رہ گئی ہے ۔ اس تعلیمی نظام کو صحت مند بنیادوں پر کھڑا کر دینے کے لئے کچھ انقلابی اقدامات اُٹھانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ بیسک طریقے پر بچوں کو تعلیم اولین دور سے فراہم کر دی جائے جس کے بل پر تعلیم مکمل ہونے پر بھی طالب علم سماج اور معاشرہ تعمیر

سے وابستہ ضرورتوں کو پورا کر سکے ۔ سماجی اور معاشی لوازمات بہم پہنچانے کے بعد ہی ایک پڑھا لکھا شخص ملک و قوم کی بہبودی کی بابت شد و مد کے ساتھ سوچ سکتا ہے ۔ اُمید کرتا ہوں کہ تشکیل شدہ کمیٹی اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے گی ۔

- لینڈ گرانٹس بل پاس کر دیا گیا ہے جس کے سبب لاچار کاشت کاروں کو اُن کے زیر اثر زمین کا مالک بنایا گیا ہے ۔ ریاست کی آبادی کا سب سے بڑا حصّہ زراعت پیشہ ہے ۔ اس لئے یہ بل پاس کرنے سے مفلوک الحال کاشت کاروں کو راحت و خوشی حاصل ہوگی ۔

- گوجر و بکروال کے ساتھ ساتھ سماج کے دیگر طبقوں کی فلاح و بہبود سے متعلق مشاورتی بورڈ تشکیل دیا گیا ۔ ایسا کرنے سے ان پچھڑے طبقوں سے وابستہ آبادی کو اچھے انداز میں زندگی گذارنے کے مواقع حاصل ہوں گے اور اُن کی اقتصادی حالت سدھر جائے گی ۔

- سرکاری ملازمین کے حق میں مہنگائی الاونس منظور کر لیا گیا ہے ۔ یقین مانئے جس فراخ دلی کیساتھ الاونس کی شرح بڑھا دی گئی ہے ۔ اُس کی خود ملازمین کو توقع نہ تھی ۔ ہر ذی حس نے اس قابل فخر اقدام کو بھرپور انداز میں سراہا ہے ۔ سب سے بڑی بات یہ کہ تاریخ میں پہلی بار ریاستی ملازمین کے مہنگائی الاونس کو مرکزی شرح کے ساتھ برابر کرنے کی کامیاب کوشش اپنائی گئی ۔ جس کا رنیک کے لئے ملازمین شیر کشمیر کا دل سے شکر گذار ہیں ۔

- میں سمجھتا ہوں کہ ضلع سطح پر ترقیاتی بورڈ تشکیل دینے ، ترقیاتی کاموں کو آگے بڑھانے ، صنعتی میدان میں موثر اقدام اُٹھانے ۔ لینڈ گرانٹس بل پاس کرنے اور ملازمین کے لئے الاونس منظور کرنے کے بعد الیکشن کے دوران شائع کردہ منشور کی کچھ اہم شرطوں کو عملی جامہ پہنایا گیا !

آخر میں اتنا کہہ دوں کہ شیر کشمیر ایک صحت مند اور آزاد معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ عمل پیہم اور مسلسل جدوجہد سے انہیں الفت ہے ۔ کاہلی اور جمود جیسے حوصلہ شکن لوازمات سے اُنہیں دلی نفرت ہے ۔

بقول علامہ اقبال ؎

نشان یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صُبح و شام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی اُن کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی اُن کی تقصیریں

شیخ صاحب کا انداز فکر اس تصورِ حیات کی جڑیں کاٹنا چاہتا ہے۔ جس نے صدیوں سے اہل مشرق کو اپنا شکار بنالیا ہے۔ اُن کا اپنا جُداگانہ سوچنے کا انداز ہے۔ شیر کشمیر پہلے ہر مسئلے پر سوچا کرتے ہیں اور سوچنے کے بعد جو رائے قائم کرلیتے ہیں۔ تو پھر ہمالیہ کی طرح اُس پر اٹل رہتے ہیں۔ یہی ایک دولت گرانمایہ ہے جو ایک صحیح و راست کردار راہنما کو ورثے میں ملا کرتی ہے

● ریاست کے مستقبل کو درخشاں اور تابناک دیکھنے کی آرزو میں آؤ ہم سب بلا تمیز مذہب و ملّت اور بلا تفریق رنگ و نسل شیر کشمیر کے جتلائے گئے نقش قدم پر چلیں اسی میں ہماری اور ہمارے آنے والی نسلوں کی بہبودی و بھلائی مُضمر ہے

●●



تعمیر

تبصرہ

محمد زمان آزردہ



مجموعہ غزلیات

● شاعر عشرت کرتپوری ———

سائز:- ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۱۲۰، قیمت ۶، روپے

اُترپردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے چھپا ہوا یہ شعری مجموعہ اس سائنسی، تکنیکی اور نفسا نفسی کے دور میں بھی قاری کو اپنی ذاتی دُنیا کے اندر لے جاکر دل کی ان عمیق کوائف کی مے پلاتا ہے جو رفتہ رفتہ ناپید ہوتی جارہی ہیں۔ عشرت غزل میں روایات کے پابند ہیں مگر اُن کا ذہن محض تقلید کا قایل نہیں جس رنگ کو انہوں نے اپنایا ہے۔ اس کو خوب نبھایا ہے

عشرت کی غزل میں پیش کی ہوئی زندگی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں پر عام زندگی مسایل میں کھو کر بے مقصد سی ہو کے رہ جاتی ہے۔" شاخِ برہنہ" کی غزلوں میں زندگی کے مسایل بے نقاب بھی ہیں۔ اور ان پر تفکرات کا مہین پردہ بھی ہے۔ ان میں حُسن و عشق کی پُرکیف مستی بھی ہے اور زبان و محاورے

تیمیر

کا لطف بھی، جو ذوقِ سلیم رکھنے والوں سے ہمیشہ دادِ تحسین وصول کریگی

عشرت کی زبان سادہ ہے۔ لیکن اس سادگی میں پُرکاری کا لُطف پایا جاتا ہے۔ سادہ الفاظ میں ایسی بات کہتے ہیں جو آسانی سے نہیں کہی جا سکتی ؎

کون اب زخمِ جگر کےلئے مرہم دے گا
خود مسیحا بھی ہے بیمار یہاں سے چلئے

فراریت اس دور کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ جب لوگ اپنے گردوپیش سے گھبرا جاتے ہیں۔ مسائل کا حل تلاش کرنے سے معزور ہو جاتے ہیں تو ایک ایسا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ جس پر چل کر وہ اس . . . . بوجھ سے اپنے آپکو سبکدوش کر لیتے ہیں۔ جو حقیقت میں اُن کے سر پر تردّدات کے پشتارے کی صورت میں پڑا ہی رہتا ہے۔ اُمید اور نا اُمیدی کے درمیان انسان جب کشمکش میں مبتلا ہو جائے تو اس کی ذہنی کیفیت عجیب ہو جاتی ہے وہ ہوا میں جھولنے لگتا ہے۔ ایسے میں عشرت کہتے ہیں ؎

بک ہی جائے گی کسی کوچے میں یہ جنسِ وفا
بند ہونے لگا بازار یہاں سے چلئے

جب غم کی کیفیت شدّت اختیار کر لیتی ہے اور اپنا سفر طے کر چکتی ہے، تو انسان اسی غم کو اپنا سرمایہ بنا لیتا ہے۔ عشرت اس کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

رکھ کے سر اپنے غم کے شانے پر
کوئی بیمار سو گیا چُپ چاپ

عشرت کی غزل میں جدید رنگ کے شعروں کی بھی کمی نہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار قابلِ توجہ ہیں ؎

بہروپے بھرتے ہیں ہر اک راہگذر سے
کوئی نہیں انسان کہاں رات گزاروں!

●

ایک منزل ہے راہ بر لاکھوں
راہرو آج کس کے ساتھ چلے

●

اللہ کسی شخص کو رسوا نہ کرے یوں
مجھ سے مرا سایہ بھی تو اب بچ کے چلے ہے

●

چپکے سے کوئی جا کے یہ دیوانوں سے کہہ دے
اس دور میں داناؤں کی دانائی ڈسے ہے

●

کس میکدے میں لائی مری تشنگی مجھے
جس میکدے کا ساقی بھی پیاسا دکھائی دے

●

میں تعاقب میں ہوں خود اپنی ہی پرچھائیں کے
ہو سکے تو کبھی مجھ سے بھی ملا دو مجھ کو

●

اک میں ہی نہیں اس دور میں تنہا عشرت
غور سے دیکھا تو ہر شخص ہی تنہا نکلا

●

اُمید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس مجموعے کی خوب پذیرائی ہوگی ۔

تعمیر

مکتوبات

محترمی بابا صاحب !

ہدیۂ خلوص، وسلام عقیدت

ماہنامہ "تعمیر" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ نظم اور قطعہ کی اشاعت کے لئے شکریہ قبول فرمایئے منظر امام، نشاط انصاری اور فضا صاحب کی غزلوں نے متاثر کیا حمد نثر بھی خوب ہے بمل کرشن اشک کے تازہ مجموعۂ کلام پہ حامدی صاحب کا فکر انگیز تبصرہ خاصا دلچسپ ہے۔

سابقہ شمارے میں مبینہ امام صاحبہ کا افسانہ "رہگذر" جونہی نظر سے گزرا تو ایسا محسوس ہوا کہ افسانہ پہلے بھی کہیں پڑھا ہے۔ افسانہ "تعمیر" میں چھپنے سے پہلے ماہنامہ گل کوہ (بدایوں) کے تشکیل نمبر میں چھپ چکا ہے۔ مبینہ صاحبہ نے خوبصورتی سے افسانے کا نام رہگذر رکھ کر 'تعمیر' کی پابندی کو جانتے ہوئے، اسے پھر چھپوایا جب کہ گل کوہ میں افسانے کا عنوان 'دھوپ' تھا۔ امید ہے آئندہ مبینہ صاحبہ اس کوتاہی کا خاص خیال رکھیں گی۔

والسلام

فقط آپ کا

اشرف آثاری

برادرِ محترم جی' ایم' بابا صاحب

تسلیمات !

بڑی نوازش ہے کہ آپ نے میری نظم خوش سلیقگی سے شائع کی' اور پھر"تعمیر" سے نئے شمارے ارسال کئے۔ یہ پرچہ وقیع اور نکھرا ہوا ہے' خدا اسے عمرِ دراز دے۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی غزل خوب ہے انہیں میرا سلام کہہ دیجئے۔

لیجیے دو نئی غزلیں ارسال ہیں۔

پسند آئیں گی۔

نیاز کیش

اسلم عمادی

ہمایوں نگر' حیدرآباد (۵۰۰۰۲۸) اے پی

●

محترم مدیر۔ آداب و نیاز

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہوں۔ چند ماہ قبل ایک غزل "تعمیر" میں اشاعت کے لئے ارسال خدمت کی تھی۔ پچھلے شمارے میں میرا خط تو "تعمیر" میں چھپا تھا مگر غزل کی اشاعت کا منتظر ہوں۔ "تعمیر" اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آ رہا ہے ہر ماہ' یہ آپ کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے اور آپ اس کے لئے لائقِ مبارکباد ہیں۔

مخلص

نظیر صفی پوری

محمود نگر' لکھنؤ۔ ۳

●

محترمی تسلیم!

تقریباً ۱۲/۱۳ سال کے بعد لکھنؤ میں مجھے بشیر فاروقی صاحب کے یہاں "تعمیر" دیکھنے میں آیا۔ ماضی میں "تعمیر" کا سائز بڑا تھا۔ اب جدید زمانے میں خوبصورت سائز دیکھ کر مسرت ہوئی مطالعہ کے بعد پرچہ جاندار اور ترقی یافتہ نظر آیا۔ جی چاہا کہ بزم "تعمیر" میں حاضر ہوکر اپنا پرانا رشتہ استوار کرلوں جناں چہ تازہ غزل لے کر حاضر ہو رہا ہوں اُمید ہے کہ پسند خاطر ہوگی اور "تعمیر" کے کسی شمارے میں شامل کرلی جائے گی۔ آپ کی خیریت کا ہر وقت متمنی ہوں بزم "تعمیر" کے تمام دوستوں کو داجباں!

آپ کا
کمال جائسی
کان پور

•

محترم ایڈیٹر صاحب پندرہ روزہ "مکتوب"

بعد اسلام مسنون:

جریدہ نظر نواز ہوئے سرزمین کشمیر سے اس معیاری صحیفے نے ایک ایسی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے کہ جس کی محبان کشمیر بڑی دیر سے ضرورت محسوس کر رہے تھے۔
اراکین جامعہ بنام جامعہ "مکتوب" کے اجرا پر بصمیم قلب شکرگذار ہیں اُمید کہ پابندی کے ساتھ اس سے استفادہ کا موقعہ فرمایا جاتا رہیگا

(رئیس جامعہ)
دلوبند، یوپی

•

محترمی بابا صاحب!

خلوص و محبت !!

"تعمیر" آپ نے بھجوایا ہے یاد آوری کے لئے بے حد مشکور و ممنون ہوں یہ ادبی رسالہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہو رہی ہے آپ لوگ جس ذوق اور خوش اسلوبی سے یہ پرچہ نکال رہے ہیں اس کے لئے دلی مبارکباد قبول کیجئے! اس شمارہ میں فضا ابن فیضی، مظہر امام، ظفر مرادآبادی کی غزلیں پسند آئیں۔

محترمی بخشی صاحب اور حامدی صاحب کو آداب — ہاں! حامدی صاحب کی غزل "آج کل" جنوری کے شمارہ میں پڑھنے کو ملی مری طرف سے دلی مبارکباد بھی دیدیں۔

میرے لائق کوئی اور خدمت

جواب کا منتظر رہوں گا —— خدا کرے آپ بخیر و شاد ماں ہوں۔!

وفا کیش

اشرف مولانگری

سیتا مرہی (بہار)



اس بزم میں

(۱) جناب شیخ محمد عبداللہ ——— وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر

(۲) جناب مرزا محمد افضل بیگ ——— نائب وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر

(۳) پروفیسر عبدالاحد رفیق۔ سری نگر کشمیر محقق

(۴) فضا ابن فیضی اردو زبان کے مشہور و معروف جدید شاعر

(۵) ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی کاشمیری، شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی نسیم باغ سری نگر کشمیر
مشہور شاعر، نقاد، معلم

(۶) پروفیسر پرتھوی ناتھ پشپ، وزیر باغ سری نگر کشمیر، مشہور ماہر لسانیات

(۷) جناب غلام نبی خیال، ایڈیٹر روزنامہ "اقبال" سری نگر کشمیر مشہور شاعر اور صحافی

(۸) جناب غلام حسن اعجاز۔ جواہر نگر سری نگر کشمیر ریٹائرڈ پروگرام ایگزیکٹو آل انڈیا ریڈیو

(۹) جناب ابوالکلام قاسمی، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اتر پردیش، ایڈیٹر "الفاظ" مشہور نقاد

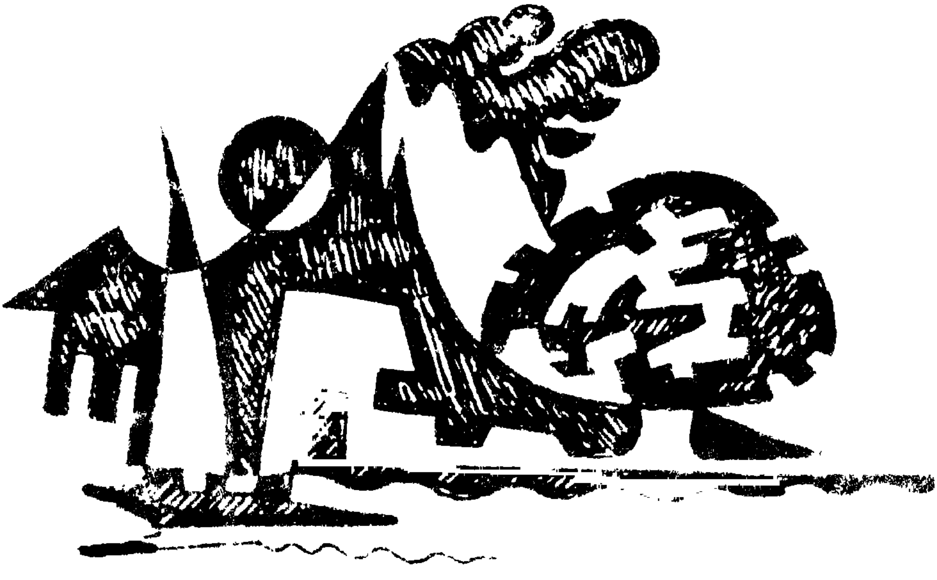
(۱۰) جناب لطف احمد پروڈیوسر دور درشن کیندر، سری نگر کشمیر ابھرتے شاعر

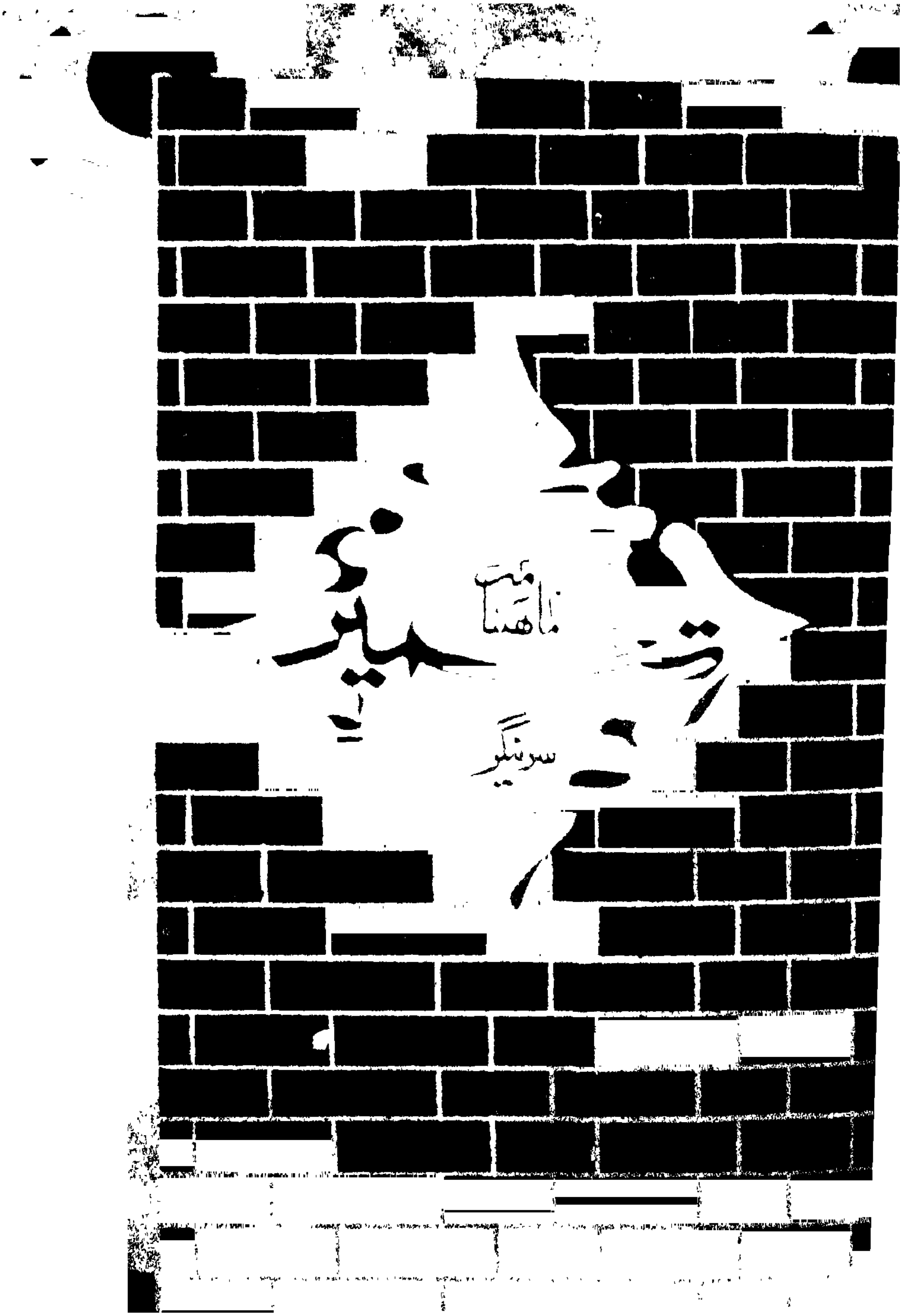
(۱۱) این۔ ڈی۔ قاضی "آشیانہ قاضی" متصل فائر بریگیڈ بٹہ مالو سری نگر کشمیر، مزاح نگار

(۱۲) جناب رشید ارشاد قلمدان پورہ سری نگر کشمیر، ابھرتے شاعر

(۱۳) جناب حسن ساہو، ۱۷ کلو منزل گورو بازار سری نگر کشمیر، مشہور افسانہ نگار

(۱۴) جناب ڈاکٹر محمد زمان آزردہ، حسن آباد رعناواری سری نگر کشمیر، مشہور نقاد و معلم




ماهنامه
سرینگر

اردو کا مقبول ماہنامہ

تعمیر
سرینگر

جنوری سنہ ۱۹۸۱ء

جلد نمبر ۱۳ — شمارہ نمبر ۱

نگران :- بخشی غلام علی، (ناظم اطلاعات)

مدیر :- خالد بشیر

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ تعمیر، نظامت اطلاعات مقبول شیروانی روڈ سرینگر کشمیر

شائع کردہ: نظامت اطلاعات، شعبہ مطبوعات

ترتیب

تعمیر



تعمیر میں چھپنے والی نگارشات میں ظاہر کی گئی آراء سے حکومت جموں و کشمیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ترتیب : غلام محی الدین

کتابت : بشیر احمد قاضی محمد حسین

مطبوعہ : گورنمنٹ پریس سرینگر

حرفِ چند

عورت ماں کی حیثیت میں ایک بچے کی پہلی اُستاد ہوتی ہے اور ماں کی گود انسان کا پہلا مکتب ہے۔ عورت سے ایک ایسا خوشحال گھر بنتا ہے جہاں مستقبل کے شہری جنم لیتے ہیں۔ پالے جاتے ہیں اور ایک مضبوط اور خوشحال ملک و قوم کی تعمیر کے لئے جوان کئے جاتے ہیں۔ سماج میں عورت کے رول کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں اُس کی مرکزی حیثیت سب تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن جب تک عورت کو اپنی نظر وسیع کرنے، صحت کی صحیح نگہداشت اور سماجی تحفظ اور عزت و احترام کا مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری مواقع فراہم نہ کئے جائیں اُس وقت تک ایک صحت مند، مہذب اور خوشحال قوم کی تعمیر کی تمام کوششیں ناکام ہوں گی۔

ریاست جموں و کشمیر میں خواتین کی بہبودی اور انہیں سماج میں اپنا جائز مقام دلانے کے لئے جو کوششیں کی جا رہی ہیں، اِن کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہ انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم زندگی کے مختلف شعبوں میں خواتین کو نہ صرف مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، بلکہ بعض جگہوں پر خواتین کو انتہائی اہم ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے پا رہے ہیں۔ خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے اُنہیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا بنیادی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس وقت ریاست میں سال ۵۱-۱۹۵۰ء میں لڑکیوں کے ۵۰۱ پرائمری سکولوں کے مقابلے میں

ڈھائی ہزار سے زائد ایسے سکول موجود ہیں۔ مڈل اور ہائی سکولوں کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے اور اس وقت مختلف سکولوں میں ڈھائی لاکھ کے قریب لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

بہبودی خواتین کے لئے خواتین کی صحت کی صحیح نگہداشت بھی انتہائی اہم ہے اور ریاستی حکومت اس امر سے بخوبی واقف ہے۔ ریاست کے ہر ایک ضلع میں ضلع ہسپتالوں میں ایک سو بستروں کی گنجائش ہے جن میں ۵۰ فیصد خواتین اور بچوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ان کے علاوہ پرائمری ہیلتھ سنٹروں اور سب سنٹروں پر خواتین کی مختلف بیماریوں کے علاج و معالجہ کے لئے ضروری سہولیات میسر ہیں اور تجربہ کار لیڈی ڈاکٹروں کی خدمات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔ ان مراکز پر خواتین کو زچگی سے قبل دوران اور بعد میں نہ صرف ماہرانہ مشورے بلکہ ضروری ادویات بھی فراہم کئے جاتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں خواتین کو رہبر صحت پروگرام اور ملٹی پرپز ہیلتھ ورکر سکیموں کے تحت ضروری طبی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ ہری نگر میں حال ہی للہ دید زنانہ ہسپتال کا افتتاح کیا گیا۔ جہاں ۵۰۰ بستروں کی گنجائش ہوگی۔ اس وقت مذکورہ ہسپتال میں دو سو زنانہ مریضوں کو داخل کرنے کی گنجائش ہے۔

تعلیم یافتہ اور پیشہ ورانہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو روزگار فراہم کرنے کے علاوہ ان پڑھ خواتین کو بھی اپنا روزگار خود حاصل کرنے کے لئے جگہ جگہ مختلف دستکاریوں کے مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ جہاں خواتین کو مختلف دستکاریوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ محکمہ [illegible] بہبود بھی اس سلسلے میں گراں قدر کام انجام دے رہا ہے۔ مسکین باغ سری نگر میں "مرکز بہبودی خواتین" کے نام سے ایک ایسا ادارہ قائم کیا گیا ہے جہاں کمزور طبقوں سے وابستہ چھ سو لڑکیوں اور خواتین کو مختلف ہنر سکھائے جارہے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں خواتین کی فلاح بہبود کیلئے بیگم شیخ محمد عبداللہ اور مسز سکھلا جہا کی کوششوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، یہ دونوں خواتین ریاست میں صنف نازک کو سماج میں اپنا جائز مقام دلانے کے لئے دن رات ایک کرتی ہیں۔ بیگم صاحبہ مسکین باغ کے مرکزی بہبودی خواتین کی موجودہ صدر بچوں سے متعلق ریاستی بورڈ کی نائب چیرمین اور سماجی بہبود سے متعلق مرکزی بورڈ کی ممبر ہیں۔ جبکہ مسز جہا خواتین اور بچوں سے متعلق ریاستی بورڈ اور ریاستی سماجی بہبود کے مشاورتی بورڈ کی چیرمین ہیں۔ اگرچہ ہم خواتین کو سماج میں مساوی درجہ دلانے کے سلسلے میں صحیح سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں تاہم ابھی اس سمت میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ جہاں تک ریاست کی موجودہ قیادت کا تعلق ہے خواتین کی فلاح و بہبود ایک ایسا

جگن ناتھ آزاد
صدر شعبۂ اُردو جموّں یونی ورسٹی
جموّں (توی)

حسرت موہانی — چند یادیں

مولینا حسرت موہانی کے ساتھ میری ملاقاتوں کی تعداد تو کم نہیں رہی، لیکن ان ملاقاتوں کو ملاقاتوں کے فوراً بعد ضبطِ تحریر میں نہ لانے کی کوتاہی جو مجھ سے ہوئی ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج اگر میں یہ داستان آپ کو سنانا چاہوں تو تاریخوں کی غلطیاں ضرور اس داستان میں در آئیں گی اور ہو سکتا ہے کہ واقعات بھی آپس میں گڈمڈ ہو جائیں لیکن اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ آج کی تقریب کے بہانے یہ چند واقعات تازہ ہو جائیں۔ تاریخوں کی اوّل تو اس داستان میں زیادہ اہمیت نہیں ہے اور اگر کچھ ہے بھی تو ان کی تصحیح کی بعد میں کوشش کی جا سکتی ہے۔

مولینا کو سب سے پہلے میں نے راولپنڈی میں دیکھا۔ ایک مشاعرے میں۔ یہ غالباً ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اس مشاعرے کا انتظام عبدالعزیز فطرت مرحوم نے کیا تھا۔ معلوم نہیں حسرت صاحب کسی کام کے سلسلے میں پہلے ہی سے راولپنڈی میں موجود تھے یا اس مشاعرے کے لیے انھوں نے خاص طور سے زحمت کی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں ہاں اتنا یاد ہے کہ شعراء ڈائس پر نہیں تھے بلکہ سامنے سامعین کی پہلی دو تین صفوں میں کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔ والدِ محترم

تسمیر

کے ساتھ کی کرسی پر حسرت مرحوم بیٹھے تھے۔ احسان دانش، پنڈت ہری چند اختر، عطا اللہ کلیم بھی پہلی صف میں تھے۔ راقم التحریر، فضل الرحمن اشک اور چند اور نئے شعراء ان کے پیچھے دوسری صف میں تھے۔

مجھے چونکہ اسی وقت مشاعرے سے اُٹھ کے رات کے دس بجے کی ریل سے لاہور آنا تھا جہاں میں زیرِ تعلیم تھا اس لیے بار بار گھڑی کو دیکھ رہا تھا اور مشاعرے میں میرا جی نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن میں حسرت مرحوم کو سُنے بغیر اُٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ وقت کی تنگی کے باوجود مشاعرے میں میری شمولیت کا ایک بڑا سبب حسرت مرحوم کو سننا تھا۔

اُس روز گرمی بہت شدید تھی۔ بجلی کے پنکھے کبھی چلتے تھے کبھی بند ہوتے تھے۔ سامعین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ ہال میں بیٹھنا دشوار تھا اور سب لوگ حسرت موہانی کو سننے کے لیے آئے تھے لیکن اس زمانے کے آداب شاعری کے مطابق حسرت صاحب کو تو آخر ہی میں زحمت دی جا سکتی تھی اور مشکل یہ تھی کہ سامعین کسی اور شاعر کا کلام سُننے پر آمادہ نہیں تھے۔

"آخر طے پایا کہ حسرت صاحب کو زحمت دی جائے۔ احسان دانش نے مصلحتاً کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے پہلے میں پڑھوں گا اور حسرت صاحب میرے بعد پڑھیں گے۔ چنانچہ احسان کا نام پکارا گیا۔ احسان نے کلام شروع کیا۔ ہال داد و تحسین کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ سارے مشاعرے کی فضا ہی بدل گئی۔

اب اس کے بعد حسرت صاحب کو زحمت دی گئی۔ انہوں نے بھی ترنم سے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اُنہوں نے کون سی غزل شروع کی۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ ان کی آواز گلے سے کم اور ناک سے زیادہ نکل رہی تھی۔ ترنم کیا تھا بس جیسے معصوم بچّہ گانے کی کوشش کر رہا ہو۔ سامعین کچھ دیر تو احتراماً سنتے رہے پھر ہال میں ایک طرف طلبہ کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ کھانسی تو آپ جانتے ہیں مشاعرے میں متعدی بیماری کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف باتیں شروع ہو گئیں منتظمین نے سامعین کو بہت سمجھایا لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ حسرت صاحب نے دوسری اور پھر تیسری غزل

تعمیر

شروع کی لیکن نہ چل سکے۔ ڈائس سے نیچے اُتر آئے اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

یہ تھا حسرت صاحب کا پہلا دیدار جو مجھے حاصل ہوا۔ اَب میں اسے ملاقات تو نہیں کہہ سکتا لیکن جو کچھ بھی تھا اس کا ایک یادگار پہلو یہ تھا کہ میں ساری صورتِ حال سے بہت مایوس ہُوا۔

حسرت صاحب نے اپنا کلام ختم کیا اور میں نے ریلوے سٹیشن کا رُخ کیا۔ ممکن ہے میں اُسی دن لاہور روانہ نہ ہو جاتا تو دوسرے دن حسرتؔ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

اس کے دو ایک برس بعد لاہور میں پھر حسرت صاحب کو سُننے کا موقع ملا۔ مولانا صلاح الدّین احمد مدیر "ادبی دُنیا" نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک عجیب و غریب اجلاس کا اہتمام کیا[1] اجلاس کی صدارت حکیم احمد شجاع نے کی۔ پروگرام کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کی ابتداء اقبال اور حسرت کی غزلوں سے ہوئی۔ اقبال کی غزل تھی۔

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

اور حسرت کی:

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

اقبال کی غزل پیش کرنے کی سعادت مجھے مِل تھی اور حسرت موہانی کی غزل میرے ایک دوست نے پیش کی جس کا نام اقبال حسین تھا اور جو آج اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔

اس کے بعد حسرت کی شاعری پر مولانا صلاح الدّین احمد۔ حکیم احمد شجاع، سیّد عابد علی اور بعض اور مقرّرین نے تقریریں کیں۔ آخر میں حسرت صاحب سے گذارش کی گئی کہ وہ اپنا کلام ارشاد فرمائیں۔ لیکن اس سے قبل غزل کے بارے میں اپنے زرّیں خیالات سے

---

[1] آج کل تو ایسے اجلاس عام ہوگئے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ اپنی وضع کا ایک انوکھا اجلاس تھا۔

اہل بزم کو شاد کام فرمائیں۔ اس واقعہ کو اب ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ مجھے حسرت صاحب کے الفاظ تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ انہوں نے غزل کی تین قسمیں بیان کیں۔ صوفیانہ، عاشقانہ اور فاسقانہ۔ یہ اقسام بیان کرنے کے بعد آپ نے کہا اب میں ان اقسام کے پیش نظر اپنا کلام آپ کو سناؤں گا۔ ایک نہایت عمدہ بات انہوں نے اس محفل میں یہ کی کہ اپنا کلام ترنم سے پیش نہیں کیا۔ تحت اللفظ ہی پڑھا ورنہ ممکن تھا راولپنڈی والی کیفیت یہاں بھی پیدا ہو جاتی۔ جب آپ صوفیانہ اور عاشقانہ موضوعات پر اپنا کلام سنا کے رخصت ہونے لگے تو آوازیں آئیں فاسقانہ۔ "فاسقانہ" چناں چہ آپ نے یہ اشعار سنانا شروع کیے۔

رشک سے مٹ مٹ گئے ہم تشنۂ کامانِ وصال

جب لگا لب ہائے ساقی سے لبِ پیمانہ آج

کہتا ہے عجیب ناز سے اِٹھلا کے یہ وہ شوخ

حسرت سے تو پردہ کیا ہے نہ کریں گے

دل خون ہوئے جاتے ہیں اربابِ نظر کے

رکھتی ہے قیامت کا تری سرمخاطب رنگ

اس پر ایک نوجوان نے کھڑے ہو کے باوازِ بلند کہا "مولینا! یہ تو عاشقانہ شاعری ہے۔ آج ہمیں سچ مچ کی فاسقانہ شاعری سنائیے۔ یہ بتلائیے اُتلی میں آپ کیا کرتے رہے؟"

ساتھ ہی ایک اور آواز آئی۔ مولینا وہ سنائیے۔

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

اتنے میں ایک اور نوجوان نے پکارا — "مولینا وہ ہمیں اُتلی کی زندگی کے بارے میں کچھ سنائیے" مولینا نے فوراً جواب دیا "وہ عاشقانہ باتیں ہیں فاسقانہ نہیں۔ اس برجستہ جواب پر ساری محفل قہقہہ زار بن گئی۔

ظاہر ہے کہ مولینا کے ساتھ یہ بھی میری ملاقات نہیں کہی جا سکتی۔ یہاں مجھے [illegible]

تعمیر

"حصارِ دور کا جلوہ" ہی رہا۔ ملاقاتیں سنہ ۴۷ء کے بعد ہوئیں جب تقسیم ہند کے بعد ہم لوگوں نے راولپنڈی اور لاہور کو چھوڑ کے دہلی کو اپنا وطن بنایا۔

دہلی میں حسرت صاحب کا مسکن تو اس مسجد کا حجرہ تھا جو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے واقع ہے اور جس کے قریب آج سابق صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد مرحوم کی آخری آرام گاہ ہے۔ لیکن حسرت صاحب اکثر ہر شام اردو بازار آتے تھے اور مولوی سمیع اللہ مرحوم کی دکان پر اپنی محفل سجاتے تھے۔ دراصل میں مولوی سمیع اللہ کی دکان ہندوستان کے ہر حصے سے آنے والے اہلِ اردو کے لیے ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ سمیع اللہ مرحوم سخن فہم تھے۔ شاعروں کی قدر کرتے تھے۔ چائے کا دور ان کی دکان پر صبح سے شام تک چلتا تھا اور جب تک مولوی سمیع اللہ زندہ رہے یہ سلسلہ جاری رہا۔

اسی دکان پر حسرت صاحب کی گل افشانی گفتار سے فیض یاب ہونے کے مواقع مجھے اکثر میسر آئے۔ میں نے ایک بار ان سے پوچھا۔ "مولانا یہ نظم معرا کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ جب پابند شاعری میں ہر طرح کا خیال روا ہو سکتا ہے۔ تو نظم معرا کی کیا ضرورت ہے۔ دراصل اس سوال کا مقصد اس صنفِ سخن کے متعلق حسرت صاحب کے خیالات جاننا تھا۔ میں نے محض انہیں PROVOKE کرنے کے لیے اس صنفِ سخن کے بلا ضرورت ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا ورنہ میں خود پابند شاعری کے ساتھ ہی ساتھ اپنے اظہارِ خیال کے لئے نظم آزاد اور نظم معرا دونوں کا انتخاب ۱۹۳۷ء ہی سے کر چکا تھا۔ کہنے لگے نظم معرا شاعری کی کوئی نئی صنف نہیں ہے۔ غزل کا ہر شعر، مطلع کو چھوڑ کر، اپنی الگ حیثیت سے معرا شاعری کی مثال ہے۔ جب غزل کے اشعار پر آپ اعتراض نہیں کرتے تو معرا شاعری پر کیوں معترض ہوتے ہیں۔ محفل میں جس قدر لوگ تھے سب نے اس نکتے کی داد دی۔ بات اگرچہ سامنے کی تھی لیکن اس پر ہم لوگوں کی نگاہ اس وقت گئی جب حسرت صاحب نے یہ نکتہ سمجھایا۔

تمام دہلی کی جس مسجد کے حجرے کا میں نے ذکر کیا ہے اس میں حسرت صاحب مرحوم کا نیاز حاصل کرنے کے لیے مجھے کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ زمین پر ایک چٹائی بچھی رہتی تھی یا بوریا۔ یہی اس فقیر کی کائنات تھی۔ اسی پر بیٹھ کے وہ آسمان فکر کی ان بلندیوں کو چھوتے تھے جنہوں نے اردو شاعری کی رفعتوں میں اضافہ کیا۔ ایک چھینکا چھت سے لٹکا رہتا تھا۔ اس میں اکثر و بیشتر سوکھی روٹی رکھی رہتی تھی۔ آپ گئے ہیں گیا حسرت صاحب نے بلا تکلف ہر ایک کو اس دعوت شیراز میں شریک کرنا چاہا۔ مجھے اس دعوت شیراز میں شریک ہونے کی سعادت دو ایک بار حاصل ہوئی۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اس باطن کے غنی اور ظاہر کے فقیر کی فقیری کی داستانیں تو بہت ہیں لیکن میں یہاں آپ کو دو ایک ہی سناؤں گا۔

ایک بار حسرت صاحب کے ساتھ ایک مشاعرے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ مشاعرے کے بعد بالعموم ہم شعرا کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ ہم قریب قریب کاسۂ گدائی بن جاتے ہیں۔ مشاعرے کے بعد اکثر شعرا کی نظر منتظمین پر ہوتی ہے کہ کب آ کر وہ اپنا مدعو وہ زر خیطر شعرا کی نذر کرتے ہیں۔ لیکن یہ ذکر ایک مختلف قسم کے مشاعرے کا ہے جس کے خاتمے کے بعد منتظمین مشاعرہ برائے احترام کے شعرا حضرات کی خدمت میں مدعو، معاوضہ پیش کر رہے تھے۔ جن شعرا نے معاوضے کی رقم کا ذکر نہیں کیا تھا اُن سے منتظمین اخراجات سفر اور معاوضے کے متعلق پوچھ پوچھ کے روپیہ ادا کر رہے تھے۔ حسرت موہانی اُنہیں شعرا میں سے تھے جنہوں نے شرکت مشاعرہ کے لیے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ منتظمین نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کے ایک لفافہ انہیں پیش کیا۔ آپ نے فوراً کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سفر میں کچھ خرچ نہیں کیا۔ ایک ٹکٹ

مجھے اپنے ساتھ اپنے ڈبے میں بٹھا کے لے آیا ہے۔ ٹکٹ میں نے خریدا ہی نہیں۔ وہ گارڈ آج شام کو واپس جارہا ہے اور مجھے وہ اپنے ساتھ لے جائے گا۔ منتظمین نے بہت کہا حضور! آپ یہ حقیر سا نذرانہ ہماری طرف سے قبول کر لیجیے لیکن حسرت صاحب اس قطعی جواب کے ساتھ اپنے انکار پر اڑے رہے کہ جب میں نے ریل کے ٹکٹ وغیرہ پر کچھ خرچ ہی نہیں کیا تو آپ سے اخراجات سفر یا معاوضہ لینے کا کیا سوال۔؟

سر سلطان احمد مرحوم کے ٹی کے سی ایس آئی حکومت ہند کے ممبر تھے۔ انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کا محکمہ ان کے پاس تھا۔ تقسیم ہند سے قبل حکومت ہند کے ممبروں کا وہی درجہ تھا جو آج کیبنٹ منسٹر کا ہے۔ اختیارات کہیں زیادہ تھے کیونکہ وہ جمہوری دور نہیں تھا۔ مشاعرے کے دوسرے دن انہی سر سلطان نے تمام شعرا کو ڈنر کی دعوت دی۔ شعرا اور حکومت ہند کے بعض اور ممبر جن میں مجھے اس وقت سر جگدیش پرشاد[1] سری واستو اور مسٹر غلام احمد کے نام یاد ہیں اور حکومت ہند کے بڑے بڑے افسر وقت مقررہ پر سر سلطان کی کوٹھی پر موجود ہیں۔ حسرت صاحب ایک طرف اپنے جھولے میں سے اخبار نکال کے اسی بوسیدہ عینک کی مدد سے پڑھ رہے ہیں جس کے ایک طرف کی کمان ٹوٹ جانے کے باعث اُنھوں نے اس کی جگہ دھاگہ باندھ رکھا ہے۔ کھانا میز پر چنا جا چکا ہے اور سر سلطان تمام شعرا سے فرداً فرداً ڈائننگ ہال میں تشریف لانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ اسی وضعداری کے عالم میں وہ حسرت صاحب کے ہاں پہنچتے ہیں اور دست بستہ عرض کرتے ہیں۔ حضور کھانا حاضر ہے تشریف لائیے۔ حسرت موہانی اخبار سے آنکھ اُٹھا کے سر سلطان کی طرف دیکھتے ہیں اور جواب دیتے ہیں " کھانا ہم کھا آئے " سر سلطان کہتے ہیں،

---

[1] یہ وہی جگدیش پرشاد سری واستو ہیں جن کے متعلق مشہور غزل گو رفیع احمد خاں کا یہ شعر ایک زمانے میں زبان زد خاص و عام رہا۔

بڑا ہی کرم ہے سری واستو کا

تعمیر

"حضور! کھانا تو آپ کو یہیں تناول فرمانا تھا" حسرت بڑی بے اعتنائی سے جواب دیتے ہیں' ہم جہاں ٹھہرے ہیں کھانا ہم نے وہیں کھا لیا تھا۔" سر سلطان درخواست کرتے ہیں' حضور تھوڑی دیر کے لیے ڈائننگ ہال میں تشریف لے چلیے۔ ذرا سا میٹھا ہی چکھ لیجئے۔؟ جواب ملتا ہے " ہم یہاں بہت آرام سے بیٹھے ہیں۔ ہم کھانا کھا آئے۔ ہم اب کچھ نہیں کھائیں گے۔"

اس دورِ شکم پرور میں یہ شانِ بے نیازی رِشیوں' منیوں اور درویشوں کی یاد تازہ کر رہی ہے۔

والد محترم ویجی ٹیرین تھے۔ اس دعوت میں انہیں شاید میز پر ویجی ٹیرین کھانا نظر نہیں آیا یا اُنہوں نے ویجی ٹیرین کھانوں کو بھی شاید نان ویجی ٹیرین سمجھا وہ بے کے حسرت موہانی کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ ان دونوں شاعروں میں کیا باتیں ہوئیں لیکن اتنا یاد ہے کہ والد نے جب تھوڑی دیر بعد ہونے والی نشست کے لیے غزل منتخب کرنے کی خاطر اپنی بیاض نکالی تو حسرت صاحب نے ان سے بیاض لے لی اور بہت دیر تک اُس بیاض کو پڑھتے رہے ممکن ہے اس کا سبب وہ غزل ہو جو والد نے گزشتہ رات والے مشاعرے میں پڑھی تھی اور جس میں حسرت موہانی کو انہوں نے بھرپور خراج تحسین ادا کیا تھا۔ اس غزل کا ذکر میں اس مقالے میں تھوڑی دیر بعد کروں گا۔ اس سے قبل آپ ایک اور واقعہ سُن لیں جو ہم دو تین ہندوستانی شعراء کو پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد صاحب (مرحوم) نے کراچی میں سُنایا تھا۔

سال تو مجھے یاد نہیں۔ ممکن ہے عرش ملسیانی کو یاد ہو کیونکہ کراچی کے اس مشاعرے میں وہ بھی شریک تھے۔ مشاعرے کے دوسرے دن غلام محمد مرحوم نے میرے والد محترم محروم صاحب، ممتاز حسن احسن (مرحوم) گورنر سٹیٹ بنک پاکستان پنڈت ہری چند اختر، عرش ملسیانی اور اس خاکسار کو چائے پر مدعو کیا۔ والد محترم کو صبح ہی پہلی فلائٹ سے دہلی واپس آنا تھا۔ اس لیے وہ اس چائے میں شریک نہ ہو سکے۔ ہم چاروں یار شریک ہوئے۔ غلام محمد' اللہ انہیں

تھے

جنت نصیب کرے ۔ بہت متواضع، خلیق اور خوش اخلاق انسان تھے ۔ سخن فہم تھے ۔ اردو اور فارسی کے ہزاروں معیاری اشعار انہیں یاد تھے ۔ کوئی دو اڑھائی گھنٹے ہم لوگ ان کے ساتھ رہے ۔ چائے کے دور چلتے رہے ۔ خوش گپیاں ہوتی رہیں ۔ اس دو اڑھائی گھنٹے کی مدت میں غلام محمد صاحب نے ہم تین چار شاعروں سے کلام سنانے کی کوئی درخواست یا فرمائش نہیں کی ۔ وہ ان اوچھے میز بانوں میں نہیں تھے جو مہمان کے سامنے چائے کی ایک پیالی رکھنے سے قبل ہی کہہ اٹھتے ہیں ۔۔۔ " ہاں صاحب کچھ ارشاد ہو " بات چیت میں حسرت موہانی مرحوم اور ان کی شاعری کا ذکر چل نکلا ۔ ہری چند اختر اور عرش ملسیانی نے حسرت موہانی کی درویشی کے کئی قصے سنائے ۔ غلام محمد مرحوم کہنے لگے ۔ ان کا ایک عجیب و غریب قصہ میں آپ حضرات کو سناتا ہوں اور وہ قصہ یہ ہے :۔

" ایک بار میں ہندوستان گیا تو جواہر لال نہرو کے ساتھ دوران گفتگو میں حسرت موہانی کا ذکر آگیا ۔ اس زمانے میں حسرت موہانی سردار پٹیل سے خفا تھے اور سردار پٹیل حسرت موہانی سے خفا تھے ۔ بات چیت کی ابتدا شائد اسی بات سے ہوئی ہوگی ۔ حسرت کا ذکر آتے ہی جواہر لال نہرو نے مجھ سے کہا ۔۔۔ غلام محمد ! تم دنیا کے مانے ہوئے ایک ماہر مالیات ہو ۔ ہمارے سامنے ایک مالیاتی مسئلہ آگیا ہے ۔ اس کا کوئی حل نکالو ہم لوگ تو پریشان ہو گئے ہیں ۔

میں عالم حیرت میں پوچھا ۔ ایسا کون سا مسئلہ ہے جو تمہاری حکومت سے حل نہیں ہو رہا ۔ اچھا بتاؤ دیکھتے ہیں ۔

جواہر لال کہنے لگے کہ گذشتہ ماہ پارلیمنٹ کے سیکرٹری میرے

یہ ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا ۔ پالیٹکس میں وہ اپنے مخالفوں کے ساتھ بد زبانی پر اتر آتے تھے اور اسی مخالفوں کی تواضع وہ گالیوں سے کرتے تھے ۔

سامنے یہ مسئلہ لائے، کہ مولانا حسرت موہانی نے کئی برس سے اپنا وہ روزانہ بھتّہ وصول نہیں کیا جو پارلیمنٹ کے ہر ممبر کا حق ہے۔ یہ روپیہ بڑھتے بڑھتے پندرہ بیس ہزار روپے تک پہنچ گیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مولانا کہتے ہیں مجھے اس روپے کی ضرورت نہیں اور خزانے والے یہ روپیہ اس بنا پر واپس لینے سے انکار کرتے ہیں کہ یہ پارلیمنٹ کے ایک ممبر کا بھتّہ ہے۔ یہ بھتّہ انہیں لینا ہی ہوگا رسید نہیں بھجوائی جائے۔ اب روپیہ درمیان میں لٹکا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس کا کیا کیا جائے۔"

غلام محمد کہتے ہیں کہ جواہر لال نہرو کی یہ بات سُن کر مجھے ہنسی بھی آئی اور میں سوچ میں بھی پڑ گیا کہ آخر اس مسئلے کا حل کیسے ڈھونڈا جائے۔ چنانچہ میں نے جواہر لال سے کہا کہ میں کل خود حسرت موہانی سے مل کے انہیں مشورہ دوں گا وہ یہ روپیہ قبول کریں۔ غلام محمد کہتے ہیں کہ میں دوسرے دن خود اس درویش کے آستانہ پر پہنچا۔ کافی دیر ان کے ساتھ رہا۔ انہیں یہی مشورہ دیتا رہا کہ آپ یہ روپیہ لے لیں اور جس ادارے کو چاہیں خیرات میں دے دیں۔ لیکن حسرت کا ایک ہی جواب تھا ـــــ میں اس بکھیڑے میں نہیں پڑ سکتا۔ تم ہی یہ روپیہ جس ادارے کو چاہو دے دو یا جواہر لال نہرو سے کہہ دو خود کسی ادارے کو دے دیں۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ حسرت صاحب کے نام کا روپیہ پاکستان کا گورنر جنرل یا ہندوستان کا وزیر اعظم خود وصول کر کے کسی ادارے کو دے دیتا۔ حسرت صاحب نے اس روپے کو آنکھ اُٹھا کے دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ معلوم نہیں انجام کار اس روپے کا کیا ہوا۔

یہ واقعات تو قیامت تک ختم نہیں ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں اس بات چیت کو اُس تعلق خاطر کے ذکر پر ختم کردوں جو میرے والد محترم کے دل میں حسرت موہانی کے لئے تھا۔ پہلے وہ واقعہ سُن لیجئے جس کی طرف میں نے سر سلطان احمد کے ڈنر کے تعلق سے

تعمیر

اشارہ کیا ہے۔ ڈنر سے ایکدن قبل جو مشاعرہ ہوا اور جس کی صدارت اگر میں غلطی نہیں کرتا تو مذکورہ ادب پرور شخصیت غلام محمد ہی نے کی جو اُس وقت حکومتِ ہند کے فائننس ممبر تھے اس میں والد نے اپنی وہ غزل پڑھی جو اُن کے مجموعہ غزلیات "شعلہ نوا" میں ان اشعار سے شروع ہو رہی ہے

تقدیر اگر ہے ناموافق موہوم ہے جذبِ عشق صادق
ہو جاتے ہیں دورِ عاشقی میں حالات تمام ناموافق !

اس غزل ——— میں والد صاحب نے حسرت کا پورے کا پورا یہ شعر

محروم نہیں تو اور کیا ہے
اُس دشمنِ عاشقاں کا عاشق

ان ——— اشعار کے ساتھ اپنی غزل میں شامل کر لیا۔

حسرت نے کہا ہے خوب یہ شعر بالکل مرے حال کے مطابق
مقطع یہ ہے مری غزل کا دیں دادِ سخن سخن کے شائق
محروم نہیں تو اور کیا ہے
اُس دشمنِ عاشقاں کا عاشق۔

حسرت صاحب ——— چونکہ خود اس مشاعرے میں موجود تھے اس لیے اس مقطعے پر جو دراصل حسرت ہی کا ایک شعر ہے بے اندازہ داد ملی اور مذکورہ آخری تین اشعار بار بار پڑھوائے گئے۔

حسرت صاحب جنگِ آزادی کے ایک سپاہی کی حیثیت سے کئی بار جیل گئے۔ ان کی قربانیوں کے متعلق والد صاحب نے دو بار خامہ فرسائی کی۔ ایک بار رُباعیات کی صورت میں اور یہ رُباعیات "حسرت موہانی اور قید فرہنگ" کے عنوان سے " رباعیات محروم " میں شامل ہیں اور دوسری بار ایک نظم کی صورت میں " جو بنام حسرت " کے عنوان سے

تعمیر

"کاروانِ وطن" میں شامل ہے۔ میں انہی مذکورہ رباعیات اور نظم پر یہ مقالہ ختم کرتا ہوں۔
سماعت فرمایئے۔

حسرت موہانی اور قیدِ فرنگ

اے زندہ شہید حسرتِ موہانی
سرکار نے کر دیا تجھے زندانی
لیکن اہلِ وطن کی نظروں میں تو
محبوب ہے مثلِ یوسفِ کنعانی

(۲)

کتنی تری طبعِ نکتہ رس رنگین ہے
رنگینیِ طبع سے نفس رنگین ہے
بلبل تو ہے وہ گلشنِ معنی کا
نغموں سے ترے ترا قفس رنگین ہے

(۳)

حاصل ذوقِ ثبات کا ہو جانا
کلفت میں مسرت آشنا ہو جانا
ہے طبعِ شگفتہ کا نرالا اعجاز
زنداں میں ترا غزل سرا ہو جانا

(۴)

پھر قیدِ فرنگ کا زمانہ آیا
آزاد کی رہ میں قید خانہ آیا
زنداں میں سنی جو بیڑیوں کی جھنکار
لب پر ترے عشق کا ترانہ آیا۔

(۵)

کب نغمۂ دلنواز زنداں میں رہا
یا نالۂ جانگداز زنداں میں رہا
چرچا اس بات کا رہے گا برسوں
حسرت سخن طراز زنداں میں رہا

تمعہ

بنامِ حسرت

اے عاشقِ آزادی اے حسرتِ موہانی
اے پیکرِ بربادی ناکام تن آسانی

اعزاز ترا ثابت زنداں کے کہن سے ہے
تو آج ہے بھارت میں رشکِ مہِ کنعانی

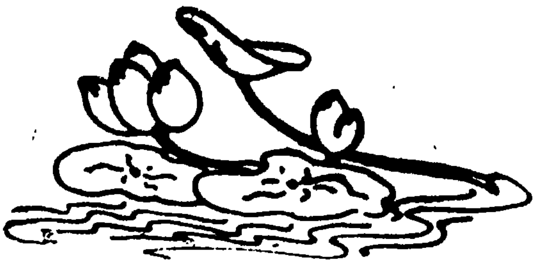
جاں بازِ وطن تجھ سا پیدا نہ ہوا ہوگا
خیرات یہ تری قُرباں خود جذبۂ قربانی

یہ لعل یہ رنگینی اور اس پہ یہ سنگینی
دل توڑ دیا تو نے اے ذوقِ ستم رانی

تاثیر دکھائے گی بے سود نہ جائے گی
یہ تیری دلافگاری یہ تیری تن افشانی

جو بزم کی زینت تھے جو رزم کی شوکت تھے
بہتر تو نہ تھے ان سے جو آج ہیں زندانی

اے اہلِ وطن سننا دل اور جگر تھامے
اُٹھتا ہے وہ زنداں سے پھر شورِ غزل خوانی



تیمیر

محمد یسین بیگ
چیف منسٹرس سیکریٹیریٹ، جموں توی

جدیدیت — ایک جائزہ

اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک بالآخر اپنے منطقی انجام کو پہنچنے لگی ہے۔ اس بات کا سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ جس شدت کے ساتھ یہ تحریک شروع کی گئی تھی، گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ نہ صرف یہ کہ اسمیں کمی آگئی ہے بلکہ جدیدیت کے وہ علمبردار بھی جو آج کے معاشرے میں فرد کی تنہائی، میکانکی زندگی کے المیے اور رقدات کی شکست جیسی قدروں کی گواہی دیتے رہے تھے، پہلے کے مقابلے میں اب کچھ تھکے تھکے سے نظر آنے لگے ہیں۔ اُن کی تحریکوں میں اور اُن کی تخلیقات میں محض داخلی انتشار کی وہ شدت اب دیکھنے کو نہیں ملتی جو ابتداً موجود تھی۔ یہاں تک کہ اُن کی تخلیقات میں ٹھہری ہوئی روایت پرستی کا عکس بھی ملنے لگا ہے اور روایت سے رابطہ توڑ کر ایک بالکل نئی حسیت کی تعمیر کا وہ دعویٰ جو جدیدیت کے علمبرداروں کی طرف سے کیا جاتا تھا اب قطعی بے بنیاد اور کھوکھلا نظر آنے لگا ہے۔ ایسی نظموں، غزلوں اور افسانوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے جن میں اجتماعی حیثیت سے عصری تقاضوں کی بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسی تخلیقات آئے دن ادبی رسالوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں اور انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انفرادی انتشار کی وہ افیون زدہ کیفیت رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے جسکی بنیادوں پر جدیدیت کا قصر تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

لیکن اس سے پہلے کہ جدیدیت کی اس گرتی ہوئی ساکھ کی اہمیت کو زیادہ واضح الفاظ میں پیش کیا جائے، یہ ضروری ہوگا کہ اس تحریک کے بنیادی تصور کا جائزہ لیا جائے۔ جدیدیت کا تصور اردو ادب میں کیا

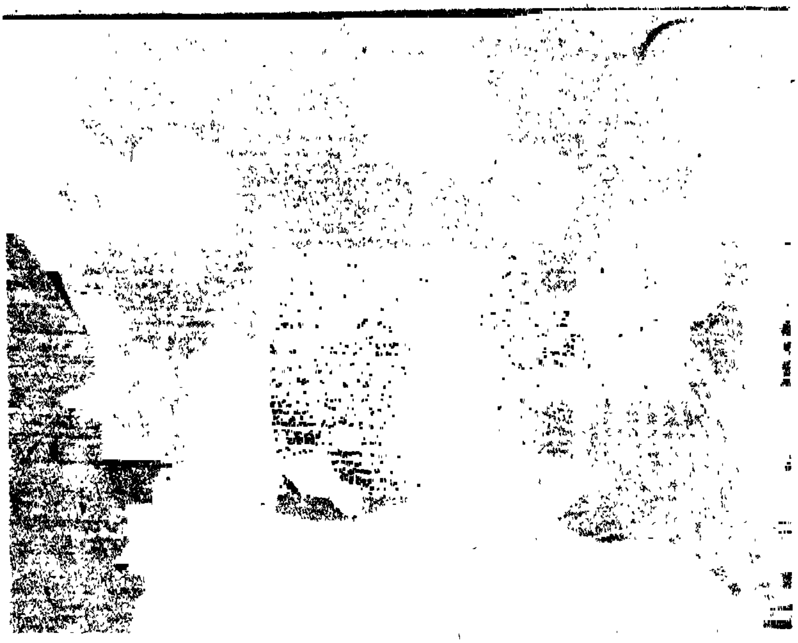
تعمیر

معنویت رکھتا ہے' اس بارے میں بڑی طویل بحثیں ہوئی ہیں۔ اس تصور کی جو بھی ذہنی و فکری جوازیت رہی ہو اور اسے فلسفیانہ دلائل کی تہہ داریوں میں جس انداز سے بھی پیش کیا گیا ہو' ایک بات مسلّمہ ہے کہ مغربی ادب کی دوسری اور بہت سی تحریکوں کی طرح یہ تحریک بھی اردو ادب میں باہر سے مستعار لی گئی ہے اور اس کے خالق وہی لوگ ہیں جو مغربی ادب سے اپنی گہری وابستگی کی بنیاد پر اس کی تمام محسن قدروں کو بو بہو اردو ادب پر بھی نافذ کر دینے میں یقین رکھتے ہیں۔ اردو ادب کے ان محسنوں میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جو کالجوں' یونیورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں ترسیلِ علم کے منصبوں پر فائز ہیں اور جو اردو زبان و ادب کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھ کر اس کے ماضی' حال اور مستقبل کے ضامن بنے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اردو ادب کے ایک عام قاری کو مغرب میں پائی جانے والی تحریکوں کے عروج و زوال سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی' وہ تو اپنے ادب کو اپنے ماحول کے آئینے میں دیکھتا ہے اور اس کے ترکیبی عناصر کو اپنے گرد پھیلے ہوئے معاشرے میں تلاش کرتا ہے لیکن اردو ادب کے ان محسنوں کو جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے' ادب کے اس خالص مقامی تصور کا احترام کرنا اس لئے بھی ناگوار گذرتا ہے کیونکہ اس میں اُن مغربی نقادوں اور فلسفیوں کے ذہن و فکری نظریات کو جذب کر لینے کی صلاحیت نہیں ہے جنہیں وہ اپنا روحانی مرشد سمجھتے ہوئے اپنے ادب پر مسلط کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح اردو ادب میں جدیدیت کے لئے جس ذہنی' نفسیاتی اور فکری رویّے کی تعمیر کی گئی ہے اس کی سب سے بڑی کمزوری بھی یہی ہے کہ یہ رویّہ ہمارے ماحول کے لئے بالکل اجنبی ہے۔

یہاں ایک بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ذہنی انتشار' فرد کی تنہائی' یاسیت' محرومی' معاشرے کے تئیں فرد کی قطعی بے رخی' داخلی ہیجان' شکستِ ذات' زندگی سے اُکتاہٹ' بے عملی اور ٹوٹ کر بکھر جانے کی جو کیفیات جدیدیت کے محرکات کے طور پر اردو ادب میں شامل کی گئی ہیں' اُن کا ہمارے ماحول کی عملی زندگی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ سبھی کیفیات مغربی ادب میں اُس ذہن کی غمازی کرتی ہیں جو دو طویل عالمی جنگوں کے بعد شدید صنعتی و اقتصادی ترقی' سائنس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت' مادیت پرستی اور جنسی لذتیت کی گمراہی کے روپ میں مغربی معاشرے میں ظاہر ہوئی۔ مغرب میں بڑھتی ہوئی مادیت' صنعتی ترقی کی وجہ سے ماحول کی آلودگی' مریضانہ حد تک بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی اور معاشرے کے بکھرتی اور

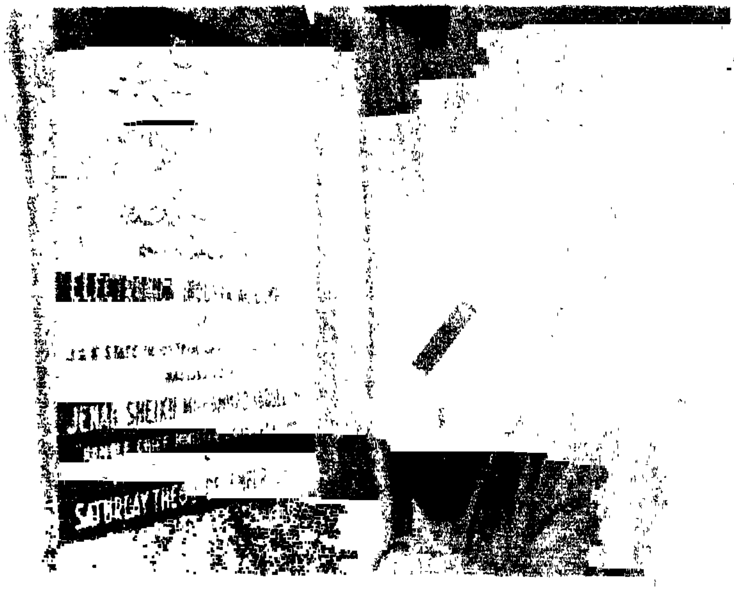
سطح پر کسی قابل قدر معیار کی طرح بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اُردو ادب کے قارئین کی تعداد روز بروز بڑھتی رہے اور اسکی طرف ذہنی رغبت کا وہ رویہ دوبارہ زندہ ہو جائے جو آزادی سے پہلے موجود تھا، جدیدیت کی تحریک نے اُردو زبان و ادب کی مقبولیت کے عمل کو بُری طرح مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اور یہ ایک ایسی کوتاہی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جدیدیت کے علمبرداروں نے موضوع میں تبدیلی کے ساتھ ہیئت میں تجربات کی بات بھی شروع کی تھی اور اس طرح گذشتہ تمام روایات سے رشتہ توڑ کر کچھ نئی اصناف کی بازیافت اور ایک بالکل ہی نئے علامتی لہجے کی تخلیق کا دعویٰ کیا تھا جو کہ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ سراسر غلط ثابت ہوا ہے۔ آج جدید شاعری کی بہترین سرمایہ غزل ہے اور غزل بھی وہ جس میں بحروں، قافیوں اور ردیفوں کو بڑی عاجزی کے ساتھ اُسی طرح اپنایا جاتا ہے جو پرانے اُردو شاعروں کا شیوہ تھا۔ اس طرح تنگنائے غزل میں جدید شاعروں کی روایت شکن فطرت بُری طرح گھر کر رہ گئی ہے اور اُن میں سے ہر کوئی ایک دوسرے کو دُہراتا ہوا نظر آنے لگا ہے۔ یہ وہی الزام ہے جو جدیدیت کے علمبرداروں کی طرف سے پرانے شاعروں اور بالخصوص ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں پر لگایا جا رہا تھا۔ جہاں تک علامتوں کا تعلق ہے چند ایک علامتوں کو سراسر غزلوں اور نظموں کا مجموعی لہجہ تخلیق کر لیا جاتا ہے اور یہ علامتیں اُبلی ہوئی کھچڑی کی طرح بد ذائقہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہر شاعر بار بار صرف ان چند علامتوں کو دہراتا ہے اور سبھی پہلوؤں سے ان کی معنویت اب اتنی واضح ہو کر رہ گئی ہے کہ جدید شاعری بھی گُل و بلبل کی حکایت جیسی نظر آنے لگی ہے۔ ان چند علامتوں میں پتھر، شہر، چہرا، آئینہ، تنہائی، صحرا، ریت، سمندر، خلاء، سورج اور دوسرے کئی الفاظ شامل کر لئے گئے ہیں۔
خود جدید شاعروں کو بھی اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ وہ خواہ مخواہ کا ابہام پیدا کرنے کے لئے بے ربط لفظوں کا استعمال بھی کرتے ہیں تا کہ شعر کے مفہوم کو ٹوٹے پھوٹے ہوئے لفظوں کی تہہ داریوں میں چھپا لیا جائے۔ بہت سے جدید شاعر تو ایسے ہیں جو مشاعروں میں خالص روایتی انداز کی غزلیں پڑھ کر عوام سے داد وصول کرتے ہیں اور منتظمین سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں جبکہ رسالوں میں چھپنے کے لئے ایسی غزلیں اور نظمیں بھیج دیتے ہیں جن میں کتنی پہیلیاں اور اوٹ پٹانگ بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ محض اس لئے کیا جاتا ہے کہ جدیدیت کی تحریک کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا جا سکے لیکن یہ دُہرا پن جدیدیت کی بے ثباتی اور اسکی کمزوری کی ایک واضح دلیل پیش کرتا ہے۔

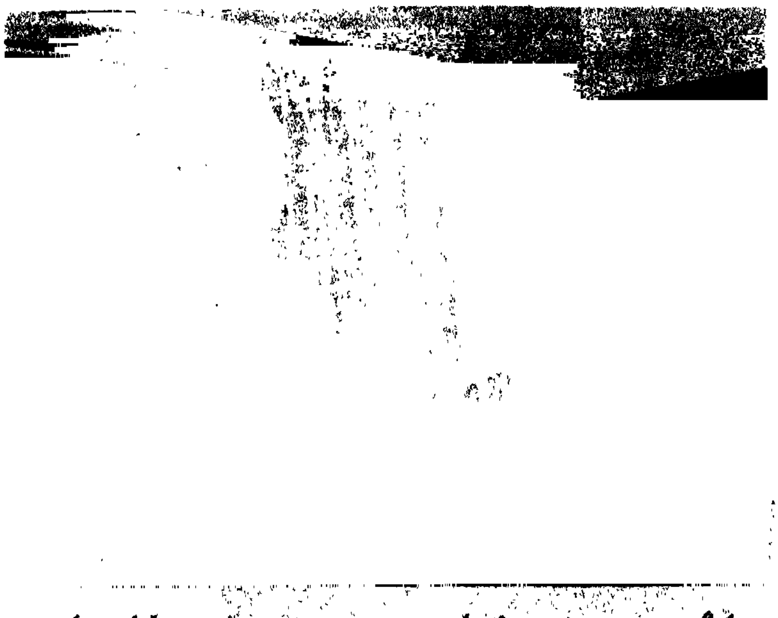


وزیر اعلیٰ جناب شیخ صاحب رام بن ہسپتال میں ایک مریض کی عیادت کرتے ہوئے

وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ ٹنگمرگ سب ڈسٹرکٹ ہسپتال کی عمارت کا افتتاح کرتے ہیں



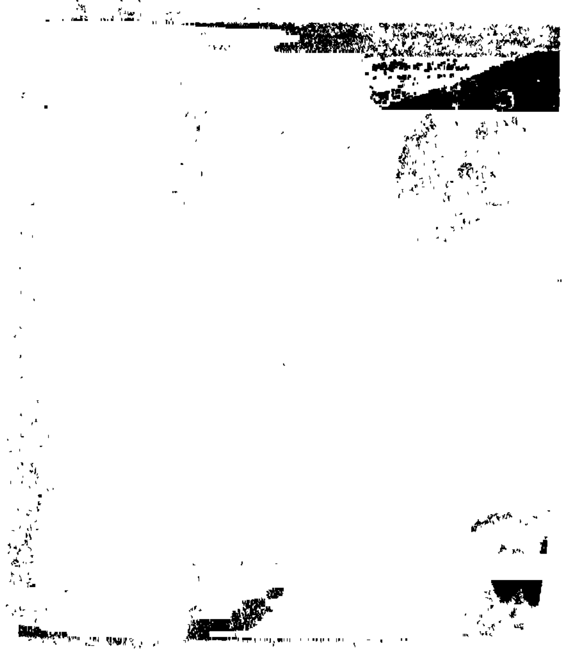
وزیراعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ الیکٹرانکس کمپلیکس کا افتتاح کر رہے ہیں۔



ریاست کے گورنر مسٹر ایل کے جھا اور اُن کی اہلیہ وزیراعلیٰ کے ۷۵ ویں جنم دن پر انہیں مبارکباد دے رہے ہیں



زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد وزیراعلیٰ کو اُنکے جنم دن پر مبارکباد دے رہے ہیں



مظہر امام ۔ دور درشن کیندر، سری نگر

غزل

وہ قریب آئے گا، ایسا نہ کبھی سوچا تھا
ہاں، بچھڑ جائے گا، کچھ کچھ یہ مجھے اندازہ تھا

رات ٹھہرے ہوئے دریا میں بہت ہلچل تھی
میری تنہائی کے ساحل پہ کوئی اترا تھا

اُس کو دیکھا تو کئی پھول اچانک سے چمکے
زخم بھولے ہوئے رشتوں کا ترو تازہ تھا

رنگ در رنگ دھنک تھی کہ جھلک آئی تھی
یاد کا شہر کہ آئینہ در آئینہ تھا

اب تو شرمندہ سا ہے دل اپنے کئے پر، لیکن
کیا وہ سچ مچ تری صورت کی طرح سادہ تھا

دُکھ تو ہوتا ہے، مگر دُکھ سے مفر کس کو ہے
کیا یہی تھی مری آواز، یہی چہرہ تھا

فاروق آفاق (کرن نگر سرینگر)

غزل

وہ اپنی لاش ٹھکانے لگانے نکلا تھا
ہوا کے دوش پہ زور آزمانے نکلا تھا

لبوں پہ مہرِ خموشی، نظر میں ابرِ رواں
وہ شخص پیاس کا صحرا بجھانے نکلا تھا

گو آشنا تھا زمانے کی سرد مہری سے
وہ پھر بھی تیرہ خموشی جگانے نکلا تھا

ہنسی مذاق سے سنجیدگی کی اور بڑھا
گئی رُتوں کی کہانی سنانے نکلا تھا

ذرا سی موج نے حلیہ بگاڑ کے رکھا
وہ ٹھہری جھیل پہ منظر اُگانے نکلا تھا

علقمہ شبلی
۸۹/۵ رپن اسٹریٹ کلکتہ-۷۰۰۰۱۶

عمر خیام

عمر خیام کی پیدائش کو ۹۰۰ سال سے زیادہ ہوگئے۔ آج عمر خیام کی شہرت اُن کی رُباعیوں کی وجہ سے ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے ایران کے باہر زیادہ متعارف ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عمر خیام بنیادی طور ایک مہندس، ریاضی داں، منجم اور فلسفی تھے اور ان کی زندگی ہی میں اس حیثیت سے ان کی شہرت ہوگئی تھی۔ یہ تو انگریزی مترجم فٹزجرلڈ کا کارنامہ ہے کہ آج عمر خیام کی شاعرانہ حیثیت ساری دُنیا میں تسلیم کی جاتی ہے۔

عمر خیام کا پُورا نام غیاث الدین ابوالفتح ابراہیم الخیام ہے۔ اُن کے والد محمد ابراہیم کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو خیمہ دوزی کیا کرتا تھا اور اسی کی تجارت ان کا ذریعہ معاش تھی۔ غالباً اسی وجہ سے ہمارے شاعر نے اپنا تخلص فارسی میں خیام اور عربی میں الخیام رکھا۔ خیام کی پیدائش نیشاپور میں ہوئی جو ایران کے شمالی حصے میں واقع ہے کچھ مؤرخوں کی تحقیق کے مطابق خیام کی جائے پیدائش شمشاد ہے جو بلخ میں واقع ہے۔ بعض دوسرے تاریخدانوں کا خیال ہے کہ خیام کی پیدائش استرآباد کے ایک گاؤں بسنک میں ہوئی تھی لیکن زیادہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ خیام نیشاپور میں پیدا ہوئے اور یہیں زندگی کا بیشتر حصہ گذرا۔ خیام کی تاریخ ولادت میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ ان کی زندگی کے متعدد واقعات اور مختلف تاریخی شواہد کی روشنی میں اس پر اکثر مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ خیام کی پیدائش ۱۸ مئی ۱۰۴۸ء (۴۴۱ھ) کو ہوئی تھی۔

خیام کی تعلیم نیشاپور اور بلخ میں ہوئی۔ دینی علوم کے ساتھ ساتھ انہوں نے خصوصی طور سے جبر و مقابلہ،

نجوم اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی اور ان علوم میں بڑی جلد ہی مہارت حاصل کرلی۔ خوش قسمتی سے انہیں اس زمانے کے ماہرین فن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کا موقعہ ملا۔ ابوالحسن انباری اُس زمانے کے مشہور فلسفی اور ریاضی داں تھے۔ خیام نے علم ہندسہ اور علم نجوم کی تعلیم ان سے حاصل کی۔ شیخ الرئیس ابوعلی سینا کو خیام نے خود اپنا اُستاد لکھا ہے اور نہایت ہی احترام کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خیام نے شیخ الرئیس سے تعلیم حاصل نہیں کی کیونکہ شیخ الرئیس کی وفات کے وقت خیام کی عمر کم ہوگی لیکن خیام جیسے ذہین شاگرد کے لئے یہ ناممکن نہ تھا کہ کم سنی ہی میں شیخ الرئیس سے درس لیا ہو۔ خیام کے ایک اُستاد امام موفق نیشاپوری بھی تھے۔ ان کو مروجہ علوم پر بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان اساتذہ کی تعلیم و تربیت نے کم سنی ہی میں خیام میں وہ ملکہ پیدا کردیا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد خیام سمرقند چلے گئے جہاں انہوں نے مشہور رسالہ "جبر و مقابلہ" لکھا۔ یہ رسالہ عربی میں ہے اور اسے جبر و مقابلہ اور علم ہندسہ کی بنیادی کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اسی دوران سلجوقی سلطان ملک شاہ نے خیام کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی اور دوسرے بڑے بڑے منجموں کے ساتھ انہیں بھی اصفہان میں ایک رسدگاہ کی تعمیر پر مامور کیا۔ سلطان موجودہ تقویم میں انقلابی اصلاح اور ترمیم کرنا چاہتا تھا۔ اس اہم کام کے لئے بھی عمر خیام کو مقرر کیا گیا جس کو انہوں نے نہایت ہی کامیابی سے مکمل کیا اور ایک نئی تقویم کی بنیاد پر متعدد زائچے تیار کئے اور اس طرح تاریخ ملک شاہ یا سلجوقی سال کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ یہ تقویم گریگری تقویم سے بھی زیادہ صحیح اور مستند ہے جو اس کے پانچسو برس بعد تیار کی گئی۔

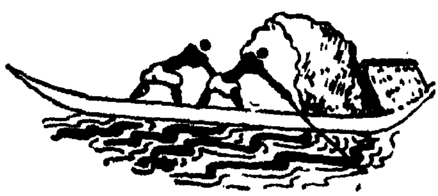
سلطان ملک شاہ کی وفات کے بعد خیام نے دور دراز شہروں کی سیاحت شروع کی اور طوس، بلخ، بخارا اور مرو ہوتے ہوئے بغداد بھی گئے۔ ایک روایت کے مطابق اسی دوران زیارت خانہ کعبہ سے بھی مشرف ہوئے۔ سیاحت کے بعد نیشاپور واپس ہوئے تو ان کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ جبر و مقابلہ، اقلیدس، نجوم، حکمت کے کارناموں کی وجہ سے انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور متعدد حکمرانوں اور شاہزادوں کی سرپرستی بھی انہیں حاصل تھی۔ اُس زمانے کے جید علما جیسے غزالی،

نظام الملک طوسی اور حسن بن صباح سے خیام کے ذاتی تعلقات تھے اور انہیں عزت و احترام کے ساتھ صدر میں بٹھایا جاتا تھا۔ لیکن خیام کی شہرت کی بنیاد بڑی حد تک ان کی رباعیاں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خیام نے حکمت، نجوم اور فلسفے کے باریک مسائل کی تحریک سے تھک کر پریشان ہو جانے کے بعد اپنے ذہنی بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے رُباعیاں کہی ہیں۔ ان رُباعیوں کی تعداد میں بڑا اختلاف ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ معاصر تذکرہ نگار جنہوں نے خیام کا ذکر کیا ہے ان کی شاعری کے بارے میں بالکل خاموش ہیں یا محض سرسری ذکر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں اور کوئی رُباعی نقل نہیں کی ہے۔ ان کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد تاریخی اور مذہبی کتابوں میں کچھ رُباعیوں کا ذکر آتا ہے جن کی تعداد دسویں صدی کے نصف تک ساٹھ بتائی جاتی ہے اور اس کے بعد مختلف مجموعوں میں خیام کی رُباعیوں کی تعداد پانچسو سے ایک ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان رباعیوں کا ایک بڑا حصہ دوسرے مشہور رُباعی کہنے والے شاعروں کی رباعیوں پر مشتمل ہے۔ جن کا پتہ لگانا آسان نہیں ہے پھر بھی اس کی کوشش کی گئی ہے اور کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے۔ خاص طور سے خیام کی رُباعیوں کا انداز بیان اور ان کی لطافت و شگفتگی دوسرے شاعروں کی رُباعیوں سے انہیں ممتاز کرتی ہے۔ خیام کی رباعیاں الفاظ کے لحاظ سے سادہ لیکن معنی کے لحاظ سے تہہ دار اور بلند پایہ ہیں۔ عام طور سے خیام کی رباعیوں کو شراب اور شباب کا ترجمان سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ خیام ذات و کائنات کے غم کو اپنی رُباعیوں میں پیش کرتے ہیں۔ زندگی کی ناپائیداری اور اسمیں انسان کی بے خبری شاعر کو پریشان رکھتی ہے۔ یہ سوچکر ان کا دل خون ہو جاتا ہے کہ زندگی کا درخت کیوں سرسبز و شاداب نہیں اور موت کی مسموم ہوا اسے کیوں خشک کر دیتی ہے۔ ظاہر داری، فریبکاری اور دو رنگی انہیں مضطرب رکھتی ہے اور انہیں مشاہدات و تجربات کا عکس ہمیں ان کی رُباعیوں میں ملتا ہے۔

خیام کی رُباعیوں کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام مشہور زبانوں میں ہو چکا ہے۔ آج ان رُباعیوں کا ترجمہ عربی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، روسی، بنگالی، پنجابی، ہندی، کشمیری اور اردو وغیرہ تمام زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے مشہور شاعر اور ادیب فٹنز جرلڈ نے خیام کو انگریزی دنیا سے متعارف کرایا اور شاعر کی حیثیت سے آج خیام کو جو شہرت ہے اسمیں اس انگریزی شاعر

کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ ایران کو بھی اپنے اس جوہرِ کامل کی بازیافت اس کے بعد ہی ہوئی اور پھر خیام اور اس کی شاعری پر تحقیق و تنقید کا سلسلہ شروع ہوا۔ اردو میں بھی رباعیاتِ خیام کے متعدد ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

خیام کے ہمعصر نظامی عروضی سمرقندی مؤلف "چہار مقالہ" کی روایت کے مطابق خیام کی وفات ۵۳۰ھ سے کچھ برس پہلے ہو گئی تھی۔ چونکہ وفات کے وقت ان کی عمر تریاسی ۸۳ برس کی تھی۔ اس لئے بیشتر مؤرخین کے مطابق ان کی تاریخِ وفات ۴ دسمبر ۱۱۳۱ء (۵۲۴ھ) ہے۔ خیام کی قبر نیشاپور کے گورستان حیرہ میں واقع ہے ؛



تعمیر

محمد یٰسین قادری
ضلع انفارمیشن آفیسر اننت ناگ کشمیر

ضلع پُلوامہ — تعمیر و ترقی کے نئے اُفق

ضلع کا پس منظر

آج سے صرف ایک برس قبل ریاستی حکومت نے پُلوامہ کو ضلع صدر مقام بنانے کا اعلان کیا اور اس ضلع کے عوام کی دیرینہ آرزوؤں اور اُمنگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے شوپیاں، ترال اور پلوامہ کی تحصیلات پر مبنی نئے ضلع کی حد بندی عمل میں لائی۔ ضلع اننت ناگ جو سات تحصیلات میں منقسم تھا، کو دو اضلاع میں تقسیم کرنے کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے۔ اس ضمن میں ریاست کے وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ نے یکم جولائی ۱۹۷۹ء کو پلوامہ میں منعقدہ ایک خصوصی تقریب کے موقع پر واضح الفاظ میں کہا کہ "ہم ریاست کے دُور دراز علاقوں اور خطوں کو تعمیر و ترقی کے عمل سے یکساں طور مستفید کرنے کے خواہاں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ماضی میں ریاست کے بعض گوشے ترقی کی عمل سے مُستفید نہیں ہو سکے تھے۔ انہیں یا تو قطعی طور نظر انداز کیا گیا تھا یا ان کی ترقی میں سابق حکومتوں کو کوئی دلچسپی نہیں تھی"۔ اس لئے وزیر اعلیٰ نے اس علاقہ کی مرکزیت اور اقتصادی ترقی کے بعض شعبوں کی پسماندگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس تاریخی اور دُور رس اہمیت کے فیصلے کا اعلان کیا۔ حق تو یہ ہے کہ ریاست کے سبھی خطوں میں متوازن ترقی یقینی بنانے کا فخر موجودہ حکومت ہی کو حاصل ہے جس نے تجرباتی طور سِنگل لائن ایڈمنسٹریشن کی ترویج اور اعلیٰ سطح پر اختیارات کی مرکزیت کو توڑنے کی پہل کی اور اس طرح منصوبہ بندی کے عمل کو نچلی سطح سے شروع کیا گیا۔

محلِ وقوع

پلوامہ سرینگر سے لگ بھگ ۳۰ کلومیٹر کی دُوری پر واقع ہے جو تین تحصیلات ترال، پلوامہ اور شوپیاں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس نئے ضلع کی کُل آبادی ۳ لاکھ ۱۳ ہزار ہے جبکہ یہاں کُل ۵۸۵ دیہات ہیں۔ ضلع کو اجتماعی ترقی کے چھ بلاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے صدر دفاتر پلوامہ، ترال، کلر، پانپور، شوپیاں اور کاکہ پورہ

تعمیر

میں قائم ہیں۔ اسی طرح یہ ضلع پلوامہ، ترال، وچی، شوپیان اور پانپور کے پانچ اسمبلی حلقوں پر مشتمل ہے۔

ترقیاتی سرگرمیاں

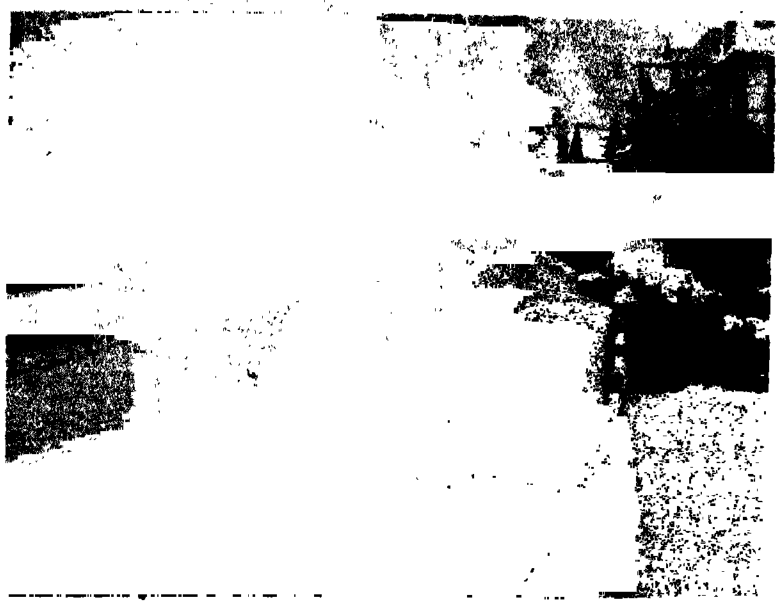
گذشتہ برس یہاں ضلع معرضِ وجود میں آنے کے فوراً بعد اننت ناگ اور پلوامہ پر مشتمل پرانے ضلع کی نئے سرے سے حدبندی عمل میں لائی گئی۔ اور ضلع اننت ناگ کے سالانہ منصوبہ کے لئے ۸ کروڑ ۶۲ لاکھ ۴۲ ہزار روپے کے منصوبہ کو دو برابر حصّوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ رقوم اس ضلع میں اقتصادی ترقی کے مختلف شعبوں کے لئے مختص کی گئی۔ چنانچہ ضلع پلوامہ کے لئے ایک علیحدہ ضلع ترقیاتی بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے ترجیحات مقرر کرنے کے بعد مختلف سیکٹروں کے لئے رقوم کی الاٹمنٹ کی۔ اس طرح ضلع پلوامہ کے ۸۰-۱۹۷۹ء کے سالانہ منصوبہ کے لئے ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ۴۳ ہزار روپے کی رقم منظور کی گئی۔ اس رقم میں سے مارچ سنہ ۱۹۸۰ء کے آخر تک ۳ کروڑ ۲۳ لاکھ ۲۱ ہزار روپے خرچ ہوئے اور ترجیحات کے مطابق آبپاشی کی چھوٹی و درمیانہ درجے اور بڑی اسکیموں کے لئے ایک کروڑ ۳۵ لاکھ ۵۷ ہزار روپے پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے ۶۹ لاکھ ۵۹ ہزار روپے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کے لئے ۳۱ لاکھ ۲۸ ہزار روپے، زراعت اور باغبانی کے لئے ۶ لاکھ ۲۹ ہزار روپے مخصوص رکھے گئے اور ان شعبوں پر بالترتیب ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپے، ۶۵ لاکھ ۲۹ ہزار روپے، ۳۷ لاکھ ۴ ہزار روپے ۴ لاکھ ۲۷ ہزار روپے خرچ کئے گئے۔

رواں سال کے ضلع منصوبہ کے تحت ضلع میں مختلف ترقیاتی شعبوں کی عمل آوری کے لئے ۳ کروڑ ۸۸ لاکھ روپے مخصوص رکھے گئے ہیں۔ اور ترجیحات کے مطابق سب سے زیادہ رقوم یعنی آبپاشی کی سکیموں کے لئے ۷۹ لاکھ روپے پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے ۹۸ لاکھ ۴۳ ہزار روپے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کے لئے ایک کروڑ ۱۸ لاکھ ۴۸ ہزار روپے اور زراعت اور باغبانی کی ترقی کے لئے ۹ لاکھ ۵۳ ہزار روپے فراہم کئے گئے ہیں۔ نیز ضلع میں جن شعبوں کی ترقی کے لئے روشن امکانات موجود ہیں ان میں باغبانی، زراعت، افزائش حیوانات، صنعتِ ابریشم اور چھوٹے پیمانے کی دستکاریاں شامل ہیں۔ چنانچہ اس نئے ضلع کو پہلے ہی بعض اہم کارخانوں کو اپنے آغوش میں جگہ دینے کا فخر حاصل ہے۔ جن میں وویَن کا سیمنٹ کارخانہ، سیمن پائپ فیکٹری، پانپور کی جوائنری مل، اینٹیں بنانے کا کارخانہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس ضلع میں چھوٹے کسانوں کی ترقیاتی اسکیم تحت سب سے زیادہ ڈائری یونٹ یعنی ۲۶۷ یونٹ قائم کئے گئے ہیں جس کے لئے کسانوں کو

۷ لاکھ ۲۶ ہزار روپے کی رقم بطور سبسڈی فراہم کی گئی اور اب یہاں سے دودھ سرینگر اور دیگر قصبہ جات کو فراہم ہوتا ہے۔

زعفران زار — ضلع کی سرزمین کو ایک اور فخر حاصل ہے کہ یہاں کی مٹی سونا اگاتی ہے۔ جہاں اس ضلع کی اراضی سے زیادہ پیداوار حاصل ہوتی ہے وہاں ساری ریاست میں سب سے زیادہ زعفران پانپور کے قطعہ اراضی سے ہی حاصل ہوتا ہے جو اس علاقہ کی اقتصادی خوشحالی اور معاشی ترقی کا ضامن ہے۔

ادبی ورثہ — ادب اور ثقافت کے لحاظ سے بھی ضلع پلوامہ دیگر اضلاع خاص طور پر اننت ناگ سے کسی بھی صورت میں پیچھے نہیں۔ یہاں بھی حبہ خاتون جیسی مشہور معروف شاعرہ، مہجور اور سوچھ کرال جیسے عوامی اور وطن پرست شاعر اور وہاب کھار جیسے عارف باللہ فی البدیہہ سخنور پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے نہ صرف اس علاقہ کی ادبی تاریخ بلکہ وادی کشمیر کی ادبی و ثقافتی تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی ترال، پانپور، شوپیاں اور پلوامہ ادبی سرگرمیوں میں بہت آگے ہیں اور تعلیمی، طبی اور دیگر ہمہ قسم کی سہولیات سے بہرہ ور ہیں۔ الغرض پلوامہ کو ضلع صدر مقام کا درجہ دینے کی بدولت اس علاقہ میں تعمیر و ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پلوامہ کا ضلع صدر مقام اب قدامت پسندی اور پسماندگی کا وہ لبادہ اتار پھینک رہا ہے جس کی بدولت وہ ماضی میں تحصیل صدر مقام سے کمتر محسوس ہوتا تھا۔ ترقی کی رفتار اسی طرح تیز رہی تو وہ دن دور نہیں جب اس ضلع کا ہر گاؤں اور ہر قریہ جدید سہولیات سے مستفید ہوگا۔



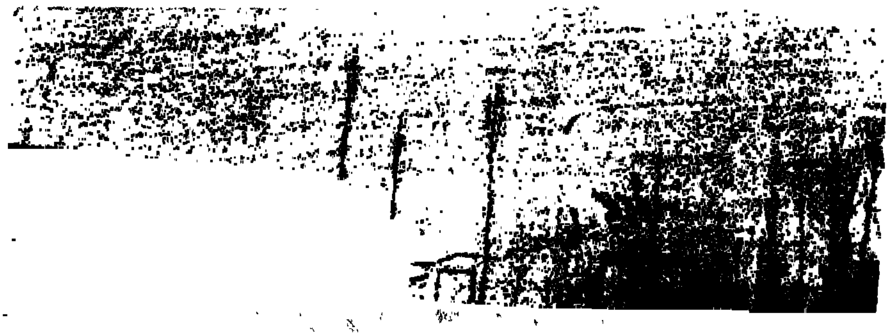
وادی میں اس سرما کی پہلی برف باری کا ایک منظر



وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ آثار شریف حضرت بل میں عوامی اجتماع سے خطاب کر رہے ہیں



وزیر تعمیرات و بجلی مسٹر جی۔ایم۔ شاہ نشاط واٹر سپلائی سکیم کا افتتاح کرتے ہوئے



نشاط واٹر سپلائی سکیم



وزیر تعمیرات مسٹر جی۔ ایم۔ شاہ زنگل واٹر سپلائی کی پائپ لائنیں بچھانے کے کام کا جائزہ لے رہے ہیں



وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ رام بن ہسپتال کے آپریشن اور آؤٹ ڈور بلاک کا افتتاح کر رہے ہیں

غلام نبی ناظر
یاری پورہ، کولگام کشمیر

غزل

میں نے دامن ترے اقرار کا دھویا ہوتا
آج کی رات یہ احساس نہ تنہا ہوتا

میرے آہنگِ تفکر نے سماں باندھا ہے
اسی انداز سے اُس وقت کبھی سوچا ہوتا

کئی صبحیں ہوگئیں دیکھتے ہی دیکھتے قتل
ڈوبتے وقت کبھی سورج کو نہ دیکھا ہوتا

آرزو اب کے بھی ہے شیشے سے پتھر کاٹیں
دلِ ناداں تجھے اپنوں سے نہ ملنا ہوتا

شاخ تک ہاتھ میرا پہنچنے والا ہی تھا
کاش اُس نے کسی آواز کو کاٹا ہوتا

ہم اُلٹ دیتے ہوا بن کے نہ پت پتا
اپنے ہونے کا پتا یوں نہ بتایا ہوتا

دِن کو ہم رات کے پردے پہ نہ لکھا کرتے
روشنی کا نہ اندھیرے پہ بسیرا ہوتا

اِک قرینے سے دِیئے جلتے چراغاں ہوتا
ہر قدم سوچ کے کانٹوں کو بکھیرا ہوتا

ٹھیک ہے ہر لمحہ سورج کا تعاقب کرنا
ہم سرِ کوہ نہ ہوتے کوئی سایا ہوتا

کالے ماحول میں کیوں کر نہ اُبھرتا سورج
حائل ان میری نگاہوں کو کبھی پردا ہوتا

سطحِ آب اور ستاروں کا اُترنا ناظرؔ
اِس نظارے کو نہ کاغذ پہ اُتارا ہوتا !

برہنہ پڑی ہے۔ کچھ بھی تو ڈھکا ہوا نہیں، ہاتھ باہیں، کٹی ہوئی گردن سے نیچے دو اُبھری ہنسلیاں اور پھر سینہ، پیٹ، ناف اور پھر—— میری پلکیں سمٹ گئیں، چہرہ شرم سے انگارہ ہوگیا۔ کان کی لوئیں جلنے لگیں، گھبرا کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی میرے عریاں جسم کو دیکھ تو نہیں رہا۔ شاہراہ پر چلتے ہجوم میں سے کسی کو ایک غلط نگاہِ انداز بھی اُس پر ڈالنے کی فرصت نہ تھی۔ لوگ بسوں، کاروں، ٹرکوں، رکشوں پر سوار تیزی سے نہ جانے کس منزل کی تلاش میں بھاگ رہے تھے، میں بالکل اکیلی اپنے ننگے اور خستہ حال وجود کو لاچاری کی حالت میں دیکھ رہی تھی، کوئی ایسا نہیں جو اس پر ایک پھٹا پرانا کپڑا ہی ڈال دے، میری آنکھوں کے سامنے ٹیک وڈ کا بنا ہوا چمک دار، والڈ روب آگیا جس میں جدید ڈیزائن کے درجنوں قیمتی سوٹ قرینے سے رکھے تھے، میری پلکیں بھیگ گئیں، اللہ کس کو آواز دوں؟—— میں بھاگی کہ کسی کو آواز ہی دے سکوں، لیکن جو کوئی مجھ کو دیکھتا وہ بلا توقف مجھ سے دور بھاگ رہا تھا۔ سڑک پر ایک عجیب افراتفری مچ گئی۔ میری آواز میرے گلے میں گھٹ کر رہ گئی، سارا چہرہ پسینے کے قطروں سے اَٹ گیا۔ کہیں بھی کوئی اپنا نظر نہیں آیا۔ جیسے میں اپنا حالِ زار سنا سکوں۔ سوچا گھر جاؤں، جہاں میں نے زندگی کی پچیس بہاریں دیکھی ہیں۔ جہاں سب میرے اپنے ہیں۔ جہاں میری ماں ہے، جس نے مجھے اپنی کوکھ سے جنا ہے، جو پچیس برسوں سے مجھے خونِ جگر سے پال رہی ہے۔ جہاں میری ہمدرد بہنیں ہیں۔

میں ہوا کی لہروں کے ساتھ بہتی ہوئی گھر پہنچی۔ خاموشی سے دہلیز پار کر کے دروازے تک آگئی، کچن سے میری چھوٹی بہن ناز نکلتی دکھائی دی۔ میں خوشی سے آگے بڑھی۔ لیکن وہ دیکھتے ہی زور سے چیخ مار کر بھاگی، اُس کے پیچھے میں بھی کمرے تک پہنچی وہاں سب موجود تھے، سب اپنوں کو دیکھ کر خوشی سے میری آنکھوں میں آئی نمی اور بڑھ گئی۔ میں آگے بڑھی تاکہ ان کو اپنا حال سناؤں، سب کی نگاہیں میرے چہرے پر پڑیں اور دوسرے ہی لمحے سب خوف زدہ ہو کر چھپنے لگے۔ میں نے آواز دے دے کر سبوں کو پکارا، لیکن کوئی میری طرف دیکھنے کے لئے بھی روادار نہ تھا۔ انتہائی مایوسی کے ساتھ باہر آئی، ابھی دل نا اُمید نہ تھا۔ ایک آخری اُمید باقی تھی، میری ماں؟ کیا ماں بھی مجھے نہ پہچانے گی، وہ ماں جس کی میں تخلیق ہوں، جس کا خون میری رگوں میں محوِ گردش ہے، میں اُس کے پاس پہنچی، وہ مجھے آبدار آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ میں نے اپنے چہرے کے پورے زور سے آواز نکالی، ماں، ماں میں ہوں تمہاری بیٹی، ماں مجھے پہچانو!

ماں عجیب تذبذب اور حیرانی کے عالم میں مجھے دیکھتی رہی، کافی غور و فکر کے بعد کہنے لگی۔ تم جاؤ میری بیٹی، خدا تمہیں ابدی سکون دے، میں آج ہی درودِ نجات پڑھواؤں گی، اور ـــــ اور تمہارے نام پر ختم شریف کرواؤں گی، اور پھر گھر کے دوسرے حیران اور سہمے ہوئے افراد سے مخاطب ہوئی جمعرات کو روحیں ضرور ہی آتی ہیں، اُف میرے خدا، یہ میں کیا سن رہی ہوں، اب میں کہاں جاؤں؟ اب کیسے اپنی بپتا سناؤں۔ میرا زندہ لیکن بے کس اور لاچار چہرہ اپنی بے بسی پر رونے لگا۔ اپنے چہرے سے میں اپنی زندگی کا احساس کسی کو بھی نہیں دلا سکتی، جسم مردہ پڑا ہے، جس پر یہ چہرہ چپکایا بھی نہیں جا سکتا، پھر ایک بار اپنے بریدہ جسم کا خیال ذہن میں آیا۔ وہاں پہنچی تو دیکھا، ایک ٹرک میرے جسم کو روند کر چلا گیا ہے۔ جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ جسم کے کچھ حصے سیاہ ہو چکے تھے، اور کمر سے بہتا ہوا خون کمر سے نچلے حصے کو لال لبادہ پہنا چکا تھا۔ اور چند قریب قسم کے کتے میری لاش کے پاس منڈلا رہے تھے،

ایک کتے نے آگے بڑھ کر میری شکستہ پسلیوں کو سونگھا اور پھر ناف سے دبوچ کر تیز دانتوں سے اپنی طرف کھینچا، میں لرز کر رہ گئی۔ بے اختیار میرے سوکھے ہونٹوں سے سی کی آواز نکلی، کتے ذرا دیر کے لئے سہم گئے۔ اتنے میں اوپر سے اڑتی ایک چیل نے اس حصے پر چونچ ماری تو ایک گڑھا بن گیا۔ اور اندر سے انتڑیاں جھانکنے لگیں، دوسرے لمحے کتوں نے دوبارہ وار کیا، تو انتڑیوں کے سارے گچھے اور معدے کی تھیلی اچھل کر باہر آگئی۔ اُف! میرے چہرے پر سیمابی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میں نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں۔ اب اور دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ لیکن میں چپ نہ رہ سکی، میں نے زور سے چلانا شروع کر دیا۔ ہر جانب ایک وحشت ناک عالم طاری تھا۔ میری آنکھوں کے گہرے سیاہ بادل زور زور سے گرجنے لگے، بجلیاں چمکنے لگیں، اولے گرنے لگے، اور تیز آندھی سے درخت اوندھے منہ گرنے لگے،

میں تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ سڑک پار کر کے ایک سنسان پارک میں آگئی، اور اپنے لئے کوئی جائے پناہ ڈھونڈنے لگی، ایک کونے پر نظر رکی۔ تو وہاں ایک معمر آدمی سفید لباس میں ملبوس اپنے نورانی چہرے کے ساتھ بینچ پر بیٹھا، اپنی سوچوں میں گم نظر آیا۔ مجھے اس کے چہرے پر نیکی اور شرافت کے آثار دکھائی دیئے، میں چپکے سے اس کے سامنے چلی گئی، ڈرے اور سہمے ہوئے لہجے میں اپنی بپتا سنانے لگی، میں ایک بیاہی مصیبت زدہ لڑکی ہوں، میرا جسم سڑا، غلاظت پر مردہ پڑا ہے، چیلیں اور کتے اسے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، یہ میرا جسم فنا ہو چکا ہے۔ میں اپنا خالی چہرہ لئے کیسے جیوں؟ کیا لوگ اس خالی چہرے کو جینے دیں گے
[illegible]

وہ میری باتیں سن کر زور سے ہنس پڑا، تم کن لوگوں کی باتیں کر رہی ہو۔ وہ تم سے زیادہ مصیبت کے شکار ہیں، اُن کے تو چہرے ہی نہیں، وہ صرف اپنے دھڑوں کا بوجھ لئے موت کا انتظار کر رہے ہیں، وہ پھر زور سے ہنسنے لگا۔ شدت کرب سے میرا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ دھندلی آنکھوں سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ تو واقعی میرے گرد جسم، چہروں کے بغیر چلتے نظر آتے، چہروں کے بغیر، بے حس جسم، پتھریلے، منجمد جسم،

شاخوں سے زرد پتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے معمولی سے جھٹکے سے بالوں پر بکھرے پتوں کو گرا دیا۔

ہوا بہہ رہی تھی، میں بھی ہوا کے ساتھ بہنے لگی نامعلوم اجنبی دریاؤں کی طرف!



تعمیرِ نو

ٹرانسپورٹ کی بہتر سہولیات

ریاست جموں کشمیر میں روڈ ٹرانسپورٹ کی اہمیت اور افادیت ریلوے کی عدم موجودگی کے پیش نظر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ریاست میں صرف جموں شہر میں ۲۱ء۸ کلومیٹر تک ریلوے کی سہولیات دستیاب ہیں۔ چنانچہ اس بات کے پیش نظر ریاست کی اقتصادی پیش رفت میں روڈ ٹرانسپورٹ کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس احساس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ریاست کی موجودہ سرکار نے روڈ ٹرانسپورٹ کو عوام کی بنیادی سروس خیال کرتے ہوئے اس کو اہمیت دی ہے۔

ٹرانسپورٹ پالیسی کا بنیادی مقصد عوام کو مناسب شرح کرایہ پر ٹرانسپورٹ سہولیات فراہم کرنا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے سابقہ سرکار نے سال ۱۹۶۹ء میں پبلک اور سٹیٹ کیریج کے لئے ایک جامع ٹرانسپورٹ پالیسی وضع کر دی۔ اس پالیسی کے تحت مرحلہ وار طریقے سے تمام سروسوں کو قومی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ بعض اہم شاہراہوں جیسے جموں سری نگر، جموں پٹھانکوٹ، سری نگر لیہہ کے علاوہ وادی کشمیر اور جموں شہر کے مضافات اور بعض علاقوں کو ۱۹۷۱ء میں قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس کے بعد مزید روٹوں [illegible] اور [illegible]

پٹھانکوٹ کٹڑہ، کو بھی قومی تحویل میں لے لیا گیا۔

دوسرے مرحلے میں مزید روٹوں کو موجودہ روٹوں پر چلنے والی بس سروس کو مستحکم بنانے کے بعد ہی قومی تحویل میں لیا جائے گا تاہم اس بات کے پیش نظر کہ پرائیویٹ ٹرانسپورٹر اس اقدام سے متاثر نہ ہوں انہیں متبادل روٹ فراہم کئے گئے۔

قومی تحویل میں لئے جانے کے پروگرام کو آگے بڑھانے کی غرض سے یکم ستمبر ۱۹۷۶ء میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ انڈرٹیکنگ کو اور روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن میں تبدیل کر دیا گیا۔ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے قیام کے وقت کارپوریشن کے پاس ۵۴۳ بسیں اور ۱۲۷ ٹرک فلیٹ تھا۔ اس فلیٹ میں شامل اکثر بسیں اور ٹرک خستہ حالت میں تھے چنانچہ عوام کو پُر اعتماد اور مستعد سروس فراہم کرنے کی غرض سے کارپوریشن نے سب سے پہلے جو اہم کام اپنے ہاتھ میں لیا وہ اپنے فلیٹ کو از سر نو منظم کرنے کا تھا۔ مارچ ۱۹۷۶ء کے اختتام تک کارپوریشن کے پاس ۷۶۵ بسیں اور ۱۱۹ ٹرک تھے۔ قومی شاہراہ اور سائٹ سینگ مقاصد کے لئے سپر ڈیلکس اور ایئر کنڈیشنڈ بسوں کو چالو کیا گیا۔ کارپوریشن کے پاس اس وقت ۶۵ نیشنل اور ۱۰۰ ازنارتھ زون پرمٹ کے تحت مال بردار گاڑیوں کا ایک فلیٹ موجود ہے جس کے ذریعے ریاست سے مال برداری اور میوہ جات کو باہر بھیجنے کے کام میں کافی مدد مل رہی ہے۔

روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن بڑی خوبی سے خسارے سے نکل کر منافع کی راہ پر گامزن ہوئی۔ اور گذشتہ سال کارپوریشن نے جو اہم فیصلہ کیا اس کے تحت کارپوریشن نے اپنے عملے اور مسافروں کو حادثات پیش آنے کی صورت میں بیمہ سکیم رائج کر دی۔ اس اقدام سے ریاست جموں و کشمیر ملک کی دوسری اہم ریاست بن گئی جس نے اتر پردیش کے بعد مسافروں اور عملے کو بیمہ کے دائرے میں لا کر اس قسم کا اقدام اٹھایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کارپوریشن ریاست کے مشکل اور دشوار گذار راستوں کے پیش نظر مسافروں اور عملے کے تحفظ کے کام میں کس قدر دلچسپی رکھتی ہے

بغیر کسی زائد یا اخراجات کے بیمہ کے فلیٹ [illegible] ۲.۴ روپے سے لیکر ۱۲۰۰۰ روپے تک ہو سکتے ہیں تاہم اس بات کا انحصار زخمیوں کے اخراجات یا زخمیوں کی نوعیت کے کہ ہلاکت یا مکمل طور معذور ہونے پر ہے

روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن نے جموں اور سری نگر میں باڈی تیار کرنے والے ورکشاپوں کا قیام بھی عمل میں لایا ہے اب تک ان ورکشاپوں میں ۲۶ بسوں اور ۳۹ ٹرکوں کی باڈیاں بنائی گئیں مقامی طور دستیاب تجربے کار تعمیر

پہاڑی علاقوں میں سات دو منزلہ بسوں کی باڑیاں بھی بنائی گئیں۔ ان دو منزلہ بسوں کو مختلف روٹوں پر متعارف کرانے سے بسوں میں مسافروں کے بھاری رش اور ٹریفک ضروریات پوری کرنے میں کافی مدد ملی ہے۔

سیاحوں کو معقول ٹرانسپورٹ سہولیات فراہم کرنے کی غرض سے ریاستی سرکار نے آل انڈیا ٹورسٹ سکیم میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا جس سے حال ہی میں مرکزی حکومت نے رائج کر دیا ہے۔ اس سکیم کے تحت حکومت کو ۵۰ منی بسوں اور ۱۰۰ ٹیکسیوں کیلئے ٹورسٹ پرمٹ الاٹ کئے گئے۔ اس سکیم کی بدولت ملک کے تمام حصوں سے سیاحوں کی آمد میں کافی سہولت میسر ہوگی اور اس سے ہماری روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی بسوں جن کے ڈیزائن بنیادی طور پر سائیٹ سینگ مقاصد کے تحت بنائے جاتے ہیں، ریاست سے باہر چلنے کا موقعہ فراہم ہوگا۔

حکومت نے پبلک کیریر پرمٹوں کے اجراء سے متعلق اپنی ٹرانسپورٹ پالیسی میں کافی حد تک اصلاحات عمل میں لائی، جن کے پیش نظر اس شعبے میں پیدا ہوئی اجارہ داری کا خاتمہ ہوگیا۔ چنانچہ حکومت نے سٹیج کیریر اور پبلک کیریر پرمٹوں کے اجراء سے متعلق پالیسی میں ترمیم کردی جن کے تحت اب کوئی بھی خواہش مند شخص پانچ ہزار روپے کی فیس کی ادائیگی پر یہ پرمٹ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے حکومت نے جو تجربہ حاصل کیا، اس کے تحت حکومت نے حال ہی میں پبلک کیریر پرمٹوں کی کسی اور نام منتقلی کے طریقہ کار کو آسان بنا دیا اور اب یہ ۵۰۰ روپے فیس کی ادائیگی پر یہ پرمٹ کسی اور نام منتقل ہو سکتے ہیں۔ پبلک کیریر پرمٹوں کے لئے کوئی مخصوص روٹ پر متعین نہیں ہے وہ ریاست کے کسی بھی روٹ پر چل سکتے ہیں۔

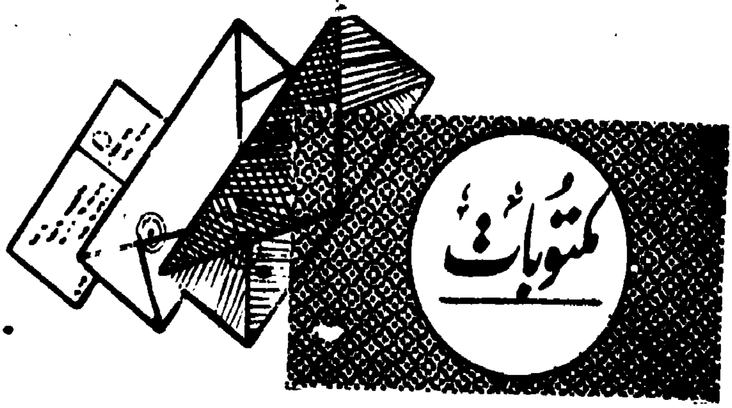
اگرچہ ٹرکوں کی نقل و حمل کیلئے اندرون اور بیرون ریاست میں کافی علاقہ دستیاب ہے، تاہم اس کی مزید ترقی کے امکانات دوسرے باقاعدہ سروسز نیشنل پرمٹوں، نان سٹینڈرڈ پرمٹوں اور عارضی بنیاد پر دیئے جا رہے پرمٹوں کے مقابلے میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تخمینہ کے مطابق اس بات کو محسوس کیا گیا ہے کہ ریاست میں روزانہ چار سو ٹرکوں کے لئے سٹیٹ پبلک کیریر پرمٹوں کی گنجائش ہے لیکن محدود تعداد میں پرمٹوں کے اجراء کے پیش نظر انہیں مختلف سکیموں کے تحت چلنے کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ ریاستی سرکار نے پنجاب، ہریانہ اور دہلی سرکاروں کے مشورے کے بعد [illegible] میں ایک فری زون FREE ZONE کا قیام عمل میں لایا جس کے نتیجہ میں ان تمام ریاستوں میں پبلک کیریرز کی نقل و حمل بغیر کسی خلل کے ممکن بن گئی۔ بلکہ اس کے لئے مقررہ کچھ فیس کی ادائیگی لازمی ہے۔ ریاستی سرکار

کوٹیشنل پرمٹ اسکیم کے تحت ۳۰ سو پرمٹ اور نارتھ زون اسکیم کے تحت دو سو پرمٹ الاٹ کیے گئے ہیں۔ ریاستوں کے درمیان حال ہی میں جن معاہدے پر دستخط کیے گئے اس کے تحت ریاست کو نارتھ زون اسکیم کے تحت مزید ایک سو پرمٹ الاٹ کیے گئے ہیں۔

نگارشات

ارسال کرتے وقت ذیل میں دیا ہوا خاکہ پُر کرنا نہ بھولیے، خاکہ پُر کیے بغیر اشاعت ممکن نہ ہو سکے گی

میں تصدیق کرتا / کرتی ہوں کہ میرا مقالہ / غزل / کہانی / نظم بعنوان ....
پہلی بار تعمیر میں شائع ہوا / ہوئی ہے۔ یہ اس سے پہلے نہ کہیں شائع ہوا / ہوئی ہے
اور نہ کسی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا / ہوئی ہے۔
تاریخ .... دستخط :-



رنگم پیٹ ۵۸۵۲۲۰

ڈسٹرکٹ گلبرگہ، کرناٹک

تسلیم!

محکمہ اطلاعات جموں و کشمیر کی جانب سے جاری کردہ ماہنامہ "تعمیر" اور پندرہ روزہ "مکتوب" تقریباً پانچ سال سے مجھے بھیجے جا رہے ہیں۔ اس عزت افزائی اور شاعر نوازی کے لیے آپ حضرات کا میں بہت شکر گزار ہوں۔

ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے کشمیر جنت نظیر سے میرا قلبی، ذہنی اور تہذیبی رشتہ ہے۔ یہ رشتہ کشمیر کے تہذیبی۔ سیاسی۔ ادبی۔ اقتصادی اور تعمیری...... حالات سے واقفیت کے لیے فطری طور پر بے چینی کی یہ پیاس آپ کے ان دونوں پرچوں سے بجھ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے میں خود کو آپ حضرات کے بالکل قریب محسوس کرتا ہوں۔

محکمہ اطلاعات کی خوش اخلاقی کہوں یا آپ مدیر صاحبان کی وضعداری سمجھوں کہ میرے جواب نہ

دینے کے باوجود آپ کے پرچے مجھے پابندی سے مِلتے رہے ہیں۔

کتابت، طباعت، معیار اور حسنِ ترتیب کے لحاظ سے دونوں پرچے بہت ہی خوب ہیں۔

مبارک باد قبول فرمائیے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ ○ تنہا تماپوری

ایمپلائمینٹ ڈویژن

سکریٹریٹ، بھوپال ۔ مدھیہ پردیش

محترم جناب، آداب و نیاز

پچھلے دِنوں آپ کے خوبصورت جریدہ "تعمیر" کا دیدار ہوا ۔ بلاشبہ یہ ایک مثالی پرچہ ہے، مبارک باد قبول فرمائیے۔

"دو" تازہ غزلیں ارسال کر رہی ہوں، شریک اشاعت کر کے ممنون فرمائیں۔

آپ کی رائے کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔

○ بیگم ممتاز امید

۱۸ ۔ مٹیا محل لین

بھوپال (مدھیہ پردیش)

محترمی! تسلیم

کشمیر جنت نظیر کا خوب صورت تحفہ "تعمیر" باصرہ نواز ہوا۔ غزل کی اشاعت اور پرچے

تعمیر

کی ترسیل کے لیے شکریہ قبول فرمائیے۔

میری ایک غیر مطبوعہ غزل اور آپ کے پاس محفوظ ہے۔ امید ہے کہ اسے کسی قریبی اشاعت میں شریک فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

جملہ اراکین ادارہ کی خدمت میں آداب!

نیاز مند ○ نور محمد یاس

ڈپارٹمنٹ آف اردو

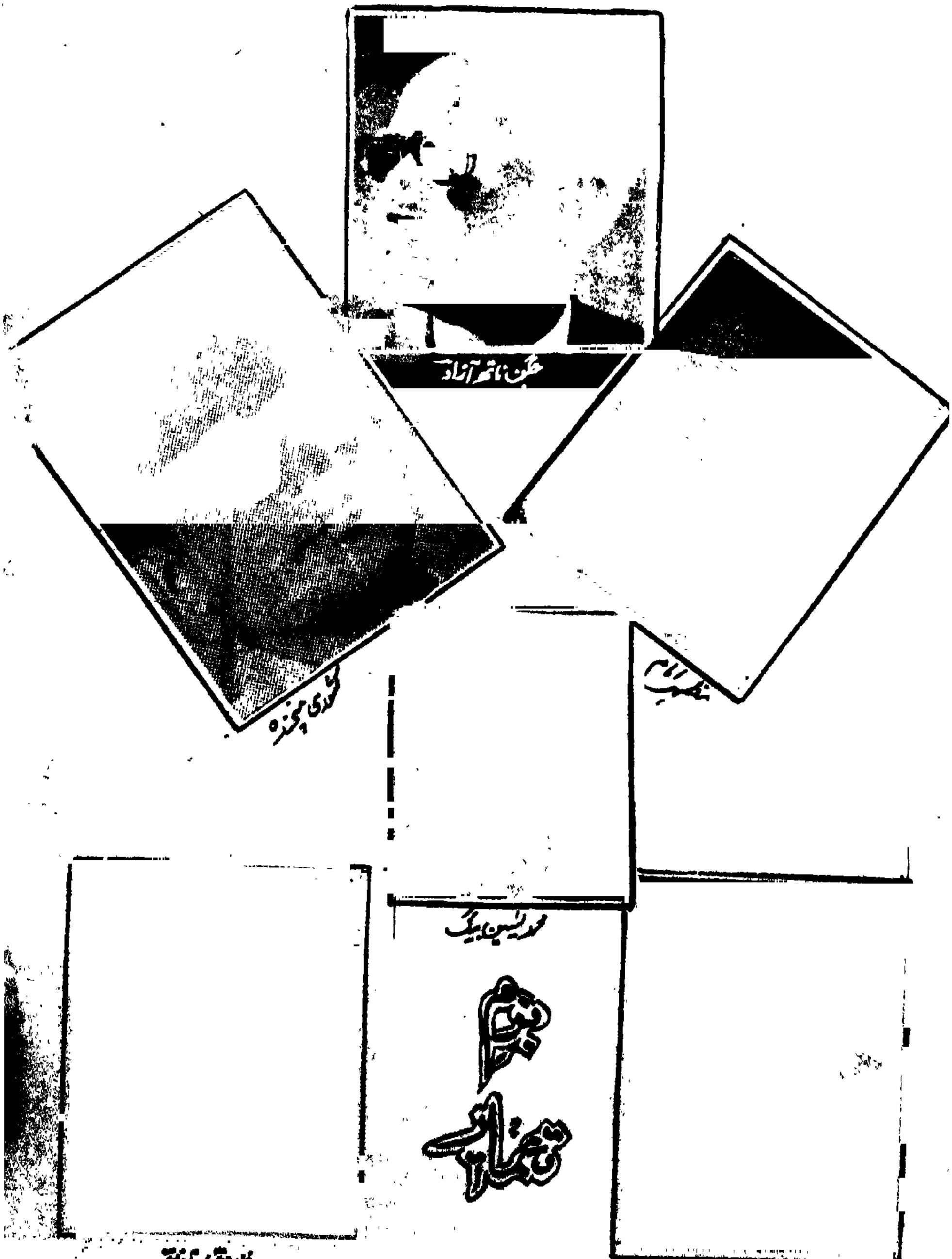
اسلامیہ کالج سری نگر

محترم خالد بشیر تسلیمات!

ماہنامہ "تعمیر" میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ مختلف موضوعات پر اعلیٰ اور معیاری مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ یہ رسالہ ایک طرف ادب کے پرستار اور شائقین کے لیے بیش بہا اور قیمتی سرمایہ ہے تو دوسری طرف ریاست کے متعلق معلوماتی مضامین بھی فراہم کرتا ہے اس طرح ادب کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں کا بھی ترجمان ہے۔

میرے چند تنقیدی مضامین "تعمیر" میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن تحقیقی اور تنقیدی مصروفیات کی وجہ سے درمیان میں یہ سلسلہ ٹوٹا ہوا نظر آ رہا ہے، چونکہ اب مصروفیات سے فارغ ہوں لہٰذا "تعمیر" کے معیاری پرچہ میں شریک ہو کر اور پابندی کے ساتھ شائع کرنے کے بارے میں آپ کی قیمتی رائے اور زریں مشورہ لازمی ہے، آپ کو جو زحمت ہوگی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپکا مخلص ○ محبوب وانی



پیغام تمہارے



اردو کا مقبول ماہنامہ

تعمیر

سرینگر

اپریل سنہ ۱۹۸۱ء

جلد نمبر ۱۳ ۔ شمارہ : ۴

نگران : بخشی غلام علی ۔ ناظم اطلاعات

شائع کردہ

نظامت محکمہ اطلاعات شعبہ مطبوعات، حکومت جموں و کشمیر

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ :-

ماہنامہ :- تعمیر سرینگر

نظامت اطلاعات مقبول شیروانی روڈ سرینگر کشمیر

تعمیر میں چھپنے والی نگارشات میں ظاہر کی گئی آراء سے حکومت جموں وکشمیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

تزئین :- غلام محی الدین   کتابت :- بشیر احمد

تعداد :- پندرہ سو۔

مطبوعہ :- گورنمنٹ پریس سرینگر کشمیر



حرفِ حرف

پچھلے کچھ دنوں سے موسم میں خوشگوار تبدیلی آگئی ہے۔ بے لباس درختوں نے پھر سے سبز پتے اوڑھ لیے ہیں اور پھولوں کی کئی قسمیں بھی کھل گئی ہیں۔ ابابیلیں، ہُدہُد اور ایسے ہی دوسرے پرندے جو سردیوں میں یہاں سے دوسرے خطوں کو چلے جاتے ہیں۔ سفیرانِ بہار بن کر پھر واپس لوٹتے ہیں۔ نرگس اور بید مشک بہار کی آمد کا اعلان کرنے والوں میں سبقت لے جاتے ہیں۔ ان کے بعد بادام کے شگوفے کھلتے ہیں جن کے کھلے رہنے کی عمر مختصر ہوتی ہے۔ موسمِ بہار کے قدم رکھتے ہی وادیٔ کشمیر میں زندگی کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور ایک نئی چہل پہل شروع ہوتی ہے۔ سردیوں کے ایام میں زندگی پر جو جمود سا طاری رہتا ہے۔ بہار کی آمد اس جمود کو توڑ دیتی ہے۔

گذشتہ دنوں بادام کے شگوفوں کا میلہ حسبِ روایت آن بان کے ساتھ منایا گیا۔ یہ میلہ ہماری ثقافتی زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے زمانے میں کشمیر میں آج کے مقابلے میں شدت کی سردی کے ساتھ زبردست برفباری ہوا کرتی تھی اور آمد و رفت کے تمام ذرائع قریب قریب ناکارہ ہو جاتے تھے یہاں تک کہ لوگوں کو گھروں میں ہی مقید ہو جانا پڑتا تھا۔ تمام سرگرمیاں کم و بیش گھروں کے اندر ہی محدود ہو جاتی تھیں۔ یہ صورتِ حال کئی مہینوں تک رہتی۔ چار دیواری کے اندر ایک لمبے عرصے تک محدود زندگی گذارنے تک

تعمیر

ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ چنانچہ جب بہار کے نرم گرم اور لطیف جھونکے وادی کے اطراف واکناف میں چلنے لگتے اور برف پگھل کر ندی نالوں کی صورت میں بہنے لگتی۔ تو لوگ اس خوشگوار تبدیلی کا کھلے دل سے خیر مقدم کرتے، موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہی بادام کے شگوفے کھل جاتے اور سردیوں سے اُکتائے ہوئے لوگوں کے لئے ان شگوفوں کا لطف اٹھانا تفریح کا ایک بہترین ذریعہ فراہم کرتا۔ سرینگر میں قلعہ ہاری پربت کے قریب بادام واری کا علاقہ ہے، جہاں بادام کے شگوفوں کا میلہ لگتا ہے۔ میلے کے دوران لوگ جوق در جوق یہاں آتے ہیں اور ہر طرف کھلے ہوئے بادام کے شگوفوں کا لطف اٹھاتے ہیں۔ یہ نظارہ واقعی قابلِ دید ہوتا ہے۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں سبھی اس میلے سے یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں۔

سردیاں اگرچہ اب بھی کسی حد تک معمول کی سرگرمیوں میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ تاہم سائنسی ایجادات نے انہیں لوگوں کے لئے بہت حد تک آسان کر دیا ہے۔ گرمیوں اور سردیوں کے درمیان موجود خلیج کو بڑی حد تک پاٹ دیا گیا ہے اور اب ایسے لوگ جو برف کے نام سے ہی کانپ اٹھتے تھے۔ برفباری کے منتظر رہتے ہیں۔ بچوں کے لئے آسمان سے سفید سفید روئی کے گولے اترنے کا سماں دل بہلانے کا سامان پیدا تو کرتا ہی ہے لیکن اب بھی برف سرمائی کھیلوں کے مشتاق کھلاڑیوں کو اپنے شوق کی تسکین کے لئے دنیا کے کونے کونے سے کھینچ کر وادیٔ کشمیر لے آتی ہے، ہماری ریاست میں گذشتہ چند برسوں کے دوران سرمائی کھیلوں کی طرف جو خصوصی توجہ دی گئی ہے اُس کے باعث اب ہر سال سردیوں کے ایام میں سیاحوں کی آمد جاری رہتی ہے۔ گلمرگ کی برف پوش ڈھلانیں دنیا بھر کے سکائیروں کے لئے اپنی کشش رکھتی ہیں جب گذشتہ اس سال بھی گلمرگ میں سیاحوں کی خاصی تعداد نے سرمائی کھیلوں میں حصہ لیا اور موسم سرما کے دوران یہاں کافی گہما گہمی رہی۔ محکمہ سیاحت کی طرف سے دیگر تمام ضروری سہولیات کے علاوہ چوبیس گھنٹے بجلی اور پانی کی فراہمی کو یقینی بنایا گیا۔ سرمائی کھیلوں کے اختتام کے ساتھ ہی گلمرگ میں سیاحوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا ہے۔ پہلگام، سونہ مرگ، کوکرناگ، اچھہ بل، ویری ناگ اور مغل باغات میں بھی چہل پہل شروع ہو چکی ہے۔ غرض موسم بہار نے ہر طرف پھول ہی پھول کھلائے ہیں اور وادیٔ کشمیر کی خوبصورتی اور رعنائی پھر ایک بار دنیا بھر کے سیاحوں کو دعوت نظارہ دے رہی ہے۔

تمیم

ڈاکٹر برج پریمی،
کشمیر یونیورسٹی سرینگر

کلہن اور راج ترنگنی

وقت کی بیکراں وسعتوں کو چیرتے ہوئے جب نظریں ماضی کے دھندلکوں کو ٹٹولتی ہیں۔ تو علم و عرفان کے بے پناہ سرچشمے اُبلتے ہوئے ملتے ہیں اور اِن نظر فریب شادابیوں کو لازوال بناتے ہیں۔ جو جنتِ ارضی کے ہر ذرّے میں رچے ہوئے ہیں۔ فلسفہ، فن، علم، نفس کون سا شعبہ ہے، جہاں ہمارے اسلاف نے چراغ نہ جلائے ہوں۔ ناگ ارجن، اشوگھوش، چرک، ولبھہ دیو، بھیم بٹ، واسوگپت، بھاسکر آچاریہ، ابھینوگپت، کھشمندر، بلہن اور ایسے ہی بیسیوں عالم و فاضل تابندہ تاروں کی ایک کہکشاں ہے جو ہمارے نیلے آسمان نیچے چمک کر دُور دُور تک نور کی لکیریں پھیلاتی رہی ـــــ ان ہی روشن دماغوں میں کلہن پنڈت کا نام بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جو آج سے لگ بھگ ۸۳۲ سال قبل ہماری سرزمین میں پیدا ہوا۔ اور اپنے کارناموں کے لئے صدیوں تک زندہ رہے گا۔

کلہن کا کارنامہ اس کی شہرہ آفاق لطیف راج ترنگنی ہے۔ جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی ٹکر کی منظوم تواریخ آج تک کسی زبان میں نہیں لکھی گئی ہے۔ ۸۲۶۷ اشلوکوں پر مشتمل یہ کتاب شاعری کے میڈیم میں تواریخ کے پانچ ہزار برسوں کو سمیٹتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ اس عظیم کارنامے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ شاعری کے لوازمات کو برتتے ہوئے اس میں کشمیر کی قدیم تواریخ کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات وثوق کے ساتھ

تعمیر

کہی جا سکتی ہے کہ عالمی ادب میں اس طرح کے شاہکار اگرچہ نایاب نہیں کم یاب ضرور ہیں۔ پنڈت نہرو اس کتاب کو تواریخی، سماجی اور معاشیاتی معلومات کا خزانہ قرار دیتے ہیں۔[1] مشہور مؤرخ آر سی مجمدار اس کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:-

"ہندوستان کے قدیم ادب میں یہ واحد کارنامہ ہے، جسے صحیح معنوں میں ایک تواریخی نسخہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے نہ صرف موجودہ مسودوں اور دوسرے ماخذات سے مواد جمع کیا ہے۔ بلکہ کتاب کے ابتدائی صفحات میں ان چند اصولوں کا ذکر کیا ہے جو یہ تواریخ لکھتے وقت اس نے پیش نظر رہے۔ ان اصولوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے کہیں آگے تھے۔ بلاشبہ یہ اصول ایسے ہیں جو انیسویں صدی تک تاریخ کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کیلئے بروئے کار نہیں لائے جاتے تھے۔"[2]

راج ترنگنی آٹھ ترنگوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ ہر ترنگ کے اختتام پر لکھا ہے:-

"راج ترنگنی کی پہلی ترنگ ... ... اختتام پذیر ہوتی ہے جسے کشمیر کے نامور وزیر چمپک کے بیٹے کلہن نے تصنیف کیا۔"

راج ترنگنی سنسکرت شاعری کا ایسا کارنامہ ہے، جس سے کشمیر کی تواریخ کے مختلف ادوار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اپنی تمام خامیوں کے باوجود یہ تصنیف کشمیر کے حکمرانوں کو دور حکومت کو ۱۱۴۸ء تک سمیٹ لیتی ہے جب کلہن نے اسے تصنیف کیا ہے۔ اور بعض بے ربطیوں کے باوجود یہ تصنیف کشمیر کی تواریخ کا ایک مسلسل تذکرہ ہے۔ والٹر لارنس اسی بات کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

"کشمیر کے ابتدائی مصنفوں کے روایتی کردار اور مصنوعی تاریخ وار سلسلہ واقعات کو رد کرتے ہوئے جو پہلے ترنگوں میں ملتا ہے۔ اور جو تاریخی تنقید کی تند آندھی کے باوجود آزمائش میں پوری اتری ہے۔ اس کتاب کو ساتویں صدی عیسوی کے بعد ایک معتبر یادداشت تسلیم کیا جا سکتا ہے۔"[3]

---

1. R.C. Pandit : A[illegible] NAGAS, INTRODUCTORY PAGE XII
2. R.C. Muzamdar: THE VEDIC AGE PAGE 4[illegible] 49
3. والٹر لارنس: ویلی آف کشمیر، صفحہ ۱۸۰

راج ترنگنی کے فاضل مترجم اُرل سٹین کے مطابق کلہن نے اس کتاب کا مقدمہ ۴۲۲۴ لوکیکا مطابق ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹ء میں لکھا۔ اور اپنے دو برس میں مکمل کیا۔ یہ راجا جے سمہا کا دور حکومت تھا۔ یہ صحیح ہے کہ کلہن کشمیر کا پہلا مورخ نہیں ہے بلکہ اس سے قبل کئی لوگوں نے تاریخ جیسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ کلہن نے خود اپنے پیش رو مورخین کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کوئی ایسا کارنامہ منظر عام پر نہیں آیا ہے اس لئے راج ترنگنی کو کشمیر کی تاریخ سے متعلق اولین ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ تاریخ نویسی ایک مشکل اور صبر آزما فن ہے اور زبردست ریاضت کا متقاضی ہے اس کے لئے مورخ کو کئی ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں کشمیر میں تاریخ نویسی کا رجحان پیدا ہوا۔ وہ دور اپنے محدود وسائل کے باعث کافی مشکلات کا دور تھا۔ رسل و رسائل کی دقتیں، تاریخی مواد کی نایابی، مخطوطات اور دوسرے ماخذات کی کم یابی، جدید سائنٹفک اور تواریخی ذہن کی عدم موجودگی میں یہ کام انتہائی کٹھن تھا اس لئے کلہن سے قبل جن لوگوں نے تاریخ جیسے موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان کا کام کارنامے کی حیثیت اختیار نہ کر سکا۔ اور وقت کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہو گیا۔

کلہن پنڈت ازل سے ہی زبردست ذہانت اور ذکاوت لے کر آیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اُسے شعر کہنے میں کمال حاصل تھا۔ بلکہ شعر کے قالب میں تاریخ جیسے موضوع کو سمیٹنا اس پر ختم ہے، کلہن کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی راج ترنگنی میں تاریخ نویسی کے اصول وضع کئے اور ان سے بحث کی۔ اس کے ساتھ ہی ان ماخذات کی نشان دہی کی جن سے اس نے استفادہ کیا ہے، کلہن نے اپنے دور کے محدود وسائل کے باوجود اپنے دور کے سکوں، پٹوں اور اپنے پیش رو مورخوں سے اکتساب فیض کیا ہے۔ اس کا اعتراف اس نے فراخدلی اور خلوص کے ساتھ کیا ہے۔

سرارل سٹین کے مطابق کلہن بارھویں صدی کے آغاز میں پرہاس پور (موجودہ پرس پور) میں پیدا ہوا۔ لیکن حتمی طور پر اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہے، راج ترنگنی ۱۱۴۸ء ۱۱۴۹ء میں لکھی گئی، قیاس غالب ہے کہ کلہن اس زمانہ میں شباب کی سرحدوں سے گذر چکا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کلہن کی پیدائش بارھویں صدی کے آغاز میں ہوئی ہوگی۔ یہ وہ دور تھا جب مہاراجہ ہرش (۱۰۸۹ء ۱۱۰۱ء) اور اس کے پیش رو بادشاہوں کی من مانیوں سے کشمیر میں غارت گری کا بازار گرم تھا۔ ہرش کے بعد اس کے رشتے کے بھائیوں سہل اور اکل نے سارے ملک میں خون ریز بغاوت شروع کر دی تھی۔ ڈامروں نے اپنے مظالم سے نظام سلطنت کی بنیادیں کمزور

تعمیر

کردی تھی۔ کلہن کا شباب آبی افراط و تفریط میں گذرا۔ اس کے والد کا نام کا شمیرک مہا۔ تی چینپ پٹ یہ چمپک تھا۔ جو مہاراجہ ہرش کے دور میں دوارپتی یا شہری دروازے کا داروغہ تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرحدی علاقے کا دفاعی افسر تھا۔ اس بات کے باوجود کہ مہاراجہ ہرش کے ذمہ دار عملے نے سازشوں سے کام لیا۔ وہ درد علاقے میں دگدھ گھاٹ کا محاصرہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس زمانہ میں جب مہاراجہ ہرش چاروں طرف مایوسیوں سے گھرا ہوا تھا۔ چمپک نے ایک نمک حلال اور وفادار ساتھی کی طرح راجہ کا ساتھ دیا۔

کلہن کا اصلی نام کلیان بتایا جاتا ہے۔ اَرل سٹین کے مطابق یہ اپ بھرنش کا لفظ ہے۔ جو پراکرت لفظ "کلان" سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی لشباش، مقدس یا برکت وغیرہ ہے۔[1] وہ برہمن نسل تھا اور شیو مت سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ راج ترنگنی کی ہر ترنگ کا آغاز شیو اور پاروتی کے مبارک نام سے کرتا ہے۔ لیکن مذہب کے معاملات میں وہ بے حد آزاد خیال تھا۔ اور بودھ مذہب کا احترام اسی جذبے سے کرتا تھا۔ جس جذبے سے برہمن مت سے محبت کرتا تھا۔ دراصل کلہن کے خاندان میں یہی روایت چلی آرہی تھی۔ کلہن کا چچا کنک راگ ودیا کا ماہر تھا۔ وہ راجہ ہرش کا درباری سنگیت کار تھا۔ حتیٰ کہ راجہ ہرش خود بھی اسی سے موسیقی میں درس لیا کرتا تھا۔ کنک بودھ مذہب کا پیرو تھا۔ کلہن اپنی خاندانی روایات کے باعث ہندو اور بودھ مت کے گہوارے میں پل کر پروان چڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں دونوں دھرموں کے تئیں عقیدت اور احترام کے جذبے ملتے ہیں۔ کلہن نے جگہ جگہ پر مہاتما بدھ اور اس کے دھرم کا ذکر انتہائی محبت اور احترام سے کیا ہے۔

کلہن بہت بڑا عالم اور فاضل تھا۔ سنسکرت زبان پر زبردست قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے کئی علوم سے بھرپور واقفیت رکھتا تھا۔ چنانچہ عروض، صرف، نحو، معاشیات، شعریات اور جنیات پر اسے مکمل گرفت حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مصوری، رقص، موسیقی اور کئی دوسرے فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے عہد اور اپنے قابل عہد کے سنسکرت ادب پر بھی گہری نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں خوبصورت اور سحر انگیز شاعری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

ہرش کے والد چمپک نے اپنے زمانے میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، اور ملکی نظم و نسق میں دسترس حاصل

---

[1] مسٹر اَرل سٹین، راج ترنگنی، جلد اوّل صفحہ ۱۳،

کی تھی، لیکن کلہن کو ایسا زمانہ حاصل نہ ہو سکا۔ وہ ایسے زمانے میں پلا بڑھا جب سیاسی اور سماجی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ اس میدان میں اپنے جوہر نہ دکھا سکا۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنا اظہار چاہتا تھا۔ چاروں طرف دروازے بند پا کر وہ شعر و شاعری کرنے لگا۔ اور اسی وسیلۂ اظہار میں اس نے تاریخ نویسی کرنا شروع کی۔ سر ارل سٹین رقم طراز ہیں:۔

"ناموافق سیاسی حالات اور غالباً خاندانی مصلحتوں نے اس پر فوج اور انتظامیہ کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ اسی لئے موروثی مذاق کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے ملک کی تواریخ کے بارے میں روایات کا قلم بند کرے اور ان ادوار پر اپنے خیالات کا اظہار کرے جن میں سے وہ زندگی گذار چکا تھا۔" [1]

کلہن ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر ہونے کے علاوہ ایک قابل تاریخ نویس تھا۔ کشمیر کی پرانی تواریخ سے جانکاری حاصل کرنے کے لئے کلہن کی راج ترنگنی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ کلہن روایت اور تواریخ کے درمیان حدِ فاصل مقرر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اور یہ کہ حالات اور واقعات کے تسلسل میں خامیاں موجود ہیں۔ کوئی سنجیدہ ذہن اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ کلہن اپنے آس پاس کی زندگی سے نابلد تھا۔ وہ ایک بے باک صاف گو اور باضمیر مورخ تھا۔ اس نے کشادہ دلی سے اعتراف کیا ہے کہ اس نے اپنے پیش رووں سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ خاص طور پر نیلمتا اور چرت اور اس طرح کے مسودات سے استفادہ کیا ہے۔ کلہن نے اس سلسلے میں گیارہ کارناموں کا ذکر کیا ہے [2] جن سے اس نے اپنا چراغ جلایا ہے۔ جدید تواریخی نقطۂ نظر کے مطابق سنسکرت میں تواریخی مواد موجود نہیں ہے۔ اس خیال کے مطابق راج ترنگنی میں بھی کوئی تواریخی مواد نہیں ہے، لیکن ایسا کہنا کلہن کی عظمت سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کلہن کے زمانہ میں تاریخ نویسی کے اصول مقرر نہیں تھے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ کلہن نے خالصتاً تاریخ نہیں لکھی ہے، بلکہ کشمیر کے راجاؤں کی کہانی رقم کی ہے۔ اسی لئے کلہن اپنی تصنیف کو "راجوں کا دریا" کہتا ہے، لیکن راجوں اور مہاراجوں کے عروج و زوال کی کہانی ہونے کے باوصف راج ترنگنی کی تواریخی اہمیت کو

---

[1] سر ارل سٹین، راج ترنگنی جلد اول، صفحہ ۲۱، [2] ایضاً صفحہ ۲۴

جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ کلہن نے ماضی اُس دور کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی کے بارے میں براہ راست کوئی بات نہیں کہی ہے لیکن راجاؤں کے ادوار کے ذکر میں کسی نہ کسی پہلو سے عوامی زندگی کا بالواسطہ ذکر ضرور آ گیا ہے۔ اس نے انتہائی جرأت اور بے باکی کے ساتھ خاص طور پر اپنے عہد کے حالات کا جائزہ لیا ہے کلہن راجہ سُسّل ۱۱۱۲ء سے ۱۱۲۸ء اور راجہ جے سمہا (۱۱۲۸ء ، ۱۱۴۹ء) کے عہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اور اسی عہد کا اُسے شعوری مشاہدہ تھا۔ اس لئے اس نے اس پورے عہد پر بھرپور تنقید کی ہے۔ اس نے امیروں کو تضحیک کا نشانہ بنایا ہے اور بادشاہوں کی کوتاہیوں کو بے نقاب کیا ہے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح کی باتوں کا اظہار کلہن نے کیا ہے، وہ اُس زمانے میں سزا دلانے کیلئے کافی تھیں۔[1]

کلہن کے ضمیر اور ایمان کی توانائی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے جاہ و حشمت اور انعام و اکرام کی پروا کئے بغیر اپنے زمانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ وہ سارے ملک میں گھوما اور نہ صرف اپنے زمانے کے مندروں، ستونوں اور مقدس مقامات کی سیر کی، بلکہ پرانے کھنڈرات کی خاک بھی چھان لی اور ان معلومات کو پوری جزئیات نگاری سے سمیٹ لیا۔ اس سے اس کی بے پناہ صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں کلہن کے ان فقروں پر بھی غور کیجیے جن سے اس کے ذہن اور فکر کی نشاندہی ہوتی ہے:۔

"وہ شریف الطبع شاعر قابل ستائش ہے، جس کے الفاظ ایک سچے منصف کی طرح زمانۂ قدیم سے متعلق [illegible] وقت کے [illegible] سے احتراز کرتا ہے۔"

کلہن کے نزدیک [illegible] اور اپنے جذبات سے بالاتر ہو کر حق گوئی سے واقعات و حالات کا تجزیہ کر لیتے۔ اس اصول کا اطلاق اس نے خود اپنی شاعری پر بھی کیا ہے۔ وہ بادشاہ اور ان کے قائم کئے ہوئے سیاسی نظاموں کی خامیوں کی پول کھولتا ہے اور جھوٹ اور فریب کے طلسم سے کبھی مرعوب نہیں ہوتا۔ وہ راجہ ہرش کو بھی معاف نہیں کرتا۔ حالانکہ اس کے ہاتھوں اس کے خاندان کے وقار میں

---

[1] :۔ پی این، کے بامزی :۔ اے ہسٹری آف کشمیر، صہ ۳۵۔

[2] :۔ پی این، کے بامزی :۔ اے ہسٹری آف کشمیر، صہ ۳۵،

اضافہ ہوا تھا۔[1] وہ بڑے سلیقے سے ان تمام عناصر کا "مونٹاژ" کرتا ہے۔ جو اس کی نظروں میں مشکوک اور قابلِ نفرت ہیں۔ وہ اپنے دور کے سرکش اور ظالم ڈامروں کو تضحیک کا نشانہ بناتا ہے۔ جنہوں نے ملک میں خانہ جنگی کی آگ لگائی تھی۔ وہ برہمنوں کی عامرانہ ذہنیت کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ وہ ان تمام طبقوں کے مظالم اور غیر انسانی سلوک کو بے نقاب کرتا ہے، جو عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں انصاف، رواداری محبت، حب الوطنی اور بھائی چارے کے واقعات سامنے آئے ہیں۔ کلہن نے بخل سے کام نہیں لیا ہے، وہ ایسے لوگوں کو دادِ تحسین دیتا ہے۔

کلہن کو کبھی درباروں میں جانے کا موقع نہیں ملا اور نہ ہی اس نے اس بات کو اپنی سعادت تصور کیا۔ کلہن نے اس سعادت کو حاصل کرنے کے لئے کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ اس نے بادشاہ وقت کی ثنا خوانی نہیں کی اور نہ ہی مبالغہ آمیز قصائد کے دفتر تیار کئے۔ کلہن کی حق گوئی اور بے باکی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے زمانہ کے راجاؤں کے ذاتی کردار پر مورخانہ ایمانداری سے قلم اٹھایا۔ جس انداز نظر کو سامنے رکھ کر کلہن نے اپنے اس عظیم کارنامے کو پیش کیا۔ اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کبھی بھی شاہی کرم فرمائی کی توقع نہیں رکھتا تھا۔[2] لیکن یہ بات بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ ہر اچھی بات اور ہر اچھے کام کے لئے اس نے تعریفوں کے موتی لٹائے ہیں۔

اس بات کے باوصف کہ کلہن کو وہ زمانہ ملا۔ جب سیاسی اعتبار سے کشمیر میں زبردست اتھل پتھل تھی، اس نے اپنی پسند ناپسند کو اپنی تصنیف کا معیار نہیں بنایا۔ بلکہ ایک منصف مزاج اور روشن ضمیر مؤرخ کے منصب کو اس نے پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنے چاروں طرف کھلی آنکھ سے دیکھا۔ اتنا ہی نہیں اس نے اپنے ذہن اور ضمیر کے دریچے بھی کھول دیئے۔ کلہن نے صدیوں کے تاریخی واقعات کو شاعری کے پورے لوازمات کے ساتھ جس طرح سنگار کیا۔ وہ اس پر ختم ہے۔ اس کا یہ عظیم کارنامہ صدیوں تک فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] پی، این، کے بامزی : اے ہسٹری آف کشمیر ص ۳۵

[2] ارل سٹین : راج ترنگنی، جلد اول ص ۱۶

سید محمد عقیم
شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

اسلوب کی تعریف و تشریح

اسلوب کی کوئی جامع یا سائنٹفک تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اسے ہم سلیقہ ادا سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آسان لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسانی جذبات و تاثرات اور افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا وہ پیرایہ ہے جو دلنشین ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد بھی ہو۔ اسی کو انگریزی میں STYLE کہتے ہیں۔ جو یونانی لفظ STILUS سے ماخوذ ہیں۔ اسٹائلس دھات کے بنے ہوئے ایسے اوزار کا نام ہے جس سے خوبصورت دلنشین نقش و نگار کندہ کئے جاتے ہیں۔ والٹر پیٹر نے اسٹائل کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"STYLE IS A CERTAIN ABSOLUTE AND UNIQUE MANNER OF EXPRESSING A THING IN ALL ITS INTENSITY AND COLOUR."

اسٹائل کسی خیال یا معنی کے طریقہ اظہار کا نام ہے۔ جو انفرادیت اور خصوصیت کے ذریعہ اصل خیال کو مکمل معنویت اور تاثرات کے ساتھ اچھوتے طریقہ سے اظہار کر دے۔"

عربی و فارسی میں اسٹائل کے لئے "سبک" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید ادب میں اس کا مطلب کلام کو حشو و زوائد سے پاک کرنا ہے اسلوب عربی زبان میں انفرادیت کے تصور کے ساتھ طریقہ روش اور ڈھنگ

کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اس لئے ادب میں بھی مخصوص اندازِ نگارش یا طرزِ ادا کے لئے اسلوب کا لفظ بولا جاتا ہے
جس میں مصنف کے منفرد خط و خال نظر آئیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں میر پہلا شاعر ہے۔ جس نے طرز کو اہمیت دی
اور اس پر سختی سے عمل کیا۔ میر نے لفظ "انداز" کو اسلوب کے خاص معنوں میں استعمال کیا ہے۔ نکات الشعراء میں میر نے
لکھا ہے کہ:-

"ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعتہا است، تجنیس، ترصیع،
تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی، خیال وغیرہ، ایں ہمہ ہا در ضمن ہمیں است
فقیر ہم ازہمیں وتیرہ محظوظم، ہر کہ از دریں فن طرز خاصے است ایں معنی را می فہمد، با عوام کارے ندارم"

مندرجہ بالا لطیف و تشریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلوب یا اسٹائل کے لئے کاوش، صنعت گری، مرصع کاری اور انفرادیت کے عنصر کا ہونا لازمی ہے۔ کوئی بھی اسلوب بغیر تصنع یا آورد کے نہیں بنتا۔

ان مباحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہر وہ شخص جو قابلِ ذکر یا لائقِ ستائش حد تک دلچسپ گفتگو کر سکتا ہے۔ یا دلچسپ ادبی و غیر ادبی مضامین تصنیف کر سکتا ہے ہم اس کے طریقہ کلام یا طرزِ نگارش کو اس کا اسلوب کہہ سکتے ہیں، ایسا کوئی طرزِ نگارش یا طریقۂ گفتگو جس کی اہمیت ذہنی سطح یا عام معلوماتی دائرہ سے تعلق رکھتی ہو اس پر اسلوب کا اطلاق مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلوب علمی اور ادبی دونوں طرح کے ہو سکتے ہیں ادبی اسلوب میں انشاء پردازی، مضمون نگاری، افسانہ، ناول، داستان اور کسی حد تک خطوط بھی آ جاتے ہیں، اس کے برعکس علمی اسلوب بیشتر ایسی علمی کتابوں میں ملتا ہے۔ جن کی زبان میں ادبیت کی چاشنی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی، جیسے تاریخ نویسی، تنقیدی اور تحقیقی مقالات اور کتب و رسائل وغیرہ علمی نثر میں سنجیدگی اور باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ تشبیہیں، استعارے، اشارے اور کنائے جو شاعری یا ادبی تخلیقی نثر کی خوبیاں ہوتی ہیں، علمی نثر میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ علمی نثر میں وضاحت اور قطعیت ضروری ہے تاکہ قاری یا سامع کے لئے تفہیم و تعبیر میں دشواری نہ ہو۔ تہہ داری، رنگینی اور دلآویزی ادبی نثر کی خصوصیت ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں انشائیات میں زیادہ برمحل اور کار آمد رہتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے علمی نثر پر تعقل پسندانہ مقصدیت کی گہری چھاپ رہتی ہے اسی لئے ہر بات کے ثبوت

تعمیر

دلائل و براہین پیش کئے جاتے ہیں تاکہ قاری یا سامع کے ذوقِ علمی کی تشفی ہو اور اس کا ذہن جدید معلومات و نئے حقائق سے منور ہو جائے۔ یہاں جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا تعلق احساسات کی بجائے مدرکات سے ہوتا ہے یہاں دل کے بجائے دماغ مخاطب ہوتا ہے۔ اور جذبات کی تشفی کی بجائے فکر کی تربیت کی جاتی ہے۔ ان مضامین میں نثر کی پیچیدگی، الفاظ کی کثرت، گنجلک خیالات، زبان کی رنگینی اور آہنگ کی شیرینی اس میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے

مختلف ادوار میں معاشرہ کے ذہنی تقاضوں، زندگی کی مختلف روایتوں اور فنونِ لطیفہ کی مختلف جہتوں کے باعث علمی یا ادبی نثر لکھنے کا انداز مختلف رہا ہے۔ اسے ہم آج پسند کریں یا رد کریں۔ تاہم اس کے پس منظر میں جاری و ساری اور ابھرتے ہوئے رجحانات کا تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ قدیم داستانوں کی نثر میں ثقالت، قافیہ پیمائی، عربی و فارسی کی گراں بار اصطلاحیں، تلمیحیں اور اشارے کنائے وغیرہ کا استعمال عام طور پر دکھائی دیتا ہے اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اس دور کی زبان دانی کے تقاضے کے مطابق ایسی نثر لکھنے والے کو عالم، فاضل اور استاد کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس بات نے بھی اندازِ نگارش پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں کہ لکھنے والا کس طبقہ کے لئے لکھ رہا ہے۔ اور اپنے موضوع کے لئے اپنی معلومات کو کہاں تک اور کس اسلوب سے سامنے لانا چاہتا ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ فلسفیانہ مضامین کے لئے مصنف کا اندازِ نگارش تبدیل ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے مخاطب اول درجے کے تعلیم یافتہ باکمال لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مذہبی تحریریں بالعموم لطف اور دلچسپی سے خالی ہوتی ہیں یا وہ مذہبی اصطلاحات سے بوجھل رہتی ہیں۔ یا سادگی کی وجہ سے اس میں سپاٹ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ مصنف عوام میں شہرت حاصل کرنے کے لئے مذہبی مضامین میں حکایات، لطیفے، اشعار وغیرہ کے استعمال سے نثر کو سپاٹ اور پھیکا ہونے سے بچا لیتے ہیں اور عوام کے لئے دلچسپیاں بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن علمی نثر میں ان عناصر کی شمولیت ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح ترجمہ کی نثر اور مصنف کی آزاد نثر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ترجمہ نگار اصل عبارت کا پابند ہوتا ہے۔ اس کے تاثر یا خیال سے مختلف بات کہنے کا اس کو حق نہیں۔ ان مباحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نثر نگار مختلف چیزوں کا پابند ہوتا ہے

. . . .

موضوع، سامعین اور قارئین، مطالعہ اور

معلومات، قدرتِ زبان اور تفحصِ الفاظ کے ساتھ ساتھ اس امر کا کہ وہ غور و فکر کا انداز کیا ہے اور کون سا علم،

تمیم



وزیر اعلیٰ ضلع راجوری میں ست پلا گرواٹر سپلائی سکیم کا افتتاح کر رہے ہیں۔



وزیراعلیٰ نے راجوری میں مسلم اوقاف کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔

کون سی زبان و نثر اس کے لئے سرچشمہ کا کام کر رہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کافی عرصہ تک اردو ادیب فارسی نثر کے اسالیب پر عمل کرتے رہے۔ انگریزی ادب سے روشناس ہونے کے بعد طریقۂ اظہار میں اس کا تصرف اور عمل شروع ہوا۔ اس طرح کی نثر وجود میں آئی۔ جو PUNCTUATION کے استعمال کے بغیر اپنی تفہیم کے اعتبار سے نامکمل اور پیچیدہ نظر آتی ہے۔

اسلوب کوئی جامع شئے نہیں۔ تاہم اس کا تعلق اپنے موضوع اور قاری یا سامع سے بہت گہرا ہوتا ہے مثال کے طور پر جب کوئی شخص کسی بڑے مجمع کو خطاب کرتا ہے تو اسے اپنے سامعین کو متاثر کرنے کے لئے اپنے لہجہ، آواز کے اتار چڑھاؤ، آنکھ اور ہاتھوں، ابرو اور پیشانی کے اشاروں سے بہت کام لینا پڑتا ہے لیکن نثر لکھتے وقت یہ چیزیں اس کے زیادہ کام نہیں آسکتیں، صرف لہجہ کے اتار چڑھاؤ کو ہی جملوں میں ڈھال کر اپنے تاثرات کا اظہار کر سکتا ہے مگر مخاطب کو اپنے نقطۂ نظر کا حامی بنانے اور ہم خیال کرنے کے لئے اس کا لہجہ اور اسلوب مختلف ہو جائیگا۔ اور کسی کو مخالفت پر آمادہ کرنے کے لئے اس کا اندازِ گفتگو اور دلائل ہو جائیں گے۔ اس طرح خطابت اور غیر خطابت کی زبان میں فرق لازمی ہو جاتا ہے۔ اخبارات کی نثر کا سادہ عام فہم اور وقتی متاثر کرنے والا اسلوب کامیاب ہونا چاہیئے اس میں گیرائی اور گہرائی نہ ہو کیونکہ قارئین کا حلقہ وسیع ہوتا ہے۔

اسلوب میں بیان کے خارجی و داخلی مظاہر شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کو جامع لفظ کہنا غلط نہ ہوگا۔ خارجی مظاہر زبان، قواعد کی پابندی، ترتیب، آرائش وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ داخلی پہلو میں مصنف کا ذہن، اس کا کردار، مزاج، علم، فکر، شعور اور رجحانِ طبع وغیرہ بیان کے خارجی مظاہر پر اثر انداز ہوتے ہیں اور الفاظ کے انتخاب و ترتیب ایک خاص ڈھنگ اور دوسرے پیرایہ کے اظہار کو متاثر کرتا ہے اسلوب صرف خارجی نہیں بلکہ اس کا ایک داخلی پہلو بھی ہے، جس کی وجہ سے اس میں انفرادیت پیدا ہوتی ہے، اسی لئے ایک کا اسلوب دوسرے سے مختلف ہو جاتا ہے موضوع اور صنف میں یکسانیت کے باوجود مقصد کے زیر اثر اندازِ گفتگو بدل جاتا ہے۔ جملوں کی ساخت مختلف ہو جاتی ہے اور لہجہ کے اتار چڑھاؤ میں تبدیلی آجاتی ہے۔ اس کی مثال ہر دور کے ادبی شہ پاروں سے پیش کی جا سکتی ہے، "نو طرزِ مرصع" اور "باغ و بہار" میں کم و بیش یکسانیت ہونے کے باوجود اسلوب نگارش میں زمین و آسمان کا فرق ہے کیونکہ دونوں کے مقصدِ قصہ گوئی، مخاطب اور شخصیت میں فرق ہے، اس لئے ایک قصہ نگار (اپنے زمانہ کی) تعمیر

فارسی ادب کے اعلیٰ انشاء پردازی کے نمونوں کے مطابق پیش کرتا ہے۔ دوسرا یہ کتاب اردو سیکھنے اور سمجھنے والوں کے لئے لکھتا ہے اس کا کسی درباری ادارے سے واسطہ نہیں بلکہ اس کے سامنے تعلیمی ادارہ کے تدریسی مقاصد ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف کی اپنی شخصیت میں بھی بظاہر درباری داری کا کوئی دخل نظر نہیں آتا۔ اس لئے ایک ہی موضوع پر قصہ لکھنے کے باوجود ایک انداز نگارش دوسرے سے بمراتب مختلف ہو گیا۔ اس کی بہت سی مثالیں علمی دائرہ میں بھی تلاش کی جا سکتی ہیں۔

اردو نثر کے پس منظر میں مصنف کے شعر و ادب کے ذوق کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر شعریت اس کے مزاج میں داخل ہے اور ادب سے اس کے شعور و فکر کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو اس کی نثر اور جملوں کی ساخت غیر شعوری طور پر شعری اسالیب سے متاثر ہو جائے گی۔ مولانا شبلی اور محمد حسین آزاد اس کی بہترین مثال ہیں دونوں انشاء پردازوں کو کمال فن سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کی تحریروں میں شعریت جاری و ساری رہتی ہے، اس کے برعکس حالی بھی شاعر تھے مگر ان کی نثر پر شعریت کا اثر بہت کم ہے، یہاں ہمیں حالی کی مقصدیت کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ مقدمہ شعر و شاعری یا دوسری تصانیف کو ترتیب دیتے وقت حالی نے شعوری طور پر شاعرانہ پیرایۂ بیان سے اپنے آپ کو بچایا ہے۔ اور اس معاملہ میں سرسید کی پیروی کو باعث فخر سمجھا ہے۔ لیکن ان کا مزاج غیر شاعرانہ تھا اس کے علاوہ ابوالکلام آزاد شاعر نہ تھے مگر انہیں شعر و شاعری سے بے حد لگاؤ تھا اس کے ساتھ وہ زور خطابت کو معیار فن تصور کرتے تھے اس لئے ان کی تحریروں میں چاہے وہ قرآن پاک کی تفسیر ہو اور چاہے غبار خاطر کے خطوط ہوں، ان کی خطابت، شعر و شاعری سے غیر معمولی شغف صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقصد معیار اور مزاج اسلوب نگارش یا طرز گفتگو کو شدید طور پر متاثر کرتے ہیں۔

مقصد اور شخصیت کا اثر بھی ہر شہ پارہ پر ہوتا ہے اس کی مثال کے لئے ہم "فسانۂ عجائب" کے مصنف رجب علی بیگ سرور کا نام پیش کر سکتے ہیں۔ سرور نے اپنے افسانہ میں ایک سے زیادہ اسالیب استعمال کئے ہیں لیکن جن پر وہ زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ وہ ان کی تحریروں میں آرائشی لوازمات ہیں ایک کے بعد دوسرا ایڈیشن شائع ہوتا ہے اور نئے ایڈیشن کے لئے اپنی تحریروں پر نظر ثانی کرتے وقت وہ تراکیب کو درست اور ڈھیلے ڈھالے فقرہ کو زیادہ سے زیادہ چست بنانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر انہیں فارسی زبان اور کلاسیکی تعمیر

نثر میں کمال حاصل نہ ہوتا تو وہ اپنی اس سعی میں کامیاب نہ ہوتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر ان کے مخاطب اس آرائشِ گفتار پر بے اختیار داد نہ دیتے۔ اور اس اسلوبِ نگارش کو پسند نہ کرتے، تو وہ اس حصّہ پر زیادہ توجہ صرف نہیں کرتے۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مقاصد کا تعین تحریر و تقریر یا نظم و نثر دونوں کے اسلوب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ سادگی یا پرکاری دونوں کے اپنے کچھ لوازمات ہوتے ہیں ان لوازمات کو ہر نثر نگار یا شاعر اپنے ذاتی میلانات، مطالعہ اور مقصد کے مطابق استعمال کرتا ہے اور اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو ان کی پیش کش میں ظاہر کرتا ہے۔

تشبیہ، استعارہ، شاعرانہ اندازِ بیان، بے تکلّف گفتگو، مبالغہ، افراط و تفریط، حسن و بد صورتی، سادگی، آرائش، دلائل و براہین اور جذباتی طریقۂ رسائی، کثرتِ الفاظ، اور کم سے کم الفاظ کا استعمال ان میں سے نہ کوئی شے عیب ہے، نہ خوبی، دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان کا استعمال کہاں اور کس موقع پر ہوتا ہے اور اس موقع کے لئے یہ استعمال مناسب تھا یا نہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں مختلف شعراء پر جو رائیں دی ہیں اور ان کے کلام کا جو ASSESSMENT ان کے یہاں ملتا ہے، اس سے اختلاف اس لئے کیا جاتا ہے کہ مولانا نے اپنے تنقیدی فیصلوں کو آرائشِ گفتار کی صورت میں پیش کیا ہے جس سے اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ مولانا تعریف یا تنقید میں مبالغہ سے کام لے رہے ہیں، کیوں تنقیدی مضامین میں آرائشِ گفتار یا مبالغہ آمیز اسلوب کی گنجائش نہیں ہوتی،

اسلوب یا اسٹائل تحریر کی کسی ایک صفت کا نام نہیں یہ مرکب ہونے کے باوجود ایک بسیط شے ہے اس میں مصنف کی شخصیت کا عکس، ذہنی اور جذباتی تجربات اور نفسِ باطن کی تمام تصاویر بصورتِ الفاظ جلوہ گر ہوتی ہیں، اس میں موضوع اور مقصد کے تعلق کے ساتھ ساتھ مخاطب یا سامعین کے ذوق کا عکس بھی جھلکتا ہے یہ تمام صفت مل کر ایسی وحدت اختیار کر لیتی ہیں، جیسے خانوں میں تقسیم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، اسلوب کی یہ تمام خوبیاں جملوں میں اس طرح جذب ہو کر ظاہر ہوتی ہیں۔ جیسے تلوار میں جوہر انسان میں قابلیت و شرافت اور پھول میں رنگ و بو، غرض یہ کہ اسلوب و ادب ایک جان اور دو قالب ہیں کوئی ادب اس وقت تک وجود پذیر نہیں ہو سکتا ہے جب تک اسلوب کا سہارا نہ لیا جائے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں اسلوب خیالات کے اظہار یا فکری ترسیل کے نظام کا نام ہے اور اس سے ادیب و شاعر کے اندازِ فکر، مطالعہ و مشاہدہ، شخصیت و شعور اور طرزِ نگارش پر کسی نہ کسی پہلو سے روشنی پڑتی ہے،

تعمیر

محمد اشرف خان
وزیر زراعت و امداد باہمی

کشمیری میوے کا روشن مستقبل

کشمیر ہمیشہ سے عمدہ اور رسیلے میوؤں کے لیے دنیا بھر میں مشہور رہا ہے۔ اصل میں وادیٔ کشمیر کی خوبصورتی یہاں کے میوے کے رنگ اور ذائقہ سے مترادف ہے۔ یہاں کے میوے کو صدیوں سے ریاست کے باہر شہرت اور خیر خواہی کے سفیر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

کشمیر میں میوے کی کاشت کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ بے شک میوے کی کاشت جو ماضی میں یہاں کے لوگوں کا ایک ضمنی کام رہا ہے اب ایک اہم مقام حاصل کر چکی ہے اور صحیح معنوں میں اس صنعت کو ہماری دیہی معیشت کی فصیل تصور کیا جاتا ہے۔ اس صنعت سے نہ صرف سالانہ ۷۰ کروڑ روپے کی آمدن حاصل ہوتی ہے بلکہ ہزاروں افراد کو بلاواسطہ اور بالواسطہ روزگار فراہم ہو رہا ہے۔ باغبانی کی صنعت کو ترقی دینے اور اس سے وابستہ افراد کی فلاح کے لیے ریاستی حکومت نے پیداواری اور مارکیٹنگ شعبوں میں کئی نمایاں کام انجام دیئے ہیں اور میوہ اگانے والوں کو متعدد سہولیات بہم پہنچائیں جس کے نتیجے میں میوے کی پیداوار جو ۷۵-۱۹۷۴ء میں صرف ۲ لاکھ ۱۴ ہزار ٹن تھی، بڑھ کر ۸۰-۱۹۷۹ء میں [illegible] تک پہنچ گئی۔ اسی طرح میوہ باغات کے تحت رقبہ جو ۷۵-۱۹۷۴ء میں ۸۴ ہزار ہیکٹر تھا اب بڑھ کر ۸۰-۱۹۷۹ء میں تقریباً ایک لاکھ ہیکٹر تک جا پہنچا۔

قدمات

اگر میوے کی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا ہے ۔لیکن ماضی میں اس کی مارکیٹنگ کی جانب زیادہ توجہ مرکوز نہیں کی گئی تھی۔ موجودہ حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی میوے کی مارکیٹنگ کے فروغ کو ترجیح دی تاکہ میوہ اگانے والوں کو اپنی سخت محنت کا مناسب ثمر مل سکے ۔ اس سلسلے میں درمیانہ داروں اور کمیشن ایجنٹوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو کم کرنے کی طرف توجہ دی گئی تاکہ چھوٹے پیمانے پر میوہ اُگانے والے حکومت کی طرف سے متعدد سہولیات جس میں قرضے، مالی امداد، تکنیکی جانکاری اور ٹرانسپورٹ بھی شامل ہیں، فائدہ اُٹھا سکیں اور ملک کی میوہ منڈیوں میں ان کے میوے کی براہ راست مارکیٹنگ کی جائے اس اقدام سے حوصلہ افزاء نتایج برآمد ہوئے ۔اور مارکیٹنگ کے شعبے میں اس صنعت کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ریاست سے باہر خشک اور تازہ میوے کی برآمدات جو سال ۷۵-۱۹۷۴ء میں ایک لاکھ ۵۰ ہزار ٹن تھی، بڑھ کر سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۳ لاکھ ۴۴ ہزار ٹن تک ہو گئی۔ توقع ہے کہ یہ رواں سال کے اختتام تک ۳ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن سے تجاوز کرے گی ۔

گذشتہ کئی برس کے دوران باغات کے تحت رقبہ پیداوار اور برآمدات میں جو اضافہ ہوا ہے وہ ذیل کے ٹیبل سے ظاہر ہے ۔

سال	باغات کے تحت رقبہ	پیداوار	برآمدات
۷۵-۱۹۷۴ء	۸۳ ہزار ہیکٹر	۲ لاکھ ۴۱ ہزار ٹن	ایک لاکھ ۵۰ ہزار ٹن
۷۶-۱۹۷۵ء	۸۶ " "	۳ " ۷۴ " "	۲ " ۴۲ " "
۷۷-۱۹۷۶ء	۹۰ " "	۲ " ۴۳ " "	۲ " ۴۰ " "
۷۸-۱۹۷۷ء	۹۳ " "	۳ " ۷۴ " "	۲ " ۶۱ " "

سال	باغات کے تحت رقبہ	پیداوار	برآمدات
۱۹۷۸-۷۹ء	۹۵ ہزار ہیکٹر	۴ لاکھ ۷۶ ہزار ٹن	۲ لاکھ ۳۸ ہزار ٹن
۱۹۷۹-۸۰ء	ایک لاکھ "	۵ " ۱۲ " "	۳ " ۵۰ " " متوقع

ریاست میں چھوٹے پیلنے پر میوہ اُگانے والوں کی کواپریٹو سوسائٹیاں منظم کرنے کی طرف بھی توجہ مرکوز کی گئی تاکہ ایسے میوہ اگانے والے براہ راست میوہ برآمد کر کے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اب تک ریاست میں میوہ اُگانے والوں کی ۴۰ کواپریٹو سوسائٹیاں منظم کی جا چکی ہیں جن کے ممبران کی تعداد ۱۰ ہزار ہے۔ پیداوار کو بڑھاوا دینے اور مارکیٹنگ اخراجات برداشت کرنے کے لیے گذشتہ برس کے دوران ان سوسائٹیوں کو قومیائے گئے بنکوں سے ۹۲ لاکھ روپے کے قرضے دلوائے گئے۔ رواں میوہ موسم میں ان سوسائٹیوں کے لیے ایک کروڑ ۵ لاکھ روپے کے مجموعی قرضے منظور کیے گئے۔

منڈیوں سے رابطہ

ملک کی مختلف میوہ منڈیوں سے رابطہ قائم کرنے سروے اور نئی منڈیاں تلاش کرنے اور میوہ اُگانے والوں تاجروں وغیرہ کو روزانہ مختلف منڈیوں میں میوے کے تھوک بھاؤ، مانگ اور خرید و فروخت سے باخبر کرانے کے لیے حکومت نے دہلی، بمبئی، مدراس، کلکتہ، حیدرآباد، جے پور، پٹنہ، ٹریونڈرم بھوپال، امرتسر اور بنگلور میں ایریا مارکیٹنگ دفاتر قائم کیے ہیں۔ منڈیوں کے اُتار چڑھاؤ کی اطلاع جو ان دفاتر سے موصول ہوتی ہے، ہر روز ریڈیو کشمیر سری نگر سے نشر کی جا رہی ہے۔

کشمیری میوہ کو مزید مقبول بنانے کے لیے محکمہ ہارٹی کلچر پلاننگ اینڈ مارکیٹنگ کی طرف سے پُر کشش اشتہارات لیبلز، کتابچے اور فولڈرس وغیرہ لوگوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بیرون ریاست مختلف سینما گھروں میں میوے سے متعلق سینما سلائیڈس دکھائی جا رہی ہیں۔ ملک کے مختلف علاقوں میں پھل

کی نمائش منعقد کی جاتی ہے۔ جہاں کشمیری پھلوں کے مختلف اقسام کی تشہیر کی جاتی ہے اور فروخت کے لیے مہیا رکھے جاتے ہیں۔

جدید ترتیب بندی

چناں چہ میوے کی جدید درجہ بندی اور صحیم و پرکشش ڈبہ بندی، منڈیوں میں مقابلے سے گذرنے کے لیے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس لیے اب میوہ اگانے والوں کو درختوں سے پھلوں کی اترائی، درجہ بندی اور ڈبہ بندی کی جدید تربیت فراہم کی جارہی ہے۔ سال ۱۹۷۵ء سے اب تک تقریباً ایک ہزار افراد کو اس قسم کی تربیت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نو پورہ سوپور میں کولمبو پلان کے تحت آسٹریلیا کے اشتراک سے ایک میکنیکل ایپل گریڈنگ پروجیکٹ قائم کیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ پروجیکٹ رواں سال کے دوران چالو کیا جائے گا۔ مکمل ہونے پر پروجیکٹ میں روزانہ ۱۵۰۰ میوہ پیٹیوں کی درجہ بندی اور ڈبہ بندی کی جائے گی جب کہ پروجیکٹ کے سرد خانوں میں ۴۰۰ ٹن میوہ رکھنے کی صلاحیت ہوگی۔

پیکنگ کا متبادل نظام

پیٹیوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے میوے کی پیکنگ کے لیے متبادل انتظامات کرنے کے لیے اقدامات کیے جارہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہارٹی کلچر پلاننگ اینڈ مارکیٹنگ اور ہارٹی کلچر کارپوریشن گتے کی پیٹیاں رائج کرنے پر تجربے کررہے ہیں۔ کارپوریشن نے اس سال گتے کے ڈبوں میں آزمائشی طور "گلاس" برآمد کئے جس سے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے۔ اسی طرح پلاننگ اینڈ مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ نے ۵ ہزار گتے کی پیٹیوں میں نو پورہ سوپور کے درجہ بندی مرکز سے سیب برآمد کیے۔ یہ تجربہ بھی کامیاب ثابت ہوا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی دشواری ہے تو وہ یہ ہے کہ گتے کی پیٹیاں لکڑی کی پیٹیوں کے مقابلے میں زیادہ مہنگی ہیں۔ کیونکہ گتے کی پیٹیوں پر مرکزی سرکار

نے بھاری ایکسائز ڈیوٹی لگائی ہے۔ حکومت نے اس ٹیکس کو کم کرنے کے سلسلے میں مرکزی سرکار سے پہلے ہی بات چیت کی ہے اور اس بات کا یقین دلایا گیا ہے کہ اس معاملے پر ہمدردی سے غور کیا جائیگا اس لیے اس بات کی توقع ہے کہ آئندہ گتے کی پیٹیاں مناسب قیمتوں پر دستیاب ہوں گی اور میوے کی پیکنگ کے سلسلے میں استعمال میں لائی جائیں گی۔

[illegible]

میوہ فروشوں اور تاجروں کو دکانات کی مناسب سہولیات فراہم کرنے کے لیے جموں میں ریل ہیڈ کے نزدیک جدید مارکیٹ کمپلیکس قائم کیا جا رہا ہے۔ اب تک دکانوں کے لیے تیار شدہ ۱۵۰ جگہوں میں سے ۹۶ جگہیں میوہ تاجروں کو الاٹ کی جا چکی ہیں۔ سری نگر میں پارمپورہ کے مقام پر ایسا ہی فروٹ کمپلیکس قائم کیا جائے گا۔ جہاں ۲۸۰ دکانات کی گنجائش ہوگی۔

ٹرانسپورٹ

میوہ اُگانے والوں کو ٹرانسپورٹ کی سہولیات فراہم کرنے کے لیے بھی خاطر خواہ انتظامات کیے جا رہے ہیں اس سال میوہ تاجروں کو میوے کی ڈھلائی کے لیے ۳۰ ہزار ٹرک پھیرے مہیا کیے گئے جب کہ گزشتہ سال میں اس مقصد کے لیے ۲۵ ہزار ٹرک پھیرے فراہم کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ جموں سے بذریعہ ریل میوہ برآمد کرنے کے بھی انتظامات کیے گئے ہیں۔

[illegible]

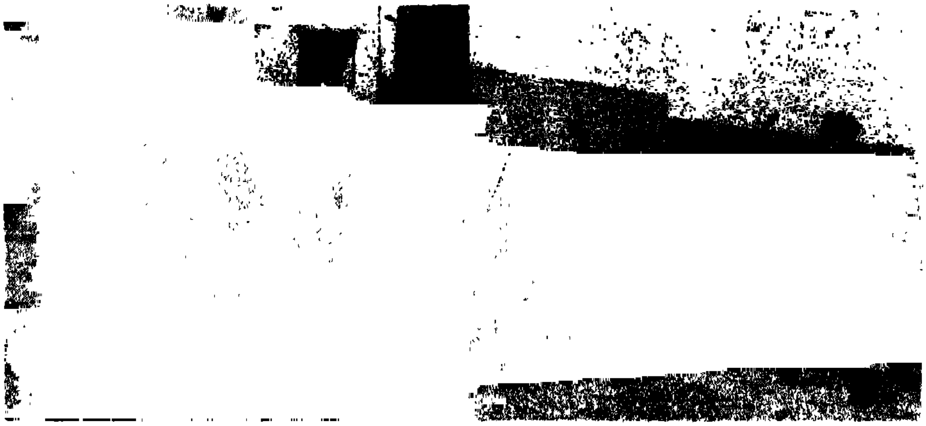
حال ہی میں ۳۰ کروڑ روپے کی لاگت سے ہارٹی کلچر انٹیگریٹڈ پروجیکٹ کو شروع کیا گیا ہے۔ پروجیکٹ کا قیام میوہ اگانے والوں کی آمدن میں اضافہ کرنے اور ریاست کی میوہ پیداوار



شیخ صاحب ایک مریض کی عیادت کرتے ہوئے۔



پونچھ میں میٹنگ ہال کا افتتاح۔



وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ کٹھوعہ کے دس بستروں والے ہسپتال کا افتتاح کر رہے ہیں۔

کا ۱۲ فیصد اور اخروٹ کی پیداوار کا ۲۰ فیصد حصّے کی مارکیٹنگ کے لیے بُنیادی ڈھانچہ فراہم کرنے کی غرض سے عمل میں لایا گیا ہے ۔

حکومت نے میوے کی مارکیٹنگ کو فروغ دینے کے لیے جو اقدامات کئے ہیں، اُن سے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں اور دہلی کی منڈی میں سیب کی فی پیٹی کا تھوک بھاؤ ۱۹۷۲ء میں ۲۵ روپے سے بڑھ کر گذشتہ برس زائد از ۵۰ روپے ہوا ہے۔ اس طرح میوے کا کاروبار روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔

نوٹ: [illegible] ارسال کرتے وقت ذیل میں دیا ہوا خاکہ پُر کرنا نہ بھولئے [illegible] کے بغیر اشاعت ممکن نہ ہو سکے گی۔

میں تصدیق کرتا / کرتی ہوں کہ میرا مقالہ / غزل / کہانی / نظم

[illegible] . . . . پہلی بار تعمیر میں شائع ہو رہا / رہی ہے۔

یہ اس سے پہلے نہیں شائع ہوا / ہوئی ہے اور نہ کسی ریڈیو یا ٹی وی سٹیشن سے نشر ہوا / ہوئی ہے۔

دستخط

ڈاکٹر اختر نظمی
صدر شعبہ اُردو کملا راجہ گرلز کالج
گوالیار (ایم۔ پی)

غزل

کیسے چھوٹی وہ رہگذر، آخر
کیا کرو گے یہ جان کر آخر

تنگیاں راستوں کی کم نہ ہوئیں
کٹ گیا ایک اک شجر آخر

آبلے تو پڑیں گے، پڑتے ہیں
کیوں چلو گرم ریت پر آخر

میں تو اچھا ہوں، کیا ہوا ہے مجھے
چاہتے کیا ہیں چارہ گر آخر

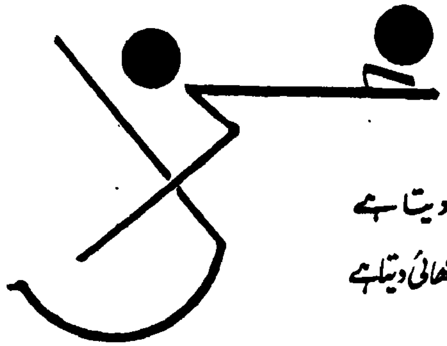
پڑھ رہا ہوں حروف کھرچے ہوئے
کیا لکھا تھا چٹان پہ آخر

جانتے ہیں مزاج سمتوں کا
دیکھتے کیوں اِدھر اُدھر آخر

راستے گھوم پھر کے لوٹ آئے
ختم ہونا ہی تھا سفر آخر

ٹوٹتا کیا طلسمِ غم نظمی
رہ گئے، ہم ہی ٹوٹ کر آخر

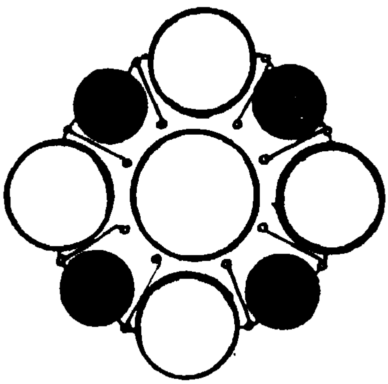
عبدالمتین نیاز
موتیا پارک بھوپال



نہ کوئی شکل نہ پیکر دکھائی دیتا ہے
بس اک غبار سا منظر دکھائی دیتا ہے

ہمارا خون ہے یہ ساعتوں کے شیشے میں
جو ایک رنگ برابر دکھائی دیتا ہے

بغیر لمس نہیں کھلتی آنکھ جذبوں کی
جو اصل شخص ہے چھو کر دکھائی دیتا ہے



مری نگاہ کسی سمت اور کیوں جائے
تمام رنگ اسی پر دکھائی دیتا ہے

کرو دماغ کو آزاد فکرِ ساحل سے
جو ڈوبنا ہی مقدر دکھائی دیتا ہے

دمکتا رہتا ہے پہروں مرے خیالوں میں
وہ ایک چہرہ جو پل بھر دکھائی دیتا ہے

یہ کیا طلسم ہے صحرائے آرزو میں نیاز
ہر اک بگولہ مجھے گھر دکھائی دیتا ہے

انیس ہمدانی

نیا اردو افسانہ

ناول کی طرح افسانہ کے لئے بھی اردو ادب زیادہ تر انگریزی ادب کا ہی رہینِ منت ہے، گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے قدیم افسانوں میں اور بوڑھی عورتوں کی اُن کہانیوں میں جو وہ بچّوں کو سوتے وقت سُنایا کرتی تھیں، بعض اجزاء ایسے ملتے ہیں جو موجودہ افسانوں کی بُنیاد بن سکے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ افسانے کی خصوصیات اسی وقت پیدا ہو سکی جب اس کی آبیاری انگریزی ادب سے کی گئی۔ اس سے پیشتر تو کسی افسانے کی اجزاء اور نہ کہانیاں خود مختصر افسانے کے ضمن میں بلا ترمیم کے شمار کئے جانے کی مستحق تھیں۔ ان افسانوں کا سرچشمہ انگریزی افسانوں کے ترجمے شائع ہوئے اور اس کی دیکھا دیکھی ترکی، روسی اور فرانسیسی زبانوں کے مختصر افسانے اردو میں لائے گئے۔

ہم افسانہ نگاری کے پہلے دور کو پہلی جنگِ عظیم کی آمد پر ہی ختم کر سکتے ہیں۔ یوں محض ذہنی سہولت کے علاوہ اس تقسیم میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جنگِ عظیم کی آمد نے ہندوستانی زندگی کے سیاسی، معاشرتی اور انفرادی پہلوؤں میں نمایاں تبدیلی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ اور اس تبدیلی کا اثر بھی قبول کیا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں پریم چند اور سجاد حیدر کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ افسانہ نگاری کا پہلا دور بھی تھا اور مختصر افسانوی ادب کا آغاز بھی۔ ان دنوں منشی پریم چند، اور سجاد حیدر یلدرم دونوں نے لگ بھگ ایک ہی وقت میں لکھنا شروع کیا۔ ان دونوں

افسانہ نگاروں نے اپنے لئے دو الگ الگ راستے اختیار کئے، پریم چند نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کیا۔ جبکہ سجاد حیدر نے زندگی کے رومانی اور فرحت بخش پہلوؤں کی عکاسی کی۔ جن لوگوں نے کامیابی کے ساتھ اردو میں دوسری زبان کے افسانوں کو ترجمہ کرکے اس ادب کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ ان کی فہرست میں سجاد حیدر کا نام زریں الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہے، غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس سلسلہ کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے سب سے پہلے اردو میں ترکی افسانوں کا ترجمہ کیا۔ سجاد حیدر کے طبع زاد افسانوں میں اکثر حیاتِ انسانی کی نفسیاتی دلیل ہوتی ہے۔ انہوں نے خیال کی رنگینی و لطافت اور زبان کی شاعرانہ طرازیوں سے افسانوی فن میں ادبِ لطیف کا رنگ ابھار کر دیا۔ جبکہ پریم چند نے دیہات کے لوگ، ان کی سیدھی سادھی زندگی، سیرت، سچائی، ایمان داری اور کبھی کبھی ان کی بے ایمانی، چالاکی، اور فتنہ پروری کا نقشہ کھینچا۔ یہی اس کے افسانوں کی جان و دل، فطری سادگی اور بے ساختگی ہے، ورنہ وہ افسانہ نویسی کے فن سے پوری طرح واقف نہ تھے۔

دوسرے دور کے افسانہ نگاروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا لیکن ان بہت سے افسانہ نگاروں میں سے چند ایسے ہیں جو مختلف حیثیتوں سے اس دور کی خصوصیات کے بہترین مظہر اور ترجمان ہیں، پریم چند اور سجاد حیدر کے علاوہ اس فہرست میں سدرشن، راشد الخیری، احمد اکبر آبادی، نیاز فتح پوری، مجنون گورکھپوری، امتیاز علی، عظیم بیگ چغتائی، علی عباس حسینی، ڈاکٹر عظیم کرلوی اور حامد اللہ افسر کے نام نمایاں ہیں، ان سب افسانہ نگاروں کی افسانوی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے، تو واضح طور پر یہ بات نظر کے سامنے آتی ہے کہ یہ سب کے سب پریم چند اور سجاد حیدر کی عام کی ہوئی روش سے متاثر ہیں۔ پریم چند سے متاثر ہونے والے افسانہ نگاروں میں سدرشن، علی عباس حسینی، عظیم کرلوی وغیرہ ہیں۔ سدرشن کے افسانوں کی نمایاں خوبی سادگی ہے، زبان بھی سادہ، بیان میں بھی سادگی اور خیال میں بھی، علی عباس حسینی کے یہاں نفسیاتی رنگ میں کرداروں کی سیرت نمایاں ملتی ہے اور ان کے مزاج میں ذہن کی شگفتگی کا ایک نکھرا ہوا لطیف رنگ بھی دکھائی دیتا ہے، جو تحریر میں چاشنی اور نکھار پیدا کر دیتا ہے۔ اور ڈاکٹر اعظم کرلوی کے پاس ایک حساس دل ہے، اس لئے وہ زندگی کے نازک واقعات اور لطیف احساسات کا ایک لمحے میں جائزہ لے سکتے ہیں، اکثر سچے واقعات کو رنگین اور دل کش بنا کر لکھ دیتے ہیں اور سجاد حیدر سے متاثر ہونے والوں میں سلطان حیدر جوش، مجنون گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے علاوہ امتیاز علی

تعمیر

وغیرہ بھی ہیں۔ جوش کی زبان میں شگفتگی اور بیان میں پختگی ہے۔ ان کا مقصد ہندوستانیوں کو مغرب کی تقلید سے بچانا ہے اور مجنوں مغربی ادب سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ ان کی ذہنیت انقلابی لیڈروں کے جوش سے پُر ہے۔ وہ تہذیب کی موجودہ روشنی میں نجات کی راہ نہیں دیکھتے

افسانہ نگاری کے تیسرے دور کی ابتداء ۱۹۳۰ء کے عالمگیر معاشی بحران سے ہوئی۔ یہ زمانہ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں بھی بڑی گہما گہمی کا تھا۔ عدم تعاون کی تحریک کی جو آگ مدتوں سے سرد پڑ چکی تھی اس کی دبی دبائی چنگاریوں میں پھر سے گرمی پیدا ہوئی۔ ہر طرف نئے قانون اور آزادی اور نئی سیاسی زندگی کے خواب دیکھے جا رہے تھے۔ اس دور میں افسانہ نگاروں کا ایک بہت بڑا کارواں سامنے آیا جن میں احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں، اختر رائے پوری، راجندر سنگھ بیدی، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر کے نام قابل ذکر ہیں
ان افسانہ نگاروں نے سیاست، دیہاتی معیشت، سرمایہ دار، مزدور کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ سدا بہار پھول، ڈالی کا جوگ، آئی، سی، ایس، کیمیا گر جیسے افسانوں نے جنم لیا۔ اور اسی زمانے نے ترقی پسند تحریک کو جنم دیا۔ ترقی پسند تحریک نے افسانے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ دراصل اس تحریک نے افسانہ نگاری کو آگے بڑھایا۔ مگر شروع شروع میں ہر تحریک کی طرح اس میں بھی مبالغے سے کام لیا گیا۔ اور بہت سے افسانے معاشی یا سیاسی مقالے بن کر رہ گئے،
یہ دور قریب قریب دس برس تک جاری رہا اور اس کے بعد کے دس برسوں میں یعنی ۱۹۴۰ء سے لیکر ۱۹۵۰ء تک جن افسانہ نگاروں نے اپنی اہمیت منوائی، ان میں ہاجرہ مسرور، بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں، پریم ناتھ پردیسی، غلام عباس، ممتاز مفتی اور شفیق الرحمان وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے زندگی کی صداقت اور فن کی لطافت کو شیر و شکر کر کے پچاس برس کی بنی ہوئی روایت کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس میں اپنی اپنی شخصیتوں کا رنگ بھر کر افسانہ کو کوئی نہ کوئی ایسی نئی چیز بھی دے دی۔ جو اس کی روایت کو زیادہ اہم اور زیادہ رنگین بناتی ہے، زندگی کی اہمیت اور فن کی رنگینی اس روایت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، اسی خصوصیت جس نے پل بھر کو بھی اسے اپنے دامن سے جدا نہیں کیا۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان سامنے آنے والے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، اشفاق احمد، انور عظیم

غلام نقوی، سید قاسم محمود، غیاث احمد گدی، جیلانی بانو، واجدہ تبسم اور رام لال وغیرہ ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے بارے میں مظہر امام لکھتے ہیں:۔

"شاید ہی زندگی کا کوئی پہلو ایسا ہو جس پر ان افسانہ نگاروں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ اور شاید ہی کوئی کردار ہو، جو ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہو۔ کانگریس کی تحریک، مہاتما گاندھی کی سیاست باضابطہ سرگرمیاں، کسانوں اور زمینداروں کی باہمی آویزش، طوائف کی داخلی اور خارجی زندگی، پردے میں رہنے والی دبی دبی سہمی سہمی عورت، اپنے ماحول سے سرکشی کرنے والی مڈل پاس لڑکی، تقسیم ہند، تبادلہ آبادی، تہذیبوں کا انہدام، اندر سے ٹوٹتا ہوا انسان، یہ سارے مسائل اور کردار کسی نہ کسی طرح اردو افسانے میں در آئے ہیں۔ تکنیک کے اعتبار سے بھی کئی طرح کے تجربے کئے گئے۔" تعمیر جلد نمبر، شمارہ ۲

۱۹۶۰ء کے بعد جو افسانہ نگار جانے پہچانے گئے، ان میں قاضی عبد الستار، کلام حیدری، جوگندر پال، نور شاہ اور ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے نام بھی شامل ہیں۔ یہ افسانہ نگار اگرچہ ۱۹۶۰ء کے بعد کے لکھنے والے ہیں۔ لیکن موضوعات کے لحاظ سے انہوں نے بھی قدیم موضوعات کو ہی اپنے اولین افسانوں کا موضوع بنایا۔ قاضی ستار نے مٹتے ہوئے جاگیردار طبقے کی نفسیاتی کشمکش کو بہت ہی تاثر انگیز اور دلکش انداز میں پیش کیا۔ جوگندر پال نے علامتی اور استعاراتی انداز کو اپنایا۔ کلام حیدری نے راست اسلوب اور علامت دونوں سے استفادہ کیا۔ نور شاہ نے جہاں علامتوں کا استعمال کیا۔ وہاں روایتی طرز تحریر کو بھی فراموش نہیں کیا۔ ڈاکٹر حامدی نے اپنے ابتدائی افسانوں میں روایتی انداز کو پیش کیا۔ اور اپنے افسانوں کے موضوع کو اپنے ارد گرد کے ماحول کا عکاس اور آئینہ دار ثابت کیا۔

اس کے بعد نوجوان افسانہ نگاروں کا ایک اور قافلہ سامنے آیا۔ جو روایت سے انحراف تو کرتے ہیں لیکن پھر بھی اپنے آپ کو جدیدیت کے اس لباس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو یورپ نے اپنایا ہے۔ یہ افسانہ نگار روایتی طرز بیان سے ناطہ منقطع نہ کرتے ہوئے بھی علامتوں، تشبیہوں اور تحریری رنگ کو اپنا رہے ہیں۔ ان ہی دور جدید کے لکھنے والوں کے بارے میں ابو الکلام قاسمی لکھتے ہیں:۔

"ان کے بعد ہند و پاک کے کم از کم ایک درجن افسانہ نگاروں نے نئی کہانی کے سرمایے میں بیش قیمت اضافے بھی کئے۔ مگر کچھ ہی عرصے میں ان کے گرد ناپختہ کاروں کی اتنی بڑی بھیڑ جمع ہوئی کہ طب واپس

تعمیر

کی شناخت تک مشکل ہوگئی۔ اِن خام کاروں کے پاس لسانی قوت اختراع تھی اور نہ اُنہیں زندگی کا عرفان حاصل تھا۔"

"الفاظ"، شمارہ ۵، ۶، جلد ۲

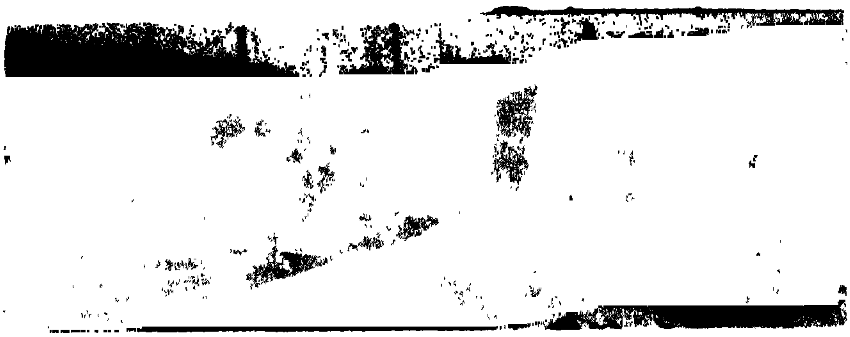
بے شک یہ خام کار ہیں اور اِن کے پاس لسانی قوتِ اختراع بھی ہے اور نہ ہی اُنہیں زندگی کا عرفان حاصل تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ شاید قاری سے نئے افسانے کے رشتے کا کمزور پڑنا اور ساتھ ہی ساتھ کہانی کی مقبولیت میں رکاوٹ، لیکن کیا وجہ تھی یا ہے یا ہو سکتی ہے؟ وہ ضرور خام کار ہیں۔ لیکن جب اُنہیں خام کار کہہ کر افسانوی ادب سے دھکے دے دے کر باہر نکالا جا رہا ہے تو کیسے وہ پختہ کار بن سکتے ہیں، کیسے اُن میں لسانی قوت آسکتی ہے اور کیسے اُنہیں عرفان حاصل ہو سکتا ہے؟



شیخ صاحب راجوری میں کالج کی عمارت کا ماڈل دیکھ رہے ہیں۔



راجوری ضلع صنعتی مرکز کا افتتاح۔



راجوری ضلع ترقیاتی بورڈ کا اجلاس۔

طٰہٰ نازکی
وارڈ نمبر ۲ ، نزد ....
بانڈی پورہ (کشمیر)

وِتستا کی سہیلیاں

وِتستا ہمارے اساطیر کی حسین شہزادی ہے ۔ ویرناگ کی یہ بیٹی خوابوں کی دنیا میں ولر کے شہزادے کو پہچان لیتی ہے ، تو پشاچوں کی دُنیا میں قدم رکھنے کیلئے تمام زنجیریں توڑ دیتی ہے ۔ اس افسانے میں ہمارے لوک ادب کا کتنا حصّہ ہے ۔ اُسے سمجھنے کےلیے نیل مت پران سے راج ترنگنی تک تاریخ کا سفر بہت ہی دِل چسپ ہے ۔ وِتستا جہلم کشمیر کے مانگ کی سیندور ہے ۔ کشمیری تاریخ میں وِتستا کا کافی حصّہ ہے اور یہاں کی جنگوں میں کئی بار وِتستا نے خاصا حصّہ ادا کیا ہے ۔ میں اس وقت اس کے تاریخی پہلو پر لکھنا نہیں چاہتا ، البتہ اس کی سہیلیوں اور ہمجولیوں کا تذکرہ کروں گا ۔

[illegible]

اس کا منبع برارِ بال کے برف سے پگھلا ہوا پانی ہے اور ساتھ ہی ساتھ شاہ آباد کے مقام پر ویرناگ کا پانی بھی اسی کے ساتھ مِل کر کھنہ بل میں نالہ برنگی اور نالہ آرہ بیتی کے ساتھ مِل جاتا ہے اور اسی ملے جلے دریا کو جہلم یعنی "وِتستا" یا ویتھ نام پڑتا ہے ۔

نالہ برنگی

اس کا منبع ہوکھ سر اور نو لوگ نئے ہیں، ککر ناگ اور دوسرے چشموں کا پانی بھی اس میں اننت ناگ کے مقام پر ملتا ہے۔ آگے چل کر یہ نالہ آرہ پتی میں مل کر جہلم کو بڑھاوا دیتا ہے۔

آرپت

اس کا منبع ژہر ناگ برہمہ سر، رودہ سر، مرگن کی پہاڑیوں سے آنے والا پانی اور اچھہ بل سرچشمہ لون، اننت ناگ کا پانی ہے یہ مل کر برنگی اور ساندرن میں شامل ہو کر کھنہ بل کے مقام پر دریائے جہلم میں داخل ہوتا ہے۔

نالہ لدر یہ منبع دن

یہ پرگنہ لار اور امرناتھ کے جنوبی کوہستانوں سے نکل کر چار ندیوں میں بٹ جاتا ہے اول گوپچھ براری دوم وارہ واس، سوم تارسر کے چشمے سے، چہارم شیشرم ناگ سے، یہ چاروں ندیاں مل کر دریائے لدر کا نام پاتی ہیں۔ اور دچھن پارہ کے علاقے کو سیراب کرتی ہوئے دریائے جہلم سے جا ملتی ہیں۔

وشو

اس کا اصلی منبع کوثر ناگ ژہر سر دوسرے چھوٹے بڑے تالاب اور اس کے برفانی میدان ہیں۔ پہاڑوں سے آتا ہوا یہ دریا اہربل میں نہایت اونچائی سے نیچے گرتا ہے۔ اونچائی سے گرنے

والا یہ آبشار نہایت ہی دلفریب ہے اس کے غبار میں سینکڑوں قوس قزح ناچتی ہیں۔ یہ جگہ اس وقت بھی سیاحوں کا مرکز ہے، اور ہمارے ماضی میں بھی شاہان شہیری، چک اور مغل اس جگہ کے دلدادہ رہے ہیں۔ چنانچہ ظفر خان احسن مغل گورنر نے اس کی تعریف میں لکھا ہے ؎

زجنت چند گوئی اے سخن ور | ندارد آبشارے مثل آہر
یکے دریائے بے پایاں زخار | زاوج کوہ می غلطد بیک بار
چو گردد از فراز کوہ راہی | شود کرار خروشش گوش ماہی
یقینم شد ازیں گردندہ دولاب | کہ گردد آسیای چرخ زیں آب
نگہ دارد تماشائے نظر را | کہ بالغزد ازاں نور بصر را

اس کے بعد مختلف نہریں، مختلف چشمے اور لوشی جو کہ دلوہ سر کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اس کے ساتھ آملتا ہے۔ ویتھ وتر جس کا منبع چشمۂ ویتھ وتر ہے اور لو موضع بیمنو کے نزدیک ہے بھی سندرن وغیرہ کے پانی سے مل کر ہالبش کے مقام پر ولیشو کے ساتھ آملتا ہے۔ نائین پہنچ کر نالہ ریشی آرہ کا پانی بھی اس میں شامل ہوتا ہے اور یہ تمام پانی دلوہ سر اڑون اور اننت ناگ کی زمینوں کو سیراب کرتے ہوئے سنگم کے نزدیک دریائے جہلم میں جا ملتا ہے۔ اس سے ۱۲ نہریں نکلتی ہیں جن میں سے چار قابل ذکر ہیں۔ پہلی نہر سوتہ من یہ موضع جمہ نگری میں اپنے اصل سے الگ ہوتی ہے اور اردن پائین کو سیراب کرتی ہے اور آگے چل کر اپنے اصل میں جا ملتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ندی راجہ سودرن نے کھدوائی تھی۔ دوسری نہر موضع ولٹو سے نکل کر علاقہ آڑون کو سیراب کرتے ہوئے نادہ پورہ میں ولیشو کے ساتھ جاملتی ہے تیسری نہر موضع "لونگر" جو کہ بکھری پورہ سے نکل کر موضع کولہ گام دلوہ سر سے ہوتے ہوئے موضع کیموہ میں ولیشو کے ساتھ جاملتی ہے۔ چوتھی نہر جس کا نام نانڈی ہے جو کہ ہالبش سے نکل کر موضع نانڈی پرگنہ اننت ناگ سے ہوتے ہوئے بیجبہارہ میں جہلم سے جاملتی ہے۔ کہتے ہیں کہ نندی نام کی

تعمیر

یک بدقماش عورت نے یہ نہر کھدوائی تھی۔

رنبی آرہ

اس کا منبع نندن سر جیندن سر اور ردبڑیں کے کوہستانوں کے علاوہ پیر پنچال کے برفانی سلسلے ہیں۔ ہرہ لپور میں اس سے چار منفرد ندیاں بہتی ہیں پہلی ندی سن گلو منبع ژوگام سے ہوتے ہوئے پرگنہ آڑون اور زینہ پورہ کو سیراب کرتے ہوئے وپی کے مقام پر اپنے ہی منبع میں سمٹ جاتی دوسری ندی ناتھو پائین ژوگام سے ہوتے ہوئے ترتر میں نالہ سن گلو سے ملتا ہے تیسری ندی سپرہ سمن پرگنہ شکرو اور چھراٹ کے کچھ دیہاتوں کو آب پاشی کرنے کے بعد ٹہب سے ہوتے ہوئے مختلف چھوٹی ندیوں کو اپنے ساتھ ملانے کے بعد لل ہار رتنی پورہ میں رنبی آرہ کے ساتھ جا ملتی ہے۔ چوتھی ندی موضع کادہ ولی لما زمینوں کو سیراب کرنے کے بعد ذرا آگے چل کر دریائے جہلم میں جا ملتی ہے اور خود رنبی آرہ پرگنہ شادرکی کھیتوں کو سیراب کر کے نایینہ کی جگہ پر ولیشو کے ساتھ جا ملتی ہے۔

رامشی

اس کا منبع سرچشمہ رامہ سرشوپہ کوری کی پہاڑیوں کے علاوہ کاڑہ گلوان ہیں۔ اور آگے چل کر دان زب میں اس کے تین حصّے ہوجاتے ہیں۔ ایک نالہ قاشی جوکہ پچھر لورہ سے ہوتے ہوئے قصبہ چرار سے گذرتا ہے دوسرا قاشی جوکہ خام پورہ کو سیراب کرتا ہے اور تیسرا نالہ رامشی جوکہ پرگنہ چھراٹ کے کھیتوں کو سیراب کرنے کے بعد کاکا پورہ میں جہلم کے ساتھ ملتا ہے۔

نالہ تولہ تریزن

اس کا منبع مکش ہے جوکہ چرار شریف اور پچھر لورہ کے بیچ میں واقع ہے۔ یہ نالہ

---

۱ کشمیری میں نالے کو کہتے ہیں

بہت ساری کھیتوں کو سیراب کر کے ویتھ نار گاؤں میں جہلم کے ساتھ مل جاتا ہے ۔

نالہ دودھ گنگا

اس کا منبع دودھ سر، سنگ سفید، کاژہ گُردان اور پیرپنجال کی پہاڑیوں سے آنے والا پانی ہے۔ آری گام کے بیچوں بیچ گزر کر چھتہ بل کے مقام پر دریائے جہلم میں جا ملتا ہے ۔ اس کا پانی بہت ہی میٹھا ہے ۔

نالہ آہج

اس کا منبع رکے یار کے برفانی کوہستان اور دوسری معاون ندیاں ہیں یہ مانچھ ہامہ اور دین سو کے علاقوں کو سیراب کرتے ہوئے ہمتہ کی دلدلی زمینوں سے گذر کر ہاکر میں جا ملتا ہے ۔

نالہ کانہامہ

اس کا منبع تُسک ناگ بیروہ کے برفانی کوہستانوں کے علاوہ کوہ پالس اور توسہ میدان ہیں جو کہ پرگنہ بانگل سے مختلف نہروں کی صورت میں آتے ہیں علاقے کی زمینوں کو سیراب کرنے کے بعد اس سے تین نہریں جُدا ہوتی ہیں ۔ پہلی نہر کانہامہ کے بیچوں بیچ ۔ دوسری نہر ہانجی ویر کے راستے سے ۔ تیسری نہر سلطان پورہ سے بماسر میں گرتی ہے اور آگے چل کر نایدکھی کے مقام سے نکل کر ہارتار میں جھیل ولر کے ساتھ جا ملتی ہے ۔

نالہ ننگل

اس کا منبع سرچشمہ آلہ پتھری اور افروٹ کے برفانی پہاڑ ہیں ۔ گلمرگ کے بیچوں بیچ

گذر کر دوسرے پہاڑوں سے آنے والا پانی اس کے ساتھ مل جاتا ہے۔ پرگنہ کروہن کے زرعی زمین کو سیراب کرنے کے بعد تارزو کے مقام پر ولر میں جا ملتا ہے۔

نالہ ہارُن

اس کا منبع سرچشمہ تارسر اور پھاگ کے برفانی پہاڑوں کا پانی ہے یہ داچھی گام کے درے سے ہوتے ہوئے تیل بل کے مقام پر جھیل ڈل میں داخل ہوتا ہے۔ اس سے بہت ساری نہریں منفرد طور پر بہتی ہیں اور راجہ بُک نے ایک نہر موضع ناگ لورہ سے نکالی ہے اور پرگنہ پھاگ کے شمالی علاقے کو خوبصورتی بخشتی ہے۔ اس نہر کو مادسر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مغل بادشاہ جہانگیر نے اس سے ہارون کے مقام پر ایک نہر نکالی تھی۔ یہ نہر شالیمار باغ کو سیراب کرتی ہے۔ آصف جاہ خان نے اس سے ایک اور نہر کھدوائی ہے جو کہ نشاط باغ کو سیراب کرنے کے علاوہ آبشاروں میں استعمال ہوتی تھی اور جناب خواجہ شاہ نیاز نقشبندی کے فرمانے پر ایک نہر ہارون کے بالائی دامن سے نکال کر برین گاؤں کو سرسبز بناتی ہے اور اس کے بعد ان تینوں کا پانی جھیل ڈل میں مل جاتا ہے اور پھر ڈل سے دو جگہوں پر نکلتی ہے۔ ایک نالہ مار جو کہ خواجہ یار بل میں جُدا ہوتی ہے اور برار نمبل کی دلدلی زمین میں داخل ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نالہ مار کو بڈشاہ نے شہر کے شمالی حصے میں کھدوایا تھا۔ اس سے چند ندیاں الگ ہوتی ہیں۔ ایک خانیار کے درمیان سے ہوتے ہوئے ہے جس کو سید بزرگ شاہ نے کھدوایا تھا۔ دوسری ندی "دولت کول" جو کہ بادشاہ دولت چک نے اپنے دورِ حکومت میں کھدوا کر اپنے مکان کے صحن سے ہوتے ہوئے گذاری تھی اور جو کھارہ بازار کی آگ کے واردات میں ہٹ گئی تھی۔ اسی نہر پر خواجہ شاہ نیاز نقشبندی نے ، ہزار روپیہ صرف کر کے پھر سے جاری کروایا تھا۔ تیسری ندی تارہ بل اشرف کدل سے نکل کر خوشحال سر سے ہوتے ہوئے انچار سر میں گرتی ہے اور نالہ ہارون کا باقی حصہ ڈُڈنٹی کُل کے نام سے درگجن

سے نکل کر شیر گڈھی کے مقام پر دریائے جہلم سے جا ملتا ہے۔

امرناتھ نالہ

اس کا منبع دچھن پارہ اور امرناتھ کی پہاڑیوں سے آنے والا پانی ہے۔ یہ پانی اکٹھے ہو کر اسی پہاڑی کے درے سے گزرتا ہے اس پہاڑی کی مٹی کا رنگ سفید ہونے کی وجہ سے اس کا پانی بھی سفید پڑ جاتا ہے۔ جسکی وجہ سے اس کا پانی دودھ جیسا ہوتا ہے اور آگے چل کر یہ سندھ لار میں جا ملتا ہے۔

کنکنی ندی

اس کا منبع ہرموکھ گنگا اور کولسر وغیرہ سے آنے والا پانی ہے۔ یہ ان برفانی پہاڑیوں سے آکر موضع کنگن میں سندھ لار میں جا ملتی ہے۔

سندھ نالہ

چشمہ وگر ھگن جو کہ زوجیلا چوٹی پر واقع ہے اس کا منبع ہے۔ اس چشمے کے دو حصے شرقاً غرباً بہتے ہیں۔ مشرقی شاخ دراس سے ہوتے ہوئے دریائے سندھ میں جا ملتی ہے۔ مغربی شاخ کا تاس کشمیر کی وادی ہے۔ اس کے ساتھ معاون ندیاں ملتی ہیں اور نیچے آکر یہ دریائے سونہ مرگ کے نزدیک وادی میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں کچھ اور ندیاں اسکے ساتھ ملتی ہیں اسے اپنے سرچشمے کے اعتبار سے سندھ ہی کا نام دیا جاتا ہے۔ علاقہ لار کے بیچوں بیچ گزر کر شادی پور کے مقام پر جہلم سے جا ملتا ہے۔ دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے سنگم پر ہندوں کا مقدس تیرتھ واقع ہے اس کے نزدیک ہی شاہان مغلیہ کی یادگار چناروں کا باغ ہے۔ اس دریا کا پانی نہایت سرد ہونے کے ساتھ ساتھ گہرے نیلے رنگ کا ہے۔

تعمیر

نالہ آرن

اس کا منبع شیراسر اور دوسرے سر ہیں۔ جن کا پانی ہرموکھ اور دوسرے مقامات سے آ کر مل جانے کے بعد پرگنہ کھوئیہامہ کے نادی ہل گاؤں کے درے سے تین راستوں سے آ کر جھیل ولر میں جا گرتا ہے دو ندیاں موضع آرگام کی کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں۔ اور ایک ندی پہاڑی کے شمالی طرف کے علاقے کو سیراب کرتی ہے آگے چل کر موضع پاپہ چھن سے ہوتے ہوئے موضع لانکریشی پورہ میں ولر کی گود میں سمٹ جاتی ہے

نالہ مدمتی

ہرموکھ کے شمالی حصّوں کی ایک چوٹی۔ راچھن ہتچھن، کے برفانی تالابوں سے یہ نالہ نکلتا ہے اس کی دو شاخیں ہیں مشرقی شاخ گریز کی طرف بہتی ہے۔ اور آگے چل کر دریائے کشن گنگا سے جا ملتی ہے مغربی شاخ لبہ کپال اور دیون کے گاؤں سے ہوتے ہوئے علاقہ کھوئیہامہ کی شمال و مشرقی زمینوں کو آباد کرتے ہوئے ستر ونی پہنچ جاتی ہے جہاں ایک اور نالہ "نالہ لونار" اس کے ساتھ ملتا ہے۔ یہاں ہی اس نالے سے نہر زینہ گر نکالی گئی ہے۔ لوکھوئیہامہ کے مغرب کی طرف بہہ کر علاقہ زینہ گیر کو سیراب کرتی ہے۔ ایک اور نہر ملک کول کے نام سے بھی نکالی گئی ہے جس سے نہر زینہ گیر کے بالائی علاقے کی زمین سیراب ہوتی ہے۔ ستر وانی سے گذر کر مدمتی کھوئیہامہ کے کئی گاؤں کی زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ نالہ مدمتی کے پانی سے بانڈی پورہ نو پورہ۔ آجر۔ کھارہ پورہ۔ آیت مول۔ کلوسہ، وٹہ پورہ۔ قاضی پورہ۔ اونہ گام پتوشے ناتھ پورہ داچھیگام کی زمینیں سیراب ہوتی ہیں۔

کرشنہ گنگا

اس کا منبع کرشنہ سر ہے۔ اسی لئے اس کا نام دریائے کرشنہ گنگا رکھا جا چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ دلشنہ سر۔ یم سر اور برفانی پہاڑوں کا پانی جا ملتا ہے۔ آگے چل کر اس میں یم سر گاڈھ سر

تیمیر



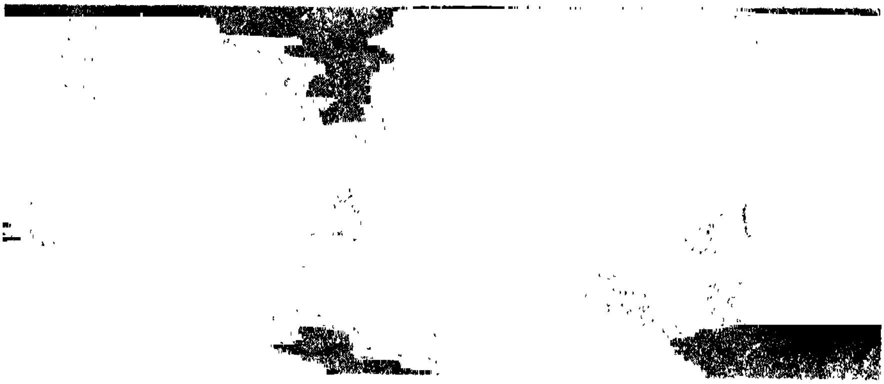
وزیر اعلیٰ ممبھلا میں بلاک ہیڈکوارٹر کی عمارت کا افتتاح کرتے ہوئے۔



ضلع ترقیاتی بورڈ پونچھ کا اجلاس۔



بسوہلی میں ضلع ترقیاتی بورڈ کے اجلاس سے وزیر اعلیٰ کا خطاب



اُودھم پور ضلع ترقیاتی بورڈ کا اجلاس۔

تلیل، دلوہ سوئی، برزنہ بال اور گریز کے پہاڑیوں کا پانی جا ملتا ہے۔ اس کے ساتھ کھوہامہ کے شمالی علاقے کے دوسرے ندی نالے ملنے کے ساتھ ساتھ دوسرے علاقوں اور کرناہ سے آنے والا پانی اس کے ساتھ جا ملتا ہے اور آگے چل کر دومیل کی جگہ پر یہ دریائے جہلم سے جا ملتا ہے۔

کٹہ کول

یہ نہر دریائے جہلم سے شیرگڈھی کے نزدیک سے نکالی گئی ہے۔ اور شہر کے جنوبی حصے کو سیراب کرکے صفاکدل کے نزدیک دریائے جہلم میں جا ملتی ہے۔

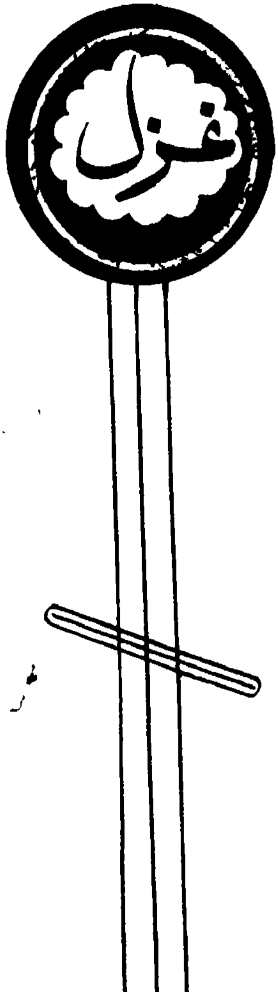
سونر کول

یہ ندی سید منصور صاحب کی زیارت کے نزدیک نہر کٹہ کول سے نکالی گئی ہے اور آگے چل کر نالہ دودھ گنگا سے جا ملتی ہے۔

نالہ شادی پورہ

یہ نالہ شادی پورہ میں دریائے جہلم سے نکالا گیا ہے۔ ماکورسر اور بماسر سے ملنے کے بعد آگے بڑھ کر جھیل ولر میں جا ملتا ہے۔

عبدالرشید فدا
بھروٹ (راجوری) جموں



بڑا پُرپیچ سارا راستہ تھا
مجھے تنہا سمندر گھورتا تھا

اسے راس آگئی بادِ مخالف
مگر موسم کا چرچا جا بہ جا تھا

کہانی اپنی سب سے مختصر تھی
طوالت کی وجہ کا حادثہ تھا

تامل۔ تشنگی۔ تحقیر۔ توبہ
خُدا جانے اُسے کیا ہوگیا تھا

بڑی سنگین تھی پَل پَل کی یلغار
ہر ایک بوڑھا مسافر کھانستا تھا

تماشائی تھے منظر کے ہزاروں
اکیلا بھیڑ میں وہ رو رہا تھا

سبھی گرم سفر تھے سوئے منزل
شہر بھر میں تماشہ ہو رہا تھا

گھنے بادل فدا تھے بستیوں پر
وہ چوراہے پہ رستہ دیکھتا تھا

حمید اللہ بٹ
کشمیر یونیورسٹی حضرت بل سرینگر

ناگ دیوتا

بے چین ہوکر اچھہ دری سانپ چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہورہا تھا۔ اتنا عرصہ خاموش رہنے کے بعد نہ جانے آج اچانک اسے کیا ہوگیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! بائیس سال تک وہ عام لوگوں، مالا پجارن اور پجاری کی نظروں میں ناگ دیوتا بن کر اندھی عقیدت کا سرمایہ لٹاتا رہا۔ لیکن آج اس کی ایذا پرستی دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ پاگل ہے۔ ہاں شاید وہ پاگل ہوچکا تھا ......

جس دن سے مالا پجارن نے اس ویران مندر میں آکر اپنی مدھر آواز، سُر اور مدہوش کر دینے والے سنگیت سے زندگی کو جنم دیا تھا اس دن سے تو ناگ دیوتا مورتی کے سامنے گھنٹوں بے حس وحرکت پتھر بن جاتا اور مالا پجارن کے آخری سُر کے بعد چھوٹی چھوٹی نگاہوں سے گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لیتا۔ پوجا میں شامل گنوار دیہاتی بھگوان شو کی آرتی اُتارتے۔ لیکن آج کی منحوس گھڑی نے ناگ دیوتا کو عقیدت کے سنگھاسن سے گرا کر سانپ بنا دیا تھا۔ سانپ مندر سے بھاگ کر چٹانوں سے سر ٹکرا کر پاگل ہورہا تھا اور پوجا میں شامل لوگ ششدر اور حیران تھے ......

اونچے پہاڑوں کی خوفناک گھاٹیوں سے نکل کر گھنے جنگل کے دشوار گذار راستوں سے ہوکر ایک بڑے کھوکھلے پتھر کو لوگوں نے مندر بنادیا تھا۔ کچھ تو کہتے تھے کہ بھگوان کرشن کا مندر ہے۔ کرشن اور اس کی داسیوں کا ملن اسی جگہ تو ہوا تھا۔ کچھ تو اسے بھگوان رام کا مندر کہتے تھے بن باس میں یہی وہ جگہ تھی جہاں راون نے راکھشس بن کر لوٹ کر سیتا کو اٹھالیا تھا۔ اور سیتا نے اس پتھر کو ساکھشی بنایا تھا کہ یہ رام سے ساری داستان بیان کرے۔ کچھ تو اس مندر کو ہنومان جی کی فوج کی چھاونی سمجھتے تھے اور پھر جب سے ناگ دیوتا نے اسے اپنا گھر بنالیا تو یہ کھوکھلا پتھر شو بھگوان کا مندر کہلانے لگا۔ نہ جانے اس پتھر کو اور کیا کیا نام دیا گیا تھا . . . .

مالا ایک سنسان رات کو دیو مالا کا حسن و شباب تھے۔ مندر کا دروازہ کھٹکھٹاتی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ شاید وہ حسن و جوانی کے بوجھ کو سہارا نہ دے سکتی تھی۔ نہ جانے اس پر کیا بیتی تھی . . . . . ! آئی اور یہیں کی ہوگئی۔ کسی کا نام تک بھی کبھی نہ لیا۔ سُر سنگیت اور پوجا۔ اب یہی اس کی زندگی تھی . . . . .

ناگ دیوتا مالا پجارن کی لئے سُن کر بُت بن جاتا اور لوگ بھگتی گیتوں کو سُن سُن مست ہوجاتے اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب ناگ کے منہ سے لعاب کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس چھوٹی سے نالی میں گرے جو گاؤں کی اور بہتی تھی۔ گاؤں میں پوتر پانی کی بانٹ کئی جھگڑوں کا موجب بن گئی تھی اور پچھلی بڑی لڑائی کے بعد یہ پانی صرف چند برہمن زمینداروں کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ لیکن غریب مائیں اپنی ممتا کو کس طرح بہلاتیں؛ وہ تو چوری چھپے اپنے بچوں کو یہ پانی پلایا کرتیں تھیں۔ بھگوان شو کی خوشنودی کے لیے . . . . .

سنجو کمہار کی اکلوتی بیٹی چندا اور بڑے زمیندار کے اکلوتے بیٹے رامو مر گئے۔ اب گاؤں میں ہر روز کوئی نہ کوئی اچانک تڑپ تڑپ کر مرجاتا اور اس کا رنگ نیلا پڑ جاتا۔ لوگ کہتے تھے کہ کوئی ناگہانی بلا ہے۔ شیو بھگوان ناراض ہیں۔ اسی لیے تو اب ہر روز

بھگوان شو کے مندر میں گاؤں والوں کی بڑی تعداد پوجا پر حاضر رہتی اور بھگوان شو سے معافی کی بھیک مانگی جاتی۔ اسی لیے تو مالا پجارن کو رات گئے تک مندر میں گیت و سنگیت کی محفل کرنی پڑتی۔ اسی لیے تو ناگ دیوتا کی آنکھیں پتھرا جاتیں اور لعاب کے قطرے تیزی سے نالی میں گر جاتے اور پھر ایک دن لعاب ٹپکنا بند ہو گیا ......

بائیس سال خاموش رہنے کے بعد ایک دن ناگ دیوتا سے رہا نہ گیا۔ وہ اچھ دری سانپ بن گیا اور تیزی سے چھلانگ لگا کر مالا پجارن کو ڈس لیا۔ لوگ حیران تھے کہ مالا پجارن کیسے بچی۔ کاٹنے کا کوئی اثر اس پر نہ ہوا تھا۔ لوگ کہتے، تھے کہ بھگوان شو کی دیا ہے۔ بھگوان اپنے چاہتوں کے لیے آگ کو پھول بنا دیتا ہے۔

سانپ اپنے سر کو چٹانوں سے ٹکرا رہا تھا اور لوگ کہتے تھے کہ ناگ پاگل ہو گیا۔

پجاری بھیڑ سے دور کچھ بڑبڑا رہا تھا ••

تعمیر نو

بھیڑوں کی افزائش

محکمہ افزائش بھیڑ جموں و کشمیر نے پندرہ سال پہلے جنم لیا اور ریاست کے اقتصادی ڈھانچے کو متحرک کرنے میں اپنا بھرپور حصہ ادا کر رہا ہے۔

کسی بھی چیز کا معیار بڑھانے کے لئے تحقیق ایک لازمی امر ہے۔ جو معیار کو پرکھنے کے لئے مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے، ریاست میں دیسی نسل کے بھیڑوں کو اعلیٰ نسل میں تبدیل کرنے کا عمل بھی کئی سال تک مسلسل تحقیق کے مراحل سے گذرا، اور آخر کار یہاں کے آب و ہوا سے مانوس کشمیر مرینو بھیڑ کو تیار کرنے میں کامیاب ہوئے کشمیر مرینو بھیڑوں کی ایک ایسی نسل ہے، جو اُون اور گوشت پیدا کرنے میں دیسی نسل سے ہزار درجہ بہتر ہے، ریاست میں قائم شیپ فارموں میں اعلیٰ نسل کے بھیڑوں کی تعداد سولہ ہزار ہے۔

گوشت کی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلے میں ریاست جموں و کشمیر ہر سال ملک کی دیگر ریاستوں سے بھیڑوں کی اچھی خاصی تعداد درآمد کرتی ہے، اس کمی کو دور کرنے کے لئے محکمہ نے تحقیق کا کام ہاتھ میں لیا ہے، اور اس غرض کے لئے کشمیر میں آلس ٹینگ اور جموں (ادھمپور) میں منیچل کے مقام پر دو مٹن ریسرچ فارم قائم ہیں جو تحقیق کے کام کو وسعت دینے میں مگن ہیں، ریاست میں بھیڑوں کی تعداد اور انسانوں کی آبادی کا تناسب ایک اور پانچ ہے جبکہ کئی دوسرے ممالک میں بھیڑوں کی تعداد انسانوں کی آبادی سے کئی گنا زیادہ ہے، اور تناسب کی شرح دس اور ایک

ہے۔ لہذا گوشت کے معاملے میں جدید تحقیق سے ریاست کم از کم گوشت کی درآمد میں کسی حد تک کمی کر سکتی ہے پھر بھی محکمہ نے اس ضمن میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ اس طرح ہے کہ ریاست میں گوشت کی پیداوار ۷۵-۱۹۷۴ء سے ۸۱-۱۹۸۰ء تک ۴۶۰۰ ٹن سے ۷۹۰۰ ٹن ہوگئی ہے۔

کشمیر چونکہ ہمالیائی سلسلہ کی ایک سرد ریاست ہے۔ اس لئے گوشت کے ساتھ ساتھ اون کی احتیاج بھی رہتی ہے۔ مدت تک اون کی ضروریات پورا کرنے کے لئے ہم دوسرے ممالک کے دست نگر رہے ہیں۔ لیکن محکمہ کی ترقیاتی پروگراموں کی تشکیل سے اس میدان میں نمایاں ترقی کی گئی ہے اور ریاست ملائم اون کی ضروریات کو پورا کرنے کی اہلیت کے قابل ہوگئی ہے۔ شیپ پروڈکٹس بورڈ کی تشکیل سے خرید و فروخت میں آسانی اور آمدنی میں اضافہ ممکن بنایا گیا ہے۔ اس بورڈ کے قیام سے شیپ فارمروں کو اپنی محنت کا بھرپور معاوضہ حاصل ہوگا۔

ریاست گیر پیمانے پر قائم سینکڑوں توسیعی مراکز کی وساطت سے ریاست کی پوری بھیڑوں کی آبادی کو علاج و معالجہ کی سہولیت فراہم کی جاتی ہیں۔ جدید ساز و سامان سے لیس دو تحقیقی لیبارٹریاں ایک جموں اور ایک سرینگر میں قائم ہیں جہاں بھیڑ بکریوں کی بیماریوں کی تشخیص انجام دی جاتی ہے اور روک تھام کے اسباب تجویز کئے جاتے ہیں

ریاست نے کاریگروں کو کام مہیا کرنے کے لئے وش (مٹن) میں حال ہی میں ایک خرگوش فارم قائم کیا گیا ہے خرگوش ذریعہ دستکاروں کے لئے دس ہزار نمونے پیدا کر کے ان کے لئے روزگار کے مواقع کو آسان بنانے میں مدد کرے گا۔ اس طرح خرگوش نمونے درآمد کرنے میں لاکھوں روپے کے زرمبادلہ کی بچت بھی ہوگی۔ اس کے علاوہ منک اور ایک خاص نسل کی لومڑیوں کی افزائش کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ قراقلی نمونے پیدا کرنے کیلئے کرگل میں ایک فارم قائم ہے۔

ریاست کے طول و عرض میں اس وقت تک ۵۹۰ توسیعی مراکز قائم ہوئے ہیں۔ جو طبی امداد کے علاوہ دیہی نسل کے ریوڑوں میں اعلیٰ نسل کی خصوصیات پیدا کرنے کے پروگرام میں جٹ گئے ہیں۔ اس سلسلے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس سے ریاست میں بھیڑوں کی کل تعداد میں سے نصف سے زیادہ بہتر نسل میں تبدیلی ہوئی ہے ہمارے شیپ فارمر اپنے دیسی بھیڑوں کو دوغلی نسل میں تبدیل کرنے میں اب خاصی دلچسپی لینے لگے ہیں تا حال نسل

تعمیر

سدھارنے کے سلسلے میں ۱۲۲۷۷ اعلیٰ نسل قسم کے مینڈھے تقسیم کئے گئے ہیں۔

پچھلے دو برس کے عرصہ میں چھوٹے اور کم اراضی رکھنے والے کسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ترقیاتی اسکیموں کے تحت ۲۲۰۰ چھوٹے چھوٹے شیپ یونٹ قائم کئے گئے ہیں۔ ان یونٹوں میں ۲۵ سے ۳۳⅓ فیصد سبسڈی پر کسانوں کو بھیڑیں فراہم کی گئی ہیں۔ ان یونٹوں میں بھیڑوں کی موجود تعداد ۳۴ ہزار ہوئی ہے۔ لگاتار چرائی کی وجہ سے ہماری چراگاہوں پر کافی دباؤ پڑا ہے۔ اس لئے اچھے قسم کے چاروں کی کاشت پر شیپ فارمز کو توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ جنگلات کا محکمہ بھی زمین کے کٹاؤ کے پروگرام کے تحت درخت لگانے کا اہتمام کر رہا ہے۔ چراگاہوں میں خاردار جھاڑیوں جو چرا اور بیج بھول کے خاتمے کے لئے ایک منصوبہ بند پروگرام ترتیب پایا ہے۔ چارے کی پیداوار کو بڑھانے کے لئے ریاستی سرکار نے ایک ہمہ گیر اسکیم بروئے کار لانے کا بندوبست کیا ہے جو عالمی بنک کی مالی معاونت سے چالو ہو رہی ہے۔ یہ اسکیم اس وقت مرکزی سرکار کے زیر غور ہے۔

بھیڑوں کی افزائش اور اس سے متعلق پیداواری صلاحیت میں اضافے سے متعلق کچھ حقائق ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

	۱۹۷۴-۷۵ء	۱۹۸۰-۸۱ء
گوشت کی پیداوار	۶۴۰۰ ٹن	۷۹۰۰ ٹن
اون کی پیداوار	۴۷۵ ٹن	۱۹۵۴ ٹن
توسیعی مراکز کی تعداد	۲۸۳ ٹن	۵۹۰ ٹن
بجٹ ۔ (میزانیہ)	۱۵ء۳۹ لاکھ روپے	۹۰ء۱۸۵ لاکھ روپے
غیر منصوبہ جاتی اخراجات	۱۵۰ لاکھ روپے	۲۲۵ لاکھ روپے

تبصرہ

ہندو مسلمان

(افسانوی مجموعہ)

مصنف : ہمت رائے شرما

قیمت : ۲۰ روپے

ضخامت : ۱۵۹ صفحات

سائز : ۱۸×۲۲

ہندوستان مختلف مذاہب اور عقائد کا ایک گہوارہ ہے جہاں صدیوں سے ہندو، مسلمان سکھ، عیسائی ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے مختلف رنگوں اور اقسام کے پھولوں کی طرح اس پھلواری کو خوش رنگ اور دیدہ زیب بنایا ہے۔ بدقسمتی سے ماضی میں غیروں کی سازشوں نے اس گلستان میں نفاق اور تعصب کے ایسے بیج بوئے جو مدتیں گزرنے کے باوجود کبھی کبھی اُگ کر کسی دشمنی، چپقلش اور فسادات کے [illegible] پھیل رہتے ہیں۔ انگریزوں نے ہندوستان پر قابض رہنے کے لیے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے لڑایا۔ فرقہ [illegible] آگ [illegible] وہ خود یہاں سے چلے گئے لیکن [illegible] گھن کے

اندھیرے سائے آج کے زمانے میں بھی احمد آباد، سنبھل، علی گڑھ اور مرادآباد کی صورت میں ہمارا پیچھا کرتے ہیں

قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ بھائی چارے کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ۔ ہمارے رہنما ہمیشہ اس کا درس دیتے ہیں اور ایک خوش حال ملک کے لیے قومی یک جہتی اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ کشتی کے لیے پتوار — آزادی سے قبل اور بعد میں قومی یک جہتی کے موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے ۔ اس موضوع پر سیاست کا ملمع چڑھانا ایک بات ہے جبکہ اسے ادب کی صورت میں پیش کرنا قطعی مختلف بات ہے ۔ مختصر اشعار اور نثری ٹکڑے قاری کے ذہن پر سیاسی لیڈروں کی طویل تقریروں سے کہیں زیادہ **IMPACT** کرتے ہیں ۔ ایک ادیب سیاست دان نہیں ہوتا ہے اور اگر وہ لیڈر بننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بگڑ جاتا ہے ۔ ادیب یا شاعر اگر قومی یک جہتی اور آپسی بھائی چارے کے درس پر اپنے خونِ جگر صرف کرتا ہے تو اس میں خلوص نیت کا دخل ہوتا ہے ۔ [illegible] افسانوی مجموعہ ہندو مسلمان بھی اسی خلوص نیت کا نتیجہ ہے ۔ [illegible] درمیان [illegible] میں [illegible] ہوں ۔ پھر [illegible] اور تعارف پر مشتمل ہے [illegible] میں [illegible] شامل ہیں ۔ ہندو مسلمان میں اگر کوئی چیز عجیب سی لگتی ہے تو وہ افسانوں کی تعداد ہے ۔ مجموعے میں کل چار افسانے شامل ہیں ۔ ہندو مسلمان، مرگ نینی، دو چراغ ایک لو اور ڈیڑھ اینٹ کی مسجد — چاروں افسانے طویل ہیں جو اردو افسانے کے اس نئے دور میں جدیدیت سے انحراف ہے ۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ نئی تکنیک نہ اپنانے کی وجہ سے شرما صاحب کے افسانے کسی بھی طرح سے بے عمل یا بے اثر ہو کر رہ گئے ہیں بلکہ ان کا اسلوب اور اُن کی زبان بے حد جاندار ہے ۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہ کتاب ایک خاص مقصد کے تحت لکھی ہے ۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب نے منظر عام پر آنے سے اپنا مقصد پورا کر لیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اُن کا مقصد انسانیت اور بھائی چارے کا درس دینا ہے اور انہوں نے یہ درس بڑے خلوص سے اور بڑی شُستہ زبان میں دیا ہے جو قاری پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتا ۔ شرما صاحب نے جو کردار پیش کیے ہیں وہ ہمارے ہی سماج کے فرد ہیں — "ہندو مسلمان" کے دین محمد اور دھرم داس، "مرگ نینی" کی نینی — "دو چراغ ایک لو"

کے پنڈت رام کشن داس اور مولوی محمد حسین اور "ڈیڑھ اینٹ کی مسجد" کے الشور داس سے ہمیں حقیقی زندگی میں کہیں نہ کہیں مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ الشور داس کا کردار متاثر کن ہے وہ ایک یتیم لڑکا ہے اور اس کی جائیداد پر اُس کا بے رحم چچا قابض ہے جو کسی نہ کسی بہانے اُسے گھر سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر یہی لڑکا جو مذہب کے بھید بھاؤ سے بالاتر ہو کر ایک مسلمان ہمسایہ کے گھر آنے جانے لگتا ہے جہاں ایک جوان لڑکی سکینہ اُسے بہن کا پیار دیتی ہے۔ لیکن بہن بھائی کے اس مقدس رشتے پر لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں اور الشور داس اپنے ہمدردوں کی عزت کا خیال کر کے یہاں سے بھی نکل جاتا ہے۔ پھر یہی مصیبت کا مارا الشور داس پھیرکیاں بنا بنا کر اُسی گاؤں میں بیچتا ہے کہ جہاں سے اُس کا مرحوم والد گذرتا تو سبھوں کی آنکھیں احتراماً جھک جاتی تھیں۔ ایک دن پھیرکیاں لے کر جب وہ اپنے گھر کی ڈیوڑھی پر پہنچتا ہے تو زوروں کی بارش شروع ہوتی ہے اور الشور داس بارش سے بچنے کے لیے ڈیوڑھی کے سائے میں آنا چاہتا ہے لیکن پھر اُسے اپنی کسمپرسی اور احساس کمتری کا احساس ہوا۔ "اب الشور داس کی حالت اُس مکھی جیسی تھی جو شیشے کے اس پار جانے کے لیے تڑپ تڑپ کر بھنبھنایا کرتی ہے مگر جا نہیں سکتی"۔

ہمت رائے شرما کے یہاں احساس کی شدت ملتی ہے۔ اُن کے جملے جذبات میں نہائے ہوئے ہیں۔ ذاتی طور پر فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کے سبب اُن کے فسانوں پر فلمی چھاپ پائی جاتی ہے اور اگر کہیں کہیں ہمیں اُن کی تحریر مکمل سکرین پلے دکھائی دینے لگے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ شرما صاحب نہ صرف ایک افسانہ نگار ہیں بلکہ اعلیٰ پایہ کے شاعر، مصور اور ہندوستانی کلاسیکل موسیقی پر عبور رکھنے کے علاوہ بیک وقت اُردو، فارسی، ہندی، انگریزی، پنجابی، بنگالی، گجراتی اور مراٹھی زبانوں پر بھی مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ جناب فراق گورکھپوری اُن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اُن کی شاعری میں ایک صحت مند اور تربیت یافتہ جوانی کارفرما ہے۔ اُن کی آواز اور طرزِ تحریر میں چوٹ اور درد ہے۔ ان کے کلام میں خوشگوار شگفتگی ہے" یہی چوٹ، درد اور خوشگوار شگفتگی اُن کے افسانوں کا بھی خاصہ ہے۔ اُن کے افسانوں میں جگہ جگہ لفظی اور معنوی حسن سے بھرپور جملے ملتے ہیں۔

* ایک جگہ تو چور نے دکان میں گھس کر گوروں نے منہ کالے کیے۔
* دیکھتے ہی دیکھتے بہن کے حنائی ہاتھوں پر بھائی کے خون کا رنگ چڑھ گیا۔
* دادی میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ باغ ضرور گل کھلا کے رہے گا۔ وہ گل کھلے گا جو کئی گھروں کے چراغ گل کر دے گا۔
* اب خیمے کے اندر خاموشی تھی جو پیش خیمہ تھی کسی آنے والے طوفان کا۔

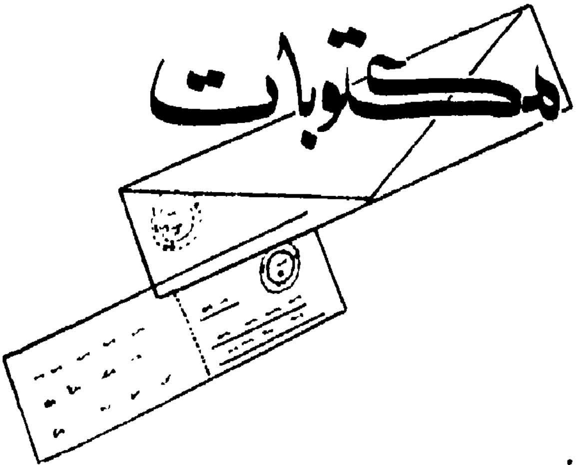
اسی طرح کے بے شمار جملے ہمیں اس مجموعے میں بار بار پڑھنے کو ملتے ہیں جو تحریر کو نئی شگفتگی عطا کرتے ہیں اور زبان پر مصنف کی دسترس کے غماز ہیں۔ "دو چراغ ایک لو" میں لکھتے ہیں۔

"ویسے پنڈت جی اور پنڈتانی جی دونوں ایسے ہندسے تھے جو ایکدوسرے پر پورے پورے تقسیم ہو جاتے۔ ساری زندگی حساب یعنی جمع 'تفریق' ضرب' تقسیم سے کام لینے والے پنڈت جی کے ہاں دے دسے کے حاصل ضرب بس ایک لڑکا تھا۔"

"ہندو مسلمان" ہمت رائے شرما کی پہلی اردو تصنیف ہے۔ اور اُن کی یہ پہلی ہی کوشش کامیاب قرار دی جا سکتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ زبان دان طبقے کے ساتھ ساتھ عام قارئین بھی اس مجموعے کا بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کریں گے۔ کتاب کا گٹ اَپ اور کتابت عمدہ ہے۔ سرورق چار رنگوں میں چھپا ہے جسے بنایا گیا ڈیزائن مصنف کے اچھے مصوّر ہونے کی دلیل ہے۔ حقیقت میں مصنف نے افسانوں میں جو چیز پیش کرنا چاہی ہے اُس کا اندازہ سرورق کا ڈیزائن دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے۔

(خالد بشیر)

مکتوبات



۱۸۲۰/کٹرا شیخ چند
بازار لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکرمی و محترمی جناب خالد صاحب

آداب و نیاز ۔ مزاج؟

آپ کی ادارت میں "تعمیر" کا پہلا شمارہ پریم چند نمبر کی شکل میں موصول ہوا، مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ واقعی یہ شمارہ ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جناب شیخ صاحب، آزاد، حامدی اور پریمی کے مضامین بہت اہم ہیں۔ فاروق آفاق کا مضمون "چند پہلو" ذرا تشنہ رہ گیا۔ بہر حال عمومی طور پر ایک اچھا ادب نمبر نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

آپ کا
ظفر مرادآبادی

شعبہ اردو
دہلی یونی ورسٹی دہلی

مکرمی مدیر صاحب

آداب!

ماہنامہ "تعمیر" کا پریم چند نمبر ڈاکٹر شارب صاحب کے گھر پر دیکھنے کو ملا۔ پریم چند پر لکھے گئے تمام مضامین معیاری، دلچسپ اور فکر انگیز ہیں یہ آپ کے انتخاب کا کمال ہے کہ اس مختصر سے رسالہ کے ذریعے پریم چند کے فن اور شخصیت کے تمام گوشے قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان مقالات سے نہ صرف پریم چند کی تفہیم میں مدد ملی ہے بلکہ ان کی اہمیت اور قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ حقیقتاً آپ نے اس عظیم فن کار کے شایان شان پرچہ شائع کیا ہے اس کامیابی کے لیے میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

پریم چند میرا بھی عزیز ترین موضوع ہے اس لیے اگر ممکن ہو سکے تو ایک کاپی مجھے بھی ارسال فرما کر مشکور فرمائیں۔

سید محمد عظیم

●

اقبال روڈ، لوگنڈ
کلگام کشمیر ۱۹۲۲۳۱

محترم خالد صاحب

اسلام علیکم

شکر ہے کہ آخر آپ نے وعدہ نبھایا "تعمیر" کا پریم چند نمبر مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ واقعی قابل تعریف ہے اگرچہ نظر ثانی کا محتاج رہ کر کتابت کی کمزوری غلطیاں رہ گئی ہیں اور اکثر جگہوں پر جملوں کو دہرایا گیا ہے پھر بھی یہ سب خوش نویسی کے دامن میں اس طرح سمٹ گئی ہیں جیسے کہ چاند کے چہرے پر داغ —— ! بہرحال

تعمیر

بحیثیت مجموعی آپ کی محنت اور کوشش قابلِ تحسین ہے جس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ توقع ہے کہ آپ آئندہ بھی بلاناغہ یاد کرتے رہیں گے اور یہاں میرے افسانے "اندھی تخلیق" کے بارے میں کیا ہوا۔؟

آپ کا

عبدالاحد واحد

شعبہ اُردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی خان بشیر صاحب

سلام و نیاز

آپ کا خط ملا تھا اور اس کے بعد تعمیر اور ہفتہ وار کے دو پرچے بھی مل چکے ہیں۔ آپ نے خواہش ظاہر کی ہے۔ تعمیر کے لیے کچھ لکھوں۔ فی الحال میرے پاس غنی کاشمیری پر ایک مختصر مضمون رکھا ہوا ہے اگر حکم ہو تو آپ کو بغرض اشاعت ارسال کروں ـــــ مگر اس بات کا کچھ اندازہ ضرور ہونا چاہیے کہ آپ معاوضہ وغیرہ کیا دے سکتے ہیں۔ اس سے قبل بھی میرے دو مضامین تعمیر میں چھپ چکے ہیں۔ ان کے سلسلے میں ایک تو غیر معمولی تاخیر اشاعت میں ہوئی دوسرے معاوضہ بھی برائے نام ہی ارسال کیا گیا۔ امید ہے آپ اس کی وضاحت ضرور کریں گے۔ آپ کا پریم چند نمبر عمدہ اور متنوع ہے۔ اپنے دفتر کو ہدایت کر دیں کہ رسالہ گول بنڈل بنا کر نہ بھیجا جائے۔ اس طرح رسالے کے صفحات بہت زیادہ مڑ تڑ جاتے ہیں۔

خدا کرے آپ بہمہ وجوہ اچھے ہوں

والسلام

ابوالکلام قاسمی

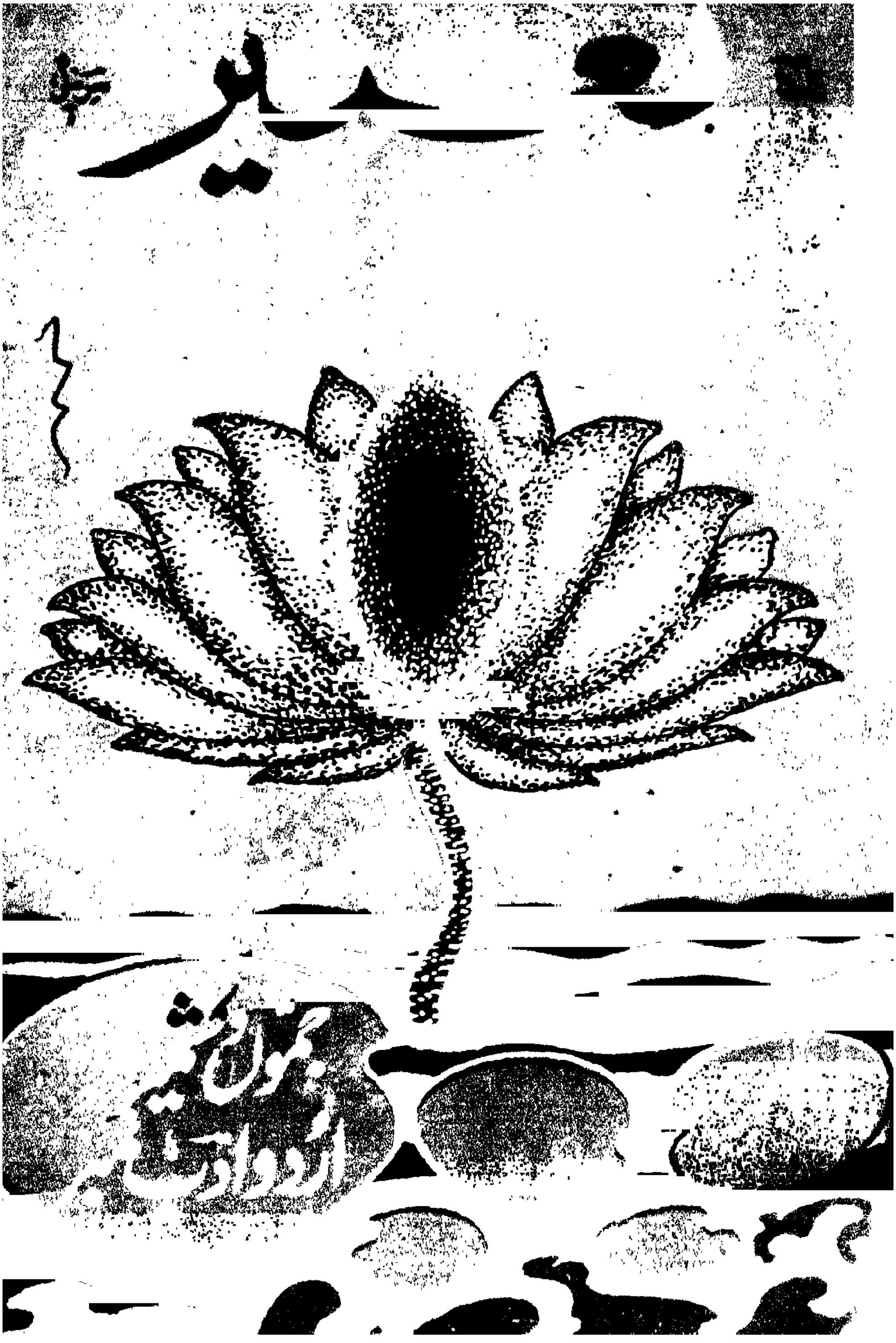
سی ۲۹۲/۱۸۴ تلسی داس مارگ
نزدیک ہسپتال
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

مدیر مکرم

تسلیمات!

بعض احباب سے اڑتے اڑتے سننے میں آئی ہے کہ تعمیر کا تازہ شمارہ آگیا ہے۔ بطور یاد دہانی تحریر ہے کہ میری ایک غزل زیر اشاعت تھی اس کے لیے آپ نے تصویر بھی مانگی تھی میں نے فوری تعمیل کردی تھی۔ براہ کرم تعمیر کا وہ تازہ شمارہ جس میں میری غزل وغیرہ شائع ہوئی ہے مجھے بھیجنے کی تاکید فرمادیں۔ ممنون ہوں گا۔

آپ کا اپنا
تسنیم فاروقی



اردو کا مقبول ماہنامہ

شیرازہ
سری نگر

[جموں و کشمیر اردو ادب نمبر]

جلد نمبر ۱۴ — اگست ۱۹۸۳ء — شمارہ نمبر — ۲

نگران :- ایس پی ساہنی
ڈائریکٹر جنرل اطلاعات و تعلقات عامہ

مدیر : خالد بشیر

شائع کردہ :- شعبۂ مطبوعات محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت جموں و کشمیر مقبول شیروانی روڈ سرینگر-۱۹۰

تعمیر میں چھپنے والی نگارشات میں
ظاہر کی گئی آراء سے حکومت جموں و کشمیر
کا متفق ہونا ضروری نہیں

سرورق : عل — کبیر قریشی
خوشنویس : غلام محی الدین — بشیر احمد
مطبوعہ : گورنمنٹ پریس سرینگر

ترتیب

حرف حرف

گوشۂ اوّل

مضامین

گوشۂ دوم

غزلیں ۱۸۷ —— ۲۱۱

شوریدہ کاشمیری، قیصر قلندر، حامدی کاشمیری، عابد مناوری، پرتپال سنگھ بیتاب
نشاط انصاری، شبیب رضوی، مسعود ساموں، اشرف عادل، رخسانہ جبیں
خالد بشیر، فاروق آفاق، منیب الرحمٰن، شافی شفائی، مقبول احمد، بے تاب
جے پوری، رفیق ہمراز، راز مناوری، نذیر احمد نظیر، واجدہ تبسم، یوسف سلیم
ستید رضا، کے ڈی مینی، قیوم کاشمیری، خورشید بسمل،

نظمیں ۲۱۳ — ۲۲۹

جگن ناتھ آزاد، شہ زور کاشمیری، فاروق نازکی، اقبال فہیم، نور شاہ، فیاراجوری
ع عامر، پریمی رومانی

افسانے ۲۳۱ — ۲۵۶

لُشکر ناتھ، عمر مجید، آنند لہر، وریندر پٹواری، مشتاق مہدی

CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

مجھے یہ جان کر انتہائی مسرت ہوئی ہے کہ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ ماہنامہ "تعمیر" کا جموں و کشمیر اردو ادب نمبر شائع کر رہا ہے۔ اردو ہمارے ملک کی زبانوں میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہماری مشترکہ میراث ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس زبان نے صورِ اسرافیل کی طرح خوابیدہ انسانوں کو جگا دیا اور آزادی کے بعد قومی تنظیم اور سیکولر روایات کی آبیاری کے سلسلے میں اس زبان کی خدمات کو سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے کافی کام ہوا ہے۔ ہمارا شاعر و ادیب ملکی سطح پر اپنے ہم عصروں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تمام کام کو یکجا کر کے شائع کیا جائے۔

مجھے امید ہے کہ "تعمیر" کا مجوزہ نمبر اس سلسلے میں ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔

میں اس خصوصی اشاعت کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں

[illegible]

ڈاکٹر فاروق عبداللہ
وزیر اعلیٰ ریاست جموں و کشمیر

Minister for Information,
Education & Soc. Welfare
Jammu and Kashmir

یہ خبر باعث مسرت ہے کہ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کی طرف سے
ماہنامہ "تعمیر" کا ایک خصوصی شمارہ شائع ہو رہا ہے جس میں ریاست اور اردو زبان و ادب
کے متعلق سے مضامین کے علاوہ یہاں کے شعراء و ادباء کی تخلیقات شامل ہونگی۔ اردو ادب
سے متعلق ہمارے یہاں قابل قدر کام ہوا ہے۔ بدقسمتی سے اسے جمع کرکے شائع کرنے کی کوئی
کامیاب کوشش نہیں ہوئی ہے۔ نتیجتاً ہمعصر ناقد و تاریخ دان جب اردو زبان و ادب
پر قلم اٹھاتا ہے تو اس کے پیش نظر جموں و کشمیر کے تعلق سے کوئی مواد نہیں رہتا۔
مجھے امید ہے کہ تعمیر کا یہ خصوصی شمارہ نہ صرف ایک دیرینہ ضرورت
کو پورا کرے گا بلکہ ایک تحقیقی دستاویز بھی ثابت ہوگا۔ میں مجوزہ نمبر کی کامیابی کے لئے
دعاگو ہوں —

محمد شفیع
وزیر اطلاعات، تعلیم و سماجی بہبود

حرف حرف

"تعمیر" کا یہ شمارہ ایک خاص اشاعت کی صورت میں حاضر ہے۔

جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے جو کام ہوا ہے۔ اُس کے بارے میں مناسب اور موزوں مواد کی کمی ہمیشہ سے کھٹکتی رہی ہے۔ اس ضمن میں بعض صاحبِ ذوق حضرات نے جو کام کیا وہ یا تو منظرِ عام پر نہیں آسکا یا قطعی ناکافی ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے تین جلدوں پر مشتمل جو کتاب تصنیف کی تھی غالباً شائع نہیں ہو سکی۔ دیگر حضرات نے ادھر اُدھر جو مضامین شائع کروائے وہ تمام ادبی کاوشوں کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ ادھر حال ہی کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے بھی ایک سمینار منعقد ہوا جہاں ریاست کے تعلق سے مختلف اصنافِ اردو ادب پر مقالات پڑھے گئے۔ ابھی تک یہ مقالات کتابی صورت میں ہمارے سامنے نہیں آئے ہیں

بعض حضرات معاصر ناقدین پر ریاست کے شعراء و ادباء کے تئیں غیر منصفانہ رویّہ اپنانے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ یہاں اس پر بحث نہیں اور نہ اس کی وجوہات بیان کرنے کا موقع ہے البتہ اس کی زیادہ تر ذمہ داری خود ریاست کے اہلِ قلم حضرات پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اب تک اس تمام کام کو یکجا کر کے شائع کرنے کا نہ کوئی اہتمام کیا اور نہ اس کام پر کوئی جامع تنقید لکھی

تعمیر

یہاں وہاں ایک آدھ مضمون لکھنے یا پڑھنے سے وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے نتیجتاً ہمارا ادیب و شاعر اپنے معاصر قلمکاروں سے ایک طرح سے کٹا ہوا ہے۔ اس صورتِ حال کے شکار ہمارے بزرگ ادیب و شاعر تو تھے ہی، بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل بھی یہی کچھ سہتی آ رہی ہے۔ ہمارا نوجوان شاعر، افسانہ نگار یا ڈرامہ نگار اپنے ماحول کے اندر الفاظ و معانی کے موتی بکھیر رہا ہے لیکن ان موتیوں کی قدر پہچاننے والا اور انہیں چننے والا اسے میسر نہیں۔ صورتِ حال کچھ اس قدر مخدوش ہے کہ ریاست سے باہر تو باہر خود ریاست کے اندر بھی ہمیں پتہ نہیں کہ ہمارا نوجوان ادیب کس راہ پر گامزن ہے اور اس نسل کے خیالات کی نہج کیا ہے؟

زیرِ نظر اشاعت کا مقصد یہی ہے کہ ریاست میں اردو زبان و ادب کی مختلف اصناف پر ہوئے کام پر تفصیلی روشنی ڈالی جا سکے۔ مختلف اصنافِ ادب پر مضامین کے علاوہ شمارہ کا ایک حصہ شعری اور نثری تخلیقات پر مشتمل ہے۔ اس طرح قاری کے لئے تنقیدی جائزوں کے ساتھ ساتھ ادبی نمونے بھی پیشِ خدمت رکھے گئے ہیں۔

ادارہ اُن تمام حضرات کا شکرگزار ہے جن کی قلمی معاونت اور مفید مشوروں نے اس اشاعت کو یقینی بنایا۔ ہم اُن حضرات کے بھی شکرگزار ہیں جن کا تعاون ہمیں متواتر استدعا کے باوجود حاصل نہ ہو سکا۔ اگر ہم یہ تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو شمارہ بے شک خوب تر ہو جاتا۔

خالد بشیر

مضامین

ڈاکٹر منظر اعظمی، شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی

جموں و کشمیر میں اردو ادب کی تاریخ

ایک سرسری جائزہ[1]

تاریخ تہذیب عالم میں وادی کشمیر کے علم و فضل اور تہذیب و تمدن کا ذکر ہمیشہ ہی جلی اور شگفتہ حرفوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ جموں و کشمیر کے تہذیبی حسن کو سنوارنے اور نکھارنے میں جہاں عوامی محبت اور حکومت کا ہاتھ رہا ہے اردو زبان و ادب کی مخصوص لطافت اور حلاوت کا ہاتھ بھی کچھ کم نہیں۔ اس ریاست میں اردو زبان کی عمر ڈیڑھ سو سال یا اس سے کچھ زیادہ ہوگی، مگر اس کو فارسی کی ہمدلیوں پر پلی جو روایات ملیں۔ انہوں نے اس کے ارتقاء اور اس کی ہر دلعزیزی میں تیزی اور درخشانی پیدا کی اور آج بھی کئی پہلوؤں سے ہندوستان کے بہت سے حصوں سے زیادہ تحقیق، تنقید اور تخلیق کے واسطے سے اردو زبان و ادب کی وقیع خدمات یہاں انجام دی جا رہی ہیں

ل اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں میں نے محمد یوسف ٹینگ کے مضمون "جموں و کشمیر میں اردو" (مطبوعہ آج کل دہلی۔ اردو نمبر اگست ستمبر ۱۹۷۲ء) محمد زماں آزردہ کے مضمون "کشمیر کا اردو ادب" (مطبوعہ آج کل دہلی نومبر ۱۹۷۵ء) اور ڈاکٹر ظہور الدین کے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے "جموں خطے میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" سے خاصی مدد لی ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

تمر

یہ بتانا مشکل ہے کہ کشمیر میں اردو شعر و ادب کی ابتدا کب سے ہوئی۔ مگر اتنا یقینی ہے کہ پنجاب میں اردو کے ارتقاء کا اثر اس ہمسایہ ریاست پر بھی پڑتا رہا۔ ۱۸ویں صدی کے اکا دکا فارسی شاعروں کے یہاں ایک آدھ اردو شعر مل جاتے ہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد سے اردو زبان کے استعمال کے شواہد اور اردو کے نامور علماء کی یہاں آمد سے اس کی ادبی تاریخ کے خد و خال ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ۱۸۶۲ء میں طبقات الارض کے ماہر فریڈرک ڈریو نے جو یہاں طبقات الارضی خدمات انجام دینے آیا تھا۔ مہاراجہ کے دربار سے متعلق یہ بات بھی لکھی ہے کہ "ہندوستان سے آنے والے ملازم لوگ بلاشبہ ہندوستانی (اردو) بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔" ۱۸۶۷ء میں "بدیا بلاس سبھا" کے قیام سے بھی اردو زبان و ادب کو بڑھاوا ملا۔ اس لئے کہ اس کے زیر اہتمام اردو میں بہت سی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ اور اس طرح دھیرے دھیرے اردو شعر و ادب کا جادو اس ریاست پر بھی اپنا اثر دکھانے لگا۔ چنانچہ ہرگوپال خستہ کی پہلی اردو تاریخ "گلدستۂ کشمیر" (۱۸۸۳ء) کے مطابق باہر کے سیاحوں اور سیلانیوں سے بازاروں اور دکانوں میں عام کشمیری اردو زبان میں آسانی سے بات چیت کر لیتا تھا۔ خود گلدستۂ کشمیر کی اشاعت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے بہت پہلے سے لوگوں میں اردو زبان و ادب سے شغف پایا جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۵ء میں اس کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ ۲۰ویں صدی کی ابتدا تک ریاست میں باہر کے متعدد اہل علم و ادب کے زیر اثر مقامی شاعروں اور ادیبوں کا بھی ایک حلقہ پیدا ہو گیا تھا جن کی شعری کاوشیں "مخزن" لاہور اور دوسرے رسالوں میں چھپنی شروع ہو گئی تھیں۔ منشی محمد ناظر کے "حلقۂ مفرح القلوب" سری نگر نے بھی مقامی شاعروں اور ادیبوں کی ادبی کاوشوں کو بڑھاوا دینے اور سنوارنے میں نمایاں حصہ لیا۔ اسی طرح جموں میں "بزم سخن" نے بھی جو بعد میں "بزم ادب" بن گئی اس علاقے میں اردو شعر و ادب کو فروغ دینے میں نمایاں کام کیا۔ ان کوششوں سے نہ صرف اردو زبان کو فروغ، مقبولیت اور وسعت ملی بلکہ اردو شعر و ادب کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

"دیپک تر"، اکبر جے پوری کا "سازِ شکستہ"، کشن سمیل پوری کا "فردوسِ وطن"، رسا جاودانی کا "نیرنگِ غزل" اور "نظمِ ثریا"، منوہر لال دل کا "نقدِ دل" اور پنڈت دینا ناتھ رفیق کا "سنبل و ریحان" قابلِ قدر ادبی اضافے ہیں۔ ان کی کلاسیکی روایات کو آگے بڑھانے والے شعرا میں قیصر قلندر، اندر جیت لطف، عرش صہبائی، عابد مناوری، قاضی غلام محمد، شہباز راجوروی، نشور بانہالی، نشاط انصاری، رہبر جدید، برج موہن شفق، رشید نازکی، دیا رتن عاصی، محمود الحسن محمود، فدا کشتواڑی اور دوسرے بہت سے شعرا کا نام لیا جا سکتا ہے۔

"بربطِ دل" (اندر جیت لطف) "شکستِ جام"، "شگفتِ گل" اور "صلیب" (عرش صہبائی) "بہارِ غزل"، "شمیمِ گل"، "اے جنتِ کشمیر" (عابد مناوری) "خیابان"، "طلوعِ جام" اور "حریمِ ناز" (رہبر جدید) کلاسیکی شاعری کی روایات کے امین مجموعے ہیں۔ قاضی غلام محمد کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ "حرفِ شیریں" دلچسپ اور بامقصد شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔

دوسری طرف جدید ادبی رجحانات سے متاثر نئی نسل کے ان شعراء کی بھی خدمات کم اہم نہیں جنہوں نے کلاسیکی روایات سے انحراف کیا اور نئے ذہن، نئے عہد اور نئی شعری حسیت کی ترجمانی کی۔ انہوں نے نئی تراکیب کی تلاش و خراش، اپنے عہد کی زبان اور حیاتی شعری تجربوں کے ذریعہ اردو کے شعری افق کے نئے دریچے پیدا کئے۔ اس طرح کے شعرا میں سب سے بڑا نام حکیم منظور کا ہے جس کے اشعار میں ذکر بھی ہے جدت اور جدت بھی اور جس کے شعروں سے وادیِ کشمیر کا دلکش ماحول اور قدرت کے حسن کے رنگا رنگ پہلوؤں کی تراوش ہوتی ہے۔ اس کے یہاں لفظوں کے کھردرے پن میں بھی معنویت کی کئی تہیں پوشیدہ ہیں۔ "ناتمام" کے بعد "لہو لمس چنار" کا صوری اور معنوی دونوں حسن اور نکھر کر سامنے آیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر کشمیری دوسرے بڑے شاعر ہیں "ثمر درونِ تمنا" کے بعد ان کی شعری کاوشیں نئی شعری حسیت، اسلام و ابہام کی نئی منزلیں سر کر رہی ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب نے "پیش خیمہ" میں اپنے عہد کی حقیقتوں کو خوبصورت تعبیر

ملاقاتی پیکر عطا کئے ہیں۔ اسی طرح فاروق نازکی، شجاع سلطان، مظفر ایرج، سلطان الحق شہیدی، رفیق راز اور فاروق مضطر نے ادبی افق میں نئے شعری رنگ اُجاگر کئے ہیں۔ ان کی کوششیں اردو شعر و ادب کی رفتار ترقی میں بہت معاون ثابت ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ آنند لہر، راز مناوری، دانش ملک اور کے ڈی مینی اور بہت سے دوسرے شعراء نے نئے آہنگ، نئے لب و لہجے اور عصری حسیت کے نئے طرزِ اظہار کے ذریعہ ریاست میں اردو شعری قافلے کو جادہ پیما کر رکھا ہے۔ اس جہت کو عام کرنے میں بزم فروغ اردو جموں کا بھی ہاتھ رہا ہے۔

فکشن اور ڈرامے کے محاذ پر بھی ریاستی ادیبوں کی کاوشیں کچھ کم وقیع نہیں۔ نرسنگھ داس نرگس، پریم ناتھ پردیسی، ٹھاکر پونچھی، پریم ناتھ در، اختر محی الدین، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، نور شاہ، پشکر ناتھ، بنسی نردوش، تیج بہادر بھان، مالک رام آنند، کشوری منچندہ، آنند لہر، غلام رسول سنتوش، شبنم قیوم، موہن یاور، علی محمد لون، برج کشن ایمہ، نثار شاہد، بشیر شاہ، غلام محمد سجود سیلانی، کلدیپ رعنا ایسے ناول نگار، کہانی کار اور ڈرامہ نویس ہیں جن کی بہت سی تخلیقات کسی بھی ریاست کے ادیبوں سے کم رتبہ نہیں۔ نہ کیفیت کے اعتبار سے نہ روایت کے لحاظ سے ———— پریم ناتھ پردیسی نے اپنے افسانوی مجموعوں "کرنیں"، "جوگی اور چار بیٹے" اور "پوتی" (ناول) کے ذریعے پورے ملک میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ نرسنگھ داس نرگس کے مجموعے "دودھیا دیپ"، "ہندیس" اور "پردیسی پریتم" قابل قدر افسانوی مجموعے تھے، خصوصاً ان کا انشاپردازانہ بیانیہ انداز، ادب لطیف کے علمبرداروں کی یاد دلاتا ہے۔ انہوں نے "پاربتی"، "مانگی" اور "نرملا" کے نام سے تین ناول بھی لکھے۔ ٹھاکر پونچھی نے تقریباً دو درجن ناول اور دو افسانوی مجموعے شائع کئے، جن میں "وادیاں اور ویرانے"، "رات کے گھونگھٹ"، "چاندنی کے سائے"، "یادوں کے کھنڈر"، "پیاسے بادل"، "چاندی کے ہاتھ"، "پت جھڑ کے بچھڑے"، "گونگے ہونٹ"، "اب میں وہاں نہیں رہتا"، اور "زندگی کی موت" اور "چناروں کے چاند" (افسانوی مجموعے) خاصے مشہور ہوئے۔

اختر محی الدین کی کہانیاں، اندھے ناسور، مرگ آنا اجیرن بہت مشہور ہوئیں۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری
کے افسانوی مجموعے، وادی کے پھول، برف میں آگ اور سراب اور بہاروں کے شعلے، چیخے
خواب، ملبے میں سکے خواب (ناول) اور پرچھائیوں کا شہر (ناولٹ) افسانوی دنیا کی مقبول
تصنیفات ہیں۔ نور شاہ کے افسانوی مجموعے بے گھاٹ کی ناؤ، من کا آنگن اُداس اُداس
یہ میری دنیا اور ناول ہاؤس بوٹ جھیل کنارے سائے اور دو ناولٹ پائل کے زخم اور آؤ سوچا میں بھی
ممتاز افسانوی کاوشیں ہیں۔ پشکر ناتھ کی افسانوی تکنیک ان کی متعدد خوبصورت کہانیوں سے
نمایاں ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے، اندھیرے اجالے، ڈل کے باسی اور عشق کا چاند اندھیرا ممتاز
مجموعے ہیں۔ بالخصوص عشق کا چاند اندھیرا کی کہانیاں بڑی متاثر کن کہانیاں ہیں۔ پریم ناتھ در نے
افسانوی مجموعہ نیلی آنکھیں پیش کیا۔ تیج بہادر بھان نے موت (افسانے) اور سیلاب اور قطرے
(ناول) لکھا۔ موہن یاور نے متعدد افسانوی مجموعے، ناولٹ اور ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ وسکی کی بوتل
تیسری آنکھ، دو کنارے، سیاہ تاج محل اور لوہی اور جہلم، پتھروں کا شہر (ناولٹ) معروف تخلیقی
کوششیں ہیں۔ مالک رام آنند نے بھی متعدد ناول، افسانوی مجموعے، ناولٹ اور انشائیے لکھے
ان کا بکھرا بکھرا منفرد انداز تحریر بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے۔ ان کی تصنیفات میں دہکتے
پھول، شبنم آنکھیں، اپنے وطن میں اجنبی، نیا دن پرانے سلسلے، جانے وہ کیسے لوگ تھے اور
میں جاپتا ہوں، ممتاز ہیں۔ شبنم قیوم نے بھی بہت سی کہانیاں، ناول اور ڈرامے لکھے۔ ایک شب
زخم اور سہی (افسانے) اور چراغ کا اندھیرا (ناول) قابل قدر کتابیں ہیں۔

کشوری منچندا نے افسانوی مجموعے "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" ہرے
پتے، بنجر زمین، سڑک انصاف کرتی ہے، احساس کے گھاؤ اور شکستہ آرزو شائع کئے۔ آنند لہر کا
ناول "تیسری کرن" قابل ذکر ہے۔ غلام رسول سنتوش کا مجموعہ اندھیرے اجالے بھی قابل ذکر
ہے۔ برج کشن ایمہ نے متعدد اچھی کہانیاں لکھیں جن میں عورتوں کی زندگی کی عکاسی ملتی

اور سپنوں کا شام وغیرہ مشہور ہیں۔ ویریندر پٹواری، او۔ پی۔ شرما سارتھی، خالد حسین نے بھی اردو میں متعدد اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔

ڈراموں میں بھی خواہ اسٹیج ڈرامے ہوں یا ریڈیائی ڈرامے، ریاستی ادیبوں کے جاندار، کامیاب اور اچھے ڈرامے ملتے ہیں جن میں تقویت بھی ہے اور تاثر بھی اور بڑی حد تک ڈراموں کی تکنیک کا حسن بھی۔ آزادی سے پہلے کے بزرگوں میں محمد عمر نورالٰہی صاحبان، جگدیش کنول، نرمتی لال زادہ، نرسنگھ داس نرگس اور ایم اے عزیز وغیرہ نے اچھے ڈرامے لکھے۔ اس سلسلے میں پردے کے پیچھے (جگدیش کنول) تعارف (نرگس) اور نوشتۂ تقدیر (ایم اے عزیز) کا خصوصی طور پر نام لیا جا سکتا ہے۔ رائے زادہ کے ڈراموں کے دو مجموعے اور ڈرامہ پرانے دیپ نئے اُجالے اردو ڈراموں میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعد کے زمانے میں ریڈیائی ڈرامے اسٹیج ڈراموں کے مقابلے میں زیادہ لکھے گئے۔ آزادی کے بعد کے لکھنے والوں میں علی محمد لون، رام کمار ابرول، ٹھاکر پونچھی، نریندر کھجوریہ، ستار شاہد، پشکر ناتھ، بشیر شاہ، وجے سوری اور غلام محمد مسعود جیلانی نے اس فن میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ انسان جیت گیا، دھرتی اور ہم (رام کمار ابرول)، وادیاں اور ویرانے، تمنا کے قدم (ٹھاکر پونچھی) راستہ کانٹے اور ہاتھ (نریندر کھجوریہ) ہم البستی، بولت ماشی، اور فطرت کا انتقام (ستار شاہد) تخلیق کا گھاؤ، میری لاڈو، میری تمنا (بشیر شاہ) کا نام مثالاً لیا جا سکتا ہے۔

ریاستی ادیبوں خصوصاً باہر سے آئے ہوئے غیر ریاستی اہلِ علم نے جو ایک عرصے تک یونیورسٹیوں اور مدرسے اداروں میں علم و ادب کے حوالے سے ریاست کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی نمایاں کام کیا اور اس طرح ریاست کا نام کیا ہے۔ ریاستی ادیبوں اور محققین میں نمایاں نام ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر حامدی کشمیری، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر ظہور الدین اور ڈاکٹر برج کرشن ایمہ کا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کی تصنیفات و تالیف

میں

میں میرا تحقیقی ... تدریس، شعر تحقیق و انتقاد، تنقیدی جائزے، دیوانِ میر اور تحقیقی نامے قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر ... کشمیری کی غالب کے تخلیقی سرچشمے، جدید اردو نظم اور یورپی اثرات نئی جہت اور عصری ... شاعری میں کارگہہ شیشہ گری ممتاز کتابیں ہیں۔ محمد یوسف ٹینگ نے متعدد علمی اور تحقیقی مضامین لکھے جن میں جموں و کشمیر میں اردو (مطبوعہ آج کل دہلی اردو نمبر اگست ستمبر ۱۹۷۳ء) بڑا اہم مضمون ہے۔ ڈاکٹر ظہور الدین نے متعدد چھوٹی بڑی دوسری کتابوں کے علاوہ ایک تحقیقی کتاب "بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی ادبی رجحانات" لکھی۔ ان کا حال ہی کا غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ "جموں خطے میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" ایک اچھی علمی کوشش ہے۔ ڈاکٹر برج کرشن ایمہ نے بھی مختلف علمی، تنقیدی اور ادبی مضامین کے علاوہ منٹو پر ایک بسیط تحقیقی مقالہ بھی لکھا۔

باہر سے آئے ہوئے جموں اور کشمیر کی یونیورسٹیوں کے اہلِ علم اساتذہ کی خدمات جو زیادہ شہرت کی حامل ہیں ریاست میں تنقیدی اور تحقیقی کاوشوں اور یہاں کی ادبی تاریخ کا ایک اہم جزو بن چکی ہیں۔ آزادی سے پہلے بھی بہت سے اہلِ علم و ادب ریاست کی علمی خدمات سے منسلک رہے اور ان کے دم سے یہاں کی ادبی فضا روشن اور تابناک ہوتی رہی مگر آزادی کے بعد کے اہلِ علم کی خدمات بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس لئے کہ یہاں کی ادبی اور علمی فضا کو روشن تر بنانے میں ان کا براہِ راست اور بلاواسطہ ہاتھ رہا ہے۔ یونیورسٹیوں کے سیمیناروں اور ادبی کانفرنسوں کلچرل اکیڈیمی کی ادبی کانفرنسوں، ریڈیو کشمیر سرینگر اور جموں کی نشریات اور ریاست کی متعدد ادبی انجمنوں سے ان حضرات کا براہِ راست یا بلواسطہ تعلق رہا ہے۔ اس طرح انہوں نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے ریاست کو پورے ملک میں ایک ادبی شہرت اور مقام دلانے کی نمایاں کوشش کی۔

آزادی کے بعد نمایاں علمی اور ادبی شخصیتوں میں ڈاکٹر ... ڈاکٹر

قمر

محمد حسن، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر شکیل الرحمان، کمال احمد صدیقی، پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ ڈاکٹر عابد پشاوری، منظر اعظمی اور سب سے آخر میں، مگر سب سے اہم اور سب سے قد آور ادبی اور علمی شخصیت پروفیسر آل احمد سرور نے شعر و فن کے جو چراغ روشن کئے۔ اس کے اثرات کے اجالوں کو کوئی احسان ناشناس ہی فراموش کر سکتا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی بیشتر تصنیفات اور تالیفات ان کے قیام کشمیر ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ اقبال اور مغربی مفکرین، اقبال اور کشمیر، مرقعِ اقبال، نشانِ منزل، آنکھیں ترستیاں ہیں اور بہت سے دوسرے مطبوعہ مضامین اور تصانیف اردو ادبی دنیا سے پہلے ریاستی ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر عابد پشاوری کی انشائیے حرف و حلیف، نقطے اور شوشے اور دوسرے تحقیقی مضامین، منظر اعظمی کی سب رس کا تنقیدی جائزہ اردو میں تمثیل نگاری اور تلاش و تعبیر اور ان حضرات کی نظم و نثر کی بہت سی تخلیقی کاوشیں ریاست کی ادبی تاریخ کا بہر حال اہم جزو ہیں۔ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ ریاستی کلچرل اکیڈیمی، حکومت کا شعبہ اطلاعات، ریڈیو کشمیر سرینگر اور جموں کی اردو ادبی خدمات اور سرینگر اور جموں کی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کے سلسلے میں لکھوائے گئے تحقیقی مقالات سے بھی ریاست میں اردو ادب کے ارتقا کو رفتار ملی ہے۔ یہاں کا ادبی مورخ ان کاموں کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لئے کہ ان کوششوں سے اردو ادب کے بہت سے پہلو زیادہ صحیح، زیادہ روشن اور زیادہ محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ریاست کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی چھوٹی بڑی ادبی انجمنیں شعراء و ادباء اور اہلِ علم ہیں جن کی کاوشوں سے ریاست میں اردو شعر و ادب کا افق روشن سے روشن تر ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر ظہور الدین، شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی جموں

جموں میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء

خطۂ جموں میں اردو کا چلن اتنا ہی پرانا ہے کہ جتنی پرانی اردو زبان بذاتِ خود ہے۔ اردو کے آغاز کے بارے میں جتنے نظریے پیش کئے گئے ہیں ان میں ایک اہم ترین نظریہ کہ جسے گراہم بیلی جیسے محقق اور ماہرِ لسانیات کی تائید بھی حاصل ہے، یہ ہے کہ اس کا آغاز مسلمانوں کی پنجاب میں آمد (۱۰۲۷ء) کے بعد ہوا اور جب ۱۱۹۳ء میں مسلمان پنجاب کے میدانوں سے آگے بڑھتے ہوئے دہلی پہنچے تو وہاں اس زبان نے کھڑی بولی کے اشتراک سے وہ شکل و صورت اختیار کی کہ جسے بعد میں اس کا معیاری روپ قرار دیا گیا [۱] یعنی پنجاب میں مسلمانوں کے قیام کے دوران ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے لسانی ارتباط نے جس زبان کو جنم دیا اور جو بعد میں لاہوری اردو کہلائی اسی نے دہلی پہنچ کر دہلی اور دہلی کے گرد و نواح کی بولیاں خصوصاً کھڑی بولی سے [illegible] قدیم

۱ T. Grahame Bailey, A History of Urdu Literature. P. 36-37

بغیر

پیدا کر کے ایک ایسے لسانی پیکر کو جنم دیا کہ جو اُس وقت کی اہم ضرورت تھا۔

اس نظریے کے مطابق اُردو کے ارتقاء کے دو مرحلے قرار پاتے ہیں۔ پہلے مرحلے نے لاہوری اُردو کو جنم دیا۔ اور دُوسرے نے دہلوی اُردو کو کہ جسے بالآخر اُردو کا معیاری رُوپ اور لب و لہجہ قرار پانے کا شرف حاصل ہُوا۔

جموں کا علاقہ عام طور پر ابتداء ہی سے اور خصوصاً اشوک کے زمانے سے مُلک کے پُر شکوہ دھارے میں شامل رہا ہے اس پر طرّہ یہ کہ وہ نہ صرف پنجاب کے میدانوں سے قریب تر رہا، بلکہ تاریخ کے متعدد ادوار میں وہ پنجاب ہی کے ایک حصّے کے طور پر نشوونما پاتا رہا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مُلک میں اور خصوصاً پنجاب میں نمودار ہونے والی ہر تبدیلی اس خطّے کی سیاسی و سماجی زندگی کو اپنی ہی سُرعت کے ساتھ متاثر کرتی رہی ہے کہ جتنی سُرعت سے سیالکوٹ اور لاہور میں بسنے والے عوام اُن سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پنجاب میں مُسلمانوں کی آمد کے بعد جو بھی سیاسی سماجی اور لسانی تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ اُنہوں نے اس خطّے کو بھی اُسی طرح متاثر کیا کہ جس طرح اُن سے پنجاب خود متاثر ہُوا پُورے مُلک اور خصوصاً پنجاب سے خطۂ جموں کے اُنہیں سیاسی، سماجی، مذہبی، تجارتی اور لسانی تعلقات کو جو ہمیں قدیم زمانے سے اِن کے درمیان ایک مضبوط رشتے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اِن کی بُنیاد پر یہ کہنا بےجا نہ ہوگا کہ اُردو اس علاقے میں اُس وقت بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی کہ جب اس کا ابتدائی نقشہ پنجاب میں تیار ہو رہا تھا۔

ان رشتوں کے علاوہ اسی زمانے میں ایک[1] اور بات ایسی ہوئی کہ جس نے اس زبان کی توسیع کے امکانات کو مزید روشن کر دیا۔ یہ اہم بات صوفیوں کا اس علاقے کی طرف رجوع کرنا تھا۔ اس علاقے میں وارد ہونے والا پہلا صوفی (پیر روشن شاہ ولیؒ) اگرچہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی وارد ہُوا لیکن لاہوری اردو کو اس علاقے میں عام کرنے والے صوفیا وہ تھے کہ جو چودھویں

۱؎ ترجمہ تاریخ جموں صفحہ ۱۵ مصنف نامعلوم مسودہ کشمیر یونیورسٹی لائبریری کے عربی و فارسی مخطوطوں کے سیکشن میں موجود ہے۔

اور پندرہویں صدی عیسوی سے یہاں آنا شروع ہوئے اور چونکہ یہ بھی پنجاب کی طرف سے آئے تھے۔ اس لئے ان کے ہمراہ لاہوری اردو، کہ جو یقیناً ان کے لئے عام فہم وسیلۂ اظہار ہوگی، وہ بھی اس علاقے میں آئی۔ اس اعتبار سے اس علاقے میں اردو کے ورود کو اسلام کے ورود پر تقدم حاصل ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو یہاں اسلام پھیلنے سے پہلے وارد ہوئی۔ کوئی تاریخی یا روایتی شہادت ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ پندرہویں صدی عیسوی کے اختتام سے قبل مسلمانوں کا کوئی گروہ اس زمین سے اٹھا ہو۔ البتہ ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کا سلسلہ اس علاقے میں پیر میٹھا کی آمد[1] (۱۵۱۷ء) کے کچھ عرصہ بعد شروع ہوا اور پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ (متعدد صوفیوں کے مزار آج بھی اس علاقے میں موجود ہیں اور مرجع خاص و عام کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس پورے علاقے میں پھیلی ہوئی ان خانقاہوں کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ ان میں سے کوئی بیس کے قریب تو صرف جموں شہر میں واقع ہیں۔)

اس علاقے میں اردو کے ارتقاء کو سب سے زیادہ فروغ مغلوں کے زمانے میں حاصل ہوا۔ اکبر اور اس کے بعد کے بھی شہنشاہ ہر سال گرمیوں میں کشمیر آیا کرتے تھے۔ اس شاہی قافلے میں صرف امراء و وزراء ہی شامل نہ ہوتے تھے بلکہ سپاہیوں کے علاوہ تجار، مزدور اور بے شمار دوسرے لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ ایک طرح سے پورا دارالخلافہ شاہی قافلے کے ساتھ سفر کرتا تھا۔ اس میں ہر طبقے اور پیشے کے لوگ ہوتے تھے کہ جو اگرچہ اپنی اپنی بولیاں بھی بولتے تھے لیکن عام بول چال کا کام اسی ملی جلی زبان سے لیتے تھے کہ جو ان کے آپسی ارتباط سے پروان چڑھ رہی تھی۔ یہ قافلہ کہ جس میں ابوالفضل[2] اور برنیر[3] (Bernier)

---

[1] ترجمہ تاریخ جموں صفحہ ۲۹، صفحہ ۳۴

[2] آئین اکبری ابوالفضل ترجمہ (H. Blochmann M.A.) صفحہ ۱۰۹

[3] وقائع سیر و سیاحت برنیر مترجمہ سید محمد حسین جلیلم صفحہ ۳۲

کے اندازے کے مطابق ڈیڑھ دو لاکھ کے قریب افراد ہوتے تھے۔ اس شہر کے دوران طویل عرصہ تک راجوری کے علاقے میں قیام کرتا، کیونکہ کشمیر جانے والا راستہ جسے آج ہم مغل روڈ کہتے ہیں، اسی علاقے سے گزرتا تھا۔ اس پوری شاہراہ پر قافلے کے قیام کے لئے بڑی بڑی سرائیں تعمیر کی گئی تھیں کہ جن میں سے کچھ کے کھنڈرات آج بھی راجوری کے علاقے میں موجود ہیں۔ ان میں سپاہیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مستقل طور پر تعینات رہتیں، تا کہ شاہی قافلوں کے قیام کے لئے انتظامات کر سکیں۔ یہ سپاہی بھی عام بول چال میں اسی طرح زبان کو استعمال کرتے تھے۔ اس قدر بھاری تعداد پر مشتمل شاہی قافلوں کا ہر سال ادھر سے گزرنا اس علاقے میں اردو کے فروغ کیلئے ایک اہم وسیلہ ثابت ہوا۔

تزک جہانگیری[1] اور اقبال نامہ[2] وہ اولین تحریری شہادتیں ہیں کہ جن سے ہمیں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اردو زبان، چاہے اس وقت اس کا کوئی بھی روپ کیوں نہ رہا ہو جہانگیر کے زمانے میں اس خطے میں عام تھی۔ یاد رہے کہ اردو کا قدیم ترین نام ہندی تھا چنانچہ ان دونوں کتابوں میں اسے ہندی ہی سے منسوب کیا گیا ہے۔

اسلام کے پھیلاؤ اور مغلیہ حکومت کے زیر اثر جب اس علاقے میں عربی اور فارسی زبانوں کو فروغ ملا۔ تو وہ تین ایسے ادبی مراکز بھی ابھر آئے کہ جن سے وابستہ علماء و فضلا نے عربی اور فارسی کے ساتھ ہی ساتھ اردو کو بھی اظہار خیال کا وسیلہ بنایا۔ یہ مراکز کشتواڑ، پونچھ اور مظفر آباد تھے۔ ان ادبی مراکز نے جہاں عربی و فارسی کی تعلیم و تربیت کے مواقع پیدا کئے وہیں اردو کا ایک سلجھا ہوا مذاق عام کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ ان علاقوں میں آج بھی متعدد ایسی ذاتی لائبریریاں موجود ہیں کہ جن میں عربی اور فارسی زبانوں کی اہم ادبی اور مذہبی کتابوں کی قلمی کاپیاں کہ جو سترہویں یا اٹھارویں صدی میں تیار کرائی گئیں، اب

---

[1] تزک جہانگیری، جہانگیر جلد دوم صفحہ ۱۳۹-۱۴۰۔
[2] اقبال نامہ، معتمد خان بخشی، مترجمہ محمد زکریا مائل صفحہ ۱۳۴، صفحہ ۱۳۵

جمع

بھی محفوظ ہیں۔ تاہم ان ذاتی لائبریریوں میں اس عہد کی کوئی اردو تحریر نہیں مل سکی ہے۔

اس علاقے میں اردو تحریر کے لئے استعمال کرنے کا سلسلہ یقیناً اٹھارہویں صدی ختم ہونے سے پہلے چل نکلا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انیسویں صدی کے نصف اول ہی میں ہمیں اس علاقے میں اردو کے شائقین کے ہاتھوں اردو کی مقبولِ عام داستانوں کی نقلیں تیار ہوتی ہوئی نظر نہ آتیں کہ جن میں سے کچھ اب بھی اس علاقے میں کہیں نہ کہیں مل جاتی ہیں بلکہ خصوصاً قصۂ چندر بدن اور قصہ سیف الملوک کی کاپیاں عام ملتی ہیں۔ اس زمانے میں چونکہ اشاعت کی سہولیات میسر نہیں تھیں، اس لئے لوگ اپنے مطالعے کے لئے اردو کے مشہور قصوں یا مثنویوں کی ہاتھ کی لکھی ہوئی کاپیاں تیار کرواتے تھے۔ اسی زمانے میں اسے سرکاری اشتہارات کے لئے استعمال کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ عوام میں اردو کا چلن اگر عام نہ ہوتا تو اشتہارات اردو میں کیونکر اور کس کے لئے جاری کئے جاتے۔

جہاں تک اردو زبان کی توسیع کا تعلق ہے۔ ڈوگرہ حکمرانوں کا کردار قابلِ ستائش ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے دونوں ڈوگرہ حکمرانوں یعنی مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۴۶ء ۱۸۵۷ء) اور مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء ۱۸۸۵ء) کے زمانے میں فارسی ہی سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہوتی رہی لیکن فارسی یہاں کبھی بھی عوام کی زبان نہ بن سکی۔ یہ صرف شعراء کی زبان تھی۔ عوام کے لئے سرکاری دفاتر میں بھی جس زبان کو استعمال کیا جاتا تھا وہ اردو ہی تھی۔ جموں آرکائیز میں بے شمار ایسے سرکاری اشتہارات اور دوسری تحریریں محفوظ ہیں کہ جو ان دونوں حکمرانوں کے زمانے میں بھی عوام کی اطلاع کے لئے سرکاری دفاتر سے جاری ہوئیں۔ چنانچہ آزادی کے بعد کی فضا میں پروان چڑھ کر جوان ہونے والا اردو کا کوئی قاری جب ان ڈوگرہ حکمرانوں کی خدمات کا جائزہ لیتا ہے۔ تو ان کے لسانی شعور اور زبانوں سے متعلق ان کی ذہنی و دلی فراخی پر رشک کئے

لے کشمیر یونیورسٹی کے عربی و فارسی مخطوطوں کے سیکشن میں بھی اور بسوہلی کے ایک ریٹائرڈ ٹیچر فخری شکت چند غدا کے ہاں ایسی کچھ نقلیں موجود ہیں

تعمیر

بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً مہاراجہ رنبیر سنگھ کا دورِ حکومت (۱۸۵۷ء – ۱۸۸۵ء) اُردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس دانشور نے بنارس اور مُلک کے دوسرے علمی مراکز سے سنسکرت[1]، فارسی، عربی، اُردو، ہندی اور انگریزی کے علماء بلوا کر ریاست کی پہلی ادبی انجمن "بدیا بلاس سبھا" قایم کر کے سنسکرت، عربی، فارسی اور انگریزی کی متعدد کتابوں کے ترجمے اُردو، ہندی، ڈوگری اور پنجابی زبانوں میں کرائے۔ بلکہ اُردو اور ہندی میں مشترکہ طور پر شائع ہونے والا پہلا اخبار "بدیا بلاس" (۱۸۶۷ء) بھی جاری کیا۔ اس انجمن کے ہفتہ وار اجلاس ہر منگلوار کو مہاراجہ کی صدارت میں ہوتے اور اُن کی روئداد خاص و عام تک پہنچانے کے لئے بدیا بلاس میں شائع کی جاتی۔ بدیا بلاس کا مکمل فائل برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔ اور اُس کے سرورق کی ایک تصویر مسٹر بی۔ پی شرما نے اپنے مضمون بعنوان "ہندی اُردو کے مشترکہ اخبار" آج کل دہلی کے جولائی ۱۹۷۶ء کے شمارے میں شائع کی تھی۔ بدیا بلاس سبھا نے جتنی کتابوں کو اُردو، ہندی، ڈوگری اور پنجابی میں ترجمہ کرایا۔ اُن میں سے کچھ (کیونکہ پوری تعداد معلوم نہیں ہو سکی) کشمیر یونیورسٹی لائبریری کے عربی و فارسی مخطوطوں کے سیکشن میں موجود ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی کوششوں کی وجہ سے اُردو زبان اس علاقے میں تمام سرکاری و غیر سرکاری ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہوئی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے عنانِ حکومت سنبھالی تو تین سال کی مختصر مدت کے اندر ہی یعنی ۱۸۸۸ء میں اسے خطہ جموں کی عدالتی زبان[2] بنا دیا گیا۔ اس کے

---

[1] پنڈت برج لال بھٹ پوری، پنڈت رسوہن بھٹاچاریہ (بنگال) پنڈت رماس (پٹیالہ) پنڈت جگیت رام شاستری (بنارس) پنڈت آسانند، پنڈت جگدھر، لالہ گلاب رائے، غلام غوث، ہوشیار پوری، گساؤں پنڈت، دیال کرپارام، میر منشی میشور، وغیرہ

[2] اس حکم نامے کی ایک نقل جموں آرکائیوز کے انگلش ریکارڈ میں اب بھی موجود ہے۔ متعلقہ فائل میں موجود دوسرے اندراجات سے اس کا پتا بھی چلتا ہے کہ یہ نقل ۱۹۰۷ء میں اس وقت حاصل کی گئی، کہ جب جموں کی طرح کشمیر میں بھی اُردو کو عدالتی زبان بنانے کی تجویز پیش کی گئی ہے لیکن اس وقت تک کشمیر میں اُردو کا چلن عام نہیں تھا۔ اس لئے اس تجویز کو مہاراجہ نے نامنظور کر دیا۔

علاوہ تعلیمی اداروں میں بھی اسے ذریعۂ تعلیم کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ریاست میں صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کا سلسلہ بھی چونکہ اسی زمانے میں شروع ہوا۔ چنانچہ نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے حکومت نے جو اقدامات کئے۔ اُن سے بھی اردو کے فروغ کو مزید تقویت ملی۔ افسوس صرف یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کی کوئی ایسی ادبی تحریر ہمارے ہاتھ نہیں لگی ہے جس سے خطۂ جموں میں اردو کی اس دور میں ادبی اہمیت کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پوری انیسویں صدی کہ جس میں اردو نے خطۂ جموں میں اس قدر فروغ پایا۔ ادبی اعتبار سے قطعی بنجر رہی ہو۔ چونکہ اس صدی کا بہت سا سرمایہ اب یورپ کی لائبریریوں میں ہے اس لئے اگر انہیں کھنگالنے کی کوشش کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ بہت سا ایسا سرمایہ ہاتھ لگے کہ جس کی اب تک کسی کو خبر نہیں ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ساتھ اس خطے میں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ ملک کے چند نامور شاعروں اور ادیبوں کی اس خطے میں موجودگی تھی خصوصاً پنڈت دتا تریہ کیفی، اثر لکھنوی اور خوشی محمد ناظر کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اسی ادبی ماحول نے ۱۹۱۲ء میں اس علاقہ کی اُس دوسری ادبی انجمن کے قیام کو ممکن بنایا کہ جسے پہلے تو بزمِ سخن جموں کے نام سے منسوب کیا گیا اور بعد میں اس کا نام بدل کر بزمِ ادب جموں رکھا گیا۔ اسی بزم کی قیادت میں یہاں مشاعروں کی روایت کا آغاز ہوا کہ جس نے اس خطے کے عوام کو ملک کے نامور شعراء سے متعارف ہونے اور اُن کا کلام سننے کے مواقع فراہم کئے۔ شروع میں چونکہ نشر و اشاعت پر کڑی بندشیں عائد تھیں اس لئے مقامی شعراء اور ادباء کی تخلیقات ریاست سے باہر شائع ہونے والے اخباروں اور اردو رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۲۴ء میں جب ملک الراج صراف نے ریاست کا پہلا مکمل اردو اخبار "رنبیر" جاری کیا۔ تو اس سے مقامی شاعروں اور ادیبوں کو نشر و اشاعت کا ایک اچھا وسیلہ [illegible] جس کے بغیر اس سے قبل وہ خود کو نامکمل سے محسوس کرنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ [illegible] ایک ادبی ماحول کا تعمیر

قدم جما حاصل کرلیا۔ اور مقامی ادیبوں کا ایک ایسا گروہ تیار ہوگیا کہ جن کی تخلیقات ریاست سے باہر تخلیق ہونے والے ادب سے کسی طرح بھی کم تر نہ تھیں۔

جموں یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری میں موجود "رنبیر" کے فائلوں سے اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ خطہ جموں کے ابتدائی اردو فن پارے زیادہ تر تمثیلی یا پھر اصلاحی و اخلاقی اور سیاسی وسماجی موضوعات کے حامل تھے نیز اُن سے یہ اندازہ لگانے میں بھی مدد ملتی ہے کہ اس دور میں اس علاقے کے ادیبوں پر بھی حالی اور آزاد کی جدید شاعری کی تحریک کے اثرات غالب تھے،

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے بعد یہاں مہاراجہ ہری سنگھ (۱۹۲۵ء—۱۹۴۷ء) نے بھی اردو کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اردو کے فروغ کے لئے جہاں اردو کے انسپکٹر آف اسکولز تعینات کئے وہیں ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات و اعزازات دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ محمد عمر، نور الٰہی کو ناٹک ساگر (۱۹۲۴ء) پر اور پنڈت وشوا ناتھ بی، اے کو تلاش حقیقت (۱۹۲۵ء) پر اسی زمانے میں بالترتیب ڈھائی سو اور دو سو روپے کے انعامات ملے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کی سبھی بڑی اصناف ادب میں طبع آزمائی کرنے والے ادیبوں کا ایک جم غفیر پیدا ہو گیا۔ نظم، غزل افسانہ، ناول، ڈراما اور تنقید سبھی میں طبع آزمائی کی گئی اور بے پناہ ادب تخلیق ہوا۔

رنبیر کے اجراء کے بعد آہستہ آہستہ بے شمار دوسرے اردو اخبار بھی جاری ہوئے جنہوں نے اس زبان کو تقویت پہنچا کر لوگوں کو اردو تہذیب اور مذاق سے روشناس کرنے کی کوشش کی۔ رنبیر ہی کے ادارے سے اس علاقے میں ادبی صحافت کا آغاز ہوا۔ جسے لالہ ملک راج صراف نے رسالہ "رتن" (۱۹۳۴ء) جاری کرکے مزید مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ رتن اپنے زمانے کے اہم ادبی رسائل میں سے ایک تھا جس میں ملک کے نامور شاعر اور ادیب چھپتے تھے رنبیر اور رتن کے بعد ادبی صحافت کو فروغ دینے کا اہم ترین کام نرسنگھ داس نرگس کے ہفتہ وار اخبار چاند (۱۹۳۶ء) اور ماہوار رسالے پریم (۱۹۴۳ء) نے انجام دیا۔ رنبیر کی طرح پریم نے تعمیر،

بھی ایک دوسرے ادبی اسکول کو جنم دیا جسے نرسنگھ داس نرگس کے الفاظ میں کشمیر اسکول آف اردو رائیٹرز یعنی اردو ادیبوں کے کشمیر ادبی اسکول کے نام سے منسوب کیا گیا[1] ان کی تخلیقات پریم جیوت میں شائع ہوتی رہیں۔

۱۹۳۵ء میں جب ملک میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔ تو اس کے اثرات یہاں بھی پہنچے اور بہت سے مقامی ادیب اس سے متاثر ہو کر فن پارے تخلیق کرنے لگے، اور اس طرح ان عناصر نے بھی ایک صحت مند تحریک کا کام کیا۔ کشتواڑ جو کہ شروع سے ہی ایک علمی و ادبی مرکز کی حیثیت حاصل کر چکا تھا، وہاں بھی یہ عناصر پہنچے جن سے متاثر ہو کر ۱۹۳۵ء میں ہی بزم ادب کشتواڑ کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی۔ غلام حیدر رنگ گرد وقیعر اس کے صدر اور عشرت کاشمیری اس کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ نشاط کشتواڑی اور دوسرے ساتھیوں نے بھی اس انجمن سے وابستہ رہ کر قابل قدر فن پارے تخلیق کئے (یہ بزم ادب آج بھی قائم ہے)

اسی زمانے میں انہیں تحریکات کے زیر اثر پونچھ میں بھی دیانند کپور اور دوسرے ساتھیوں نے بزم ادب پونچھ قائم کی جس نے اس علاقے میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کے لئے قابل قدر خدمات انجام لائیں۔ پونچھ بھی یوں تو انیسویں صدی سے ہی ایک علمی و ادبی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس بزم کے قیام سے اس علاقے کے ادیبوں کو مناسب سمت اختیار کرنے کے آگے بڑھنے اور اپنے اندر عصری تقاضوں کو پورا کرنے کا شعور پیدا کرنے میں مدد ملی۔ چنانچہ اسی بزم کی کوششوں سے چراغ حسن حسرت، دینا ناتھ کپور، سراج الحسن، ضیاء الحسن اور دینا ناتھ رفیق جیسے فن کار سامنے آئے۔

۱۹۴۴ء میں جب نیشنل کانفرنس نے نیا کشمیر کا آئین مرتب کیا تو اس میں ریاست کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ اردو چونکہ ریاست کی دوسری قومی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ اور ہمہ گیر تھی اس لئے اسے ریاست میں رابطے کی زبان ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ (آزادی کے بعد جب جمہوری نظام

[1] پریم جیوت مدیر نرسنگھ داس نرگس جلد نمبر ۳ شمارہ ۱۰ نومبر ۱۹۴۶ء صفحہ ۸

کہ آئین کا اطلاق عمل میں آیا۔ تو اس میں بھی اردو کو ریاست جموں و کشمیر کی ہی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا)

اس دور میں (آزادی تک) جو ادیب و فن کار اردو کی مختلف اصناف سے وابستہ رہے اور جنہوں نے اس خطے کے اندر اور اس کے باہر نام پیدا کیا اُن میں سے کچھ کے نام حسب ذیل ہیں:

شاعری

سید ذوالفقار علی نسیم، کشن لال حبیب، بدری ناتھ وکیل، پنڈت واسدیو خاک، پنڈت امر ناتھ، غلام محمد خادم، نرسنگھ سہائے شوق، قدرت اللہ شہاب، پنڈت کشن چند کشن، لالہ روپ چند شوق، کشن سمیل پوری، بشارت خارانی، غلام حیدر چشتی، شبر احمد شیر، چوہدری حسن محمد منہاس، خواجہ علیم یزدانی، ہدایت اللہ ذوق، عبدالمجید نظامی، نسیم رضوی، قیس شیروانی، پنڈت نند لال طالب، عماد الدین سوز، رسا جاودانی، نشاط کشتواڑی، غلام رسول کامگار، عشرت کاشمیری، غلام حیدر گگرو تیمز، منوہر لال دل، لاغر جموی، رام کرشن غافل، محمد عمر نور الٰہی، اللہ رکھا ساغر، دیا کرشن گردش، قیصر سیمابی، کمیٹی اسرائیلی، مسعود قریشی، اعجاز رسانی، حنیف ہاشمی، گلزار احمد فدا، آفد عسکری، اکیش کاشمیری

ڈراما

محمد عمر، نور الٰہی، جگدیش کنول، اثر عسکری، نرسنگھ داس نرگس، ایم اے عزیز

افسانہ و ناول

کرشن موہن لال، پنڈت وشوا ناتھ، مسری ڈوگرو، کے ایل ورما، اقبال چند ڈاکٹر کے ایس چوہدری، نشاط جموی، امنت رام دیا، مہاشا روشن لال، ساگر چند، سندرشن، ولبت رام گپتا، عشرت کاشمیری، محمد عمر نور الٰہی، محمود ہاشمی، کنول نین پرواز، محمود مدنی، آوارہ زمی، فیض مہدی، انور نقوی، محبوبہ بخشی، عزیز کاش، شاکر کرپٹھم، عبدالعزیز ملانی، طالب کرنگانی، نعیم

اقبال تمنائی، گلزار احمد فدا، موہن یاور، حمیدہ فضل کریم، بملا گپتا، رعنا نظامی

تنقید

محمد عمر نورالٰہی، حنیف ہاشمی، بی۔ ڈی۔ بل شرما، دیاکرشن گردش، عبدالمجید نظامی گلزار احمد فدا، محمد شبیر، ڈاکٹر محمود درازی

آزادی کے لئے ہم نے جدوجہد تو بہت کی تھی لیکن وہ جب آئی تو اپنے ساتھ بہت سی بدعتیں اور مصائب بھی لائی۔ ملک کی تقسیم اور فسادات کی آگ نے اس علاقے کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ نہ صرف خطۂ جموں کا ایک بہت بڑا حصہ اس سے کٹ گیا بلکہ اُن کی ادبی محفلوں کا شیرازہ بھی بکھر گیا کہ جنہوں نے اس خطے کو اردو کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ بہت سے ادیب پاکستان چلے گئے۔ کچھ نے ملک کے دوسرے ادبی مراکز کی طرف ہجرت کی یا پھر اردو چھوڑ کر کسی اور زبان کے سائے میں پناہ لی۔ جو باقی بچے اُن کے ذہنوں پر فسادات کی ہولناکیاں اس قدر مسلط تھیں کہ اُنہیں سوجھ ہی نہ رہا تھا کہ کیا کریں۔ آزادی سے پہلے اس خطے سے سو کے قریب اردو اخبار نکلتے تھے۔ آزادی کے بعد جو باقی بچے وہ بھی غیر یقینی صورتِ حالات کا شکار ہو گئے۔ تاہم اس انتشار کے زمانے میں ریڈیو کشمیر جموں (۱۹۴۸ء) کے قیام نے ایک قومی سہارے کا کام انجام دیا۔ اب یہی ریڈیو اسٹیشن ادبی اسکول بھی تھا اور ادبی مرکز بھی۔ اسی کے گرد آہستہ آہستہ ادیب جمع ہونے لگے اور تخلیقی کاوشوں کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہوا۔ نظمیں غزلیں، تنقیدی و تحقیقی مضامین اور ڈرامے نشر کرنے کے علاوہ ریڈیو نے مشاعرے منعقد کرنے کی روایت کو از سرِ نو زندہ کیا۔ (جو آج تک جاری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ریڈیو جموں نے اب تک ایک ہزار کے قریب ادبی پروگرام اور پانچ سو کے قریب اردو ڈرامے نشر کئے ہیں)

دوسری طرف ریاستی سرکار کے شعبۂ نشر و اشاعت نے بھی ریاستی سرکار کی پالیسیوں کے فروغ کے لئے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح

تعمیر

خطۂ جموں کے کونے کونے میں ڈرامے اور دوسری تفریحی تقریبات منعقد کی جانے لگیں۔ سرکار کی کامیابیوں اور کارناموں کو خاص و عام تک پہنچانے کے لئے کتابوں اور کتابچوں کے علاوہ اشتہارات بھی اسی زبان میں جاری ہونے لگے جس سے اردو زبان کو نامساعد حالات کے باوجود زندہ رہنے کا موقع ملا۔

وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے جمود کے بادل چھٹنے لگے مقامی ادیبوں نے کہ جن میں پرانی نسل کے کچھ ادیبوں کے علاوہ نئی نسل کے بہت سے ادیب بھی شامل تھے انہوں نے ریڈیو اور شعبۂ نشر و اشاعت کے علاوہ دوسرے ادبی مراکز بھی قایم کرنا شروع کئے جس کے نتیجے کے طور پر متعدد ادبی انجمنیں اس خطے کے طول و عرض میں قایم ہوگئیں۔ ان ادبی انجمنوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ کو نہ صرف ممکن بنایا بلکہ اسے توسیع دینے کے لئے بھی اقدامات کئے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خطۂ جموں میں متعدد ادبی مراکز ابھر آئے جن میں کشتواڑ، بھدرواہ، ادھم پور، جموں، تھنہ منڈی، راجوری، سرن کوٹ اور پونچھ کے ادبی مراکز نے خاصی شہرت حاصل کی۔ ان کوششوں سے پورے خطے میں اردو کا ماحول تیار ہوگیا۔ (اور اب صورتِ حالات یہ ہے کہ اس خطے کا شاید ہی کوئی علاقہ ایسا ہو کہ جہاں اردو کی کوئی ادبی انجمن کام نہ کر رہی ہو۔)

۱۹۶۳ء میں جب ریاستی سرکار نے کلچرل اکیڈیمی کا قیام عمل میں لایا تو اس سے دوسری زبانوں کے ساتھ ہی ساتھ اردو کو مزید استحکام ملنے کے امکانات پیدا ہوگئے۔ کلچرل اکیڈیمی نے مشاعرے منعقد کرنے، فن پارے تخلیق کروانے، انہیں شائع کرنے کے لئے امداد دینے، ڈرامے تخلیق کروانے اور ڈراما فیسٹول منعقد کرنے، ادیبوں کو فیلوشپ اور اعزازات دینے، کتابوں پر ہر سال انعامات دینے کے علاوہ ادبی انجمنوں کو مالی امداد دینے کا کام بھی شروع کیا۔ ان کوششوں نے مزید ادبی انجمنوں کے قیام کو ممکن بنایا۔ [چنانچہ اس وقت جو ادبی انجمنیں اس خطے میں قایم ہیں ان کے نام یہ ہیں:۔ کلچرل فورم جموں (۱۹۶۹ء) بزم اردو تعمیر

جموں (۱۹۴۰ء) بزم ادب جموں (۱۹۵۲ء) انجمن ترقی پسند مصنفین جموں (۱۹۵۸ء، ۱۹۶۸ء) انجمن فروغ اردو جموں (۱۹۶۳ء) انجمن ترقی اردو جموں (۱۹۶۷ء) بزم ادب ادھم پور ۱۹۶۸ء مجلس ادب [illegible] شناسی (۱۹۶۸ء) بزم ادب بھدرواہ (۱۹۶۸ء) بزم ادب بانہال ۱۹۷۲ء بزم ادب [illegible] ۱۹۷۳ء حلقۂ فکر و فن جموں (۱۹۷۳ء) نورنگ ادبی کنج (۱۹۷۵ء) کرشن چندر لائبریری کلب پونچھ (۱۹۶۸ء) کرشن چندر میموریل کلب سوہن کھوٹ ۱۹۶۸ء]

خطۂ جموں میں اردو زبان و ادب کو مزید فروغ دینے اور تحقیقی تنقیدی کاموں کی روایت شروع کرنے کا سہرا شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی (۱۹۶۵ء) کے سر ہے۔ یونیورسٹی میں ایم اے کا شعبہ قائم ہونے کا صحت افزا اثر کالجوں پر بھی پڑا۔ آزادی کے بعد کالجوں میں اردو کی حالت کمزور ہو چکی تھی اور طلبہ کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی تھی۔ اردو کا شعبہ قائم ہونے سے اس میں پہلے تو ٹھہراؤ پیدا ہوا اور پھر آہستہ آہستہ طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی سرکردگی میں شعبۂ اردو نے نہ صرف یونیورسٹی کی چار دیواری کے اندر اردو کا ماحول پیدا کیا بلکہ اس کے باہر بھی اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر کے اردو کی فضاء کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ (اب یہی کام پوری شد و مد سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد انجام دے رہے ہیں) خطۂ جموں میں اردو کی صورت حالات کو بہتر بنانے میں شعبۂ اردو کی خدمات کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں جب یہ شعبہ قائم ہوا تو اسے شام کا شعبہ قرار دیا گیا تھا لیکن اب یہ دن کا شعبہ ہے اور طلبہ کی تعداد بھی پہلے سے کہیں بہتر ہے۔ ایم اے کے علاوہ ایم فل کلاس کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ اور ایک درجن سے زیادہ اسکالر پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اس وقت تک شعبے کے [illegible] اسکالر پی ایچ ڈی اور ایک ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ ایک [illegible] اسکالر [illegible] کے لئے پیش کئے جا چکے ہیں اس وقت تک [illegible] کام ہو چکے

ہیں۔ اُن کی تفصیل اس طرح سے ہے:۔

(۱) محروم کی شاعری ۱۹۶۷ء از ظہور الدین، مطبوعہ

(۲) اردو ڈرامہ جموں و کشمیر میں ۱۹۶۸ء از جتیندر شرما، غیر مطبوعہ

(۳) عجائب القصص، ۱۹۶۹ء از ایڈلین رُوحی، غیر مطبوعہ

(۴) نقوشِ غالب (۱۹۶۹ء) مرتبہ: ڈاکٹر گیان چند جین، مطبوعہ

(۵) نریش کمار شاد حیات اور شاعری (۱۹۷۰ء) از کیلاش کمار، غیر مطبوعہ

(۶) اُردو پر گاندھی کا اثر ۱۹۷۱ء از تحفہ اختر، غیر مطبوعہ

(۷) تفسیرِ غالب (۱۹۷۱ء) از ڈاکٹر گیان چند جین، مطبوعہ

(۸) بیسویں صدی کے اُردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات (۱۹۷۲ء)

از:۔ ڈاکٹر ظہور الدین، مطبوعہ

(۹) تجزیے (۱۹۷۳ء) از:۔ ڈاکٹر گیان چند جین۔ مطبوعہ

(۱۰) لسانی مطالعے ۱۹۷۳ء از:۔ ڈاکٹر گیان چند جین۔ مطبوعہ،

(۱۱) جموں و کشمیر میں اُردو شاعری ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۷۳ء، جاوید قاضی، غیر مطبوعہ

(۱۲) ریاست جموں کشمیر میں اردو افسانہ ۱۹۷۳ء، اسد اللہ وانی، غیر مطبوعہ

(۱۳) جموں و کشمیر میں اردو ناول ۱۹۷۴ء، محمد شریف ملک غیر مطبوعہ

(۱۴) اردو میں تمثیل نگاری (۱۹۷۵ء) ڈاکٹر منظر اعظمی

(۱۵) انشاء اللہ خان دہلوی حیات شخصیت اور اردو نثر میں ان کا حصہ، ۱۹۷۶ء

از:۔ ڈاکٹر ایس ایل کالرا، غیر مطبوعہ

(۱۶) تشکیلات (۱۹۷۶ء) از:۔ ڈاکٹر ظہور الدین، مطبوعہ

(۱۷) مسلم [illegible] (۱۹۷۶ء) از:۔ عبدالرحمان اونیال، غیر مطبوعہ)

تعمیر

(۱۸) رسالہ جامعہ کا وضاحتی اشاریہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۷۶ء تک (۱۹۷۶ء)
صرف ۲۱۳ رسالے از: تسنیم اختر زادہ (غیر مطبوعہ)
(۱۹) چراغ راہ (۱۹۷۶ء) ڈاکٹر منظر اعظمی (مطبوعہ)
(۲۰) اقبال اور کشمیر ۱۹۷۷ء پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ
(۲۱) اقبال، زندگی، شخصیت اور شاعری (۱۹۷۷ء) از پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ
(۲۲) مرقع اقبال (۱۹۷۷ء) از: پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ
(۲۳) دو ریڈیو فیچر (۱۹۷۷ء) از: پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ
(۲۴) بچوں کا اقبال (۱۹۷۷ء) از: پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ
(۲۵) ملک راج، سوانح اور ادبی خدمات (۱۹۷۸ء) کنول کمار دگل، غیر مطبوعہ
(۲۶) پشکر ناتھ حیات اور کارنامے (۱۹۷۹ء) رام دتہ چارک، غیر مطبوعہ
(۲۷) علی عباس حسینی، حیات اور کارنامے (۱۹۷۹ء) ڈاکٹر ثمینہ اختر، غیر مطبوعہ
(۲۸) ل، احمد، حیات اور کارنامے (۱۹۷۹ء) ڈاکٹر محمد اقبال، غیر مطبوعہ
(۲۹) نقطے اور شوشے (۱۹۸۰ء) ڈاکٹر ایس۔ ایل۔ کالرا، مطبوعہ
(۳۰) اقبال اور مغربی مفکرین، پاکستان ایڈیشن (۱۹۸۰ء)
از: پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ
(۳۱) آنکھیں ترستیاں ہیں۔ (۱۹۸۱ء) از: پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ
(۳۲) فکر اقبال کے بعض اہم پہلو (۱۹۸۲ء) از: پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ
(۳۳) IQBAL HIS POETRY AND PHILOSOPHY، (۱۹۸۲ء)
از: پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ
(۳۴) نشانِ منزل (۱۹۸۲ء) از: پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ

نعیمہ

(۳۵) مشاکر اپنچھی حیات اور کارنامے (۱۹۸۲ء) ڈاکٹر محمد شریف ملک، غیر مطبوعہ

(۳۶) اردو میں علامتی افسانہ، ۱۹۶۰ء کے بعد، (۱۹۸۲ء)
از: شری کلدیپ کمار گپتا، غیر مطبوعہ

(۳۷) جموں میں اردو کی ادبی انجمنیں ۱۹۸۲ء، راج سنگھ، غیر مطبوعہ

(۳۸) گوپال متل کی شاعری ۱۹۸۳ء ضیاء الدین، غیر مطبوعہ

(۳۹) جوش ملیح آبادی بحیثیت نثر نگار (۱۹۸۳ء) سکھ چین سنگھ، غیر مطبوعہ

(۴۰) پونچھ کے کچھ ادیب، ۱۹۸۳ء کرن جیت سنگھ، غیر مطبوعہ

(۴۱) پروفیسر مجیب کی ڈرامانگاری، ۱۹۸۳ء، وجے دیو سنگھ، غیر مطبوعہ

(۴۲) IQBAL-MIND AND ART ۱۹۸۳ء پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ

(۴۳) محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات ۱۹۸۳ء پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مطبوعہ

تحقیقی و تنقیدی کام کے سلسلے میں شعبے کے اساتذہ کی خدمات کو نہ صرف ریاست کے اندر بلکہ باہر بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ملک کے مختلف اداروں نے انہیں متعدد انعامات سے نوازا ہے۔ شعبے کے موجودہ صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد اپنی متعدد کتابوں پر اس وقت تک ۱۸ انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر عابد پشاوری ایک، ڈاکٹر منظر اعظمی دو، راقم دو انعامات حاصل کر چکے ہیں۔

اردو زبان کے فروغ کیلئے یونیورسٹی کے دو ادارے شعبے سے متعدد خدمات انجام لے رہے ہیں۔ یہ شعبے INSTITUTE OF CORRESPONDENCE COURSE اور CONTINUING EDUCATION ہیں۔ ان دو اداروں نے تین سرٹیفکیٹ کورسز چلا رکھے ہیں جن میں سے ایک کورس ہندی کے ذریعے اردو پڑھانے سے متعلق ہے۔

ریاست میں اردو زبان کو سب سے زیادہ استحکام ۱۹۷۵ء میں شیخ محمد عبداللہ کے دوبارہ

تعیر

برسرِ اقتدار آنے کے بعد حاصل ہوا۔ شیخ صاحب کی قیادت میں ریاستی سرکار نے زبانوں سے متعلق جو پالیسی اختیار کی وہ قابلِ ستائش ہے، اردو اور ہندی دونوں کو لازمی مضامین قرار دے کر خطہ جموں میں اردو کے فروغ کے مزید امکانات پیدا ہوئے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پالیسی کو ایمانداری کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ اور ایسے تعلیمی ادارے کہ جہاں ان زبانوں کی تعلیم و تربیت کے انتظامات نہیں ہیں وہاں مخصوص اقدامات کئے جائیں۔ غیر سرکاری تعلیمی ادارے خاص طور سے بڑی غیر ذمے داری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ایسے غیر سرکاری ادارے جو حکومت کی اس پالیسی پر عمل نہ کریں، انہیں تمام سرکاری مراعات سے محروم کیا جائے لیکن ایسا کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ یہ سب کچھ علاقائی زبانوں کی قیمت پر نہ ہو۔ اردو نے آج تک کسی کا حق نہیں مارا ہے۔ بلکہ ہر ایک کے حق کی تائید کی ہے، اردو زبان کا یہی اخلاق اس کی بقا کا ضامن ہے اور اب بھی وہ اپنے اسی روایتی خلوص اور فراخیٔ قلب سے کام لیکر اپنے لئے ماحول سازگار بنا رہی ہے۔ اور سب کو ساتھ لے کر آگے بڑھ رہی ہے۔ سب زبانوں کو فروغ کے مواقع فراہم کئے جانے چاہیں، یہ ان کا بنیادی حق ہے اور اردو زبان اس پالیسی کی تائید کرتی ہے۔

آزادی کے بعد خطہ جموں میں جہاں بے شمار نئے اخبار و رسائل وقتاً فوقتاً جاری ہوئے ہیں، وہیں مختلف ادبی اصناف کی صورت میں بے شمار کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ نئے رسائل میں سنگم، نوری چمپم، ڈھنگ اور ادبیات قابلِ ذکر ہیں۔ اخباروں میں سندیش، رفتار، اجالا، اور قومی آواز کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت اس خطے میں چھپنے والے اردو اخباروں کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے۔

ادبی تصنیفات میں کلام کے مجموعے، افسانوں کے مجموعے، ناول، ڈرامے اور تحقیقی و تنقیدی کتب شامل ہیں۔ ان تصنیفات میں فنی اعتبار سے جہاں روایتی اقدار کا

تعمیر

تتبع کیا گیا ہے وہیں جدید ادبی نظریات کے عناصر بھی برتے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اردو کے مقامی ادیب اُتنے ہی بیدار ذہن ثابت ہوئے ہیں کہ جتنے ملک کے کسی دوسرے علاقے کے اردو ادیب۔

آزادی کے بعد شاعری میں کشن سمیل پوری، عرش صہبائی، عابد مناوری، تماما بدوانی، رہبر جتبید، محمد یٰسین، دینا ناتھ رفیق، غلام رسول کامگار، نشاط کشتواڑی، عشرت کاشمیری، منوہر لال دل، پرتپال سنگھ بیتاب، یوگ راج اور حکیم منظور، ڈرامے میں رام کمار ابرول، زیڈ سہیو، دینو بھائی پنت 'زہری رانیزادہ'، نرسندر کھجوریہ، وجے سمن اور پشکر ناتھ، ناول اور افسانے میں ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، مالک رام آنند، پشکر ناتھ، کرن کاشمیری، نند کمار ابرما، کشوری منچندہ، وجے سوری، شیام سندر، آنند لہر، خالد حسین اور راقم، تنقید و تحقیق میں ڈاکٹر گیان چند جین، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر عابد پشاوری، ڈاکٹر منظر اعظمی، راقم اور شعبۂ اردو کے متعدد طلبہ کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے کچھ کی تصنیفات پر ریاستی کلچرل اکیڈیمی اور ریاست سے باہر کی متعدد اکیڈیمیوں نے انعامات دیئے ہیں۔ کچھ کی تفصیل یوں ہے:-

(۱) شگفتِ گل، از عرش صہبائی، ۱۹۶۰ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے انعام دیا۔

(۲) اندھیرے اُجالے از پشکر ناتھ ۱۹۶۲ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے انعام دیا۔

(۳) بہار غزل از عابد مناوری ۱۹۶۲ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے انعام دیا۔

(۴) ڈل کے باسی از پشکر ناتھ ۱۹۶۷ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے انعام دیا۔

(۵) تفسیرِ غالب از:- ڈاکٹر گیان چند جین ۱۹۷۲ء میں غالب اکیڈیمی نے انعام دیا۔

(۶) تجزیے:- از: ڈاکٹر گیان چند جین، ۱۹۷۴ء میں یوپی اردو اکیڈیمی نے انعام دیا۔

(۷) محروم کی شاعری از:- ڈاکٹر ظہور الدین ۱۹۷۶ء میں یوپی اردو اکیڈیمی نے انعام دیا۔

(۸) سب رس کا تنقیدی جائزہ از ڈاکٹر منظر اعظمی ۱۹۷۶ء میں یوپی اردو اکیڈیمی نے انعام دیا۔

(۹) اردو میں تمثیل نگاری از: ڈاکٹر منظر اعظمی ۱۹۷۸ء میں یو.پی اردو اکیڈمی نے انعام دیا۔

(۱۰) نا تمام از: حکیم منظور، ۱۹۷۹ء۔ ریاستی کلچرل اکیڈمی نے انعام دیا۔

(۱۱) اثر کے حریف و حلیف از: ڈاکٹر عابد پشاوری ۱۹۸۰ء میں یو.پی اردو اکیڈمی نے انعام دیا۔

(۱۲) کیفی بلند از ڈاکٹر ظہور الدین ۱۹۸۲ء میں یو.پی اردو اکیڈمی نے انعام دیا۔

(۱۳) پیش خیمہ از: پرتپال سنگھ بیتاب ۱۹۸۲ء میں ریاستی کلچرل اکیڈمی نے انعام دیا۔

(۱۴) آنکھیں ترستیاں ہیں: از پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ۱۹۸۲ء ریاستی کلچرل اکیڈمی نے انعام دیا۔

(۱۵) نشانِ منزل از پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۸۳ء یو.پی اردو اکیڈمی نے انعام دیا۔

اوپر پیش کئے گئے اس مختصر سے جائزے سے یہ بات عیاں ہے کہ خطہ جموں میں اردو زبان و ادب کا مستقبل روشن ہے۔ اس خطے کے عوام کی روایتی فراخدلی نے انہیں اردو زبان کا گرویدہ بنا دیا ہے اور وہ اسے ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس سودمند ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو والے اپنی کوششوں کو منظم کرکے انہیں مناسب سمت عطا کریں۔ لیکن یہ کام دوسری زبانوں کے حقوق کی پاسداری کرکے اور ان کے تعاون سے کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ اردو کے فطری رجحان سے مناسبت رکھتا ہے۔ دوسری طرح کی کوئی بھی کوشش اردو کو فائدہ پہنچانے کی بجائے اس کے لئے نقصان دہ ہوگی۔

ڈاکٹر نذیر ملک شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی

کشمیر میں اُردو — ایک لسانیاتی جائزہ

اُردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔ اس کی عمر مشکل سے سات آٹھ سو برس ہوگی لیکن جدید ہند آریائی زبانوں میں یہ واحد زبان ہے جو کم عمری میں ہی ملک گیر زبان کی حیثیت حاصل کر گئی۔ ہندوستان میں اس کی باضابطہ ابتداء ۱۱۹۳ء سے ہوتی ہے جب مسلمان پنجاب میں تقریباً دو سو سال رہنے کے بعد محمد غوری کی قیادت میں دہلی اور اس کے گرد و نواح میں داخل ہوتے ہیں چونکہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں فارسی سرکاری زبان تھی اس لئے اُردو بہت جلد ادبی زبان کی حیثیت حاصل نہ کرسکی لیکن بول چال کی زبان کی حیثیت سے یہ دلی اور اس کے گرد و نواح کی گلیوں اور بازاروں میں برابر ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی اور فارسی کے گہرے اثرات قبول کرتی رہی۔ اس کے بعد علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کے دورِ حکومت میں یہ نوایجاد زبان دکن کے غیر ہند آریائی ماحول میں [illegible] سلطنت کے قیام کے بعد اس کو موافق حالات میسر ہوتے ہیں اور [illegible] شعرا و ادبا کی [illegible] منزلیں طے کرتی ہے ساتھ ہی دکن

میں اردو ادیبوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوگیا۔ ان میں سالک، خوشی محمد ناظر، منشی سراج الدین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے "مفرح القلوب" کے نام سے ادیبوں کا ایک حلقہ ترتیب دیا اور باضابطہ مشاعرے اور ادبی نشستیں منعقد کیا کرتے تھے اس طرح اردو کی ترویج میں اس حلقے کے اراکین نے بھی نمایاں رول ادا کیا۔ اسی زمانے میں دلی، امرتسر اور لاہور سے اردو اخبارات بڑی تعداد میں آنے شروع ہوگئے۔ اس طرح اردو ایک طاقتور زبان کی حیثیت سے یہاں قدم جمانے لگی۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت نشین ہوئے۔ اردو کی مقبولیت، ریاست کی لسانیاتی تقسیم اور ہندوستان کے ساتھ تہذیبی تعلقات کے پیش نظر کچھ مدت کے بعد ہی انھوں نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک جموں و کشمیر کی عدالتوں اور محکمہ مال کا سارا کام کاج اسی زبان میں انجام دیا جانا شروع ہوگیا تھا۔ کشمیر میں اردو کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ تحریک آزادی کشمیر کا سارا مواد اسی میں چھپتا تھا۔ یہاں کے لیڈر اور تحریک آزادی کے بانی جناب شیخ محمد عبداللہ مرحوم تحریک آزادی کے نعرے اسی زبان میں بلند کرتے تھے اپنی تقریروں کا آغاز اردو شعرا اور خاص کر کلام اقبال سے کرتے تھے غرض کشمیر کی تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں اردو نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ کشمیر میں اردو کی ترویج اور ترقی کے سلسلے میں اخبارات کے رول کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے ریاست کا پہلا اخبار "بدیا بلاس" ۱۸۸۲ء میں جموں سے شائع ہوا۔ یہ سرکاری اخبار تھا اس کے بعد آہستہ آہستہ اردو صحافت بھی یہاں زور پکڑتی گئی اور تقسیم ملک تک یہاں اردو صحافت ارتقا کی کئی منزلیں طے کرچکی تھی۔ چنانچہ پریم ناتھ بزاز جیسے

تعمیر

ملک راج صراف، مولانا مسعودی وغیرہ صحافت کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دے چکے تھے۔ آج بھی اخبارات جن میں سرینگر ٹائمز، آفتاب، آئینہ، نوائے صبح وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کشمیر میں اردو کی ترویج میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ عام لوگوں کے ساتھ اردو زبان کے رشتے کو زیادہ گہرا اور مستحکم بنانے میں یہ اخبار آج موثر رول نبھا رہے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں حکومت نے ریاست کی لسانیاتی تقسیم کے پیش نظر سیدین کمیٹی کی سفارشات کو منظور کیا اور اردو کو تمام سکولوں میں ذریعہ تعلیم بنایا۔ یہ واقعہ کشمیر میں اردو کے فروغ کے سلسلے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں سے اس عزم سے ریاست کے طول وعرض میں سکولوں اور کالجوں میں اردو اساتذہ تعینات کئے گئے اور اردو تعلیم کے سلسلے میں خاطر خواہ انتظامات کئے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء کا سال بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے جب یہاں کی قانون ساز اسمبلی نے دفعہ ۱۴۵ کے تحت اردو کو باضابطہ سرکاری زبان کی حیثیت دے دی اور ریاست کا سارا سرکاری کام اسی زبان میں انجام دیئے جانے پر زور دیا گیا۔

لسانی اعتبار سے ریاست جموں وکشمیر کئی بولیوں میں بٹی ہوئی ہے مثلاً کشمیری، ڈوگری، لداخی وغیرہ لیکن سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اردو ریاست کے تینوں خطوں کے درمیان رابطے کی زبان کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اس طرح تینوں خطوں کے باشندوں نے اس کو ایک تہذیبی زبان کی حیثیت سے قبول کیا ہے اور اسی زبان کے ذریعے ہندوستان کے ساتھ تہذیبی رشتے قائم رکھے ہوئے ہیں۔ جموں میں رہنے والوں کی مادری زبان ڈوگری ہے جو لسانیاتی اعتبار سے پنجابی کی ایک بولی ہے اور جس کا ارتقا پنجابی سے الگ طور پر ہوا ہے۔ اسی طرح اس میں کچھ ایسی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ پنجابی سے کچھ کچھ مختلف معلوم ہوتی ہے لیکن جہاں

تعمیر

تک اس کی بنیادی ساخت کا تعلق ہے وہ پنجابی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اسی طرح یہ ایک ہند آریائی زبان ہے لیکن جہاں تک ڈوگری میں ادبی علمی اصطلاحات کا تعلق ہے ڈوگری پنجابی سے زیادہ جدید ہندی سے استفادہ کر رہی ہے۔ جہاں تک اردو اور کشمیری کا تعلق ہے، دو مختلف خاندانِ السنہ سے تعلق رکھنے کے باوجود آپس میں گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ کشمیری نے اردو سے بہت سے الفاظ مستعار لئے ہیں اور ان کو اپنی گرائمر اور صوتیات کے مطابق استعمال کر رہی ہے دونوں کا ادبی علمی اور اصطلاحی لین دین ہے۔ کچھ آوازوں کی تحریری علامتوں کو چھوڑ کر دونوں کے رسم خط میں گہری مماثلت ہے یعنی دونوں عربی فارسی خط کی توسیع شدہ شکلیں ہیں۔ کشمیری نے اردو کے ذریعے ہی علمی، ادبی اور مذہبی لفظیات اور اصطلاحات کا بڑا ذخیرہ بنایا ہے۔ کشمیر میں اردو کے ارتقا کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہئے کہ اردو نے کشمیری کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے اس سے پہلے کشمیری فارسی سے گہرے طور پر متاثر ہو چکی تھی۔ لیکن فارسی اور عربی کی بہت سی خصوصیات ایسی ہیں جو اردو کے توسط سے کشمیری میں آئی ہیں۔ اس کے علاوہ خاص اردو الفاظ کی ایک بڑی تعداد بھی کشمیری میں رچ بس گئی ہے جو آج کشمیری زبان کا ایک ناقابلِ تنسیخ حصہ بن چکے ہیں۔ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے فن پارے اس کے واضح ثبوت ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو کس طرح یہاں کی زبان اور ذہنوں کے ساتھ مضبوط رشتہ قائم کر چکی ہے اور یہاں کی لسانی صورت حال کو کس قدر متاثر کر چکی ہے تعلیمی زبان کے طور پر یہاں کے طالب علم ابتدائی درجات میں ہی اس سے متعارف ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک ذہنی اور جذباتی رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ یہ رشتہ ان کی تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ بہت گہرا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے

تعمیر

پڑھے لکھے لوگ کشمیری میں گفتگو کرتے ہوئے اردو الفاظ کا آزادانہ استعمال کرتے ہیں اور کشمیری میں متبادل الفاظ ہونے کے باوجود اردو الفاظ کے استعمال کو ترجیح دیتے ہیں۔ کشمیری میں گفتگو کرتے ہوئے کبھی کبھی ایک دم اردو میں بولنا شروع کرتے ہیں۔ اس عمل کو علم لسانیات میں CODE SWITCHING کہتے ہیں۔ کشمیر میں CODE SWITCHIN صرف اردو اور انگریزی زبانوں تک محدود ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی اردو کو ہی ترجیح دی جاتی ہے۔
ان تمام باتوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو یہاں کی تہذیب میں کس طرح رچ بس گئی ہے۔ جہاں تک کشمیر میں اردو ادب کا تعلق ہے یہاں کے فن کاروں نے اردو ادبیات میں نمایاں اضافے کئے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ پر بات کرتے ہوئے کشمیر کی اردو ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہاں شاعری، افسانہ، ناول انشائیہ، تنقید غرض ادب کے ہر شعبے میں کامیاب تجربے کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ اردو چونکہ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی مادری زبان نہیں ہے اس لئے ان کے ہاں اردو بول چال کی زبان کا تخلیقی استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس کے بجائے وہ مروّجہ شعری الفاظ کے استعمال کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ شائد ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیر سے ہم ابھی تک ایک بھی بڑے اردو شاعر کو پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ بول چال کی زبان میں جو تخلیقی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں ظاہر ہے کہ ایک غیر مادری زبان شاعر انھیں EXPLOIT نہیں کرسکتا ہے۔ بہ حیثیت سرکاری اور تعلیمی زبان کے کشمیر میں اردو کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ یہاں کے فعال تخلیقی بطن سے اپنا مضبوط رشتہ قائم نہیں کرسکی ہے۔ اور شائد یہی وجہ ہے کہ یہاں کے بہت سے شعرا جو اردو میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں

کا اظہار کرتے تھے اب کشمیری کی طرف آنے لگے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ کشمیر میں اردو کی حیثیت ثانوی اور اکتسابی زبان کی ہے۔ دوسری زبان کو سیکھتے ہوئے مادری زبان کے اصول اور قواعد ہمیشہ مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ سیکھنے کے اس عمل میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسری زبان کے اجنبی اصولوں کو ہم غیر شعوری طور پر مادری زبان کی لسانیاتی عادات کے مطابق استعمال کرتے ہیں اور یہ محسوس بھی نہیں ہو پاتا ہے کہ ہم اپنی لسانیاتی عادات کے مطابق نئی زبانوں کے اصولوں کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ .... ۔ نئی زبان کی اجنبی خصوصیات کے بارے میں جب تک سیکھنے والے کو واقف نہ کیا جائے وہ ان کے صحیح استعمال پر قادر نہیں ہو سکتا ہے ۔ یہ ایک لسانیاتی حقیقت ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں دوسری زبانوں کے سکھانے کے سلسلے میں جدید لسانیاتی طریقوں کے بجائے ابھی تک روایتی طریقوں سے ہی کام لیا جاتا ہے۔ کشمیر میں بھی اردو سکھانے کے سلسلے میں وہی روایتی TRANSLATION METHOD مروج ہے۔ جس میں بول چال سے پہلے تحریری اور کتابی گرامر پر ساری توجہ مرکوز کرائی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہاں کے طلبہ گرامر کے اصولوں کے گورکھ دھندے میں پھنس جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ اردو کے کتابی گرامر سے بہ خوبی واقف ہوتے ہیں لیکن اس کے صحیح استعمال پر قادر نہیں ہو سکتے ہیں۔ وہ اردو بول چال میں اکثر اردو کی آوازوں اور بعض دوسری خصوصیات کو کشمیری عادات کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ زبانیں دو مختلف مزاجوں کی ہیں اور دونوں کی ساختوں میں نمایاں فرق ہے اس لئے اردو زبان

سیکھتے ہوئے اس کی مخصوص صوتی اور دوسری قواعد کی خصوصیات پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے اور ان کو شعوری طور پر پہچاننے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کشمیری پر اردو کے گہرے اثرات ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ اثرات صرف الفاظ تک محدود ہیں۔ جہاں تک کشمیری کی صوتیات، بنیادی افعال، اسماء ضمائر اور تذکیر و تانیث کا تعلق ہے اس نے اردو سے کوئی اثر قبول نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں اردو اور کشمیری دونوں کی اپنی اپنی نمائندہ خصوصیات ہیں۔ ایسی صورت میں کشمیر میں اردو کا معیاری تلفظ قائم نہیں ہو سکا ہے۔ اردو کے معیاری تلفظ سے میری مراد بعض آوازوں کی طریق ادائیگی سے ہے۔ ف۔ق۔خ۔غ۔بھ۔دھ۔جھ۔ گھ۔ڈھ۔ڑھ اردو کی بنیادی آوازیں ہیں۔ ان آوازوں کے بغیر میرے خیال میں اردو کی پہچان ممکن نہیں ہے۔ یہ آوازیں چوں کہ کشمیری صوتیات میں بالکل مفقود ہیں اس لئے قدرتی طور پر کشمیری ان آوازوں کے مخارج اور طریق ادائیگی سے واقف نہیں ہیں اور نہ انھیں روایتی نظام تعلیم میں شعوری طور پر ان آوازوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔ اس لئے اردو بولتے ہی ان آوازوں کا صحیح تلفظ نہیں ہو پاتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ ہر زبان کی بعض علاقائی خصوصیات ہیں اور زبان لسانیاتی اصطلاح میں دراصل مختلف بولیوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور بولیوں کی تفاوت ہی ایک زندہ زبان کی شناخت ہوتی ہے اور جب کوئی زبان بندھے ٹکے اصولوں میں مقید کی جاتی ہے تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ سنسکرت کا حال سب کو معلوم ہے۔ لیکن ایسی خصوصیات اور آوازوں کے بارے میں کیا کہیے گا۔ جن کے بغیر ایک زبان کی پہچان ہی ممکن نہ ہو۔ درج بالا آوازوں

کا تام ہی اردو ہے جو اس کو ایک طرف فارسی سے قریب کرتی ہیں اور دوسری طرف اس کے ہند آریائی مزاج کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان آوازوں کے تلفظ کے بغیر اردو کے صحیح بول چال سے انصاف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال کشمیر میں اردو کا لسانیاتی جائزہ پیش کرتے ہوئے درج بالا خصوصیات اوّلین اہمیت کی حامل ہے۔

نون غنہ (غنیت NASALIZATION) اردو اور کشمیری دونوں کی صوتیات کی مشترکہ خصوصیت ہے اور دونوں زبانوں کے بولنے والے اس کے تلفظ پر قادر ہیں لیکن اردو کے یہ گنتی کے الفاظ تینتیس[۳۳]، چونتیس[۳۴]، پینتیس[۳۵]، سینتیس[۳۷]، سینتالیس[۴۷] وغیرہ جن میں نون غنہ کی آواز ہے کشمیری اردو بولنے والے اعلانیہ نون کے ساتھ بولتے ہیں۔ یہ خصوصیات اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ کشمیر میں اردو کتابوں سے سیکھی جاتی ہے۔ اردو تحریر میں جیسا کہ سب کو معلوم املا کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی ہے اردو تحریر میں جب نون غنہ لفظ کے بیچ میں آتا ہے تو اس کیلئے (ں) علامت مقرر ہے مثلاً سیّنتالیس لیکن اردو تحریر میں نون غنہ کو ہمیشہ لفظ کے بیچ میں صرف نقطے سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لئے غیر مادری زبان والے اس کو نون غنہ کے بجائے اعلانیہ نون کے ساتھ بولتے ہیں اس لئے کہ ان کو اعلانیہ نون کے ساتھ پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے اور بعد میں یہ خصوصیت ان کے ساتھ برابر رہتی ہے تاوقتیکہ ان کو شعوری طور پر اس سے واقف نہیں کرایا جاتا ہے۔

'ڑ' اردو کی مخصوص آواز ہے۔ یہ آواز کشمیری میں سرے سے مفقود ہے اور ظاہر ہے کہ کشمیری اس آواز کو بھی صحیح تلفظ کے ساتھ اس وقت تک ادا نہیں کرسکتے ہیں جب تک کہ ان کو اس کے صحیح مخرج سے شعوری طور پر واقف نہیں

کرایا جاسکے۔ اُردو کے ایسے الفاظ جن میں یہ آواز استعمال ہوتی ہے کشمیری میں "ڈ" کی آواز سے بولے جاتے ہیں مثلاً" لڑکا، توڑا، چھوڑا، علی گڑھ کو بالترتیب لڈکا، توڈا، چھوڈا علی گڈھ بولا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہاں کی تحریروں میں بھی علی گڑھ کے بجائے علی گڈھ لکھا جاتا ہے ۔

کشمیری میں ایسے الفاظ کی بڑی تعداد ہے جن کے آخر میں غیر مسموع ہکاری آواز کا استعمال ہوتا ہے مثلاً اَکھ، تارکھ، کتھ، بَاتھ، بیٹھ، تاپھ وغیرہ، یہ کشمیری صوتیات کی ایک نمائندہ خصوصیت ہے۔ اُردو کے ایسے الفاظ جن کے آخر میں غیر مسموع غیر ہکاری آواز ہوتی ہے کشمیری اردو بولتے ہوئے اپنی صوتی عادات کے مطابق ان الفاظ میں غیر مسموع غیر ہکاری آوازوں کو غیر مسموع ہکاری آوازوں میں تبدیل کرتے ہیں۔ یہ پورا عمل غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ مثلاً" اُردو کے ان الفاظ اجازت، ٹھیک، صلاحیت، عافیت، سوچ، سلطنت کو بالترتیب اجازتھ، ٹھیکھ صلاحیتھ، عافیتھ، سوچھ، سلطنتھ، بولتے ہیں اور ایسے اُردو الفاظ جن میں مسموع ہکاری آوازیں مستعمل ہیں سے کشمیری اُردو بولنے والے ہکاریت کا پہلو نکالتے ہیں اور اپنی عادت کے مطابق اس ہکاریت کو اسی لفظ کے غیر مسموع غیر ہکاری آواز میں شامل کرتے ہیں مثلاً بھیک، گدھا، بھکاری، کو بالترتیب بیکھ، گتھا، بکھاری بولتے ہیں۔ یہ صرف مادری زبان کی مضبوط گرفت کی وجہ سے ہوتا ہے ۔

کشمیری میں مندرجہ ذیل الفاظ تانیث بولے جاتے ہیں زون (چاند) یڈ (پیٹ) رُمال (رومال) کامم (کام) اولاد وغیرہ - اردو میں بات کرتے ہوئے کشمیری زبان کی گرفت کی وجہ سے ان کو تانیث کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جب

تعمیر

کہ یہ الفاظ اردو میں مذکر ہیں۔ اسی طرح بندوق، جیب، شراب، گھاس جو اردو میں مونث ہیں کشمیری ان کو مذکر استعمال کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت عام لوگوں تک محدود ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ اس سے شعوری طور پر واقف ہے لیکن پھر بھی غیر شعوری طور پر وہ بھی کبھی کبھی ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح کشمیری میں بارش اور برف پڑنے کا تصور ہے اس کے بجائے اردو میں بارش ہونے اور برف گرنے کا تصور ہے اس لئے اردو میں بات کرتے ہوئے کشمیری بارش ہو رہی ہے اور برف گر رہی ہے کے بجائے بارش پڑ رہی ہے یا بارش برس رہی ہے۔ اور برف پڑ رہی بولتے ہیں۔ اس طرح اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسی بہت سی خصوصیات ہیں جو صرف مادری زبان کی وجہ سے کشمیریوں کی اردو بول چال میں پائی جاتی ہیں۔

جہاں تک کشمیر میں اردو کے مستقبل کا تعلق ہے وہ اطمینان بخش ہے گو کہ پچھلی مردم شماری میں اردو کو مادری زبان لکھوانے والوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن بہر حال اردو یہاں کی سرکاری زبان ہے اور اسی کے ذریعے ریاست کی تینوں وحدتوں کی سیاسی، انتظامی اور تہذیبی ضروریات انجام پذیر ہوتی ہیں۔ یہاں کے تقریباً سبھی اخبارات اردو میں چھپتے ہیں۔ یہ اخبارات پوری وادی میں خاصے مقبول ہیں اور بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ریڈیو کشمیر اور ٹیلی ویژن سے اردو کے اچھے خاصے پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی رسالے چھپتے ہیں جن میں یہاں کے اور بیرون ریاست کے فن کاروں کی تخلیقات چھپتی رہتی ہیں۔ یہاں کے نوجوان بھی اس میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ یہاں کی کلچرل اکادمی اور کشمیر یونیورسٹی کا شعبہ اردو بھی اردو کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح اردو کی ترویج اور ترقی کے سلسلے میں تقریباً تمام امکانات ہیں لیکن

تعمیر

ان تمام باتوں سے قطع نظر لسانیاتی حقیقت یہ ہے کہ کوئی غیر مادری زبان مادری زبان کا رول نہیں نبھا سکتی ہے۔ غیر مادری زبان کو ہمیشہ چند مجبوریوں اور کچھ ناگزیر حالات کے تحت اپنایا جاتا ہے لیکن جب ان مجبوریوں پر قابو پایا جاتا ہے تو غیر مادری زبان کا رول آہستہ آہستہ کم ہو کر آخر کار ختم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں فارسی اس کی درخشندہ مثال ہے۔

●●

عبدالغنی شیخ ، ریڈیو کشمیر لیہہ لداخ

لداخ اور اردو

اردو لداخ کی تہذیبی اور رابطے کی زبان ہے۔ یہاں مادری زبانوں کے بعد اردو پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے تخت نشینی کے بعد فارسی اور انگریزی ترک کی اور اردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنائی۔ اسے پینتالیس سال پہلے لداخ پر ڈوگرہ حکومت کا پورا تسلط ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے ریاست کی دو اکائیوں کے ساتھ لداخ میں بھی اردو پہنچی تب سے ایک سو سال ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں نے اسے تقریباً دو سو برس پہلے بلتستان اور لداخ کو فارسی سے روشناس کیا۔ لداخ کے راجے مغلوں کے ساتھ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مسلمانوں کی آمد سے بلتی زبان میں فارسی کی بڑی آمیزش ہوئی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ہری سنگھ نے اردو کو فروغ دینے کے لئے بڑی توجہ دی۔ ۱۹۴۰ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت نے سیدین کمیٹی کی سفارشات پر ریاست کی دو اکائیوں کے ساتھ لداخ اور بلتستان کے مدرسوں میں بھی اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا۔

پچھلے ایک سو سال کے دوران لداخی زبان کو اردو نے متعدد الفاظ دیئے ہیں، جن میں

تعمیر

کچھ الفاظ اپنی اصلی صورت میں ہیں اور متعدد الفاظ لداخی سانچے میں ڈھل کر اس میں ضم ہو گئے ہیں۔ کئی مقبولِ عام کہاوتیں اور محاورے اسی دور کی یادگار ہیں جن میں اردو کے الفاظ ملتے ہیں۔

لداخی زبان کی ترکیب، ساخت اور مزاج کچھ ایسا ہے کہ اس میں اردو، ہندی یا فارسی کے الفاظ نہیں جچتے۔ اور اس زبان کے شعراء، ادیب اور صحافی اس میں دوسری زبانوں کی آمیزش کے بالکل خلاف ہیں اور نئے اور متبادل الفاظ کے لئے تبتی ماخذ سے الفاظ ڈھونڈتے ہیں یا لداخی الفاظ اور ان کے مرکبات سے تلمیحیں اور اصطلاحیں وضع کرتے ہیں۔ تاہم متعدد اردو الفاظ لداخی میں ایسے ضم ہو گئے ہیں کہ ان کے بغیر لداخی نامکمل ہو گی۔

آزادی کے بعد لداخیوں نے بلاتمیز مذہب و ملت اردو پڑھی اور تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ اردو قارئین کی تعداد بھی بڑھی۔ یہاں ہر گاؤں میں اردو پڑھانے والے استاد مل جاتے ہیں۔ لداخ میں زبان کے نام پر تناؤ اور کھنچاؤ نہیں ہوا۔ یہاں جموں کی طرح اردو سے سرد مہری اور بے اعتنائی نہیں برتی گئی بلکہ فراخ دلی سے اردو کو سینے سے لگایا گیا۔ یہی وجہ ہے آج لداخ میں ادبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی پر اردو کا اثر ہے۔ یہ ریاست اور ملک کے دوسرے حصوں کے لئے رابطے کی زبان کا کام دیتی ہے۔ اندرونِ ملک سے کوئی بڑی شخصیت آتی ہے تو اردو میں اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اردو میں سپاسنامہ پڑھا جاتا ہے۔ کھیل کے میدان میں کومینٹری اسی زبان میں ہوتی ہے اور مختلف اعلانات کرنے کے لئے اسی زبان کا سہارا لیا جاتا ہے۔

لیکن تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ جو حال کی پیداوار ہے۔ اس زبان کے ساتھ ماضی میں جو گہری وابستگی تھی، اب لیہہ ضلع میں اس میں کمی آئی ہے۔ اردو کو چوتھی جماعت تک پہلی زبان کے طور اختیار نہ کرنے کے لئے ایک غیر مرئی سی تحریک چلی ہے ریاست سے باہر جو لداخی طلباء فارغ التحصیل ہو کر آتے ہیں وہ اردو سے نابلد ہوتے ہیں۔

مجھے حال میں ایک استاد نے بتایا پچھلے دنوں لیہہ کے ایک سکول میں چند ناخواندہ مائیں آئیں اور انہوں نے پہلی جماعت میں اردو پڑھانے والے استاد سے کہا کہ ان کے بچے اردو نہیں پڑھیں گے۔ چنانچہ ان بچوں کو اردو کلاس سے خارج کیا گیا۔ ان عورتوں کے پاس بتلانے کے لئے کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ کیوں ایسا کر رہی ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ تاثر تھا کہ اردو آگے چل کر ان کے بچوں کے مفاد میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے وہ کسی کے اشارے پر بچوں کو اردو پڑھانے سے گریز کر رہی تھیں

لیکن اس تحریک کا اثر فی الحال بالکل محدود ہے۔ عام لوگ بلا تمیز مذہب و ملت اردو سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ اردو شاعری پر سر دھنتے ہیں اور اردو کی چاشنی کا گن گاتے ہیں۔ یہ اردو کی اپنی جاذبیت اور دلکشی کا جادو ہے۔

ریاستی حکومت کی موجودہ لسانی پالیسی سے اس خطے کے لوگوں میں CONFUSION سا پیدا ہوا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو دسویں جماعت تک لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق جس نے پہلی زبان اردو اختیار کی ہو۔ چوتھی سے ثانوی زبان کی حیثیت سے ہندی پڑھنی ہوگی اور ہندی پہلی زبان اختیار کرنے والے کو چوتھی سے اردو پڑھنی ہوگی۔

اردو کو اس لحاظ سے فوقیت دی گئی ہے کہ ایک لازمی مضمون کے علاوہ ابتدائی درجے سے میٹریکولیشن تک اسے ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے۔

سرکاری نوکریوں کے لئے اردو ہندی کا جاننا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

لیکن ان فیصلوں پر پوری طرح عمل نہیں ہوتا ہے اور والدین بچوں کو زبان پڑھانے کے معاملے میں تذبذب اور انتشار کے شکار ہیں۔

عام مشاہدے میں آیا ہے کہ جو زبان شروع میں اختیار کی جاتی ہے اس کی بنیاد اچھی رہتی ہے۔ خاص کر آج کل جب تعلیم کا معیار گر گیا ہے یہ مسئلہ زیادہ سنگین بنا ہے۔ چوتھی جماعت میں پہنچنے

کے بعد دوسری زبان سیکھنے کی طرف طلبہ سنجیدہ نہیں ہوتے اور بیگار سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ دونوں زبانوں میں کمزور ہوتے ہیں۔ میٹرک کے بعد ہر طالب علم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کیونکہ ان دونوں زبانوں کو خیرباد کہے اور دوسرا مضمون اختیار کرے۔ یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہونے کی وجہ سے سبھی انگریزی کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

نئے لسانی فارمولے کے مطابق بہت سارے استادوں کو ہندی یا اردو سکھانے کے لئے ریفریشر کورس کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے نتیجے کا سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ یہ اُستاد ان زبانوں کو پڑھانے کے اہل نہیں ہیں۔ ایک زبان میں ملکہ حاصل کرنے اور درس و تدریس کی مہارت پانے کے لئے ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

کئی ریاستی سرکاروں کے لئے سہ لسانی فارمولا دردِ سر بنا ہے۔ یہاں چار زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ بچوں پر بڑا بوجھ ہوگا۔

ریاست کی تینوں اکائیوں میں مادری زبانوں کا اپنا مسئلہ ہے۔ جموں میں ڈوگری، کشمیر میں کشمیری اور لداخ میں لداخی کے حق میں ایک تحریک چل رہی ہے تاہم اس تحریک نے ہمہ گیر صورت اختیار نہیں کی ہے۔ کرگل اور دراس میں بلتی یا شینا کا کوئی مسئلہ نہیں تاہم ضلع لیہہ اور زانسکار میں لداخی زبان کی تعلیم کے لئے لوگوں کا ایک بڑا طبقہ کوشاں ہے۔ یہاں تمام سکولوں میں میٹرک تک اکثر لڑکے اُردو اور ہندی کے علاوہ لداخی بھی پڑھتے ہیں۔ اکثر تخلیقی کام لداخی میں ہوتا ہے۔ اس زبان کی اپنی تاریخ، رسم الخط اور ادبی ذخیرہ ہے۔ ہر سال ریاستی کلچرل اکادمی لداخی زبان کی بہترین تصنیفات پر انعامات دیتی ہے اور نئی کتابوں کی چھپائی کے لئے سبسڈی دی جاتی ہے۔ لیکن کشمیری یا ڈوگری کی طرح لداخی زبان میں قارئین کی تعداد بہت کم ہے۔ تعلیم یافتہ نئی نسل انگریزی جریدے، اخبارات اور کتابوں کی رسیا ہے اور عام پڑھے لکھے لوگ اردو اور ہندی کتابوں اور

رسالوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

کرگل میں بلتی بولی جاتی ہے جو لداخی سے تقریباً ملتی جلتی ہے۔ بلتی عام بول چال تک محدود ہے۔ اس کے درس و تدریس یا اس میں تخلیق کی کوئی کاوش نہیں ہو رہی ہے۔ اور نہ ہی اس معاملے میں لوگ سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ مستقبل میں بلتی کی ترقی و ترویج کی طرف کوشش بھی ہوتی ہے تو اسے اردو متاثر نہیں ہوگی۔ وہاں اردو کی گرفت مضبوط ہے۔ یہی حال دراس کا ہے جہاں لوگوں کی مادری زبان شینا ہے۔

اردو لداخ میں اس وقت رابطے کی ایک اہم زبان بنی ہے۔ یہاں نہ صرف تینوں اکائیوں کے ملازم ملتے ہیں بلکہ ملک کے مختلف حصوں سے ہزاروں لوگ آتے ہیں جن میں سیاح، فوجی جوان اور تاجر شامل ہیں۔ یہی زبان سب کے لئے آپسی بات چیت اور تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہے۔

ملک کے دوسرے حصوں کی طرح فلم یہاں بھی اردو کی بقاء اور نشو و نما میں اہم کردار ادا کر رہی ہے اور فلمی مکالمے اور گیت ناخواندہ لوگوں کی زبان پر بھی چڑھے ہیں۔

اکثر لداخی ادیب اور شاعر اردو سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس کے مداح بھی ہیں۔ ان میں سے کیتوں نے اردو میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے ان میں نامور شاعر تشی رنگیس اور لداخی زبان کے سکالر چھیتن ینچک کے نام آتے ہیں۔

لداخی پر اردو ادب کا اثر ہے اور اردو میں لداخی ادب پایا جاتا ہے۔

ریاست میں اردو کی پہلی کتاب سفر نامہ بخارا ہے جو جموں میں چھپی اور اس کا مصنف مہتہ شیر سنگھ ہے۔ وہ بخارا سے لداخ کے راستے واپس کشمیر روانہ ہوا تھا۔ اس کتاب میں لداخ کا ذکر ہے۔ 'احوال ملک لداخ' اس خطے کے بارے میں ایک پرانا قلمی نسخہ ہے۔

۱۹۳۰ء کی دہائی میں لیہہ کے واحد مجاہد آزادی منشی عبدالستار نے اردو میں

"تاریخ لداخ" تصنیف کی۔ اور ریاست میں لکھی جانے والی اردو کی پہلی تصنیفات میں سے ایک ہے۔

آزادی کے بعد کرگل کے کاچو سکندر خان نے ایک لداخی داستان "لاھو اپھوتی" کو اردو کا جامہ پہنایا۔ ایک لداخی نے لداخی زندگی پر کئی کہانیاں اور مضامین قلم بند کئے۔ کئی غیر لداخی ادیبوں اور قلم کاروں نے لداخ پر اردو میں لکھا ہے۔ ان میں وزیر حشمت اللہ کی تاریخی کتاب "تاریخ لداخ جموں و کشمیر" اور امین پنڈت کی تصنیف "لداخ کی کہانی" قابل ذکر ہیں۔

راقم الحروف نے اردو میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اردو قارئین کو متعدد مطبوعہ مضامین میں لداخی زبان، ادب، تاریخ اور تمدن سے روشناس کیا ہے۔ کئی لداخی گیتوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور اپنی کئی کہانیوں اور دو ناولوں میں لداخی زندگی کی عکاسی کی کوشش کی ہے۔

یہ حقیقت ہے لداخ میں اردو قارئین زیادہ ہیں اور لکھنے والے کم۔ لداخی زندگی پر اردو میں لکھی ہوئی ایک معیاری کتاب آسانی سے چار پانچ سو کاپیاں فروخت ہوتی ہیں۔ اگر کتاب دلچسپ ہو اور طباعت اور گٹ اپ معیاری ہو تو اس سے کہیں زیادہ تعداد میں فروخت ہو سکتی ہے۔ راقم الحروف کو اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ یہاں نئی چیزیں پڑھنے کی فرمائش ہوتی ہے۔ لیکن وادی میں اردو والوں کی تعداد لداخ سے متعدد گنا زیادہ ہونے کے باوجود مقامی ادباء کی کتابوں کو پوچھنے تک نہیں ہیں اور تو اور وہاں فیض، ساحر، منٹو اور کرشن چندر جیسے نامور شاعروں اور افسانہ نگاروں کی کتابوں کی کئی کاپیاں بک سٹال پر مہینوں پڑی رہتی ہیں۔ اس لحاظ سے لداخ، وادی کشمیر اور جموں کے مقابلے میں آگے ہے۔

لداخ میں [illegible] کے متعدد رسائل بکتے ہیں۔ ان میں بیسویں صدی، شمع، شبستان، روبی، شاعر، سب رنگ، مجرم، تیز قلم، کھلونا، ہلال، چہار رنگ، نیرنگ، ھما، جاسوسی دنیا، نیا دور اور چاند رنگ شامل ہیں۔ شمع، کرگل اور لیہ دونوں شہروں میں کئی سو کاپیاں

تعمیر

آتی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہاں کوئی شمع معمہ نہیں بھرتا۔ کیونکہ ملک کے دوسرے مقامات پر معض ٹوکن کی خاطر شمع کی ہزاروں کاپیاں بکتی ہیں۔

لیہہ میں، شاعر کے دس پرچے آتے ہیں اور فروخت ہوتے ہیں۔

کتابوں میں صرف ناول اور رومانیہ شاعری کی کتابیں آتی ہیں۔ ان میں گلشن نندہ سرفہرست ہے۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ لداخ میں اردو کی ترقی یا اس کی بابت کوئی انجمن نہیں۔ اردو مشاعرہ شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ جو تک بندی تک محدود ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی اردو شاعر نہیں ہے۔ البتہ لداخ میں رائٹرز فورم WRITERS FORUM ہے۔ اور لداخی میں اکثر مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔

اردو کی ترقی کے لئے لیہہ ریڈیو سٹیشن اچھا کردار ادا کر رہا ہے۔ لداخی کے علاوہ اس سٹیشن سے اردو میں بھی پروگرام نشر ہوتے ہیں۔

میں نے کچھ مدت پہلے ریاست میں مروّج درسی کتابوں سے متعلق ڈاکٹر حامدی کشمیری کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ مجھے ان کے صحیح الفاظ تو یاد نہیں تاہم انہوں نے لکھا تھا کہ ریاست میں مروج اردو کی نصابی کتابیں یہاں کے بچوں کے مزاج اور معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ لداخ پر بھی یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے۔ خاص کر میٹرک کی موجودہ اردو کتاب جو مدت سے نصاب میں شامل ہے بدلتے ہوئے حالات سے میل نہیں کھاتی۔ اردو کے ایک قابل ترین مدرس کو بھی یہ کتاب پڑھانے میں دقّت پیش آسکتی ہے۔ کلاسیکل ادب اور متقدمین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن ملک کے نئے نامور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات بھی شامل کی جانی چاہئیں۔ کتاب میں ہماری ریاست سے متعلق مواد کا ہونا بھی ضروری ہے۔

میں اس ضمن میں ایک مثال دینا چاہوں گا۔ چند سال پہلے میرا ایک مضمون 'آزادی کے بعد لداخ میں سماجی تبدیلیاں' ماہنامہ 'آج کل' دہلی میں چھپا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجھے

ہائر سکینڈری بورڈ مہاراشٹر کا ایک خط ملا۔ جس میں مضمون کے اقتباسات ریاست کے اردو ہائی سکینڈری کے نصاب میں شامل کرنے کے لئے میری اجازت لی تھی اور اس کے لئے معاوضے کی پیش کش کی تھی ۔

میرا خیال ہے کہ مہاراشٹر کے اردو طلباء آزادی کے بعد کے لداخ کی بہت سی باتوں سے باخبر ہوں گے ۔ لیکن ہماری ریاست کے طلباء ان سے انجان ہوں گے ۔ اسی طرح لداخی طلبہ ریاست کے مختلف عوامل سے بے خبر ہیں ۔

۱۹۵۶ء میں آئین کی دفعہ ۴۵ کے تحت اردو ریاست کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے آج یہ روزمرہ کی زندگی میں رابطے کی زبان بھی ہے اور ذریعہ تعلیم بھی ہے ۔ اگر اسے مستقبل میں سرکاری زبان کی حیثیت سے انگریزی کی جگہ لینی ہے تو آج ہی حکومت کو چاہئے کہ اردو کے لئے بتدریج میدان ہموار کرے اور اسے ریاست میں ایک ہمہ گیر زبان بنائے ۔ اس ضمن میں لداخ کے لئے میری چند تجویزیں ہیں ۔

(ا) ریاست کے تینوں خطوں میں قائم کلچرل اکادمی اور محکمہ اطلاعات کے دفتروں سے منسلک ایک شاخ یا ادارہ کھولا جائے جو اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے کام کرے ۔

(ب) یہ ادارے محکمہ تعلیم، مقامی ادیبوں اور ادب نوازوں کے اشتراک سے سیمیناروں، ورک شاپوں اور کانفرنسوں کا اہتمام کرے ۔ اور نامور ادیبوں اور مفکروں کے دن منایا کریں ۔

(ج) لداخ میں کوئی اردو کاتب نہیں ہے ۔ ہر سال یہاں سے کتابت اور خوش نویسی کی تربیت کے لئے سرینگر امیدوار بھیجے جائیں ۔

(د) نجی تعلیمی اداروں میں اردو پڑھانے کا انتظام کرایا جائے ۔

تعمیر

(د) لداخ ایک ایسا خطّہ ہے جو سال میں چھ یا سات ماہ ریاست اور ملک کے دوسرے حصّوں سے منقطع رہتا ہے۔ یہاں کا بڑا مسئلہ ابلاغ اور ترسیل کا فقدان ہے۔ لداخ میں کوئی اخبار نہیں نکلتا۔ سب سے بڑا مسئلہ چھپائی کی مشین ہے۔ ریاستی سرکار کو اس خطّے میں پریس کی سہولت فراہم کرنے کے لئے ہمدردانہ غور کرنا چاہیئے۔

زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور نہ اسے جغرافیائی حد بندیوں یا خانوں میں قید کیا جا سکتا ہے۔ ادیب پہلے ادیب ہوتا ہے اور اس کے بعد زبان آتی ہے۔ آج دنیا سکڑ سمٹ گئی ہے۔ مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان میں لکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے اسے مادری زبان کی بالواسطہ خدمت ہوتی ہے۔ خاص کر ایک ایسی زبان جو مادری زبان کے علاوہ اس خطے میں مروج اور مقبول ہو اور جس کے پڑھنے والے زیادہ ہوں۔ اُردو ایک ایسی ہی زبان ہے جسے بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔

سرکاری اور رابطہ کی زبان کی حیثیت سے بھی ہم اردو کو کبھی نظر انداز نہیں کرسکتے۔

●●

ڈاکٹر برج پریمی ۔ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی سرینگر

جموں و کشمیر میں اردو تنقید و تحقیق

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کی عمر بھی کوئی سو سوا سو سال کے آس پاس ہوگی۔
مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۴۶ء ۱۸۵۶ء) نے نہ صرف ڈوگرہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ بلکہ ریاست جموں کشمیر کی حکومت قائم کی۔ اس وقت کے تقاضوں اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ریاست کے تعلقات دلی اور لاہور کی سرکاروں کے ساتھ استوار ہوئے۔ اس زمانے میں وسائل معاش کے ساتھ ساتھ تجارتی لین دین کے سلسلے میں عام لوگوں کو بھی دور دراز جگہوں پر آنے جانے کے مواقع میسر ہوئے۔ اس طرح باہمی اختلاط سے پنجابیوں اور تاجر پیشہ لوگوں کو مروجہ اردو میں جانکاری حاصل ہوئی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست کی درباری زبان فارسی تھی لیکن جموں کے بیشتر علاقوں میں ڈوگری کا بول بالا تھا۔ جو لسانی اعتبار سے پنجابی اور اردو کے قریب ہے

لاہور اور پنجاب کے ساتھ اہلِ جموں کے تعلقات وادی کے لوگوں سے مقابلتاً زیادہ استوار تھے
اور اس لئے کہ کشمیر کے مقابلے میں جموں لاہور کے نزدیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ جموں میں اردو
... زبان کے نقوش کشمیر کے مقابلے میں بہت جلد مرتب ہوئے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء۔
۱۸۸۵ء) نے وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر نئے علوم و فنون کو رائج کرنے کے اقدامات کئے
اسی منصوبے کا ایک حصہ "بدیا بلاس" پریس تھا اور ایک دارالترجمے کا اہتمام تھا۔ "بدیا بلاس" کے
نام سے ریاست کا پہلا اخبار سرکاری گزٹ کے طور پر اسی پریس سے شائع ہوا۔ دارالترجمے کے
اہتمام سے علاوہ ڈوگری اور ہندی کے اردو میں بھی مختلف مسودات ترجمہ ہونے لگے۔ ریاست میں
اردو زبان کی باقاعدہ ترویجات یہیں سے ہوتی ہے۔ اسی زمانے سے کشمیری ادیبوں اور شاعروں کی
ادبی کاوشیں منظرِ عام پر آنے لگیں۔ میری مراد ان ادیبوں اور شاعروں سے ہے، جنھوں نے
ترکِ وطن نہیں کیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۲۴ء تک کئی کشمیریوں نے لاہور، دہلی
الہ آباد وغیرہ سے کئی اخبارات جاری کئے۔ ان میں علاوہ دوسری باتوں کے ریاست کے ریاسی،
سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین لکھے جاتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں جموں سے ریاست کا پہلا
باقاعدہ اخبار "رنبیر"، اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں کشمیر سے "وتستا" جاری ہوا۔ ان اخباروں
کے اجراء ہونے سے ریاستی ادیبوں اور شاعروں کو ایک حوصلہ ملا۔ اور وہ شعر و نثر کے مختلف
شعبوں میں قلم چلانے لگے لیکن اس ابتدائی دور میں ریاستی قلم کاروں سے اعلیٰ قسم کے ادبی
کارناموں کی توقع کرنا عبث ہے۔ خاص طور پر تحقیق اور تنقید کے میدان میں جس میں زبردست
کد و کاوش کے حوصلے کے ساتھ ساتھ محققانہ آہنگ، فکر و نظر کی وسعت اور تنقیدی شعور کی
ضرورت ہے اس لئے بھی کہ اردو زبان ابھی ریاست میں گھٹنوں کے بل چلنا سیکھ رہی تھی۔
اس بات میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ تحقیق و تنقید کی [illegible] تحقیق کی

عدم موجودگی میں صحیح تنقید ناممکن ہے۔ تلاش و تحقیق کی شروعات شک اور شبہ سے ہوتی ہے
تنقید کیا اور کیوں کے سوال اٹھاتی ہے۔ تحقیق ان سوالوں کے جواب فراہم کرتی ہے حل
طلب مسائل کو حل کرنا تحقیق کا کام ہے۔ جس کے ڈھانچے پر تنقید اپنی عمارت تعمیر کرتی ہے
فن پاروں کو گمنامی کی تاریکیوں سے نکال کر دریافت کرنا تحقیق کا کام ہے اور ان کے اصل
جوہر کی شناخت کرنا تنقید کا منصب ہے۔ لیکن کشمیر میں ابھی اس قدر ادبی دفینے نہیں تھے کہ
جن کو گمنامی کی تاریکیوں سے نکال کر پرکھا جاتا اور نہ ہی اس منصب کو اس ابتدائی دور میں
سمجھا گیا تھا۔ فکر و نظر کی کشادگی کے ساتھ بعد کے برسوں میں اس کی طرف توجہ ہوئی اور ریاست
کے محققین اور ناقدین نے اپنی بساط کے مطابق بڑے کارنامے انجام دیئے۔

ریاست میں تحقیق و تنقید کے شعبے میں ابتدائی کارنامے فوق مرحوم کے نام سے
عبارت ہیں۔ فوق نے جہاں تاریخ، ادب، فکشن اور شاعری کے میدانوں میں چراغ جلائے
وہاں تحقیق کے میدان میں بھی وہ پیچھے نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کی تحقیق کا اصل موضوع تاریخ ہے،
لیکن انہوں نے بعض ایسے تذکرے بھی تالیف کئے تھے جن میں اردو ادب سے متعلق تحقیق کا حق ادا
کیا۔ مثلاً تذکرہ اخبار نویساں، تذکرہ شعرائے لاہور، تذکرہ علمائے لاہور، بادِ رفتگان ایسی کتابیں
ہیں جن کا تعلق اردو ادب کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد چند ایک مضامین لاہور کے اخبارات یا پھر
ریاست سے شائع ہونے والے اخبارات میں نظر آتے ہیں۔ جو مختصر ہیں اور جو کسی اصول یا نظریے
کے پابند نظر نہیں آتے۔ ایسے مضامین کی اہمیت نہیں ہے۔

محمد عمر اور نور الٰہی اردو دنیا میں محمد عمر نور الٰہی کے نام سے مشہور ہیں۔ بھول خطے سے
تعلق رکھنے والے ان دو بھائیوں نے مشترکہ طور پر کئی ادبی کارنامے انجام دیئے۔ افسانوں اور ڈراموں
کی تخلیق کے ساتھ ساتھ انہوں نے ڈراما کی صنف سے متعلق کئی قابل قدر کارنامے انجام دیئے
جن کی نوعیت تحقیقی اور تنقیدی ہے۔ ان کا سب سے بڑا تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ "ناٹک ساگر"

تعمیر

ہے جو اردو میں ڈرامانگاری کی پہلی کتاب ہے۔ ناٹک ساگر لاہور سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب اردو ڈرامے کی جامع تاریخ نہیں اور اس میں کئی خامیاں موجود ہیں مگر اردو ڈرامے کا کوئی سنجیدہ قاری یا ناقد اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا

۱۹۲۶ء میں محمد عمر نور الٰہی نے امانت کی "اندر سبھا" شائع کی۔ یہ ایڈیشن بھی لاہور سے شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کی ایک خوبی یہ ہے کہ مرتبین نے ڈرامے کو دو ایکٹوں اور نئے سینوں میں تقسیم کر کے ایک نئی صورت دی ہے۔ مرتبین کے حواشی اور مقدمے نے اس کی قدر و قیمت کو جانچنے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ "اندر سبھا" کے اس ایڈیشن کو اردو ڈرامے کی تحقیق اور تنقید میں ہمیشہ نمایاں مقام رہے گا۔ اور محمد عمر نور الٰہی کی اس مساعی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

تحقیق و تنقید کے شعبے میں عبدالاحد آزاد نے بڑی سنجیدگی سے قلم اٹھایا۔ آزاد نے ۱۹۳۵ء میں "حیاتِ مہجور" کے عنوان سے ایک مختصر سا مقالہ لکھنا شروع کیا تھا لیکن ذوقِ جستجو نے اس کام کو کافی پھیلا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کافی ضخیم مسودہ تیار ہو گیا۔ یہ مقالہ اگرچہ ۱۹۴۷ء سے قبل لکھا گیا تھا لیکن شائع نہ ہو سکا۔ ۱۹۵۹ء میں پہلی بار ریاستی کلچرل اکادمی کے اہتمام سے یہ مسودہ "کشمیری زبان اور شاعری" کے عنوان سے تین جلدوں میں شائع ہوا۔ آزاد اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن ان کی کھوج اور تحقیق کے معیار کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک بڑے محقق تھے۔ اور گہری تنقیدی بصیرت کے مالک تھے۔ اس زمانہ میں جب کشمیر میں رسل و رسائل کے موزوں ذرائع بھی موجود نہ تھے آزاد نے پاپیادہ دور دراز وادیوں میں گھومتے رہے اور بڑی جگر کاوی سے اپنا مواد اکٹھا کیا۔ کشمیری زبان کے شعرا کا اس پہلے قابلِ قدر اور معتبر تذکرے میں لل دید سے لیکر مہجور کے عہد تک کے جملہ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ آزاد نے صرف چند نام گنوانے پر اکتفا کیا ہو بلکہ مشہور اور معروف شعرا کے ساتھ ساتھ بہت سے گم نام شعرا کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور ان کے

تعمیر

بارے میں مواد فراہم کرکے ان پر بےلاگ تبصرہ کیا ہے۔ آزاد کی بے پایاں محنت اور لگن اور ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کتاب کے مقدمے میں علی جواد زیدی رقمطراز ہیں:۔

"آزاد کی نظر میں وسعت ہے۔ ان میں تحقیق کرنے والوں کی ہمت اور صبر ہے۔ ان کے قلم میں روانی اور سلاست ہے اور وہ ایک بڑے کام کو انجام دینے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ کسی مشعل کے بغیر وہ تاریکیوں میں رواں چلے جاتے ہیں۔ صدیوں کے پردے چاک کرتے ہیں اور کم از کم چھ صدیوں پر پھیلے ہوئے مواد کو تین مختصر جلدوں میں یکجا کر دیتے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔"

"کشمیری زبان اور شاعری" جس کے لئے آزاد نے "تاریخ ادبیات کشمیر" کا نام تجویز کیا تھا کشمیری زبان کی شاعری کی تاریخ ہے لیکن اسے اردو ادب میں ایک "قابل قدر محققانہ تصنیف" قرار دیا جا سکتا ہے۔ آزاد پہلے محقق اور ناقد ہیں جنہوں نے اردو زبان میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے تاریخی اور سماجی پس منظر سے مدد لے کر نتائج اخذ کئے ہیں اور نہ صرف اس زبان کے تدریجی ارتقاء پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ مختلف ادوار کے شعراء کے حالات بیان کر کے اپنی پوری تنقیدی بصیرت کے ساتھ ان کے کلام کو پرکھا ہے۔ آزاد کو محض ایک تذکرہ نویس قرار دینا حقیقت سے انحراف کرنا ہے۔ اس سے ان کے کارنامے کی اہمیت گھٹ جاتی ہے۔ آزاد ایک وسیع نظریے کے حامی نظر آتے ہیں۔ خود لکھتے ہیں:۔

"ہر انقلاب پرانے تہذیب و تمدن کو نئے سانچے میں ڈھالتا ہے، ادب بھی انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی ہر منزل پہ نئے نئے روپ بدلتا ہے، مگر ہر نئے ادب کو پرانے ادب کے ساتھ گہرا ربط ہوتا ہے۔"

اس طرح آزاد ہر بدلتے ہوئے عہد کے ڈانڈے ماضی اور روایت کے ساتھ جوڑتے ہیں

اور یہ ان کے سائنسی نقطۂ نظر کا غماز ہے۔ آزاد نے عملی تنقید کے چند اچھے نمونے بھی پیش کئے ہیں اور ساتھ ہی اس پچھڑی ہوئی زبان کے قابل قدر سرمائے کو اردو قارئین تک پہنچانے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ ان کا یہ احساس توقیت کے زبردست جذبے پر استوار ہے، ایک معمولی تعلیم یافتہ پرائمری سکول معلم کے تبحر علمی اور گہری نظر کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ مغربی تنقید سے واقف نہیں ہیں لیکن پھر بھی گہرا تنقیدی ادراک رکھتے ہیں، نفسیاتی تحلیل "ادب برائے ادب" "ادب برائے حیات اجتماعی" اور "ادب اور زندگی" کے رشتے کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور اپنی کتاب کے آغاز میں ان تمام انگریزی کتابوں کی فہرست مرتب کرتے ہیں جن میں کشمیری زبان پر غیر ملکی مصنفین نے قلم اٹھایا ہے۔ ابتدائی حصوں میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے لیکن کتاب کی تیسری جلد میں آزاد نے ایک اچھا اور متوازن ناقد ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ غرض آزاد کی کتاب تحقیق اور تنقید کا قابل قدر کارنامہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

"غالب شناسی" کے سلسلے میں پنڈت نند لال کول طالب کی تصنیف "جوہر آئینہ" ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ طالب کشمیر کے بلند مرتبت شاعر تھے لیکن شعر و شاعری کے ساتھ تنقید و تحقیق کے ساتھ بھی ان کی کافی دلچسپی رہی ہے۔ برس ہا برس تک وہ "زمانہ" "کانپور" "ادب لطیف" لاہور، "نوائے ادب" بمبئی اور دوسرے رسائل میں تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ غالب فہمی اور غالب شناسی سے متعلق ان کے مضامین کافی رسائل میں چھپتے رہے ہیں: "کلام غالب" پر ان کی تنقید غیر جذباتی انداز میں ملتی ہے ان کی اس تصنیف کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

طالب کے معاصرین میں جموں خطے کے غلام حیدر چشتی بھی رہے ہیں۔ چشتی صاحب نے نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی تھی، وہ اپنے عہد کے بہت اچھے ادیبوں اور محققوں میں

نعیم

شمار ہوتے تھے۔ "اصلاح ادب" ان کا ایک اچھا تحقیقی کارنامہ ہے۔ جس میں انہوں نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد بڑے بڑے مشاہیرین کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اور زبان و بیان کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں کئی مباحث ابھارے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر سید جیشور عدنا نے اپنی کتاب "آریائی زبانیں" میں ایک نئے زاویہ نظر سے کئی لسانی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ آریائی زبانوں کے رشتے سے اردو کے بعض لسانی مباحث کو پہلی بار ریاست کے کسی محقق اور ماہر لسانیات نے سائنٹفک بنیادوں پر اٹھا کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔

آزادی کے بعد اردو تحقیق اور تنقید نے کافی منزلیں طے کر لیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد عملاً ایک سائنسی عہد کا آغاز ہوا ہے۔ ادب کا تجزیہ بھی نفسیات، معاشیات اور سماجیات کی طرح سائنس کی روشنی میں ہونے لگا۔ اس نئے ذہنی رویے نے اردو تنقید اور تحقیق کے زاویے بدل دیئے اور نئے معیار اور اصول مرتب ہوئے۔ تحقیق کے کارنامے جدید نفسیات اور سماجی علوم کی مدد سے انجام پانے لگے۔ مغربی علم و فن کے مطالعے نے تحقیقی اور انتقادی شعور کو جلا بخشی، طرز بیان اور اسالیب کی شگفتگی نے ادبی تحقیق اور تنقید کو ریاضی کے فارمولائی انداز سے نکال کر سلاست اور صفائی سکھائی۔ ذہن کے دریچے کھل جانے سے تعصبات کم ہونے لگے اور اکثر حالتوں میں فن کی بازیافت تحقیق اور تنقید کا منصب ٹھہرا۔ انفرادی اور آزاد کارناموں کے ساتھ یونیورسٹیوں اور اکادمیوں کے توسط سے بھی اردو تحقیق اور تنقید کو سہارا ملا۔ ریاست جموں کشمیر تو نیم پیمانے پر اس پھیلاؤ سے متاثر ہوئی۔ اور یہاں کے صاحب فکر و نظر اس شعبے میں اپنے کارنامے انجام دینے لگے۔

آزادی کے بعد جو محقق اور ناقد ابھرے، ان میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا نام سرفہرست ہے۔ حامدی کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ انہوں نے شاعری، افسانے، ناول، تحقیق اور تنقید وغیرہ اصناف پر اپنا قلم آزمایا ہے لیکن ادھر چند برسوں سے انہوں نے تحقیق اور تنقید کو

اپنا خاص موضوع بنالیا ہے۔ "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" "غالب کے تخلیقی سرچشمے" "نئی حسیت اور عصری اردو شاعری" "کارگہہ شیشہ گری"، "غالب اور اقبال"، "ناصر کاظمی کی شاعری" وغیرہ اس شعبے میں اِن کے اہم کارنامے ہیں۔ حامدی اپنے تخلیقی ذہن، فکر و نظر کی وسعت اور مغربی ادبیات کے گہرے مطالعے کی بدولت آج اردو تنقید میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ چونکہ خود شاعر اور افسانہ نگار ہیں اسلئے دونوں اصناف پر قدرت رکھتے ہیں

"جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" اُن کا پہلا تنقیدی اور تحقیقی کارنامہ ہے۔ حامدی نے بڑی عرق ریزی سے جدید اردو نظم کے صوری اور معنوی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے۔ اردو نظم پر یورپی اثرات کی نشاندہی کرکے ایک خالص تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مطالعہ حالی اور آزاد کے عہد سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کی نظمیہ شاعری پر محیط ہے۔ اس کتاب کے بیشتر حصے تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ جہاں اُنہوں نے اردو شاعری کے دورِ قدیم میں نظم کی اصطلاحات کی روایات، حالی سے قبل کی اردو شاعری اور اردو نظم کے ابتدائی نقوش کو تلاش کیا ہے۔ اس کے بعد کا حصہ تنقیدی ہے اور یورپی اثرات کے تحت اُبھرنے والے اہم شعری رجحانات کا جائزہ لیا ہے۔ "غالب کے تخلیقی سرچشمے" میں غالب کی نفسیات کا مطالعہ کیا گیا ہے اور غالب کے فکری سرچشموں کی بازیافت ہوئی ہے۔ حامدی آرٹ کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت شاعر سے زیادہ شعری کائنات کو اہم قرار دیتے ہیں اور بقول خود اسی آئینے میں شعری شخصیت کے نفسیاتی خدوخال تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ فن کار کی نفسیاتی زندگی کے اسرار کھولتے وقت آرٹ کی فنی اور جمالیاتی قدروں کا لحاظ کرتے ہیں۔ اس کتاب میں اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھا گیا ہے۔

"نئی حسیت اور عصری شاعری" ایک تنقیدی کارنامہ ہے۔ ادھر کئی برسوں سے جدیدیت، شاعری اور نئی شعریات کے مباحث پیدا ہوئے ہیں۔ شروع شروع میں یہ مسائل نہایت کھردرے اور اُلجھے ہوئے تھے اور نئی شاعری کی آڑ میں اچھے شعری نمونوں کے ساتھ ساتھ

لغو

ناقص، کھردرے، غیر شعری نمونے بھی سامنے آئے۔ جہاں اس کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ وہاں بعض لوگوں نے ان چیزوں کو اس لئے قبول کیا کہ جدیدیت کی دنیا میں انہیں جاہل، کور ذوق اور روایت پسند سمجھا جائے۔ حامدی بھی جدیدیت کے میلان سے متاثر ہیں۔ لیکن اس کے پس پشت ان کے احساس اور جذبے کی دیانت ہے۔ انہوں نے محض کورانہ تقلید سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ان مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ انہوں نے بقول شمس الرحمان فاروقی ایک بڑے خلا کو بھرنے کی سعی کی ہے۔ حامدی اس کتاب میں اپنی پوری تنقیدی بصیرت سے جدید اردو شاعری کی فضا کو اچھی طرح سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسرے متعلقہ مباحث کے لئے راستہ کھول دیتے ہیں۔

"کارگہہ شیشہ گری" ڈاکٹر حامدی کی حالیہ تصنیف ہے، اس میں میر کا مطالعہ ایک نئے انداز سے ملتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے میر تقی میر کی شاعری میں پوشیدہ تخیلی کائنات میں حیاتی اور علامتی پیکروں کو کھوجنے اور ان کی معنویت کو پرکھنے کی مستحسن کوشش کی ہے

۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے محققین میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا نام اہم ہے۔ اکبر حیدری نے اردو کی کلاسیکی شاعری پر مسلسل اور بے تکان قلم چلایا ہے۔ ان کی سعی جمیل اور مخلصانہ جگر کاوی نے اردو کے ایسے بے شمار خزانوں کے دروازے کھول دیئے ہیں جن پر شدائد زمانہ کی دھول پڑی ہوئی تھی۔ ان کے کئی کارنامے اردو کے تحقیقی ادب میں مستقل عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حیدری نے ایک سچے محقق کا منصب نبھایا ہے۔ اور پوری ادبی دیانت اور خلوص کے ساتھ نبھایا ہے۔
حیدری صاحب بڑے زود نویس ہیں۔ انہوں نے تیس سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے بیسیوں مضامین ہندوستان اور پاکستان کے جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ پہلے ہمارے محقق ہیں جنہوں نے مرثیہ، تذکرہ اور کلاسیکی شعرا پر بطور خاص کام کیا ہے ان کا مرتب کیا ہوا دیوانِ میر نقوش لاہور میں کتابت اور طباعت کی تمام طرح نفاستوں کے بغیر

ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس میں میر کا غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔ اس کے مطالعے سے حمیدی کی محققانہ جگرکاوی اور تلاش و جستجو کی زبردست لگن کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے مقدمے نے اس کارنامے کا اعتبار بڑھا دیا ہے۔ ڈاکٹر حمیدی کی اہم تصانیف میں میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، میر ضمیر، دیوانِ تپش، شاہ اعظم مرزا دبیر، اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء، تذکرہ شاعرات اردو، دیوانِ ناجی، تحقیقی نوادر، تذکرہ میر حسن بخط میر حسن، تذکرہ ہندی بخط مصحفی، مثنوی میر حسن وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر حمیدی نے اپنے بعض مقالوں میں متنازعہ فیہ مباحث ابھارے ہیں ان کی بعض باتوں سے اختلافات کی گنجائش ہے لیکن ان کے بلند حوصلے، ان کی ریاضت، ان کے تحقیقی شعور اور ان کے اندازِ استدلال سے انکار ناممکن ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ گھوم کر معمر لوگوں کا سامنا کر کے جس طرح شعر و ادب کے نادر دفینوں کو کھنگال کر دریافت کیا ہے۔ اس کی مثال محققین میں مشکل سے ملے گی۔

اردو کی خدمت گزاروں میں ڈاکٹر عزیز احمد قریشی کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے عزیز احمد کا بنیادی موضوع دینیات رہا ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے کئی کتابیں اردو میں لکھی ہیں لیکن شعر و ادب کے ساتھ بھی ان کی دلچسپی رہی ہے "جدید تنقیدی زاویے" اور "ہماری قومی اور انقلابی شاعری" اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ کتابیں بقول مصنف طالب علموں کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی ہیں اور ان کی بنیاد خود ان کے زمانہ طالب علمی میں تیار کئے ہوئے نوٹس ہیں، لہٰذا ان کتابوں میں شعر و ادب کے باریک رموز کی تلاش عبث ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر عزیز نے خاصا مواد اکٹھا کیا ہے اور اسے ترتیب و تنظیم کے ساتھ اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمد یوسف ٹینگ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ہمارے بالغ نظر نقاد ہیں۔ اردو اور کشمیری ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ غالب، اقبال، منٹو اور کشمیری اور اردو کے شعر و تعمیر،

ادب سے متعلق ان کے بعض عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی مقالے چھپ چکے ہیں۔ مختلف کتابوں پر لکھے ہوئے ان کے مقدمے بذاتِ خود ایک مستقل عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے نہ صرف ان کے تبحرِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کی تنقیدی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے شگفتہ اسلوب اور منطقی استدلال سے ایک نئی سوچ و فکر کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کا تحقیقی مقالہ "مرزا سلامت علی دبیر۔ حیات اور کارنامے" بھی چھپ کر آ گیا ہے۔ یہ مقالہ ایک غیر جانبدار مطالعے پر مبنی ہے۔ اس مقالے میں دبیر کے صحیح ادبی مقام کو متعین کرنے کی ایک مستحسن کوشش ملتی ہے، نہ صرف یہ کہ اس مطالعے میں حیات دبیر کے بعض ایسے گوشوں کو تلاش کیا گیا ہے۔ جو نظروں سے اوجھل تھے، بلکہ دبیر کے غیر مطبوعہ کلام اور ان کی دوسری کاوشوں کو دریافت کر کے ایک کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔ اس مقالے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں دبیر کے اصلی اور الحاقی کلام کی نشان دہی کی گئی ہے جس سے دبیر کے کلام کا اصل جوہر کھل جاتا ہے۔ اور ان کے صحیح مرتبے کی پہچان ہو جاتی ہے۔ زماں کے متوازن اور سنجیدہ اسلوب نے مقالے میں جان ڈالی ہے۔ ادھر زماں کئی برسوں سے سنجیدہ موضوعات کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں اور ملک کے مختلف رسائل میں ان کے کئی تحقیقی اور تنقیدی مضامین چھپ چکے ہیں۔ جو موضوع کے تنوع کے اعتبار سے اہم ہیں اور ان کی فکر و بصیرت پر دال ہیں۔

راقم السطور کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے مجموعے "حرفِ جستجو" کا ذکر کرنے کی اجازت دی جائے تو عرض کروں گا کہ ان مضامین میں راقم کے مشاہدے، مطالعے اور تلاش و جستجو کی چند کیفیتیں شامل ہیں۔ جو راقم کے ذہنی رویے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ مضامین اردو فکشن کے بعض فن کاروں کے تخلیقی عمل اور ان کی تخلیقات کے بعض اہم پہلوؤں کے تجزیاتی مطالعے پر مبنی ہیں۔ راقم نے ان مضامین میں اور دوسرے ایسے مضامین میں جو ملک

تعمیر

متعدد رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اپنی لیاقت بھر خلوص اور ادبی دیانت کے ساتھ تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے پیش کرنے کی حقیر سی کوشش کی ہے۔ ان کی قدر و قیمت کی پرکھ راقم کے قاری ہی صحیح معنوں میں کر سکیں گے۔ راقم کی دو اہم کتابیں زیر طبع ہیں۔ سعادت حسن منٹو پر راقم کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ منٹو کی حیات اور ان کے کارناموں کے تجزیاتی مطالعے پر غالباً اردو میں پہلی کتاب ہے۔ کشمیر کے سب سے بڑے افسانہ نگار "پریم ناتھ پردیسی" پر لکھی ہوئی کتاب بھی اہم نوعیت کی ہے ان کتابوں کی قدر و قیمت کی جانچ اہل نظر کریں گے۔

"جموں و کشمیر میں اردو صحافت" کے عنوان سے گذشتہ برسوں میں صوفی غلام محی الدین کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اردو صحافت کی تاریخ بڑی عرق ریزی سے سمیٹ لی گئی ہے۔ اس میں ریاست میں اردو صحافت کے آغاز سے لیکر حالیہ برسوں تک اخبارات کے اجراء، ان کی درجہ بندی، ان کے احتساب ان کی طاقت اور توانائی، اخبارات کی فہرست ریاست اور ریاست کے باہر کے کشمیری اخبارات کی روداد شامل ہے جو زبان حال سے مصنف کی تلاش و تحقیق پر دال ہے۔

دوسرے اہم نقادوں اور محققوں میں پروفیسر رشید، پروفیسر جے لال کول، پروفیسر رحمان راہی، پروفیسر شمس الدین احمد، ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا، شمیم احمد شمیم، امین کامل، غلام رسول نازکی، قیصر قلندر، موتی لال ساقی، بلدیو پرشاد شرما، رشید نازکی، نیلامبر دیو، محمد عبداللہ شیداء اوتار کرشن رہبر، مرغوب بانہالی، امر مالموہی، اسداللہ وانی، روسل پونپر، نشاط انصاری، سیف الدین سوز، مشعل سلطان پوری، شانتی سروپ نشاط، عشرت کشتواڑی، عبدالغنی شیخ لداخی عبدالاحد رفیق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں، نقادوں اور محققوں نے شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں پر قابل قدر مضامین لکھے ہیں۔ جو ان کی وسعت نظری پر دال ہیں۔

نئی نسل سے تعلق رکھنے والے نوجوان بھی بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں ہر کبھی

رومانی، مجید مضمر، اقبال فہیم، یوسف سلیم، شاد کرالرواری، ریاض دماغی چند اہم نام ہیں۔ پریمی رومانی نے حال ہی میں "جدید اردو شاعری: چند مطالعے" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ نئے شعراء کا یہ معروضی مطالعہ پہلی بار کتابی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اقبال فہیم بت شکن ہیں۔ ان کی تحریروں میں نئے ذہن کی آگ ہے۔ جو بعض اوقات بنا چاہے بھی اپنی بات منوا لیتی ہے۔ مجید مضمر اردو افسانے کے اچھے ناقد ہیں۔ یوسف سلیم وجودیت کے فلسفیانہ افکار اردو شاعری میں تلاش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کئی اچھے مضامین لکھے ہیں۔

ڈاکٹر ظہورالدین کا تحقیقی مقالہ "بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی رجحانات" ایک اہم کارنامہ ہے۔ ظہورالدین نے اپنے مقالے میں اردو کے ساتھ انگریزی ادب کے اہم رجحانات کو بڑی محنت سے تلاش کیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے بڑی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے انگریزی ماخذوں سے اپنا مواد اکٹھا کیا ہے اور پھر بیسویں صدی کے اردو ادب میں ان رجحانات کو ٹٹول ٹٹول کر دریافت کیا ہے۔ ڈاکٹر عابد پشاوری کا مقالہ اردو کے کلاسکی سرمایے میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے انشا کی نثری عبارات کا تجزیہ کیا ہے اور کئی تاریک گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کنول کرشن بالی کی تصنیف "آزاد نظم اور اردو شاعری" اپنے موضوع کی مطابقت سے اچھی کتاب ہے۔

شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، شعبہ اردو جموں یونیورسٹی، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، ریاستی کلچرل اکادمی، ان سب اداروں نے تحقیق اور تنقید کے شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ان کا ذکر کیے بغیر ریاست میں اردو تحقیق اور تنقید کا باب لکھا نہیں جا سکتا۔ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے رسائل "آگہی"، "نیا شعور"، "بازیافت"، اقبال انسٹی ٹیوٹ کا "اقبالیات"، کلچرل اکادمی کا "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" اس میدان میں برس ہا برس سے خاصا کام کرتے رہے ہیں۔ ان رسالوں میں اعلیٰ معیار کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے

ہیں جن سے ریاستی مصنفوں اور ناقدوں کی علمی اور ادبی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ دونوں یونیورسٹیوں میں تحقیق اور تنقید کے شعبوں میں جو کام ہوا ہے اس کو تفصیل سے بیان کرنا یہاں ممکن نہیں۔ میں صرف چند کارناموں پر اکتفا کروں گا۔ ڈاکٹر اسد اللہ کابل نے "اردو میں سیرت النبیؐ کا ادب" پر کام کیا ہے۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ ہنوز شائع نہیں ہو سکا ہے۔ اس مقالے میں کابل نے ایسی کتابوں کی نشان دہی کی ہے۔ جو معراج العاشقین سے قبل اردو میں لکھی گئی ہیں اور جن کا موضوع سیرت ہے۔ کابل صاحب کا مقالہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں سیرت نبویؐ سے متعلق تقریباً دو ہزار کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے جن میں اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ادبی مقام متعین کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد ملک کا تحقیقی مقالہ "اردو رسم خط ارتقا اور جائزہ" ہے۔ ڈاکٹر مدھیشور ورما کی لسانیاتی موضوع پر لکھی ہوئی اہم کتاب کے بعد ہمارے یہاں پہلی بار لسانیات کے موضوع پر کام ہوا ہے۔ مقالے میں کئی مسودات کے عکس تحریر شامل ہیں جن میں خاص طور پر دکھنی مخطوطات (مثلاً دیوان قلی قطب شاہ) اور شمالی ہندوستان کے مخطوطات (مثلاً بکٹ کہانی) کے بعض عکس اہم ہیں۔ ڈاکٹر محبوبہ وانی نے "اردو اور کشمیری شاعری میں رومانی رجحانات" پر مقالہ لکھا ہے اور بڑی محنت سے اردو شاعری کے رومانی رجحانات کے اثرات کو کشمیری شاعری میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس طرح سے یہ مقالہ دونوں زبانوں کے رشتے کی بازیافت پر ایک اچھی سعی ہے۔ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے دوسرے اہم تحقیقی اور تنقیدی مقالوں میں ڈاکٹر ظاہرہ عبداللہ کا آغا حشر کی ڈراما نگاری، ڈاکٹر شہرہ پال کا اردو ناول میں کردار نگاری، ڈاکٹر سیماں کور کا اردو تنقید میں غالب شناسی، ڈاکٹر نذیر احمد بٹ کا اردو تنقید میں اقبال شناسی، ڈاکٹر شفیقہ پروین کا اردو شاعری میں میر کی روایت، ڈاکٹر موہن لال کول کا انیسویں صدی کی اردو نثر میں سماجی طنز شامل ہیں۔ شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کے زیر اہتمام بھی کئی اہم مقالے لکھے گئے ہیں جن میں ڈاکٹر منظر اعظمی کا اردو میں تمثیل نگاری، ڈاکٹر مہمینہ انور کا "اردو ادب میں

تعمیر

گا تعصباتی اثرات "، سُرداسکر نارسنگھ کا "بیدی کا فن" - اسداللہ وانی کا "جموں کشمیر میں اردو افسانہ ۴۷ء کے بعد"، محمد شریف ملک کا "ٹھاکر پونچھی، حیات اور کارنامے" اور ملم وتہ چاٹک کا "پشکر ناتھ حیات اور فن" اچھے کارنامے ہیں۔ دونوں شعبوں میں اس وقت کئی اہم تنقیدی اور تحقیقی کارنامے انجام دیئے جا رہے ہیں۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر آل احمد سرور کی بصیرت افروز رہنمائی میں قابل قدر تحقیقی اور تنقیدی کام ہورہا ہے۔ گذشتہ برسوں میں انسٹی ٹیوٹ کے جریدے "اقبالیات" کے کئی شمارے منظر عام پر آئے ہیں۔ اسی طرح "اقبال اور مغرب"، "اور اقبال اور تصوف"، "اقبال اور مغربی فکر" جیسی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں اقبال کے فکر و فن سے متعلق بڑے عالمانہ مقالے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اہم موضوعات پر اس وقت تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔

اردو تحقیق اور تنقید کی ترویج و اشاعت میں ریاستی کلچرل اکادمی کی مساعی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ برسوں میں اکادمی کی طرف سے اس سلسلے میں کافی کام ہوا ہے۔ اکادمی کے زیر اہتمام جو کتابیں تصنیف یا تالیف یا ترجمہ ہوئی ہیں۔ ان میں جدید ڈوگری ادب کا ارتقاء (نیلامبر دیو شرما) تفسیر غالب (ڈاکٹر گیان چند جین) ڈوگری لوک گیت اور پہاڑی آرٹ (مرتب: نیلامبر دیو شرما) نکات و اقعات غالب (اکبر علی خاں) دیوان میر (ڈاکٹر اکبر حیدری) نئی حسیت اور عصری اردو شاعری (حامدی کاشمیری) اور کئی دوسری کتابیں قابل ذکر ہیں۔ اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اردو رسائل "شیرازہ" اور "ہمارا ادب"، سارے ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان رسائل میں ریاست کے محققوں اور ناقدوں کے علاوہ ملک کے جن عالموں کے اعلیٰ پایہ کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان میں عبدالقادر سروری، احتشام حسین، اسلوب احمد انصاری، اکبر علی خاں، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، افسر انصاری، امیاز علی عرشی، ڈاکٹر ثمینہ شوکت، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، خلیق انجم، ڈاکٹر رضی الدین احمد، سری نواس لاہوٹی، نعیم،

سید محمد جعفر، شمیم حنفی، علی جواد زیدی، علی عباس حسینی، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر عابد حسین، عالم خوندمیری، عنوان چشتی، قاضی عبدالودود، قمر رئیس، گوپی چند نارنگ، گیان چند جین، محی الدین قادری زور، عتیق صدیقی، مکیش اکبرآبادی، نورالسعید اختر، ویریندر پرشاد سکسینہ، ہنس راج رہبر، اطہر پرویز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان رسالوں کے کئی خاص نمبر بھی شائع ہوئے ہیں۔ جو اس لئے اہم ہیں کہ ان میں تحقیق و تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے۔

آخر میں ان محققوں اور نقادوں کا ذکر ناگزیر ہے جو گرچہ سرزمین جموں کشمیر سے تعلق نہیں رکھتے۔ مگر یہ حضرات اردو ادب کی آبرو ہیں۔ اردو دنیا میں کون ایسا کور ذوق ہوگا جو ان کے کارناموں سے واقف نہ ہو۔ یہ بات ہمارے لئے باعث افتخار ہے کہ یہ مقتدر حضرات برس ہا برس ہمارے درمیان موجود رہے اور ہمارا حصہ بن گئے۔ یہیں رہ کر انہوں نے کئی کارنامے انجام دیئے ہیں جن کی اردو تنقید و تحقیق میں دستاویزی حیثیت ہے۔ میری مراد پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، اثر لکھنوی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر عالم خوندمیری وغیرہ سے ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی خدمات کو کون بھول سکتا ہے۔ تحقیق کے ساتھ ان کی لگن جنون کی حد تک تھی۔ انہوں نے اپنے کشمیر کے سات سالہ قیام کے دوران کشمیر کے تعلق سے کئی گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔ "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ "دو بھائی دو ادیب" میں مہاراجہ رنبیر سنگھ اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد کے اہم ادیبوں اور شاعروں کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ "تاریخ ادبیات کشمیر" (تین جلدوں) میں ایک معرکے کا کارنامہ ہے جس کا ابھی تک صرف ایک حصہ "کشمیر میں اردو"

بقیہ

کے عنوان سے کلچرل اکادمی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ پوری کتاب اردو اور کشمیری کے تعلق سے دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ ان کے دم قدم سے ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں سرور صاحب کی نگرانی میں کئی سیمینار ہوئے۔ جہاں بڑے عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی مقالے پڑھے گئے۔ یہ مقالے ریاست اور ملک بھر کے ماہرین اقبالیات کے غور وفکر اور تلاش وتحقیق کا نتیجہ ہیں اور ان میں سے بیشتر مقالے ایسے ہیں۔ جو اقبال کی فکروفن کے مختلف گوشوں پر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شائع ہونے والے جرائد اور کتابوں میں ان کی اشاعت کا اہتمام ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اقبالیات کے متنوع پہلوؤں پر اس ادارے میں قابل قدر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمن نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ کشمیر کو دیا ہے۔ یہ سارا زمانہ انہوں نے اردو کی خدمت گذاری میں صرف کیا ہے۔ شکیل صاحب کا شعور اسی سرزمین میں نکھرا اور یہیں ان کے تنقیدی نظریات کی تشکیل ہوئی۔ اس دوران ان کی کئی اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں جو تنقید وتحقیق کے شعبے سے تعلق رکھتی ہیں۔ شکیل صاحب بنیادی طور پر ایک ناقد ہیں وہ جمالیات کی روشنی میں فن اور فنکار کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نفسیات اور اساطیر کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ اور اس طرح سے وہ تخلیق کے باطن میں چھپے ہوئے بے چین شعلے کی شناخت اور بازیافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن، فرائیڈ، یونگ، اڈلر، ارک فرام اور کئی دوسرے مغربی فلسفیوں اور ماہرین نفسیات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جمالیات اور خاص طور پر ہندوستانی جمالیات کی روشنی سے بھی فیض حاصل کرتے ہیں۔ جمالیات ان کا محبوب موضوع ہے اور اس کی بصیرت سے وہ تنقید میں بھی کام لیتے ہیں۔ اردو کے جدید نقادوں میں وہ اپنے نظریے کے باعث منفرد مقام رکھتے ہیں

تعمیر

کشمیر میں قیام کے دوران انہوں نے اردو ادبی تنقید کو ادبی قدریں اور نفسیات، غالب کی جمالیات، لاوے کا سمندر، اقبال، روشنی کی جمالیات، اقبال اور فنونِ لطیفہ، شعور اور تنقیدی شعور، وسعتِ فکر، شکیل بدایونی کی شاعری، فیض احمد فیض کی شاعری جیسی کتابیں دی ہیں۔ یہ کتابیں موضوع کی ندرت، فکر و نظر کی وسعت، اعلیٰ تنقیدی بصیرت اور اپنے اسلوب کی انفرادیت کے باعث کافی اہم ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا پہلا عشق اقبال ہے۔ ریاست میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے اقبال اور کشمیر، اقبال اور مغربی مفکرین، نشانِ منزل جیسی کتابیں لکھیں۔ آزاد صاحب ایک صاحبِ نظر محقق اور ناقد ہیں۔ انہوں نے "اقبال" کے کئی ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جو گوشۂ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر عابد پشاوری کی نئی تصنیف "انشا و حریف و حلیف" ہمارے کلاسیکی ادبیات کے مطالعے میں اضافہ ہے۔

بڑی ناانصافی ہوگی، اگر میں دوسرے غیر ریاستی نقادوں اور محققوں کا ذکر نہ کروں، یہ حضرات اگرچہ ابھی بہت قلیل عرصہ سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ بلکہ انہوں نے بھی اس دوران اپنے کئی قیمتی مقالات سے ہماری تحقیق اور تنقید کے سرمایے میں اضافہ کیا ہے میرا اشارہ مظہر امام، ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، ڈاکٹر قدوس جاوید وغیرہ سے ہے۔

تنقید اور تحقیق کے اس نسبتاً کم سن شعبے میں ہمارے کارنامے قلیل سہی، مگر اردو ادبیات کا کوئی بھی سنجیدہ قاری اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ کہ ہمارے کارنامے معیار اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے کم تر درجہ کے نہیں ہیں اور یہ حقیقت بجائے خود اردو زبان کے ساتھ ہماری بے پناہ محبت کا اظہار ہے۔

محمد اسد اللہ وانی شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ (ڈوڈہ)

جموں و کشمیر میں اردو افسانہ

ریاست جموں و کشمیر میں اردو نے ڈوگرہ حکمرانوں کے وقت میں رواج پایا۔ جموں کے ڈوگرہ خاندان کا اپنے دورِ حکومت میں دلی، لاہور اور پنجاب سے گہرا رابطہ تھا۔ اِدھر کشمیری تاجروں کا بھی باہر کے ان علاقوں میں آنا جانا تھا جہاں اردو پھول، پھل اور پھیل رہی تھی۔ اِس طرح سے جموں اور کشمیر میں ابتدا میں اردو کا کسی حد تک چلن قائم ہوا۔ بقولِ برگوپال کول خستہ[1] کشمیر میں اردو کا چلن ۱۸۷۳ء میں صرف بازاروں تک محدود تھا۔ جموں و کشمیر میں اردو زبان کو رائج کرنے اور اسے فروغ دینے میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا سب سے زیادہ اور اہم ہاتھ ہے۔[2] ۱۸۹۳ء میں جب مہاراجہ کو انگریزوں کی سازش کے تحت گدی سے ہٹا کر ملک بدر کر دیا تو حکومت کا کام ایک انگریز ریذیڈنٹ کو سونپا گیا جس کی مدد کے لئے ایک کونسل بنائی گئی جس کی ساری کاروائی فارسی کے بدلے انگریزی میں کرنے کا حکم صادر ہوا مگر جب مہاراجہ نے دوبارہ گدی حاصل کی تو اس نے انگریزی زبان کو ہٹا کر اردو کو مراج دربار کی زبان قرار دیا۔ گویہ کاروائی انگریزوں کی زبان سے انتقام کے جذبے کے تحت عمل میں لائی گئی مگر تب سے ہی اردو جموں و کشمیر کی سرکاری زبان قرار پائی۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے صرف آئینی حقوق حاصل ہیں ورنہ

---

[1] بحوالہ شیرازہ (اردو) جلد ۱۱، شمارہ ۹، مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی ص۔ ۶۰
[2] ۔ " " " جلد ۱۱، شمارہ ۳ مطبوعہ " " ص ۷۸ ۔

طوطی تو انگریزی ہی کا بول رہا ہے۔

جموں و کشمیر میں جب اُردو کی حیثیت ایک نومولود بچے کی سی تھی تو اس دَور میں کشمیری شاعروں میں روپہ بھوانی، محمود گامی، بلبل ناگامی، پرمانند و آسہ کول و گرہ تبل، کرشن راز دان اور رسول میر کے ہاں اس کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ہر گوپال خستہ، سالک منشی سراج الدین[1] سعد الدین سعد، چودھری خوشی محمد ناظر، قمر کرازی، محمد عمر نور الٰہی، عماد الدین سوز اور غلام حیدر چشتی وغیرہ ادیبوں کے نام لئے جا سکتے ہیں جنہوں نے یہاں اس پودے کی بھرپور آبیاری کی۔ بلاشبہ ان میں سے بہت سے غیر کشمیری تھے مگر اُردو کی ترقی و ترویج میں ان کے حصّے کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جموں و کشمیر میں یوں تو اُردو افسانے کی ابتداء پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں سے ہوتی ہے مگر یہاں کی افسانہ نگاری کی تاریخ جب تک ادھوری سمجھی جائے گی جب تک کرشن چندر کا ذکر نہ کیا جائے۔ جن کا رومان انگیز بچپن پونچھ کی رومان پرور فضا میں گذرا جموں و کشمیر کے ساتھ ان کا روحانی اور تخلیقی رشتہ بڑا گہرا ہے۔ پروفیسر بلاقی رام سے لیکر بے پنکھ فرشتہ یا ادب برائے بطخ تک ان کے بیشمار ناول اور افسانے اسی ریاست اور اس کے ماحول سے متعلق ہیں۔ ان کے کردار یہاں کے عوام کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ کرشن چندر بنیادی طور پر رومان پرست اور جذباتی فنکار ہیں لیکن ان کے فن میں رومان کے ساتھ ساتھ گہرا اور کاری طنز بھی ہوتا ہے جو زندگی کے حقائق کو چھوتا ہے چنانچہ ان کے افسانوں میں حقیقت و رومان کا گہرا امتزاج ملتا ہے۔

پریم ناتھ پردیسی کی ادبی زندگی کا سفر اس وقت شروع ہوتا ہے جب ریاستی عوام مطلق العنانی کی آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں درد و کرب، حاکمانہ جور و جبر، حرمان و یاس، غربت و افلاس، غلامی، جہالت، سماجی نابرابری، طبقاتی کشمکش، بیکاری اور پریشانی جیسے ہوشربا موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔

پریم ناتھ پردیسی ابتدا میں ادب برائے ادب کے نقیب تھے۔ مگر جب پریم چند کی کہانی "کفن" اور ترقی پسند مصنفین کا مشترکہ مجموعہ "انگارے" چھپا اور اس کے ساتھ ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کا باضابطہ

---

[1] یہ بزرگ کشمیر کے مشہور اہل قلم مرزا کمال الدین شیدا کے اجداد میں سے تھے جن کے ہاں اپنے دورۂ کشمیر کے دوران علامہ شبلی نعمانی نے قیام کیا تھا۔

قیام بھی عمل میں آیا تو پردیسی کو یہ احساس شدت کے ساتھ ہوا کہ ادب برائے ادب کا نظریہ زندگی کے حقائق کو سمجھنے کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اس لئے انہوں نے رجعت پسندی، رومانیت، داخلیت، فراریت اور تصور پرستی کے خیالات کو ترک کر کے ادب کے خارجی اور افادی پہلوؤں پر کافی توجہ دی۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں صدیقہ بیگم سیوہاروی کو لکھا"...... ۱۹۳۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر فخر نہیں کر سکتا...... اس وقت مجھے یہ احساس نہ تھا کہ ایک افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطن عزیز کے کیا فرائض ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی کے اس خط سے ہمیں دو باتوں کا اشارہ ملتا ہے۔ ایک یہ کہ ان کا ادب کے بارے میں کیا نظریہ تھا۔ دوسرے جموں و کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کی ابتدا حقیقتاً ۱۹۳۱-۱۹۳۲ء کے آس پاس ہوئی ہے اور آپ کا جموں و کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد ڈالنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے اس وقت ملک کے سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیا۔ اپنے افسانوں کو رومانی اور داخلی حصار سے نکال کر زندگی کے افادی اور خارجی پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ ان کے بعد کے افسانوں میں زندگی کی تلخیوں اور بدھرتاؤں کا سنگیت ساتھ ساتھ ملتا ہے: 'نرک'، 'شام و سحر'، 'ہماری دنیا'، 'کیچڑ کے دیوتا' اور 'بہتے چراغ' اسی قبیل کے افسانے ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی کے ہمعصر افسانہ نگاروں میں قدرت اللہ شہاب، پریم ناتھ دھر، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، موہن لال ایکوٹی، نرسنگھ داس نرگس، ٹھاکر پونچھی، کوثر سیمابی، موہن یاور، اخگر عسکری، دیا کرشن گردش، کیف اسرائیلی، گنگا دھر بھٹ دیہاتی، سوم ناتھ زتشی اور مہندر ناتھ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی، قدرت اللہ شہاب، رامانند ساگر، ٹھاکر پونچھی، پریم ناتھ دھر، مہندر ناتھ اور کشمیری لال ذاکر کے افسانے فن اور تجربے کے لحاظ سے بڑی حد تک ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس وقت کے اپنے فن پاروں میں زیادہ تر جموں و کشمیر کے ماحول کی عکاسی کی ہے اسی لئے ان سب نے اپنے افسانوں میں ڈوگرہ شاہی کے مظالم، سیاسی و سماجی بے راہ روی، معاشی و اقتصادی بدحالی، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام، اس دور کی جہالت، پراگندگی، بھوک، افلاس، ظلم و ستم اور ظالم و مظلوم کی مختلف عنوانات و موضوعات کا سہارا لیکر نقاب کشائی کی ہے۔

لہ ہمارا ادب ۱۹۶۹ء مضمون پریم ناتھ پردیسی اور اُس کا تخلیقی ذہن۔ مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی۔

اس دور کے سبھی افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں فن کی نئی قدروں اور نئے رجحانات کو سموتے وقت انتہائی خلوص اور بے باکی سے کام لیا ہے۔ پردیسی کا بہتے چراغ، شام وسحر اور قدرت اللہ شہاب کا 'سرواز جسونت سنگھ' افسانوں کے کردار نئی روشنی، نئی قدروں اور نئے رجحانات کے علمبردار ہیں۔ ٹھاکر پونچھی نے خانہ بدوش، یہ پتھر میرے ہیں، بے خواب کواڑ، اور موہن یاور نے اڑتے آنچل، سیاہ تاج محل، تیسری آنکھ جیسے افسانے لکھ کر جنسی اور نفسیاتی کشمکش کے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ رامانند ساگر نے ٹنگمرگ کے اڈے پر آئینے، آب حیات اور پریم ناتھ دھر نے 'آخ تھو' نیلی آنکھیں، کاغذ کا واسدیو' افسانے لکھ کر جہاں تشبیہات استعارات، اشاریت اور ابہام سے کام لیا ہے وہاں طنز کے نشتر بھی چھوئے ہیں۔ جہاں تک ان کے ان افسانوں کا تعلق ہے۔ ان میں واردات قلب اور نفسیات کا تحلیلی تجزیہ خلاقانہ ہے، طنز و مزاح کے علاوہ استعارات اور تشبیہات کی مدد سے جس شگفتہ بیانی کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ موہن لال رام کوٹی (نرسنگھ داس نرگس) کے غریب کی عید، ہری جن لڑکی، قانون کے محافظ' افسانوں میں شخصی حکومت، جاگیردارانہ نظام اقتصادی بدحالی، سماجی و طبقاتی کشمکش اور دیہاتی ماحول کی عکاسی بدرجہ اتم موجود ہے جس عشق کا موضوع اگرچہ پٹا ہوا ہے، مگر حکام کی بے دردی اور سرمایہ داروں کی بالادستی کے باوجود ان کے افسانوں میں دیہاتی دوشیزاؤں کی آہیں، ان کا بے لوث پیار، نقرئی قہقہے اور شرمیلی مسکراہٹیں بھی ملتی ہیں۔

مہندر تلکھ، سومناتھ زتشی اور کشمیری لال ذاکر نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی اس کے لوازمات کے ساتھ ساتھ ذہنی پراگندگی اور جنس و نفسیات سے متعلق انتہائی حسین مرقعے پیش کیے ہیں۔ جموں و کشمیر میں افسانہ نگاری کے اس دور میں اور بھی کئی فن کار سامنے آئے ہیں ان میں سے کنول نین پروانہ، محمود ہاشمی، جگدیش کنول، کندن لال، گنگا دھر بٹ دیہاتی، وجے شمن سوسن، اور دیانند کپور نے بھی افسانوی ادب میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ان کے ساتھ محبوبہ یاسمین نے 'دل ہی تو ہے'، شیخ منظور الٰہی نے 'ایک سال'، گلزار احمد فدا نے 'ابا کے پاس'، عزیز کاشر نے 'رجنی'، محمد عمر نور الٰہی نے 'گلوری'، شیخ عبدالعزیز علائی نے 'سرائے'، طالب کورگانی نے 'ہاتھی نالہ' اور عبدالحمید نظامی نے 'تحفہ' جیسے مختلف عنوانات کے تحت افسانے لکھ کر روزمرہ زندگی کے مسائل، عوام کے جذبات اور اس وقت کے اہم تقاضوں کو اپنے فن میں برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اُردو افسانہ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ اس وقت ہوا جب ۱۹۴۷ء میں آزادی کی صبح طلوع ہوئی۔ جموں و کشمیر کو بھی شخصی حکومت سے نجات ملی مگر ملک کی تقسیم سے ادیبوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔ احباب اقارب بچھڑ گئے۔ کئی ایک فرقہ وارانہ فسادات میں مارے گئے۔ کشمیر پر قبائیلیوں کا حملہ ہوا۔ سارا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ کئی خونچکاں داستانیں وجود میں آئیں۔ ان حالات سے ادیب و فنکار یہاں تک متاثر ہوئے کہ پریم ناتھ پردیسی نیشنل ملیشیا NATIONAL MALITIA میں بھرتی ہو گئے اور انہوں نے ان ہی حالات پر مبنی "نغمۂ جنگ اور بہتے چراغ" جیسے افسانے لکھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "اب آپ کے چراغ نہیں جلیں گے سیٹھ جی، دنیا کو امن کی ضرورت ہے[1]۔ یہ جملہ امن کے لئے ان کے دل میں موجود تڑپ کا اظہار ہے۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا اور اس تقسیم کے ساتھ ہی ساتھ ہماری ریاست بھی بٹ گئی بہت سے افسانہ نگار پاکستان چلے گئے اور کچھ ملک کے دیگر حصوں میں جا کر رہائش پذیر ہو گئے اور کئی افسانہ نگاروں کے تخلیقی سوتے خشک ہو گئے۔ قدرت اللہ شہاب، محمد عمر نور الٰہی، کوثر سیمابی، محبوب یاسین طالب گورگانی، کیف اسرائیلی، گلزار احمد فدا، عبدالحمید نظامی، اخگر عسکری، شیخ منظور الٰہی، عبدالعزیز علائی اور عزیز کاشش ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے جس کی وجہ سے ریاست ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی ٹولی سے محروم ہو گئی۔ رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، دیا کرشن گردش، جگدیش کنول، کنول منی پروانہ، کندن لال ٹھاکر لوکھی، اور پریم ناتھ دھر وغیرہ ریاست سے باہر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں تلاش معاش کی خاطر بکھر گئے۔ اور اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ پریم ناتھ پردیسی وفات پا گئے۔ سوملا ل ملکوٹی اور موہن یاور نے صحافت کا کام سنبھالا اور کم و بیش افسانے بھی تخلیق کرتے رہے بالخصوص موہن یاور۔

تقسیم وطن کے ساتھ ہی کچھ عرصہ تک یہاں کی ادبی فضا پر جمود و تعطل کا عالم طاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات سُدھرے تو یہاں کے ادبی افق پر کچھ نئے چہرے ابھرے جنھوں نے اُردو افسانے کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ ان میں علی محمد لون، تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، برج کتیال، حامدی کاشمیری، برج پریمی، غلام رسول سنتوش، اختر محی الدین، صوفی غلام محمد، نور شاہ

---

[1] بہتے چراغ۔ ص ۲۹۵۔

غ۔م جانباز، امیش کول، ہنسی نزدوکش، جگدیش بھارتی، مخمور بدخشی، شبنم قیوم، رام کمار ابرول اور ویدراہی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اُردو زبان میں لکھنے سے کیا اور پھر کشمیری یا ڈوگری کی طرف مائل ہوگئے۔ ان میں علی محمد لون، اختر محی الدین، جگدیش بھارتی، ہنسی نزدوکش، امیش کول اور غلام رسول سنتوش کے نام لئے جاسکتے ہیں جنہوں نے کشمیری میں افسانے تخلیق کئے۔ علی محمد لون نے اگرچہ کشمیری میں لکھ کر اپنے لئے ایک خاص مقام بنالیا لیکن انہوں نے اُردو کے ادبی سرمائے میں بھی بہت سے افسانے کئے۔ انہوں نے موتیجموں الی گڑیا، پاپی پجارن کی سنتان' اور بُت شکن جیسے کئی ڈرامائی انداز کے افسانے لکھے۔ اختر محی الدین نے پوندا بچ، پیوندا ور رات مرگئی اور ماہیرن جیسے عمدہ اُردو افسانے لکھے۔ غلام رسول سنتوش جو کہ بنیادی طور پر ایک مصور اور شاعر ہیں نے خزان کی خوشبو، ایک موت ایک مسکراہٹ، یہ قربتیں یہ دوریاں اور ڈل کے باسی نامی افسانوں میں مصورانہ اور شاعرانہ جدت پیدا کی ہے۔ رام کمار ابرول اور ویدراہی نے ڈوگری ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنادیا۔ اس کے باوجود ویدراہی نے کالے ہاتھ' اور شگوفہ جیسی اچھی کہانیاں لکھیں۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں سے حامدی کاشمیری، نورشاہ، تیج بہادر بھان، پشکرناتھ اور برج پریمی نے اچھا لکھا۔ برج کتیال، شبنم قیوم اور مخمور بدخشی نے درمیانہ روش اختیار کی۔ غ۔م جانباز اور غلام محمد نے بہت کم لکھا بلکہ لکھنا ہی ترک کردیا۔

حامدی کاشمیری کے ابتدائی افسانوں پر معاشرتی اور اصلاحی رنگ غالب ہے مگر بعد کے افسانوں میں جدیدیت کی بوباس ملتی ہے: سراب' سندری' وادی کے پھول' برف میں آگ' اور آگ ہے اور دھواں نہیں' افسانوں میں جہاں شعری پیکر تراشیاں ہیں وہاں مشاہدے کی باریکی اور غور و فکر کی گہرائی کے ساتھ جنس کا شدید احساس بھی ملتا ہے اور حسن و عشق کی حقیقی داستانوں کی چاشنی بھی۔ حامدی بنیادی طور پر شاعر ہے اس لئے ان کے ان افسانوں میں شعریت فن کی اہمیت، کشمیری کلچر اور عوام کی نفسیاتی زندگی کی تہہ در تہہ درگرہیں یک جا ملتی ہیں۔ حامدی کاشمیری نے عرصہ ہوا اب افسانوی ادب تخلیق کرنے سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور شعر و شاعری اور تنقید کی طرف ہمہ تن توجہ دے رہے ہیں۔

تم

تیج بہادر بھان کا افسانہ "جہلم کے سینے پر" اپنے جلو میں کشمیر کا مخصوص ماحول لئے ہوئے ہے "عورت" "جوتے" اور "سہارا" افسانوں کے ذریعہ انہوں نے جموں و کشمیر کے عوام کے دلوں کی ہو بہو ترجمانی کی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں جن کو عوامی زندگی کا عمیق مشاہدہ ہے۔ ان کے افسانوں پر کشمیری زبان کے لب و لہجہ اور محاوروں کا کافی اثر ہے۔

پشکر ناتھ ایک حقیقت نگار ہے۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں حقیقت اور تخیل کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے۔ وہ بدلتی فضاؤں کے ترجمان ہیں۔ "اندھیرے اجالے" "ڈل کے باسی" "آس نراس" اور "گلوان" افسانے ندرتِ خیال، انداز بیان اور طرز تحریر کے لحاظ سے اعلیٰ فنی نمونے ہیں۔ ان افسانوں میں حقیقی زندگی اس کے مسائل، ان کا عمیق مطالعہ اور احساس و فکر کی مکمل ہم آہنگی ملتی ہے "گالی"، "گاشری" اور "پردہ نشین" افسانوں میں اچھے کردار ملتے ہیں جو جموں و کشمیر کے ہی پروردہ ہیں۔

نور شاہ کے افسانوں میں شاعرانہ تخیل طرازیاں سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے سے لیکر اس وقت تک سبھی افسانوں میں یکساں اور ہموار فضا ملتی ہے جس نے ان کے افسانوں کو ایک محدود دائرے میں مقید کر دیا ہے مگر اس کے باوجود ان کے افسانوں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں[1]۔ "ایک رات کی ملکہ" "بے گھاٹ کی ناؤ" "ویرانے کے پھول" اور "من کا آنگن اداس اداس" افسانوں میں حقیقی معنوں میں ان ہی زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ہیں۔ انداز شگفتہ مگر بے ساختہ نہیں ہے۔ ابتدائی افسانوں میں مشاہدے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ "سوکھی ندی کا گیت" "لمحے اور زنجیریں" "پتھر اور انسان" افسانوں میں زندگی کے انفرادی اور خارجی پہلوؤں کو اجاگر کر کے تلخ اور حسین لمحات کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے۔

محمود بدخشی کے افسانوں میں بقول ڈاکٹر محی الدین زورؔ "ان کی گفتگو اور انداز طبیعت کے خلاف ان کے افسانوں میں مسکراہٹیں کم اور طنز کاری زیادہ ہے۔ انہوں نے ہنستے چہروں سے زیادہ افسردہ دلوں کو پیش کیا ہے اور ہوس کاروں اور مکاروں پر بھرپور طنز کرنے کی کوشش کی ہے[2]۔ نیل کنول مسکائے" "عبداللہ دیوانہ" "یہ خلش کہاں سے ہوتی" اور "ہار جیت" کے مطالعے

---

[1] شاعر تاولٹ نمبر ۱۹۷۱ء تعارف نور شاہ۔
[2] شیرازہ اردو سنہ ۱۹۶۰ء زور نمبر ص ۶۱ مطبوعہ کلچرل اکیڈمی۔ نیز نیل کنول مسکائے ص ۱۳۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں اوّل مشاہدے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ دوم وہ کشمیری محاورات براہِ راست لفظی ترجمہ کر جاتے ہیں جس کی وجہ سے کہانی کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

محمود ہدخشی کا افسانوی سرمایہ بس "نیل کنول مسکائے" مجموعہ ہے۔ بعد ازاں انہوں نے لکھنا ترک کر دیا اور اب تو یقین بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ "نیل کنول مسکائے" مجموعے کے افسانوں کا خالق یہی شخص ہے۔ اس طرح سے ڈاکٹر زور کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا"..... اور مجھے یقین ہے کہ کشمیر کا یہ ابھرتا ہوا فن کار اگر اسی طرح مصروف تخلیق رہے تو اردو کے افسانوی ادب میں اپنا نام پیدا کر سکے گا اور اپنے وطن کو تمام اردو دنیا میں باعزت طریقے سے روشناس کرنے کا باعث بن سکے گا۔[1]

برج کتیال، شبنم قیوم اور برج پریمی نئی فضا اور نئے رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ تخیلی تانے بانے کم اور حقیقت پسندانہ عناصر بہت زیادہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں روزمرہ زندگی کے چٹخارے اور عام ماحول کی تصویر کشی کے علاوہ طنز کا عنصر بھی وافر ملتا ہے۔ برج کتیال کے "موت کے راہی" شبنم قیوم کے "لوہا پگھلتا ہے" "پانی کا دھواں" "بہت اونچے بہت نیچے" اور برج پریمی کے "یادوں کی خوشبو" "سپنوں کی شام" افسانوں میں بیسویں صدی کے مشینی دور کے انسان کا کرب ملتا ہے۔

جموں و کشمیر میں اردو افسانوی ادب کے لئے یہ دور نشاۃ ثانیہ سے کم نہیں۔ اس دور میں جہاں نئے لکھنے والے سامنے آئے وہاں کہنہ مشق ادیب مثلاً ٹھاکر پونچھی، پریم ناتھ دھر، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، موہن یاور اور پشکر ناتھ بدستور لکھتے رہے۔ اسی دور میں متعدد اخبارات اور رسائل شائع ہونے لگے۔ ریڈیو اسٹیشنوں کا قیام عمل میں آیا۔ آزادی کے عام تعلیم کی برکات سے ہر شخص کو ترقی کے یکساں مواقع بہم ہوئے۔ اسی طرح کلچرل اکیڈیمی کا قیام بھی یہاں کی صحافت و ثقافت کی تحریک کے لئے فالِ نیک ثابت ہوا جس سے ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انہیں مالی معاونت دی جانے لگی۔ کتابیں چھپنے لگیں اور زبان و ادب کو کافی وسعت ملی۔ اس ضمن میں محکمۂ اطلاعات کی ادبی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔

جموں و کشمیر کے ادباء نے اس دور میں ایک طرف ملک گیر پھیلنے پر چوٹی کے اردو ادیبوں کے

---

[1] نیل کنول مسکائے پیش لفظ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ص ۱۴-۱۵

تتمہ

سبک کی پیروی کی اور اپنے یہاں کے معاشی اور سماجی پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھی اور دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر مروج رجحانات مثلاً مارکس کے معاشی اور فرائڈ کے جنسی خیالات کا اثر بھی قبول کیا اور اس طرح سے انہوں نے مارکسزم اور تحلیل نفسی کے ساتھ ساتھ وجودیت، اشاریت، اظہاریت، تاثیریت، جمالیات، شعور کی رَو جیسے جدید نظریات و رجحانات سے متاثر ہو کر افسانے تخلیق کرنے کی کوشش کی۔

اُردو افسانے کا یہ دوسرا دور لگ بھگ سنہ ۱۹۵۰ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۹۶۰ء میں ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد نئے افسانہ نگاروں کا ایک بہت بڑا قافلہ رَواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ ان میں مالک رام آنند، او۔ پی شرما سارتھی، وجے سوری، گیا چند شرما، سوم ناتھ ڈوگرہ، ہردے کول بھارتی، یش سروج، کلدیپ رعنا، ڈی۔ کے کنول، امر مالموہی، ہری کرشن کول، راج بیس گوہر، گھنشیام سیٹھی، ساگر کشمیری، ریاض پنجابی، ڈاکٹر ظہور الدین، موتی لال کپور، عمر مجید، عبدالغنی شیخ لداخی، نعیم اختر، شمس الدین شمیم، کشوری منچندہ، جیت کماری، شبی حسن ساہو اور جوگیشور پتھک کے نام خصوصی طور پر لئے جا سکتے ہیں لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان میں سے بہت سے افسانہ نگاروں نے کشمیری، ڈوگری اور پنجابی میں لکھا اور بہت سے اُردو میں لکھتے رہے چنانچہ جب ہم ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ موضوعات متنوع ہوتے ہوئے ان کے افسانوں میں جمہوریت، سوشلزم، مارکسزم، جدیدیت، طبقاتی کشمکش، ہند وچین اور ہند و پاک کی جنگیں، عرب اسرائیل اور ویتنام و قبرص کے مظلوموں کی آہ و فغاں کے مشترکہ احساسات ملتے ہیں۔ ان میں موجودہ سائنسی، سماجی، سیاسی اور تکنیکی دَور کے انسان کا دَرد و کرب بھی موجود رہے۔ خلائی کھوج اور تسخیر قمر نے ادب میں نئی فضاؤں کا سماں باندھ دیا۔ مشینی دور نے ادب میں انسانی زندگی کی پراگندہ مزاجی اور نفسانفسی کو شدید تر کر دیا۔ ان افسانوں میں ایک طرف سماج کے رِستے ہوئے ناسوروں کا ذکر ہے تو دوسری طرف انسان کی کس مپرسی اور تنہائی کا گہرا احساس ملتاہے۔

چنانچہ مالک رام آنند کے "دہکتے پھول"، "شبنم آنکھیں"، "اپنے وطن میں اجنبی"، "پائیلٹ"، "سرخ برف زرد پتے"، یش سروج کے "زمین پیاسی ہے"، "خون کا قرض"۔ سوم ناتھ ڈوگرہ کے "دو آنسو"، "دو خط ایک کہانی"، "میرے ارمان میرے سپنے"۔ امر مالموہی کے "موت کی آرزو"، "سحر ہونے تک"، "انگارے"۔ کشوری منچندہ کے "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"، "سڑک انصاف کرتی ہے"، "بھوک"، "الیکشن"۔ وجے سوری کے "زندہ لاش"

خدا اور انسان۔ او۔ پی شرما سارتھی کے 'درد'، 'مجرم کون؟'، 'اپنے وطن سے اپنے وطن میں' اور گیان چند شرما کے 'بنجر دھرتی' 'بہتر لوگ' افسانوں میں نہ صرف یہ کہ سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی الجھنیں ہیں بلکہ حقیقت و رومان کا ایک دلنشین سنگم بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں دکھ درد، غم، پریشانی، ماضی کی تلخیاں، حال کی کشمکش، مستقبل کی مایوسی کے ساتھ ساتھ ہند و پاک کی تقسیم کے اثرات، گاہ بگاہ وجود میں ہونے والی جنگیں اور ان کا عوام پر ردِ عمل کے پرتو ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں حال کی تاریکیوں کو پھاندنے اور مستقبل کے اُجالوں کی نشاندہی بہت کم ملتی ہے۔

ادبی افق پر پھیلتے ہوئے جدید میلانات اور رجحانات نے یہاں کے نئے اور پرانے افسانہ نگاروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا اور ان فنکاروں نے ان کے میلانات و رجحانات سے متاثر ہو کر بہت ہی خوبصورت افسانے تخلیق کئے۔ ان میں کلدیپ رعنا کا 'ایک خط، ایک گیت، زندگی'، ہری کرشن کول کا 'کتے کی دم'، راجیش گوہر کا 'سہاگ بنا رہے'، گھنشیام سیٹھی کا 'ایک شام'، اجیت کمار بخشی کا 'اس کا اور میرا سچ' 'شرمیلا'، ڈاکٹر ظہور الدین کا 'نجات'، 'دردِ شہوار'، ساگر کاشمیری کا 'زلزلہ'، ریاض پنجابی کا 'لمحوں کی صلیب'، موتی لال کپور کا 'برج کا باسی'، عمر مجید کا 'پرچھائیاں'، نعیم اختر کا 'بہار آئی چمن میں مگر خزاں کی طرح'، عبدالغنی شیخ کا 'لوسر' اور 'آنسو'، 'مسکراہٹ'، شمس الدین شمیم کا 'انگلیاں'، 'دوسری صلیب' اور 'حسن ساہو'، جوتیشور پتھک اور محمد زمان آزردہ کے کچھ افسانوں کا نام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے ادب اور فن کو جدیدیت کے ساتھ ہم آہنگ کیا اور فنِ افسانہ کے لئے نئی راہیں متعین کیں۔

جموں و کشمیر میں ۱۹۷۰ء کے بعد اردو افسانہ نے یہاں کے بہت سے نئے چہروں کو اپنی طرف متوجہ اور پرانے کہنہ مشق ادبا کے ساتھ ساتھ نوجوان افسانہ نگاروں نے بھی قدم ملا کر چلنا شروع کیا اور ریاست میں افسانوی ادب کے ایک خوش آئند دور کی نوید سنائی۔

سنہ ۱۹۷۰ء کے بعد دنیا کے نقشے میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ ثقافتی، سماجی، سیاسی اور ادبی افق پر بھی متاثر کن حالات نے کروٹ لی۔ ادیب اور فنکار کو بھی ان حالات سے دوچار ہونا پڑا اور اس نے اپنے ماحول میں پیدا شدہ پراگندہ مزاجی کا حل تلاش کرنا شروع کیا۔ اس طرح سے ۱۹۸۰ء کے بعد ریاست میں ایک نئے دور کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور افسانوی ادب میں یہاں کئی ایسے نوجوانوں کا اضافہ ہوا جن سے حوصلہ افزا توقعات وابستہ ہو گئی ہیں اور دس بارہ برس کے اس مختصر عرصے میں انہوں نے جو

تمع

کامیابیوں کو چھا لیا ہے ان سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ صنفِ ادب ریاست میں مسلسل فروغ اور نشو و نما پا رہی ہے اور اس کا دامن اس قدر وسیع اور وقیع ہے کہ اس میں تعطل اور جمود پیدا ہونے کے دُور دُور تک امکانات نہیں ہیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد پرانے لکھنے والوں میں سے ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، نور شاہ، کشمیری لال ذاکر، شبنم قیوم اور پریم ناتھ دھر وغیرہ نے حالات کے تقاضوں، سماجی ضرورتوں اور فنی نزاکتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے افسانے تخلیق کئے۔ پریم ناتھ دھر نے 'اسٹرے پھسے'، تیج بہادر بھان نے 'رنڈی اور بچے'، 'دو بھائی'، شبنم قیوم نے 'دکھتی آنکھیں'، 'جہاں انسان دفن ہے'، 'دیوی دیوتا'، نور شاہ نے 'ایک ادھورا ناول'، 'لمحوں کا سفر'، پشکر ناتھ نے 'جوڑا'، 'بابیلوں کا'، ٹھاکر پونچھی نے 'موت کی موت'، 'سفیدے کا درخت' وغیرہ بہت اچھی کہانیاں لکھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ کشوری منچندہ نے 'سڑک انصاف کرتی ہے'، 'میں سوداگر نہیں'، 'روش سے ہٹ کر'، کلدیپ رعنا نے 'لکیریں'، ریاض پنجابی نے 'بے نام'، جوہر تنویر پتھک نے 'ٹوٹے رشتوں کا روگ'، غمگین غلام نبی نے 'دل کی بات'، وجے سوری نے 'زخم'، شمس الدین شمیم نے 'بھاوٹے کی بیٹی'، 'کچھ دن کی مدی'، عبدالغنی شیخ نے 'دکھوں کی کہانی'، 'آرزوئیں'، مرزا محمد زمان آزردہ نے '...اور وہ ناپ گئی'، 'اسیر وقت'، نسیم، حسن ساہو نے 'پھول کا ماتم'، 'ایک بستی تین روپ'، 'دیوالی کے دیپ'، عمر مجید نے 'تاریخ ساز'، 'اور جہلم بہتا رہا'، 'بادشاہ'، سلمیٰ فردوس نقاش نے 'سلومی'، نزہت داوری نے 'آسیب زدہ چنار'، اور ڈاکٹر ظہورالدین نے 'میگنولیا کا قتل' جیسے علامتی اور تجریدی افسانے لکھ کر ریاستی افسانوی ادب میں جہاں قابلِ قدر اضافہ کیا وہاں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

۱۹۷۳ء میں ریاست کے افسانوی ادب میں چند ایک کو چھوڑ کر کئی نئے چہرے سامنے آئے ان کو سامنے لانے میں ڈاکٹر بشیر گاش اور سلطان فردوسی کا کافی ہاتھ رہا ہے۔ ڈاکٹر بشیر گاش نے جن نئے فنکاروں کی تخلیقات پر [illegible] ترتیب دیا۔ سلطان فردوسی نے شائع کیا لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ ساڑھے تین سو صفحات کے اس مجموعے میں ریاست کے صرف خطہ کشمیر کی نمائندگی ہے جموں اور لداخ کے ادیبوں کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ اکتیس افسانہ نگاروں کی تخلیقات پر مبنی یہ افسانوی مجموعہ ریاستی افسانوی ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مجموعے کی بدولت بہت سے نئے افسانہ نگاروں کا تعارف ہوا ہے اگر مرتب نے کشمیر کے بہت سے افسانہ نگاروں کو نظیر

بھی اسمیں شامل نہیں کیا ہے) اس مجموعے میں رابعہ ولشاد، فرحت آرا، حیدر رشی، شمیم اختر، ایم نسا،
نسیم جہاں، رفیقہ عارف، نیلوفر شاعر، عمر مجید، شمس الدین شمیم، نذیر شہباز، م رم صدیق،
ایس ایم قمر، اے رضوی، عبدالاحد بٹ، نذیر مشتاق، بھوشن لال بھوشن، مصطفےٰ الجوہر،
مرزا محمد زمان آزردہ، طاہر رحمان، الطاف شیرا، عبدالرشید فراق، شیخ بشیر احمد، حشمت مختار،
نیاز احمد جان، زاہد منظور، خالد بشیر، نذیر شیدائی، یٰسین فردوسی، ظہور احمد شاعر، دین محمد شمع
اور بشیر گاش کے بالترتیب کرب کی صلیب، زرد پتیاں، پیاسے سپنے، گوری دشمن، رشتہ،
ایک زخم ہرا سا، میرے وطن، سڑک، فنکار، واپسی، تیسرا پتھر، روشنی کے کیڑے، آخری موڑ، دھماکہ
شہر کا قہر، سولہ نمبر، اور وہ ٹاپ کر گئی، گرد اور آئینہ، مداوا، ساحل کا تھپیڑا، دوسری لڑکی، وعدہ
ادکھی عورت، آگ کی گڑیا، روشنی، بے وفا مورتیاں، لیلیٰ، اندھیرا، ادھوری بات، اگالدان
افسانے شامل ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں سے بہت سے لوگوں نے اب اپنا ایک مقام بنا لیا ہے
اور بہت سے ابھی اندھیروں میں ہی بھٹک رہے ہیں۔ ان تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا
ہے کہ بعض افسانہ نگاروں کو ابھی تک افسانے کی تکنیک بھی معلوم نہیں ہے بعض کے ہاں مشاہدات و تجربات
کا فقدان ہے اور بعض کما حقہ آگاہی رکھتے ہیں۔

زبان و ادب کے فروغ اور اسکی ترقی و ترویج میں وسائل کا بہت ہی اہم حصہ رہا ہے۔ یوں ہر
ادیب کے بس کی بات نہیں کہ وہ اپنی تخلیقات کا مجموعہ شائع کرے اور قارئین مستفید ہوں اس کمی کو صرف
رسائل ہی پورا کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ریاست جموں و کشمیر میں ریڈیو، ٹیلیویژن اور اخبارات
کے ساتھ ساتھ ادبی و نیم ادبی رسائل میں شیرازہ (کلچرل اکیڈیمی) اور تعمیر (محکمہ اطلاعات) کی خدمات ناقابلِ
فراموش ہیں۔ ان دو رسالوں نے کئی افسانہ نگاروں کو عوام سے متعارف کروایا۔ ان کے علاوہ بیرون
ریاست سے نکلنے والے رسائل آجکل، شاعر، بیسویں صدی، ہمارا دور وغیرہ میں بھی ریاستی ادیبوں کی
تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں چنانچہ گذشتہ چند برسوں میں اور بھی کئی ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں
شیرازہ کے افسانہ نمبر اور ہر سال شائع ہونے والے نوجوان نمبر کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ شیرازہ نے ان
عام قاریوں کی [illegible] افسانہ نگاروں کی تخلیقات سے [illegible] میں اردو،
کشمیری [illegible] اور [illegible] افسانوں پر مبنی شیرازہ کا افسانہ نمبر شائع ہوا۔ اس خاص نمبر میں [illegible] کے علاوہ اور

کشمیری، ڈوگری اور پنجابی افسانوں کے اردو میں بالترتیب بیس اور چار چار تراجم شامل ہیں۔ اردو افسانہ نگاروں میں تیج بہادر بھان (تلاش)، نور شاہ (میرے دوست کی بیوی) اور بی شرما سارتھی (اپنا ایک سفر)، ڈاکٹر برج پریمی (خوابوں کے دریچے) عبدالغنی شیخ (ڈی لائیٹ تھیٹر سے گھر تک)، شبنم قیوم (جھنکارہ)، عمر مجید (یہ شام بھی کہاں ہوئی)، شمس الدین شمیم (عمارت)، امر مالموہی (احساس کا کرب)، جوگیشور بیتھک (اداس لمحوں کا سفر)، راجہ نذر بونیاری (کتنی شکلیں کئی سورج)، غمگین غلام نبی (افسانہ) ڈی۔ کے کنول (شکست)، روشن لال روشن (آواز کا گھاؤ) مسعود ساموں (۔۔۔اور قطرہ ٹپکا) اور یسین فردوسی (باجی) کے افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں ان کا اپنا وہی اسلوب اور انداز بیان ہے جس سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے ابتدائی مراحل طے کئے ہیں۔ البتہ او بی شرما سارتھی، برج پریمی، شمس الدین شمیم، امر مالموہی، عمر مجید، راجہ نذر بونیاری، غمگین غلام نبی اور مسعود ساموں کے افسانے جدیدیت کے حامل ہیں۔ ان میں تجربات اور مشاہدات کا انوکھا پن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ انہوں نے اپنے ان افسانوں میں افسانے کے فنی اور تیکنیکی پہلوؤں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

جہاں تک اردو میں کشمیری افسانوں کے تراجم کا تعلق ہے، یہ افسانے اپنے ماحول، کردار نگاری، پلاٹ کے علاوہ فنی اور تخلیقی اعتبار سے جہاں جدت و ندرت کے حامل ہیں وہاں یہ عوامی زندگی کی چھاتیوں کے بہت قریب ہیں اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کشمیر میں اردو کی نسبت کشمیری زبان میں نئے تجربے کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا جا رہا ہے اور کشمیری افسانہ اردو سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ریاست کے ابتدائی اردو ادیب ہی اب پوری تندہی کے ساتھ کشمیری زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان میں علی محمد لون، اختر محی الدین، امین کامل، غلام رسول سنتوش، ع شنکر رینہ، فاروق مسعودی، ہردے کول بھارتی، بشیر اختر، اوتار کرشن رہبر، ناظر منصور، گلشن مجید اور غلام محمد آجز کے افسانے بالترتیب آگے کوئی نہ پیچھے، سانحہ، بھکمنگے، سنگ مزار، لکیریں اور نقطے، کوہ قاف پہ پری جن اور سیرو رستی و الیکی لکھ رہے ہیں، فلمی ٹریلر، مردوان زندہ رہنے کے لئے، میرے خوف کی کہانی، چھوٹی بستی کا بند دروازہ قابل ذکر اردو تراجم ہیں۔ ان افسانوں میں علامتی اور تجریدی فن کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور قدیم اقدار کی توڑ پھوڑ کے ساتھ جدید ذہن کی پراگندہ مزاجی اور ایک ایسے انسان کی کہانی بھی ملتی ہے جو اس مشینی اور تکنیکی دور میں کچھ ایسا کھو گیا ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود

اسکی بازیافت ناممکن سی ہوگئی ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے ادبی فن پر رونما ہونے والے جدید رجحانات کا بالواسطہ اثر قبول کیا ہے۔ اور ان میں کشمیری رنگ روپ سے مزید نکھار پیدا کیا ہے۔ اس اعتبار سے بشیر اختر اور فاروق مسعودی قابل ذکر ہیں دونوں کے ہاں بظاہر جنسی پہلو ہے مگر بغور مطالعے کے بعد مسعودی کے ہاں تو جنسی جذبات علامتی انداز میں محض تشنگی کا باعث بنتے ہیں جن سے ذہنی آسودگی اور جنسی انگیخت ہویدا ہے لیکن بشیر اختر کے ہاں جنس کا برتاؤ بھرپور علامتی انداز میں ہے۔ ان پر سعادت حسن منٹو کا کافی اثر دکھائی دیتا ہے لیکن علامتوں کے برتنے میں ان کا انداز منفرد ہے اور اگر وہ اسی انداز سے اپنے فن پارے تخلیق کرتے رہے تو وہ دوسرے کشمیری افسانہ نگاروں کو بہت پیچھے چھوڑ کر کشمیری زبان کے منٹو ہوں گے۔

اس شمارے میں ڈوگری اور پنجابی کہانیوں کے جو تراجم شامل ہیں ان میں نریندر کھجوریہ کا 'برگِ آوارہ' بندھو شرما کا 'یادوں کے جھروکے' ڈاکٹر منوج کا 'ایک اور کٹی گھاؤ' ادم گوسوامی کا 'پھکی' ڈوگری میں اور پنجابی میں سرن سنگھ کا 'دھوپ' کنول کشمیری کا 'دجیت ماں آمین کا' 'ادھورہ تاج محل' اور پریم سنگھ کا 'محنتی' سماجی، اصلاحی، جدید اور علامتی سبھی قسم کے قابل مطالعہ افسانے ہیں۔ البتہ دونوں زبانوں کے کچھ اہم اور مشہور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کی کمی بُری طرح سے کھٹکتی ہے۔

جہاں تک ڈوگری، پنجابی اور کشمیری افسانوں کے اردو تراجم کا تعلق ہے یہ گاہ بگاہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے شائع ہونے والے ایک اور مجموعے کا نام لینا بہت ہی ضروری ہے کہ جو 'پربت اور سنگھٹ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ کلچرل اکیڈیمی کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس کے تحت اب تک دو جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ اور ان میں کشمیری اور ڈوگری دونوں زبانوں کے اہم اور چوٹی کے افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کئے گئے ہیں جن کا اپنی زبان میں ایک مستند مقام ہے۔

نوجوان افسانہ نگاروں کو ریاست اور بیرونِ ریاست کے ادیبوں سے روشناس اور متعارف کروانے کی غرض سے ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے ان کی تخلیقات پر مبنی ہر سال شیرازہ کا ایک خاص شمارہ نوجوان نمبر شائع کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی ۱۹۷۹ء کا نوجوان نمبر ہے [illegible] کے تین شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی بدولت ان نوجوان افسانہ نگاروں [illegible]

اور طریقۂ پیشکش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ریاست کے ان ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں میں انیس ہمدانی، غلام رسول آزاد، آنند لہر، عبدالرشید فراق، نیلظر نذر، جان محمد آزاد، محمد شریف دانش، عبدالرشید خان راہگیر، یسین فردوسی، دلکش مقبول، الطاف نادلپوری، مشتاق مہدی، زاہد مختار، اطہر نعیمہ احمد، فاروق رینزو، بھوشن لال بھوشن، کے۔ ڈی مینی، ریاض ماہر، صوفی بشیر بشر، مقبول احمد، تمنا منشی، مطربہ معصوم، خالد بشیر، اشرف آثاری، اشوک پٹواری اور غلام نبی شاہد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں میں موجودہ ماحول کی اس بے چینی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے جس سے نوجوان نسل دوچار ہے ان میں ایک درد و کرب ملتا ہے جس کی بدولت نوجوان طبقہ زندگی کی الجھنوں میں اس طرح الجھ کر رہ گیا ہے الجھنوں کی ان بھول بھلیوں سے باہر نکالنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں سے بلاشبہ بہت سے لوگوں کو افسانہ نگاری کا خاصا اچھا سلیقہ ہے اور یہ اپنے اس ماحول کے حقائق کو اپنی گرفت میں لینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے یہاں زندگی اور اس سے متعلق پیچیدگیوں کا احساس قوی نہیں ہے اور بعض کے یہاں مشاہدے کی کمی اور احساس کی ناپختگی کا بھی پتہ چلتا ہے لیکن مسلسل کاوشوں سے جہاں یہ باتیں دور ہونے کا امکان ہے وہاں تجربات اور مشاہدات کی بدولت اسلوب میں کنایت اور تیکھاپن بھی از خود آنے کی امید بھی ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے افسانوں میں انیس ہمدانی کا 'آہٹ'، 'مکمل ہونے تک'، غلام رسول آزاد کا 'شہر کا مرکز'، آنند لہر کا 'اندھی روشنی'، 'ٹرین کا ڈبہ'، 'جواب'، 'پانی کی لکیریں'، 'عدالت'، نیلظر نذر کا 'میں کی واپسی'، 'ہولی نادر'، محمد شریف دانش کا 'دستکار'، خالد بشیر کا 'دھندلے نقوش'، زاہد مختار کا 'کسوٹی'، 'تخلیق کے گھاؤ'، صوفی بشیر بشر کا 'بے زبان'، فاروق رینزو کا 'آخری داؤ'، 'آواز کا سایہ'، کے۔ ڈی مینی کا 'پہلا پتھر'، 'چاند'، مطربہ معصوم کا 'امیدوں کا پتھراؤ' اور دلکش مقبول کا 'بیمار مسیحا'، اشرف آثاری کا 'نئے افق کی تلاش'، تمنا منشی کا 'اجالے اندھیرے'، تمثیلی تجریدی اور جدیدیت کے حامل افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں افسانہ نگار کے ان تجربات کی نشاندہی ہوتی ہے جہاں لوگوں کی بھیڑ میں بھی اُسے شدید تنہائی کا احساس ہوتا ہے جہاں وہ اپنی ہر شے بلکہ اپنا آپ تک کھو بیٹھا ہے اور اُسے اسکی از سرِ نو تلاش ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ فن کار موجودہ ماحول سے فرار ہو کر پھر کہیں گوشہ نشینی اور صوفی کی زندگی نہ گذارنے لگیں جس میں اُن کی

۱ے جہاں تک چاند اور مطربہ معصوم کا تعلق ہے یہ نام اور پتے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے یہ ریاض معصوم قریشی کا نام ہے جنہیں بعض مصلحتوں کی بنا پر نسوانی روپ دھارنا پڑا - (محمد اسد اللہ وانی)

بقا اور سالمیت پنہاں ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے افسانوی ادب میں گذشتہ دس برسوں میں کافی قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ متذکرہ نوجوان اور بعض بزرگ اور کہنہ مشق افسانہ نگاروں کے ساتھ مل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے قلم کی سیاہی خشک نہیں ہونے دی ہے بلکہ حالات و واقعات تجربات و مشاہدات اور ترسیل و ابلاغ کے اس اژدھام میں انہوں نے اپنے اشہب قلم کی جولانیاں اور تیز کر دی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کشمیری لال ذاکر نے 'تین بیڑوں والا مکان' تیج بہادر بھان نے 'یہ اولے یہ رجحان' نور شاہ نے 'گیلے پتھروں کی مہک' 'دوسرے شوہر کی خوابگاہ' 'پل صراط' موہن یاور نے 'میرے ... ت کی لاش' 'صندلی گلی کے موڑ پر' پشکر ناتھ نے 'غبارے رنگ برنگے' 'پل نمبر صفر کے گدھ' موالی نشوری منجندہ نے 'سکون کا کرب' 'یادوں کا دھواں' سرا، ڈی۔ کے کنول نے 'روپ بہروپ' مالک رام آنند نے 'الٹی گنگا' عمر مجید نے 'شہر کا اغوا' 'جب راستے الجھ جاتے ہیں' 'سب سے بڑا غم' ڈاکٹر بشیر گاش نے 'شکست' دیویندر پٹواری نے 'فرشتے خاموش ہیں' 'ڈرپوک' 'وہ عورت' 'وقت وقت' ڈاکٹر ظہور الدین نے 'اوڈی سوز' 'کینی بلز' 'ٹوٹے شیشے کا کرب' شمس الدین شمیم نے 'مسلسل سفر' 'میزان حسن' 'ہونے' 'حالات کی ضرب' خالد حسین[1] نے 'ٹھنڈی کانگڑی' 'کھوکھلا سورج' 'گوری فصل کے سوداگر' 'سورج کا گیت' جیسے افسانے لکھ کر ان میں سیاسی بحران، نفسیاتی کشمکش، اخلاقی قدروں کا فقدان، سماجی اور معاشی مسائل اور جنسی بے راہ روی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان میں سے بہت سے افسانے فن اور اسلوب کے لحاظ سے علامتی اور تمثیلی ہیں اور کچھ افسانے فنی تجربے کے اعتبار سے بھی ایک قابل قدر اضافہ ہیں جن میں سے ڈاکٹر ظہور الدین کے طویل افسانے اوڈی سوز کا ذکر کرنا

---

[1] خالد حسین ریاست جموں و کشمیر کے ایک بلند قامت پنجابی ادیب ہیں۔ پنجابی میں ان کی کہانیوں کے مجموعے 'تے جہلم وگدا رہیا' نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ انہوں نے چند برسوں سے اردو میں بھی لکھنا شروع کیا اور کچھ اپنے پنجابی مجموعے سے ترجمہ اور کچھ نئی کہانیاں لکھ کر 'ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں' کے عنوان سے اردو مجموعہ شائع کیا۔ زبان کا جو چٹخارہ اور اسلوب ان کی پنجابی کہانیوں میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ وہ اردو میں بہت کم ہے۔

دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ اپنی طرح کا اُردو ادب میں ایک نیا تجربہ ہے جس کو انجام تک پہنچانے میں افسانہ نگار آزاد منظوم لہجے میں شعور کی رَو سرریلزم اور اشاریت سے بہت زیادہ مدد لی ہے۔ پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، کشمیری لال ذاکر اور موہن یاور کے افسانوں میں فن اور تجربہ کی پختگی اور مشاہدے کی گہرائی کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ خصوصاً پشکر ناتھ کے افسانہ "پل منزل سفر کے گدھ" بڑے معرکے کا افسانہ ہے۔ نور شاہ کے افسانوی مجموعہ "گیلے پتھروں کی مہک" میں انداز تو وہی پرانا ہے البتہ نئے جنسی تجربات کی فضا اپنی پوری قوت کے ساتھ حاوی ملتی ہے۔

جموں و کشمیر میں اُردو افسانے کا مستقبل بڑا تابناک دکھائی دیتا ہے کیونکہ اس صنف ادب میں جدید فنی تقاضوں اور نئے رجحانات و میلانات کو مدنظر رکھ کر کہنہ مشق افسانہ نویسوں کے ساتھ ساتھ نوجوان افسانہ نگاروں کی جو پود آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے انہوں نے اپنی خورد سالی کے باوجود ملک گیر پیمانے پر اپنے زورِ قلم سے قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی ہے اور یہ ریاست میں اُردو افسانہ نگاری کے ایک خوش آئند مستقبل کی علامت ہے۔ نوجوان افسانہ نگار جن کا ذکر اس سے پہلے صفحات میں آچکا ہے ان میں سے انیس ہمدانی، آنند لہر، غلام رسول آزاد، عبدالرشید فراق، نیلم نذر، مشتاق مہدی، زاہد مختار، اشوک پٹواری، اظہر نعیم احمد، دلکش مقبول، مقبول احمد، کرشن لال بھوشن، فاروق رینزو، خالد بشیر کے ساتھ ساتھ محمد شریف، دانش جاوید آذر کے، ڈی مینی، ہمراہ کشمیری، ایوب شبنم، اشرف آثاری، مطربہ معصوم، تمنا منشی، ڈاکٹر عبدالمجید، عبدالرحیم مغل، زینت فردوس، نزہت، واجدہ تبسم (سرینگر)، غلام نبی شاہد، ریاض معصوم قریشی، ایس ایم قمر، وحشی سعید، ساحل، حمید اللہ بٹ، بیتاب بجے پوری، اور صوفی بشیر بشر سے کافی توقعات وابستہ ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں کا یہ قافلہ جس مستعدی اور شوق سے آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ افسانوی ادب کا شجر آئندہ برسوں میں کافی تناور ہوگا۔

---

[1] ہمراہ کشمیری کے دو افسانوی مجموعے "بکھرے الفاظ اور آوارہ احساس" شائع ہو چکے ہیں جنہیں وہ خود "افسانے" کہتے ہیں اور ایک مجموعے کا پیش لفظ اہندر ناتھ مشہور افسانہ نگار جوگیندر پال سے لکھوایا ہے مگر انہیں افسانہ کہنے کو جی نہیں مانتا کیونکہ ان میں سے بہت سے افسانے ایسے ہیں جو مختصر آزاد نظم سے بھی مختصر ہیں جو مثلاً "زندگی کاغذ کی ایک ناؤ جو آگ کے دریا میں بہتی ہے" پھر بھی تجربے کے طور پر ان کو پرکھا جاسکتا ہے۔

تمیر

ان افسانہ نگاروں کے افسانوں میں نئے رجحانات اور نئی فضا کی جیسی عکاسی ملتی ہے اور جیسا ان کے اسلوب کے تیکھا پن، لفظ و بیان کی دلکشی، واردات قلب کا اظہار، حقیقت و رومان کا حسین اور دلفریب امتزاج، مشاہدہ و فکر کی ہم آہنگی اور نفسیات کا فن کارانہ تحلیلی تجزیہ مطالعہ میں آتا ہے، وہ ایک روشن مستقبل کی نشاندہی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ کچھ افسانہ نگاروں کے ہاں زندگی کی پیچیدگیوں کا احساس پختہ نہیں ہے اور نو آموزی کی وجہ سے مشاہدہ بھی کچا ہے۔ اور کہیں کہیں جذبات کی رَو میں بہہ کر خطابت اور جذباتیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس سے انہیں بچنا چاہیئے۔ زبان و بیان کی لغزشوں سے بھی احتراز کرنا چاہیئے کیونکہ یہ خطہ اُردو کا ہوتے ہوئے بھی اُردو سے عاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ہر اُردو ادیب زبان و بیان کی غلطیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے نوجوان ادبا کو اس جانب خصوصی توجہ دینا چاہیئے۔

ایک اور بات جس کا ذکر کرنا یہاں پر ضروری ہے کہ عالمگیر پیمانے پر جو سائنسی، صنعتی، تیکنیکی، اٹمی اور علمی ترقی ہوئی ہے ہندوستان بھی اس میدان میں برابر آگے بڑھ رہا ہے اور اس سے پیدا شدہ پیچیدگیوں سے یہاں کا ہر ادیب اور فن کار متاثر ہوا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں ادبا نے جن انقلابی خیالات اور فکر و فن کے نئے رجحانات کو جنم دیا ہے اُردو افسانہ نے بھی اس کا اثر قبول کیا ہے چنانچہ اُردو میں جو نئی اسٹوری، علامتی اور تجریدی افسانے وجود میں آئے اور ملک گیر پیمانے پر جوگندر پال، بلراج مینرا، سریندر پرکاش، انتظار حسین، ممتاز مفتی، خالدہ حسین اور رشید امجد نے جو بغیر پلاٹ اور کردار کے تاثراتی افسانے لکھے ہیں۔ انہوں نے ان نوجوانوں کے ذہن کو اپنے تاثرات اور شدت کی وجہ سے ایک طرف جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے اور دوسری طرف بیکاری، بیروزگاری، جنسی بیراہ روی، اخلاقی اور سماجی قدروں کے انہدام نے ان میں بے چینی، نفسیاتی پیچیدگی، گھٹن اور زندگی سے فرار کا جو احساس پیدا کیا ہے۔ اسکی بدولت نوجوان نسل ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں سے اسے اپنے لئے راہ متعین کرنے میں بڑی دانشمندی اور ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ اس سلسلے میں میرا یقین واثق ہے کہ نوجوان افسانہ نگاروں کی یہ نئی پود اپنے مشاہدات و تجربات کا ہم آہنگی، جدید میلانات اور رجحانات کے حسین برتاؤ، علم و عمل کی یکسوئی، فن و ادب کی تکنیک سے آگاہی، اسلوب بیک کی پیروی میں انفرادیت، فکر و خیال کی آزادی، نفسیات و واردات قلب کے فن کارانہ تجزیوں اور دقت نظر اور وسعت مطالعہ کے سہارے آگے بڑھتے ہوئے ریاست میں فن افسانہ نگاری کو نئی جہتوں اور نئی منزلوں سے روشناس و ہمکنار کرانے میں نہ صرف کامیاب و کامران ہوگی بلکہ ایک تابناک و درخشندہ مستقبل کی امین و آئینہ دار بھی ہوگی۔ ●●

منیب الرحمٰن شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ریاست کی نئی اردو شاعری

سنسکرت اور فارسی کے بعد اردو تیسری غیر مقامی زبان ہے جس میں ریاستی ذہن نے اپنی ادبی صلاحیتوں کو ظاہر کیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو کے نہایت ذمہ دار اور سنجیدہ قسم کے نقاد اور مدیر ریاست کی ادبی کاوشوں کو پیہم نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس غفلت شعاری اور بے اعتنائی کی حد یہ ہے کہ اردو شاعری کے کسی تذکرے، کسی جائزے یا کسی خاکے میں ریاست کے ہونہار اور باصلاحیت شعراء کا دور دور تک پتہ نہیں ملتا ہے۔ تاہم یہ بات اس سلسلے میں قابل تعریف اور خوش گوار ہے کہ چند رسائل نے جن میں شب خون الہ آباد سر فہرست ہے، ریاستی شعراء کی اشاعت کی ابتداء کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ریاستی شعراء کی زیادہ سے زیادہ اشاعت سے یہ بات واضح ہو گی کہ ریاست کی نئی نسل اردو شعر کی تخلیق میں امتیاز و انفرادیت کا بے مثال مظاہرہ کر رہی ہے۔

ریاست میں اردو شاعری کی ابتداء آزادی کے آس پاس ہوئی۔ واضح ہے کہ

[illegible]لی شاعری میں ان ہی شعری رجحانات کی نمائندگی ہوتی رہی جو ۱۹۴۷ء سے قبل اردو شاعری پر غالب تھے۔ شعراء کا رجحان زیادہ تر روایت اور تقلید کی طرف رہا جس کی وجہ سے خیالات اور منفرد اشعار کی کوئی بھی متوجہ کن تعداد تخلیق نہ ہو سکی۔ سیاسی بیداری، سماجی ذمہ داری، وطن پرستی، اقبال کی پیروی اور اشتراکی تصورات کی خوشامد نے شاعروں کی تخلیقی قوتوں کو پامال کر دیا۔ تاہم قلیل تعداد میں ایسے شعر دستیاب ہیں جو اپنے تخلیقی جوہر اور فنی تکمیلیت کی بدولت ریاست میں اردو شعر کی بنیادیں فراہم کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔

نئی شاعری کے سلسلے میں جس کی ابتداء ریاست میں ۱۹۶۵ء کے بعد ہوئی حامدی کاشمیری نے پیش رفت کی۔ روایتی اور رومانی شاعری سے کنارہ کش ہو کر انہوں نے موضوع اور اسلوب کو بے جا جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے نئے شعری تقاضوں کے مطابق کر دیا۔ حامدی کاشمیری کی شاعری نہ صرف اسلوب اور آہنگ کے لحاظ سے ایک نئی سمت اختیار کر گئی بلکہ ان کے موضوعات عصری تقاضوں کے پیش نظر زیادہ پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہو گئے ان کی شاعری میں ان تبدیلیوں کے نتیجے میں زبان و بیان کی چستی اور مناسب در و بست وجود میں آئے۔ حامدی کاشمیری کے ساتھ ساتھ اور ان کے تھوڑی دیر بعد اور بھی کئی ذہین شعراء نے اپنے طریقہ ہائے اظہار میں تبدیلیاں شروع کر دیں جن میں قیصر قلندر، عابد مناوری، فاروق نازکی، حکیم منظور، محمد یٰسین اور مظفر ایرج قابل فہرست ہیں۔ فوراً بعد ایک نئی پود سامنے آنے لگی جس نے اس نئے شعری رجحان کو ریاست میں نمایاں اور مستحکم کر دیا۔ ان شعراء میں شجاع سلطان، اشرف ساحل، عابدہ احمد، فاروق مضطر، پرتپال سنگھ بے تاب، غلام محمد آجز، شہباز راجوروی، رفیق راز، اقبال فہیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ریاست کی نئی اردو شاعری کے نمائندہ شعراء کی فہرست میں حامدی کاشمیری سب سے آگے ہیں۔ وہ منفرد اسلوب جو انہوں نے اپنے مجموعہ کلام "نایافت" کی غزلوں تک قائم کیا، پچھلے دو چار برسوں کی غزلوں سے جیسا کہ ظاہر ہے [illegible]

تعمیر

منفرد ہے۔ حامدی کاشمیری نہ صرف ریاست میں ممتاز شعری اسلوب رکھتے ہیں بلکہ وہ ملک بھر کے معدود شعراء میں مخصوص شعری اظہار کی نسبت سے کافی نمایاں ہیں۔ ان کے موضوعات کسی نئے شاعر سے مختلف نہیں جس فرق صرف ان موضوعات کی نسبت ان کے شعری رویے کا ہے۔ حامدی کاشمیری اپنے شعروں میں طلسمی صورت حال تخلیق کرنے کے قائل ہیں۔ اس شعری انفرادیت میں ان کو اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ حامدی کاشمیری پیکر تراشی اور استعاراتی اظہار کے روا دار ہیں۔ یہی الفاظ مثلاً برف، وادی، پہاڑ، سنگ، شجر، سایہ، شعلہ، آسیب، دشت وغیرہ ان کی شاعری میں استعاراتی نظام قائم کرتے ہیں جس سے بحث فی الحال مقصود نہیں ہے۔ یہ اور اس نوعیت کے دیگر الفاظ حامدی کاشمیری کے مخصوص شعری رجحان اور فکر و احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں معنی الفاظ میں پوشیدہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس طلسمی فضا کے تراشیدہ ہوتے ہیں جو حامدی کاشمیری شعروں میں تخلیق کرنے کے روادار ہیں۔ تحیر ان کی تخلیق کردہ طلسمی دنیاؤں کا ایک اہم عنصر ہے۔ ان کی شاعری میں عصری انسانی صورت حال کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ عصری ماحول اور زندگی کی بے معنویت لاحاصلی اور بے خبری کا احساس ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔

پرندے اب کہاں دشت نوا ہیں
وہ لے آئیں گے زیر دام کس کو

کتنے سورج تھلوں میں اترے تھے
فصل انجم سمندروں میں نہیں

حامدی کاشمیری بصری پیکروں کا غالب استعمال کرتے ہیں۔ جن کی متقابل بندی سے ان کے اشعار میں معنی خیز منظر تخلیق ہوتا ہے۔ پیکروں کی متقابل بندی میں ان کا اچھوتا تخیل مستعد نظر آتا ہے۔ ان کے طلسم خانۂ شعر سے چند مثالیں یہ ہیں

تھے وہ درماندۂ شب جاگ کے پھر سوتے تھے
شہر ظلمات ہے کب اس میں سویرا ہوگا

تھے

گونجی دستک کی صدا میں نے دریچہ کھولا
سامنے تکتا ہوا راہ گذر تھا کوئی

میں کچھ خریدنے نکلا تھا، یہ بھی یاد نہیں
ہے یاد یہ کہ چکا چوند تھی دکانوں میں

لاکھ کہتے رہے اس دیس کا کچھ حال کہو
تکتے تھے چہروں کو آمادۂ گفتار نہ تھے

دکھا کے انگلیوں پہ رقص آفتابوں کا
مجھے اتار گئی وہ سیاہ خانوں میں

ہنس کے آنکھیں نکال کر دے دیں
دست خوں خوار سے مفر ہی نہ تھا

نکل آئے ہو تہہ خانوں سے آخر
کہو تم میں ہوا الہام کس کو

ظاہر ہے کہ حامدی کاشمیری کی شاعری عصری زندگی کی ستم سامانیوں کے شدید احساس کی روداد ہے۔ ان کی شاعری میں آسیب زندگی، نارسائی اور غیر یقینی کا ایک خرابہ آباد ہے۔ حامدی کاشمیری اپنے احساسات کی تخلیقی بازیافت اشعار میں مناسب لفظ و پیکر سے کرتے ہیں۔

تعمیر

حکیم منظور ریاست کے نئے شعراء کی پہلی ٹولی میں جن کا میں نے شروع میں ذکر کیا حامدیؔ
کاشمیری کے بعد سب سے نمایاں اور منفرد اظہار رکھتے ہیں۔ حکیم منظور کی غزلوں میں اظہار کو موثر
بنا دینے والی فکر و احساس کی تازگی اور اجنبیت نمایاں ہے۔ زبان و بیان میں خود روی کی
سی کیفیت ملتی ہے جس کی بدولت غزلوں میں سادگی اور سہولت کے عناصر نمو پذیر ہوتے ہیں
ان کی شاعری میں ایسے الفاظ کا وافر استعمال ہے جو سرزمین کشمیر کے مظاہر فطرت اور کلچر
سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قسم کی مقامی شناخت کئی شعراء کے زبان و بیان میں ملتی ہے جن میں
حامدی کاشمیری، شجاع سلطان، رفیق راز وغیرہ شامل ہیں۔ پتھر اور آئینہ، برف، پیڑ اور
ہوا، سورج، نقش اور رنگ وغیرہ الفاظ حکیم منظور کی شاعری کو استعاراتی وسعت سے
ہمکنار کرتے ہیں۔ جہاں حکیم منظور کے مجموعۂ کلام "ناتمام" میں انفرادیت کے کئی عناصر
تلاش کئے جا سکتے ہیں وہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بے گھری، احساس زیاں،
ستم زدگی اور استفہام ان شاعری کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

دے جو سکتا تھا کئی رنگ کئی موڑ اسے
وہی کردار کہاں میری کہانی سے گیا

ہمیں پہ ثبت ہے اک بوسہ جلتے سورج کا
ہمیں پہ سرخ سمندر کا وار ہونا ہے

خاموشیوں کے زرد تکلم کے ڈر سے وہ
اک ان سنی صدا کا طرفدار بن گیا

میں انفرادیت پسند ہوں [illegible] بھی
تمام ذات ہماؤں سے بنا ہوا ہوں میں

نہ کھوکھلا یہ کہیں ہو گیا ہو اندر سے
جمی ہوئی ہے عجب گرد سی سمندر پہ

حکیم منظور کی شعری انفرادیت کے عناصر کی نشاندہی اوپر دیئے گئے اشعار سے کی جا سکتی ہے یہ اشعار ان کے نئے احساس اور خوش اسلوبی کی بہترین مثالیں ہیں۔ البتہ حقیقت ہے کہ جہاں ان کے مجموعہ کلام "ناتمام" میں اس شعری تکمیلیت کے اشعار دستیاب ہیں وہاں بہت ہی سطحی اشعار بھی .... مل جاتے ہیں۔ کئی اشعار بناوٹی ہیں جو احساس اور جذبے سے عاری ہیں مثلاً شکست و ریخت اور [illegible] کے سلسلے میں ایک دو شعر یہاں

شکست و ریخت کے اس دور میں بھی منظور
نہیں یہ ہمت ہے جا کر آئینہ دیکھوں

منظور نہیں ہوں کوئی بے چہرہ میں لیکن
آئینے کا شرمندۂ احسان نہیں ہوں

یہ دونوں شعر بناوٹی ہیں اس لئے ان کو کلام موزوں کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

قیصر قلندر، فاروق نازکی اور عابد مناوری کا [illegible] اور روایتی شاعری کا سنگم پیش کرتی ہے۔ عابد مناوری کی بھی غزلیں [illegible] کی [illegible] کرتی ہیں لیکن ان کی زیادہ تر غزلوں اور اشعار میں روایتی طرز اظہار غالب ہے۔ قیصر قلندر کی

تعمیر

کی غزلوں میں [illegible] فاروق نازکی کی نظموں میں معاصر فکر اور حسیت کا اظہار بہتر تخلیقی سطح پر ہوا ہے۔ قیصر قلندر کی نظمیں [illegible] سے سمجھنے کی نہیں ہیں لیکن فاروق نازکی کی نئی نظموں کی پیکر تراشی [illegible] اور مترنم آہنگ تازہ کاری کا احساس دلاتے ہیں فاروق نازکی عصری [illegible] منتشر اور وقت اور ماحول کی جبریت کو ایک حساس فن کار کی طرح محسوس کرتے ہیں [illegible] کا اظہار اپنی نظموں میں آزادانہ طور پر کرتے ہیں۔ محمد یٰسین کی غزلوں میں ایک زخم خوردہ [illegible] کا دبا دبا احتجاج ہے۔ جو ان کی بلا آمیزش والی زبان سے احساس اور سچائی کی عکاسی کرتا ہے۔ [illegible] کی غزلوں میں غم، محرومی اور نامرادی کی داستان ہے ان کی شاعری عصری مسائل مثلاً [illegible] انسانی مسائل سے دوچار ہے۔ محمد یٰسین نے ادھر کچھ مختصر نظمیں بھی لکھی ہیں جو بہت [illegible] طرزِ اظہار رکھتی ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر اگرچہ سست رفتار ہے لیکن مثبت منزلوں کی طرف ہے۔ محمد یٰسین غزلوں میں متوازن زبان استعمال کرنے کے روادار ہیں۔ زبان کے سلسلے میں وہ زیادہ جدت سے کام نہیں لیتے ہیں ان کا ایک مجموعہ "شاخ [illegible]" بھی چھپ چکا ہے۔

منظر ایمچ کی عام نظمیں ان کی غزلوں کی نسبت قدرے زیادہ کامیاب ہیں اس لئے بھی کہ ان کی غزلوں میں نظموں کے برعکس زبان کہیں کہیں مصنوعی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی غزلیں غالباً فکر کا ہی نتیجہ ہیں اس لئے ان میں وہ روانی اور تازگی مفقود ہے جو ان کی نظموں کا خاصہ ہے۔ منظر ایمچ کی شاعری میں قدروں کی شکست و ریخت، خالی کر [illegible] مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کو خدا اور آسمانی ہدایات کی ضرورت کا شدید احساس ہے جو ان کی بیشتر نظموں سے ظاہر ہے۔ منظر ایمچ ریاست کے [illegible] ایک [illegible] حیثیت رکھتے ہیں۔ جن شعراء کا اب تک ذکر ہوا ان

کے کلام سے چند مثالیں درج ہیں -

ہر سانس سے ڈر لگتا ہے سناٹا ہے ایسا
لمحوں کی یہ کٹتی ہوئی زنجیر ہلا دوں
(قیصر قلندر)

گھروں سے لوگ نکل کر کہاں گئے عابدؔ
تمام شہر میں ہیں قفل کیوں مکانوں پہ
(عابد مناوری)

شہر خموشی کے شہزادے چپ کا کوئی گیت سنا دے
لفظوں کو آزاد کرا دے معنی کی دیوار گرا دے
بستی بستی آگ لگا دے دریا دریا خون بہا دے
(فہیدہ فاروق نانکی)

اک دھوپ کی جادو گری ہے پانی پر نقش بناتی ہے
دیکھو تو یہ دنیا سب کچھ ہے سوچو تو یہ دنیا کچھ بھی نہیں
(صمد لیسین)

خدا جانے
میں کتنے بے گنہ لمحے
فلک سے تا زمیں بکھرے ہوئے
مریخ سے آئے ہوئے عفریت کے منہ میں
بعد عجز و ادب
انڈیل دیتا ہوں (سرگوشیوں کا لمس ـــ مظفر ایرج)

تغیر

جن شعراء کا اب تک ذکر ہوا اور جن کا ذکر آگے آئے گا، ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح
ہو جاتی ہے کہ جو ہم اسلوبی اور یکسانیت بیرونِ ریاست کے نئے اور نوجوان شعراء میں پائی جاتی
ہے وہ ریاست کے شعراء میں کم اور بہت کم پائی جاتی ہے۔ ریاست کے ہر نمائندہ شاعر کا اسلوبِ
اظہار منفرد ہے یا انفرادیت کی طرف معروف سفر ہے۔ ریاست کے نوجوان شعراء تخلیقی
صلاحیتوں سے مالا مال ہیں نئی حسیت اور عصری آگہی کا اظہار ان کے اشعار میں زبان و
بیان کے نئے پن اور لہجے کی تازگی کے ساتھ، فنی تنظیم اور دیگر نزاکتوں کے شعور کے ساتھ
ہوتا ہے۔ شروع میں میں نے ان شعراء کے نام لئے ہیں جو نئے ریاستی شعراء کی پہلی ٹولی کے بعد
سامنے آنے لگے۔ اس مقام پر چند ناموں کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں جو یکے بعد دیگرے سامنے
آ کر شعری سفر میں شریک ہوئے۔ نام یہ ہیں: احمد شناس، مسعود سامون، شبیب رضوی،
ریحانہ جبین، فاروق آفاق، سید رضا، خالد بشیر، راز مناوری، ح عامر، رفیق ہمراز،
جاوید آذر وغیرہ۔ ریاست کے تمام نئے اردو شاعروں میں سے صرف سات شعراء نے
اپنے مجموعے چھاپ دیے ہیں۔ یہ شعراء ہیں حامدی کاشمیری، حکیم منظور، عابد مناوری،
محمد یٰسین، پرتپال سنگھ بے تاب، اقبال فہیم اور خالد بشیر۔ ریاست کے نئے شعراء کی
تخلیقات تو ریاستی رسائل میں آتی ہی رہتی ہیں۔ بیرون ریاست کے رسائل میں صرف چند
لوگوں کی تخلیقات چھپ چکی ہیں۔ مثلاً شب خون الہ آباد نے اب تک ریاست کے نئے
شاعروں میں سے حامدی کاشمیری، قیصر قلندر، شجاع سلطان، عابدہ احمد، فاروق مضطر،
رفیق راز، پرتپال سنگھ بیتاب، اقبال فہیم، مسعود سامون، ح عامر اور منیب الرحمان
کی تخلیقات چھاپی ہیں۔ چونکہ اکثر ریاستی شعراء کے مجموعے نہیں چھپ چکے ہیں اس لئے
ان پر کچھ لکھنے میں بہت دشواریاں پیش آئی ہیں تاہم میں نے ان کی شاعری پر جو بات

تعمیم

کرنا چاہتی ہے اس کے لئے رسائل میں شائع شدہ تخلیقات ہی کی طرف رجوع کیا ہے۔ سب سے پہلے میں ریاست کی نئی اردو شاعری کے دو اور نمائندہ شعراء پر بات کرنا چاہوں گا۔ شجاع سلطان اور رفیق راز۔ شجاع سلطان اور رفیق راز ریاست کی نئی اردو شاعری کے چند معتبر شعراء میں شامل ہیں۔ دونوں نے اگرچہ زیادہ تعداد میں غزلیں نہیں کہی ہیں تاہم کیفیت کے لحاظ سے ان کی شاعری بہت آگے ہے ۔

شجاع سلطان کی غزلوں کے مطالعے سے سب سے پہلے جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے اشعار میں زبان کا غیر پیچیدہ استعمال ہوتا ہے۔ اور ان کے استعارہ و پیکر بھی غیر ضروری طور پر مبہم نہیں ہوتے ہیں۔ معنوی اعتبار سے بھی ان کی شاعری میں پیچیدگی کے بجائے وسعت ملتی ہے۔ انہیں عقائد اور قدروں کے کھوکھلے پن کا احساس ہے جو ان کی شاعری میں طرح طرح کے لفظ و پیکر میں اظہار پاتا ہے ۔

رنگ، خوشبو، یاد، سائے، خواب سب کے سب سراب
اب تو بس کافی ہے صحراؤں کے منظر دیکھنا

شجاع سلطان کی غزلوں کا ایک غالب موضوع ہے : رشتوں کی بے معنویت عصری ماحول میں جہاں نزدیک سے نزدیک رشتے بھی ٹوٹ چکے ہیں۔ جس کے نتیجے میں آج کا حساس فرد نا آشنائی کے کرب سے دوچار ہے۔ یہ کرب اور یہ احساس شجاع سلطان کی شاعری کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کے شعروں کو کربلا اور تجسس کی منزلوں تک لے آتے ہیں۔

آشنا ڈھونڈیں کوئی نقشِ صدا کا ڈھونڈیں
خود سے ملتا ہوا بازار میں چہرا ڈھونڈیں

خلاء میں، دشت میں، سڑکوں پہ تیرہ سالوں میں
کہاں تلاش کریں خود کو اتنے چہروں میں

شجاع سلطان کی شاعری کی ایک اور خصوصیت فکر و جذبہ اور لفظ و آہنگ کی وحدت اور ہم آہنگی ہے۔ ان کے اشعار میں غیر ضروری الفاظ یا خیالات کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہ خصوصیت اس وجہ سے آئی ہے کہ وہ اپنے احساسات اور تجربات کا براہ راست اظہار نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کو تخلیقی عمل کی میزان سے گذار کر ہی سامنے لاتے ہیں۔ شجاع سلطان الفاظ کا نہایت ہی صاف ستھرا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے منفرد اندازِ شعر کی جھلک مندرجہ ذیل شعروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

زمانہ بیت گیا راستوں نے سوچا تھا
وہ آئے گا تو کچھ اک سنگ ہی ہٹا دے گا

ہم ایسے شعلہ بکف سوچتے رہے اکثر
گریں جو گھر پہ وہ چنگاریاں کہاں کی تھیں

اُسی کے ذکر سے روشن ہیں بام و در اپنے
اگر سنے گا تو سب روشنی بجھا دے گا

آنکھ میں کل کی شکست عکس کا منظر لے
آئینہ سب ڈھونڈتے ہیں ہاتھ میں پتھر لئے

رفیق راز کی شاعری متضاد طلسمی پیکروں کا اجتماع ہے۔ شعری ارتکاز ان کے شعروں کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ الفاظ کی دروبست سے ان کی قوت تخلیق کا اندازہ ہوتا ہے۔ رفیق راز کا رجحان مشکل پسندی کی طرف ہے جو ان کی پیچیدہ پیکر تراشی اور فارسی تراکیب کے غالب استعمال سے نمایاں ہے۔ ان کی شاعری کا غالب موضوع ہے۔ احساس فنا۔ یہ احساس فنا شاید تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا پیدا کردہ ہے۔ جدید دور میں حساس افراد کو جس غیر یقینی غیر معقولیت اور بے چینی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا بھی اس احساس فنا میں بڑا دخل ہو سکتا ہے۔

ابر بردوش پہاڑوں سے اتر آئے تھے
ہم کہ پھر برق فنا ہی کو نظر آئے تھے

دیوار و در سے ٹپکے یونہی قطرہ قطرہ زہر
سوئے ہوؤں پہ موت کا سایہ پڑا ہے

بے حس کے رہ گئے تھے جناب رفیق راز
وہ بھی شرار وادی برق فنا ہوئے

یہیں پہ ہم نے بجھائے تھے آفتاب کئی
یہیں پہ ہوگا ہمارا بھی خاتمہ بابا

تعمیر

رفیق راز کی غزل ریاست کی نمائندہ شاعری کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے ان کی غزل ملک بھر کے شعری تناظر میں اپنے منفرد عناصر کی نسبت سے نمایاں ہے۔ ان کے اظہار میں بڑی قوت اور تازگی ہے۔ الفاظ کا استعمال ان کی شاعری میں نئے تلازمات پیدا کرتا ہے۔ رفیق راز کے شعری اسلوب کی نشاندہی ان اشعار سے کی جاسکتی ہے۔

بولے تو اک سکوت کے شعلے نے ڈس لیا
لب سی لیے تو وادیٔ شہر صدا ہوئے

تم کہ برفیلی گپھاؤں میں کہیں بھی نہ ملے
ہم کہ مٹھی میں لیے شمس و قمر آئے تھے

زہریلی آندھیوں کے عجیب ساز بج اٹھے
گرتے ہوئے مکان بھی نغمہ سرا ہوئے

گہرے سیاہ خوف میں لپٹا ہوا یہ شخص
ان دیویوں کے بیچ میں کب تک کھڑا رہے

ساحلی لوگ انہیں روزنوں سے تکتے رہے
لکھ کے موجوں پہ وہ روداد سفر آئے تھے

اشرف ساحل کی شاعری لطیف اور نازک پیکروں سے وجود میں آتی ہے۔ ان کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ماورائیت کی طرف لے جاتی ہے۔ ان کی شاعری کے موضوع ہیں فرد کے اندر کا انتشار اور اس کے نتیجے میں جو اثرات ظاہری وجود پر پڑتے ہیں۔ اشرف ساحل کی شاعری میں لفظ و پیکر کا استعمال اس قدر منفرد ہے کہ ان کی شاعری دور سے پہچانی جا سکتی ہے۔ انہوں نے غزلیں اور نظمیں برابر فنی اور تخلیقی قدرت سے کہی ہیں۔ ظام محمد آبو غزلوں سے زیادہ نظموں میں ہی کامیاب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اساطیر کا استعمال اپنی نظموں میں بڑی موزونیت سے کیا ہے۔ ان کی نظمیں ان کی غزلوں کے مقابلے میں فکری بلندی کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ بہرحال چند تازہ غزلوں سے بھی ان کی فنی قدرت اور عصری شعور کا پتہ چلتا ہے۔ عابدہ احمد کی مختصر نظمیں اور غزلیں نیم مبہم پیکر تراشی سے وجود میں آتی ہیں، وہ ان کی شعری انفرادیت کا حصہ ہے۔ ان کا نسوانی لہجہ بھی ظاہر ہے پرتپال سنگھ بیتاب بھی منفرد اسلوب شعر کی بشارت اپنی نظموں اور غزلوں میں الگ الگ طور پر دیتے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام "پیش خیمہ" سے ظاہر ہے کہ وہ الفاظ کی نئی معنوی جہتیں اپنے تجربات اور احساسات کے تناظر میں تلاش کرتے ہیں۔ فاروق مضطر کی شاعری جدید دور کی پیدا کردہ الجھنوں اور خوف و تردد کی داستان ہے۔ فاروق مضطر کی غزلیں بہت دنوں سے دیکھنے کو نہیں ملی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی شاعری جو غزل پر مشتمل ہے ریاست کی نمائندہ شاعری میں شمار کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے تجربات اور احساسات کا اظہار مناسب اور موزوں پیرائے میں کرتے ہیں۔ اقبال فہیم غزل اور نظم دونوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور منفرد اسلوب کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری سے فلسفیانہ انداز فکر ظاہر ہے۔ فکر اور تجسس ان کی کئی نظموں میں بنیادی عناصر کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کی اکثر غزلوں

تعمیر

اور نظموں میں خوابوں اور حقیقتوں کا ٹکراؤ ملتا ہے - ان کا مجموعۂ کلام "سنگ بر آب" ایک سوچتے ہوئے محسوس کرتے ہوئے ذہن کے اظہار کا بہترین نمونہ ہے - شہباز راجوروی کی غزلوں میں ان کے نیم واضح اور نیم مبہم تجربات کا اظہار ملتا ہے ان کی زبان ان کے تجربات اور احساسات کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے - شہباز راجوروی عصری زندگی کی تمام الجھنوں سے واقف ہیں اور ان کا اظہار ان کی شاعری میں تخلیقی سطح پر ہوتا ہے - متذکرہ شعراء کے کلام سے مثالیں مختصراً پیش ہیں :-

کوئی میرا جسم کر جائے سیاہ[٣]
منتظر میں صورت قرطاس ہوں

(اشرف ساحل)

پھر اتر جاؤں گا اپنی خامشی کے غار میں
اور اندر گونج کر باہر بھٹکائے گا مجھے

(غلام قدر آجر)

ساحلی شام آ
دیکھ تیرے لئے
نرم ریت کی چاپ پر
کوئی سپولا ہے کیا
تم لیٹی ہو یا (معلق جھونپڑے کے بیچ نظم - عابدہ احمد)

تعمیر

میں ڈوب جاؤں کہ ابھروں یہ مجھ پہ چھوڑ دیا
دیا ہے اس نے فقط بحرِ بیکراں مجھے
(سرنپال سنگھ بے تاب)

گھر میں بھی بھر چلا ہے سمندر سکوت کا
بے چارگی کی چھت پہ کھڑا چیختا ہوں میں
(فاروق مضطر)

وہ جن کے چہرے نہیں روشنی سے بھاگیں گے
میں آئینوں میں رہا ہوں مرا تو چہرہ ہے
(اقبال فہیم)

اتنے چہروں نے مجھے نوچ لیا ہے اب کے
کس کو ڈھونڈوں میں کسے اپنا شناسا لکھوں
(شہباز راجوروی)

تازہ ترین ریاستی اردو شعراء میں فاروق آفاق نمایاں اور منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ انہیں دوسرے شعراء کے مقابلے میں زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ فاروق آفاق کا شعری اسلوب نئی منزلوں کا پتہ دیتا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چراتے نہیں ہیں بلکہ ان کو عریاں دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہوا چلے تو کھلے جسم کی حقیقت بھی
کہاں تلک یہ رہِ شوق کا غبار چلے

فاروق آفاق کی شاعری میں جدید دور اور زندگی کے کئی مسائل اپنا اظہار پاتے ہیں۔

تعمیر

وہ اپنے گرد و پیش سے اپنے تجربات حاصل کرتے ہیں۔ موجودہ دور کا سیاسی انتشار بھی ان کے شعر کا ایک موضوع ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے منفرد اور نئے انداز سے شعر کہے ہیں

پیچھے پلٹ کے دیکھتا ہوں مشتعل ہجوم
آگے کہ بند ہوتی دکانوں کا سلسلہ

معمار ایسا کہ اطراف کا سراغ نہیں
کہ جلسہ گاہ تلک شال قطار سے چلے

فاروق آفاق کی شاعری کا ایک اہم پہلو طنز کا ہے - اس پہلو کی وجہ سے ان کی غزلوں میں معنوی تہہ داری وجود میں آتی ہے - ان کی شعری انفرادیت کی نشاندہی مندرجہ ذیل اشعار سے ہو سکتی ہے - ان کا اسلوب شعر جیسا کہ ان اشعار سے معلوم ہوگا بظاہر آسان اور سطحی نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ان کے اشعار کی تہوں میں منفرد معنی کے طوفان موجزن ہوتے ہیں -

پانی ہوا اور دھوپ سے محروم رہی ہے
دھاگوں کے سہارے یہ امر بیل کھڑی ہے

گذر گئی وہ ابھر کر مثالِ موج ہوا
جھکا بھی میں تو کسی شاخِ منحنی کی طرح

ہو چکا میں روزن شب کا اسیر
دو قدم پر دن کا روشندان تھا

دیگر شعراء جو اپنی تخلیقی قوتوں اور زبان و بیان کی تازگی کا پتہ دیتے ہیں ان کے کلام سے مثالیں پیش ہیں۔ ان شعراء کی شاعری پر بحث کرنا اس وقت ممکن نہیں ہے میں نے اس مقالے میں کوشش کی ہے کہ ریاستی شعراء کی ہر ٹولی کے چند نمائندہ شعراء کی شاعری پر تھوڑی بات ہو۔

بہر حال تازہ ترین شعرا میں احمد شناس، مسعود ساموں، سید رضا، رخسانہ جبیں اور خالد بشیر کی شاعری امکانات سے بھری ہے۔ خالد بشیر کی شاعری جیسا کہ ان کے مجموعہ کلام "صدائے نیم شب" سے ظاہر ہے، ایک متوازن لہجے کی شاعری ہے۔ باقی تمام شعراء شعری تجربات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ مثالیں درج ہیں۔

غبار ہو جائیں گے سبھی مرحلے سفر کے
غبار پھر سامنے کھڑا کوہ قاف ہوگا

(احمد شناس)

کوئی معکوس سا کردار ہے مجھ میں پنہاں
فیصلے دونوں طرف اپنے ہی اندر کرتا

(مسعود ساموں)

رہ گئے آنکھ میں سب دل میں نہ اترا کوئی
لوگ اس کو بھی سمجھتے ہیں عجوبہ کوئی

(سید رضا)

بر

اُداسیوں کے سیّہ جنگلوں سے گذری ہے
مرے دریچے کی یہ روشنی مبدا ہی لکھو

(رخسانہ جبیں)

کوئی لفظ کہنے کی فرصت نہ تھی
زبانوں کے ذمّے بڑا کام تھا

(خالد بشیر)

زرخیز ساعتوں کے تھرکتے لبوں پہ ہم
دشتِ طلب میں وادیٔ ظلمات سے آگے

(رفیق ہمراز)

اونچی فصیل کر کے مرے گرد اور بھی
دیکھو وہ دوڑتا ہوا اٹّھی گذر گیا

(جاوید آذر)

جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نئی نسل کے امکانات

جموں و کشمیر، ہندوستان کی وہ واحد ریاست ہے جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے اور جو اس ریاست کے تین خطوں جموں، کشمیر اور لداخ کے درمیان رابطے کی زبان ہے۔ اس ریاست میں کئی زبانیں اور بولیاں عام بول چال میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنا الگ ادب بھی رکھتی ہیں۔ کشمیری اور ڈوگری کو ساہتیہ اکیڈیمی نے باقاعدہ ادبی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے اور ان زبانوں میں شائع شدہ کتابیں ساہتیہ اکیڈیمی کے انعام کی مستحق قرار پاتی ہیں۔ اس ریاست میں کئی علاقائی زبانیں ہیں، لیکن الگ الگ خطوں اور علاقوں کے درمیان اردو کی حیثیت ایک پل کی ہے۔ دفتری اور عدالتی معاملات میں ہی نہیں، ہر چند کہ اس سے نظم و نسق، معاشی اور روزگار کے مسائل وابستہ ہیں، بلکہ یہ خیالات و جذبات کے باہمی اظہار کا بھی واحد ذریعہ ہے۔

کشمیر فارسی زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ غنی کاشمیری وہ یکتا شاعر تھا جسے اہل ایران نے بھی سر آنکھوں پر بٹھایا۔ کشمیری پنڈتوں کا فارسی زبان سے شغف اور عالمانہ شعور تمام ملک میں تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ [illegible] کے تعمیر

کلاسیکی شعر و ادب سے آگاہی، اردو زبان میں لکھنے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اور سرزمین کشمیر سے اردو زبان کے کئی قابل قدر ادیب اور شاعر نمایاں ہوئے محمد دین فوق، حامد جوانی، شہ زور کاشمیری، غلام رسول نازکی، دینا ناتھ مست، کمال الدین شیدا طالب کاشمیری، پریم ناتھ پردیسی، رامانند ساگر، پریم ناتھ در، پروفیسر محمود ہاشمی وغیرہ کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ یہ وہ شاعر اور ادیب ہیں جن کی نگارشات متحدہ ہندوستان کے بعض اہم رسائل میں شائع ہوا کرتی تھیں اور جن سے ریاست کشمیر کے لکھنے والے ملک گیر سطح پر متعارف تھے۔ ان میں سے کئی لکھنے والے تقسیم ہند کے بعد بھی ملک کے معتبر رسالوں میں نظر آتے رہے۔ کچھ اور نئے نام آسمان ادب پر تاروں کی طرح جھلملانے لگے تھے۔ دینا ناتھ نادم، قیصر قلندر، رحمن راہی، امین کامل، اختر محی الدین، علی محمد لون، سوم ناتھ زتشی، غلام رسول سنتوش، حامدی کاشمیری، موہن یاور، پشکر ناتھ، ٹھاکر پونچھی، اکبر لداخی، عرش صہبائی نور شاہ وغیرہ۔

تقسیم کے بعد پنجاب کا وہ حصہ جو اردو کے بہترین رسالوں کا مامن تھا ہندوستان سے کٹ گیا۔ کشمیر کے لکھنے والے عام طور پر انہی رسائل میں نظر آتے تھے۔ تقسیم کے فوراً بعد ہندوستان میں اردو خود کسمپرسی کا شکار ہو گئی۔ علاقائی زبانوں کی ترویج و اشاعت پر زور دیا جانے لگا۔ وادی کشمیر میں کشمیری زبان کا احیا ہوا۔ اور کئی لکھنے والے جو اردو ادب میں آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا رہے تھے، پورے طور پر کشمیری کے ہو رہے۔ کشمیری زبان کا علاقہ محدود سہی لیکن اس محدود دائرے میں ان شاعروں اور ادیبوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور وہ جائز طور پر نہ صرف ساہتیہ اکیڈمی کے بلکہ دوسرے انعام و اعزاز کے بھی مستحق قرار پائے۔ کشمیری زبان و ادب کے فروغ میں ریڈیو کشمیر، کلچرل اکادمی اور ریاستی حکومت کا بالخصوص ہاتھ رہا۔ دینا ناتھ نادم، رحمن راہی، امین کامل، اختر محی الدین، علی محمد لون

سوم ناتھ زتشی، غلام رسول سنتوش وغیرہ اردو کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے پہچانے نہیں جاتے۔ اور کشمیری ادب میں انہیں غیر فانی مقام حاصل ہے۔ لیکن ایسے لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی، جو اپنی شہرت کو صرف کشمیر، یا صرف جموں تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ مقابلہ سخت تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں اردو کے لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ میں انہیں اپنی شناخت کرانی تھی۔ انہوں نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اردو کے وہ علاقے، جو اپنے آپ کو اہلِ زبان تسلیم کرانے پر مصر رہے، انہوں نے ریاست جموں و کشمیر کے اردو لکھنے والوں کے ساتھ اعلیٰ ظرفی کا ثبوت نہیں دیا۔ اور ان کی وہ پذیرائی نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ بہار، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، تامل ناڈو، وغیرہ کے اردو لکھنے والوں کے ساتھ بھی عرصے تک اچھوتوں کا سا برتاؤ ہوتا رہا ہے۔ جموں اور کشمیر کے اردو لکھنے والوں کا اس رویہ سے دل برداشتہ ہونا فطری ہے، لیکن کچھ لوگ پتھروں کو کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے کی ہمت کرتے رہتے ہیں۔ ایسی شخصیتوں میں سب سے اہم نام حامدی کاشمیری کا ہے۔ حامدی نے بھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے چند ایک غزلیں کشمیری زبان میں لکھی ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو اردو کے ادیب کی حیثیت سے ہی ..... منوایا ہے۔ آخر فیض اور احمد ندیم قاسمی نے بھی کچھ چیزیں پنجابی میں لکھی ہیں۔ ایسے کئی شعراء ہیں جو اردو اور پنجابی دونوں میں لکھتے ہیں۔ اس لئے اگر کشمیر میں بھی کچھ شعراء اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں لکھیں تو اس پر کسی کے معترض ہونے کا کیا جواز ہے!

کشمیری ایک ترقی پذیر زبان ہے اور اردو ایک ترقی یافتہ زبان۔ ہندوستان اور پاکستان کا کوئی ادیب اگر مثال کے طور پر انگریزی میں لکھتا ہے تو وہ بین الاقوامی شہرت پاتا ہے۔ ہندوستان یا پاکستان کے کسی علاقے اور خطے کا کوئی ادیب [illegible] لکھتا ہے۔

لیکن

تو اس کی شناخت پورے برصغیر میں ہوجاتی ہے۔ یہ مقابلہ سخت ہے لیکن دلِ ناتواں کا
امتحان تو سخت مقابلوں میں ہی ہوتا ہے۔ اپنی مادری اور علاقائی زبان میں اظہار
فطری ہے اور اس لئے نسبتاً آسان، کسب و ریاض سے حاصل کی ہوئی زبان میں
اظہار کرنا زیادہ محنت طلب ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، اس محنت طلب ریاضِ فن سے عہدہ برآ ہونے کا
فرض جموں وکشمیر کی نئی نسل کے ادیبوں میں حامدی کاشمیری نے بحسن خوبی ادا کیا ہے۔ اگر
نئی نسل سے مراد وہ نسل ہے جس نے گذشتہ دس پندرہ سال کے دوران لکھنے لکھانے کا سلسلہ
شروع کیا ہے، تو ظاہر ہے حامدی کا شمار نئی نسل میں نہیں ہوگا لیکن اگر جموں وکشمیر کی نئی
نسل وہ نسل ہے جس نے جدید عصری حسیت اور نئے مزاج کو سب سے پہلے قبول کیا تو پھر یہ نئی
نسل، حامدی کاشمیری سے شروع ہوتی ہے۔ ہمدم کاشمیری، ہرچند حامدی سے قبل ہی نئے
مزاج سے آشنا ہو چکے تھے لیکن وہ شعر و ادب کی راہ میں ثابت قدم نہیں رہے اور
اس لئے ان کے نام اور کام سے کم ہی لوگ آشنا ہیں۔ البتہ حکیم منظور کا نام یہاں لینا مناسب
ہوگا۔ وہ عمر میں حامدی کاشمیری سے چھوٹے ہیں۔ لیکن جہاں تک نئے مزاج کو قبول کرنے
کا سوال ہے حکیم منظور اور حامدی کاشمیری ہم عمر ہیں۔ حامدی کا دائرہ کار وسیع ہے، میں اُن
کے افسانوں اور ناولوں کا ذکر نہیں کروں گا کیونکہ یہ اُن کی ابتدائی دور کی کاوشیں ہیں
اور ایک رومانی مزاج کی تخلیق ہیں۔ البتہ گذشتہ سولہ سترہ سال کے دوران ان کی شاعری
نئے رویوں کی ہم قدم رہی ہے، اسی دوران انہوں نے اپنی تنقیدوں کے ذریعے بھی نئے
ادبی مزاج کو تقویت بخشی اور ادب کو خالص ادبی نقطۂ نظر سے پرکھنے کی کوشش کی۔
ان کی نظموں اور غزلوں میں حسی اور بصری پیکروں کی بعض خوبصورت مثالیں ملتی ہیں
حامدی کاشمیری پوری ادبی دنیا میں معروف ہیں۔ ان کے تنقیدی خیالات جو ان میں

تعمیر

پیش کیے جاتے ہیں اور اردو کی نئی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے کلام سے بھی مثالیں دی جاتی ہیں۔

ریاست کے دوسرے معروف شاعر حکیم منظور ہیں۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو غزل کی صنف تک محدود کر لیا ہے لیکن اُن کی غزلیں جدید احساس اور طرزِ احساس سے آمیز ہو کر دو آتشہ ہو گئی ہیں۔ اُنہوں نے اس دور کے نہایت معتبر غزل گو باکی کے اثرات ضرور قبول کئے لیکن اپنی انفرادی لے کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ ہندوستان گیر سطح پر آج کے نمایاں غزل گویوں میں حکیم منظور کا شمار ہونے لگا ہے۔ حامدی اور حکیم منظور دونوں ہی اپنے کامیاب لمحوں میں اردو زبان کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔

جلائے رکھو لہو کے چراغ پلکوں پر
سرکتی دھوپ کا کیا اعتبار ہے لوگو!

(حامدی کاشمیری)

چہرے تمام رنگ تھے، باتیں تمام لفظ
کچھ بات تھی جو زخم کی صورت دلوں میں تھی

(حکیم منظور)

جموں و کشمیر کے تیسرے معروف شاعر مظفر ایرج ہیں۔ اُنہوں نے اسلامی اساطیر اور تلمیحات کے حوالے سے اپنی نظموں کا تار و پود تیار کیا ہے۔ مظفر ایرج نے کچھ غزلیں بھی کامیابی سے کہی ہیں۔ لیکن وہ دراصل نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک مجموعی ارتقاء ملتا ہے۔ نظم نگاری کے مشکل فن سے وہ جابک دستی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اُنہیں آج کے نظم نگاروں کی صف میں نمایاں جگہ ملنی چاہیے۔ اُن کی ایک نظم کا ابتدائی حصہ مُلاحظہ فرمایئے:-

تعمیر

یہ اُن دنوں کی بات ہے۔
میرے اور تمہارے درمیاں کوئی فصیل نہ تھی
کوئی خلاء نہ تھا، کوئی دوئی نہ تھی
انہا اید کے میٹھے پانیوں میں قید تھی
یہ اُن دنوں کی بات ہے
میرا نام لوحِ خاک پر رقم ہُوا نہ تھا
مراد جو میری ذات کے غبار میں دھواں نہ تھا
تم نے "کُن" کہا نہ تھا، میں نے "لا" سُنا نہ تھا!

پرتپال سنگھ بے تاب اِن سب سے نئے ہیں۔ اِن کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں ہے لیکن اُنہوں نے بڑی سُرعت کے ساتھ اپنے آپ کو متعارف کرالیا ہے۔ اِن کا شمار جموں و کشمیر کے سب سے زیادہ چھپنے والے شاعروں میں ہوتا ہے۔ اِن کے کلام کا ایک مجموعہ "پیش خیمہ" شائع ہو چکا ہے۔ اُنہوں نے نظمیں اور غزلیں دونوں ہی خاصی بڑی تعداد میں لکھی ہیں۔ غزلوں میں اُن کا لہجہ زیادہ صاف اور منجھا ہُوا ہے:-

نہ دے پختہ عمارت، اِک کھنڈر دے
میں بے گھر ہوں، مجھے بھی کوئی گھر دے
نہ دے اُونچائی میرے قد کو بے شک
مری ہر شاخ کو لیکن ثمر دے
فرشتہ میرے جینے کا غلط تھا کر،
مجھے بھی میرے ہونے کی خبر دے

اقبال فہیم کی شاعری ایسی برہمی اور جھلاہٹ کی آئینہ داری کرتی ہے، جو آج کی نسل کا

تعمیر

مقدر ہے۔ اِن کے کلام کا مجموعہ "سنگ برآب" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اِن کے پاس کہنے کے لئے مواد ہے لیکن الفاظ کو گرفت میں لینے اور اظہار کو زیادہ جاذب اور پُر تاثیر بنانے کے لئے اُنہیں مزید ریاض کرنے کی ضرورت ہے، یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ عام جدید شاعروں کے برعکس اقبال فہیم کا رشتہ صحراؤں اور سمندروں سے نہیں، بلکہ اپنی زمین سے اپنے گاؤں سے اور اپنے شہر سے زیادہ استوار ہے:۔

یہ میں نے پوچھا: ہوائیں گاؤں میں پھر رہی تھیں کہاں گئیں وہ
یہ میں نے پوچھا: صدائیں شہروں میں گونجتی تھیں کہاں گئیں وہ
منارِ روشن تھے گاؤں گاؤں وہ کیا ہوئے ہیں!

خالد بشیر اِن سب کے مقابلے میں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ زیادہ نئے ہیں۔ اِن کے کلام کا ایک مجموعہ "صدائے نیم شب" حال ہی میں شائع ہوا ہے جس میں اُن کی صرف ڈھائی برس کی شاعری شامل ہے اُن کے مجموعے کا ایک سرسری مطالعہ زبان و بیان کے کچے پن کا احساس دلاتا ہے لیکن کچے پھلوں کا بھی اپنا ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ اِن کی بصری پیکر تراشی اکثر تصوّرات کی نئی گرہیں کھولتی ہے۔

دُور تک پت جھڑ کا موسم دیکھ کر دل رو دیا
میں نے یادوں کے دریچوں کو ابھی کھولا ہی تھا

"درخت" اور "پرندہ" خالد بشیر کے مانوس استعارے ہیں۔ اس بڑی بصری دُنیا میں فخرِ کائنات یعنی انسان کتنا حقیر، تنہا اور غیر یقینی ہے اس کا احساس خالد بشیر کو شدت سے ہے:

وہی سماں ہے، وہی شجر ہے، وہی ہیں ہم
گئے برس کا پرندہ نظر نہیں آتا
گزشتہ [illegible]

ہم نے اب تک جن شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں مظفر ایرج کے علاوہ ہر ایک کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مظفر ایرج کا مجموعہ بھی جلد ہی منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ مجموعے کی اشاعت سے کم از کم دو باتیں ضرور سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر کے پاس اتنا اثاثہ ہے کہ وہ انہیں جمع کر کے کتاب کی شکل دے سکے۔ دوسرے یہ کہ اس میں اتنا اعتماد اور شوق ہے کہ وہ اپنے سرمائے کو دوسروں کے سامنے پیش کرے اور ان سے اپنی کوششوں کی داد چاہے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ صرف مجموعے کی اشاعت سے ہی شاعر یا ادیب کی اہمیت اور صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کی نئی نسل میں (یا نئی نسلوں میں) کئی لکھنے والے ایسے ہیں جن کے مجموعے ابھی شائع نہیں ہوئے لیکن جن کی تحریریں اُن کے امکانات کا پتہ دیتی ہیں۔ رفیق راز، رخسانہ جبین، مسعود ساموں، شجاع سلطان، محمد یسین، عابدہ احمد، اشرف ساحل، منیب الرحمٰن، اشرف آثاری، فاروق آفاق، راز منادری وغیرہ ایسے شاعر ہیں جن کے مجموعے ابھی شائع نہیں ہوئے لیکن جن کا کلام ریاست سے باہر کے جرائد میں بھی چھپ چکا ہے یا چھپتا رہتا ہے۔ ان سب شاعروں پر فرداً فرداً اظہارِ خیال کا موقع نہیں، ان میں سے اکثر شعراء کے یہاں تخلیقی اُپج کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے لئے لگن، ذوق اور ولولہ ہے ——— نئے سے نئے تجربوں کو قبول کرنے اور نئی سے نئی صنف میں اظہارِ خیال کرنے کی شعوری کوشش ریاست کے نئے ادیبوں اور شاعروں میں ملتی ہے۔ فاروق نازکی جن کا شعری سفر حامدی کاشمیری کے بعد اور حکیم منظور کے تقریباً ساتھ شروع ہوا تھا اور جن کے یہاں ابتداء میں فیض کے اثرات بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں، اب نئے تجربات کے نامانوس اظہار کی طرف راغب ہوئے ہیں اور اردو شاعری کی جدید ترین صنف آزاد غزل کو بھی گلے لگایا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں آزاد غزل لکھنے کی پہلی کوشش مظفر ایرج نے کی [illegible] فاروق نازکی نے۔ مقبول احمد (جو پہلے [illegible] کے نام سے [illegible] مقبول [illegible] [illegible]) اسلام آباد کے نوجوان شاعر ہیں۔ انہوں نے [illegible]

آزاد غزلیں ، اوّل الذکر دونوں شاعروں کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں لکھی ہیں ۔ بلکہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے مشاعروں میں بھی آزاد غزل پیش کرنے کی جسارت کی ہے ۔ شہزادی رضیہ شاہین اور حلیمہ پروین جو ریاست کی بالکل ہی نئی شاعرات ہیں ۔ انہوں نے بھی آزاد غزل کہنے کی ایک دو کوششیں کی ہیں ۔

ریاست میں جہاں تک اردو کا تعلق ہے ، نثر کے مقابلے میں شاعروں کی طرف رجحان زیادہ ہے ۔ یہ رجحان صرف ریاست میں ہی نہیں ، بلکہ ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی ہے لیکن یہاں یہ رجحان اس لئے نمایاں ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ نثر کی طرف توجہ دینے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے ۔

تنقید میں حامدی کاشمیری کا نام درجۂ اعتبار رکھتا ہے ۔ لیکن ان کے علاوہ بحیثیت تنقید نگار کسی اور نے اپنے لئے جگہ نہیں بنائی ہے ۔ رحمٰن راہی بہت اچھی تنقیدی بصیرت رکھتے ہیں اور اردو میں ان کے لکھے ہوئے تنقیدی مضامین توجہ کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ محمد یوسف ٹینگ نے بعض عمدہ تنقیدی مضامین لکھے ہیں ۔ ان کا استدلال اور تجزیاتی انداز بیان اور اس پر مستزاد ان کی ذہانت اردو تنقید میں اضافے کا موجب بن سکتی ہے ۔ کاش ان دونوں کے تنقیدی مضامین کے مجموعے اشاعت پذیر ہو جاتے ۔ یہاں نوجوان تنقید نگار سبھاش چندر ایمہ ، پریمی رومانی کا ذکر نہایت ضروری ہے ۔ پریمی رومانی ابھی نوجوان ہیں اور ان کا تنقیدی شعور پوری طرح بالیدہ نہیں ہوا ہے لیکن ان کے یہاں غور کرنے ، سیکھنے اور محنت کرنے کی جو لگن ہے ۔ وہ ان کے بہتر مستقبل کی ضامن ہے ۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "جدید اردو شاعری ، چند مطالعے" اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے ۔ جدید اردو شاعروں کے الگ الگ مطالعے پر مبنی مضامین کا کوئی اور مجموعہ کم از کم ہندوستان سے شائع ہوا ہے ۔ برج پریمی یہاں کے ایک اور قابل ذکر نقاد ہیں ۔ آپ کا نام رحمٰن راہی اور

سلطیف

محمد یوسف ٹینگ کے نام سامنے آتا جا رہا ہے۔ آپ کے مضامین کا مجموعہ حرفِ جستجو "تنقیدی سوجھ بوجھ کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس مجموعے سے قطع نظر بھی، ان کے تنقیدی مضامین ملک کے معتبر اور معروف رسائل میں آج کل باقاعدگی سے نظر آتے ہیں "سعادت حسن منٹو شخصیت اور فن" ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جو جلد منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ ان کے بعض حصے جو ادھر اُدھر رسائل میں نظر آئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے منٹو پر خاصی محنت اور دیدہ ریزی سے کام کیا ہے۔ بالکل نوجوان لکھنے والوں میں مجید مضمر کے یہاں تنقیدی شعور کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر ان کی گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے چند ہی مضامین وقفے وقفے پر رسالوں میں دکھائی دیئے ہیں۔ وہ اگر تنقید کی جانب باقاعدگی سے توجہ دیں تو اپنے امکانات کو روشن کریں گے۔

ریاست کی نئی نسل میں اردو کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی کمی کا بڑا نظر احساس ہوتا ہے نئے افسانہ نگاروں میں آنند لہر کافی فعال ہیں اور انہیں علامتی کہانی لکھنے کا خاص ملکہ ہے۔ ان کی کہانیاں ملک کے موقر جرائد میں باقاعدگی سے چھپتی رہتی ہے۔ وریندر پٹواری نے تھوڑے عرصے میں کافی لکھا ہے۔ ان کے یہاں علامتیں واضح ہیں اور لکھنے کا انداز عام لوگوں کی دلچسپی کے سامان رکھتا ہے، ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "فرشتے بولتے ہیں" شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ نذیر تند اور شمس الدین شمیم کے افسانوں کے مجموعے بھی بالترتیب "سلوٹیں" اور "دہلیز" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ نذیر تند کو علامتوں سے دلچسپی ہے، بلکہ وہ کہیں کہیں تجریدی انداز بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کا تازہ افسانہ "برقان" اس کی مثال ہے۔ شمس الدین شمیم کو انسانی زندگی کے المیوں سے زیادہ دلچسپی ہے، وہ افسانے کی افسانویت کے شاید اپنے دوسرے ہم عصروں سے زیادہ قائل ہیں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ شمس الدین شمیم کشیری ہو کے ہو کر رہ گئے ہیں یا پھر ان کا کوئی افسانہ ادھر میں نظر نہیں آیا۔ خالد حسین بنیادی طور

پر

پر پنجابی کے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن انہوں نے کچھ افسانے اردو میں بھی لکھے ہیں۔ اردو میں ان کا ایک مجموعہ "شہ شدی کا گمری کا دھواں" حال میں چھپا ہے۔ خالد حسین نئے افسانے کے تقاضوں سے پوری طرح آشنا ہیں اور وہ اردو افسانے کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ عمر مجید کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا لیکن ان کے افسانے ہر اعتبار سے کامیاب ہیں اور ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ نور شاہ اور پشکر ناتھ ریاست کے افسانہ نگاروں میں معروف ہیں۔ لیکن ان کا رشتہ نئی نسل سے جوڑنے ہوئے تکلف ہوتا ہے۔ نور شاہ بنیادی طور پر رومانی افسانہ نگار ہیں۔ پشکر ناتھ ان کے مقابلے میں حقیقت پسندی کی طرف مائل ہیں۔ لیکن ان کا اسلوب نگارش نئی نسل کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اردو میں معیاری ناولوں کا قحط ہے خصوصاً ہندوستان میں۔ اس لئے اگر ریاست جموں کشمیر میں بھی ناولوں کی کمی ہو تو تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ علی محمد لون (شاہد ہے تیری آرزو) غلام رسول سنتوش اور تیج بہادر بھان (پہچان) نے اردو میں ناول لکھے ہیں۔ جن کی اپنی خوبیاں ہیں۔ مگر ان ادیبوں کو اب نئی نسل سے وابستہ نہیں کیا جاتا۔ بالکل نئے لکھنے والوں میں سجاد حسین نے کئی ناول شائع کرائے ہیں۔ فاروق رنیتو کا ناول "زخموں کی سالگرہ" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس پر بعض اچھے تبصرے آئے ہیں۔ اس ناول کا تعلق آج کے اہم مسئلے سے ہے یعنی طالب علموں میں انتشار اضطراب اور اضطرار کی لہر۔ فاروق رنیتو نے اپنے ناول میں طالب علموں کے اضطراب کو ایک تعمیری سمت عطا کرنے کی کوشش کی ہے اور چونکہ ناول پر اصلاحی پہلو غالب ہے لیکن ناول نگار نے فنی لوازمات کو نظر انداز نہیں کیا۔ ہے۔ مہ وشی سعید ساحل بحیثیت ناول نگار اپنے لئے مستقل جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ اس صنف کی طرف پوری توجہ دیں۔ ناول کے فنی مطالبات ان کے پیش نظر ہیں اور ان کے یہاں نئی حسیت دوسرے ناول نگاروں کے مقابلے میں [illegible] مہ وشی سعید ساحل

نیز

کہ افسانے بھی انور سجاد اور سریندر پرکاش کی روایت کو آگے بڑھاتے ہیں۔

جموں و کشمیر کے لکھنے والوں کی یہ شکایت ایک حد تک بجا ہے کہ ریاست سے باہر کے رسائل، تنقید نگار اور تذکرہ نویس، یہاں کے لکھنے والوں کی پذیرائی نہیں کرتے، بلکہ انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔ کئی دوسری ریاستوں کو بھی یہی شکایت رہی ہے اور انہیں اپنے آپ کو تسلیم کرانے کے لئے کافی جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے لکھنے والوں کو بھی اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔ اور ریاست سے باہر کے کچھ مدیروں اور ناقدوں کے رویّے سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنی تخلیقات کو ریاست سے باہر کے جرائد و رسائل میں اشاعت کے لئے باقاعدگی سے ارسال کرتے رہنا چاہیئے۔ زبان و ادب (پٹنہ) آہنگ (گیا) نیا دور (لکھنؤ) شب خون (الٰہ آباد) الفاظ (علی گڑھ) آج کل (دہلی) سطور (دہلی) تعمیر (ہریانہ چنڈی گڑھ) جواز (مالیگاؤں) شاعر (بمبئی) امکان (بمبئی) کوہسار (بھاگلپور) عصری ادب (دہلی) چنگاری (دہلی)، اسباق (پونا) گلبن (احمد آباد) ادب نکھار (شوناتھ بھنجن) وغیرہ، بیرون ریاست کے وہ رسالے ہیں جو باقاعدگی سے چھپتے رہتے ہیں۔ جموں و کشمیر کے بعض لکھنے والے ان رسالوں میں نظر آتے ہیں۔ مگر خال خال، ان کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیئے ریاست سے شائع ہونے والے رسائل میں "شیرازہ" اور "تعمیر" ہندوستان گیر شہرت رکھتے ہیں یہ رسائل یہاں کے لکھنے والوں کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں۔ اسلام آباد (اننت ناگ) سے "تاثیر" اور "لفظ لفظ" دو رسالے شائع ہوئے ہیں۔ اردو کے حق میں یہ فال نیک ہے ممکن ہے، ریاست سے باہر کے بعض مدیران رسائل یہاں کے کسی لکھنے والے کی تحریر واپس کر دیں اس سے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ بہت سے معتبر اور برگزیدہ لکھنے والوں کی نگارشات بھی واپس آجاتی ہیں۔ کرشن چندر کی شہرت کے عروج کے زمانہ میں بھی بعض مدیروں نے ان کے افسانے لوٹا دیئے۔ گزشتہ دنوں کراچی میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے

تعمیر

نیا دور کے لیے موصول شدہ ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مضمون واپس کر دیا۔ کیونکہ وہ ان کے رسالے کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

یہاں کے لکھنے والوں کو زبان و بیان کی صحت اور صفائی کی طرف پورا دھیان دینا چاہیے اور فن کے نکات سے پوری آگاہی کرنی چاہیے۔ اردو میں لکھنے والی یہاں کی نئی نسل کا مستقبل تابناک ہے ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ڈرامہ نگاری کا ممتاز ناقد و محقق

صاحبزادہ محمد عمر

صاحبزادہ محمد عمر صاحب [illegible] کے رہنے والے تھے اور جوڈیشل منسٹر کے دفتر میں پہلے منتظم [illegible] صاحبزادہ [illegible] شاہ صاحب ان [illegible] کے بیٹے تھے۔ مختصر [illegible] ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک مسلسل تحقیق کرتے رہے۔ ابتداء میں [illegible] کے جگری دوست نور الٰہی بھی شریک رہتے تھے۔ ان دونوں میں دوستی ایسی تھی کہ یک جان دو قالب ہو کر ہمیشہ نور الٰہی محمد عمر کے نام سے مضامین [illegible] نور الٰہی محمد عمر [illegible] ہیں۔ ان دونوں بزرگوں [illegible] تک زندہ رہے اور آخر عمر تک ڈرامے کے سلسلے [illegible]

نیرنگ خیال لاہور – بابت اپریل ۱۹۳۵ء

پر تحقیق کرتے رہے۔

نور الٰہی محمد عمر نے مشترکہ طور پر ڈرامہ پر ایک مبسوط کتاب "ناٹک ساگر" کے نام سے تصنیف کی جو دسمبر ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ چھپی تھی۔ یہ کتاب نایاب تھی۔ سال گزشتہ ۱۹۸۲ء میں اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے اس کا دوسرا ایڈیشن آفسٹ میں شایع کیا۔

کتاب کی ابتداء میں ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب لکھتے ہیں :۔

"ڈرامہ کے فن اور اس کے ارتقا پر اردو میں جو پہلی مبسوط کتاب لکھی گئی وہ ہے نور الٰہی اور محمد عمر صاحبان کی "ناٹک ساگر"۔ اس سے استفادہ کئے بغیر ڈرامے سے متعلق ہمارا حاصل مطالعہ بڑی حد تک تشنہ اور ادھورا رہے گا۔ اس کتاب کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ مگر نفس کتاب عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ اور بہت سے اچھے کتب خانے بھی اس سے خالی نظر آتے ہیں۔"

مصنفین نے کتاب کا انتساب ذیل کے عنوان کے تحت ڈاکٹر عبد الحق کے نام کیا تھا :۔

"زہے نصیب کہ جناب مولانا عبد الحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اس ناچیز تصنیف کا ڈیڈیکیشن منظور فرماتے ہیں"

کتاب پر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی[1] نے ایک معرکہ آرا تاریخی مقدمہ لکھا ہے۔

---

[1] کیفی ۱۳ ستمبر ۱۸۶۶ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ کشمیر میں [illegible] سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے سر سید، آزاد، شبلی اور حالی کا زمانہ [illegible] حالی کے شاگرد بھی تھے۔ آزاد لکھنوی، آغا شاعر، اقبال، ثاقب، حسرت، ناظر اور مسعود حسن رضوی ادیب ان کے مداح [illegible]۔ کیفی نے ایک [illegible] ہیں اور

مقدمہ نگار نے ہندوستانی سٹیج، یونانی سٹیج، یورپی سٹیج، ہندی سٹیج اور اردو سٹیج پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"ناٹک ساگر کی تقریب یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ وہ کتاب ہے جو ادیبوں اور ڈرامہ نویسوں اور سٹیج یعنی تھیٹر کے ہر قسم کے متعلقین کے لئے روزنامچہ ہدایات کا کام دے گی۔"

"ناٹک ساگر" میں امانت لکھنوی، مداری لال، پارسی اور اردو ڈرامہ، بالی والا اور طالب، الفریڈ تھیٹر، احسن لکھنوی، بیتاب، نیو الفریڈ تھیٹر، حشر کاشمیری، بمبئی پارسی تھیٹریکل کمپنی اور جوبلی کمپنی کا ذکر کیا گیا ہے۔

"ناٹک ساگر" بعض لغزشوں کے باوجود اردو ڈرامہ نگاری میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

نور الہٰی محمد عمر صاحبان نے ۱۹۲۱ء میں رسالہ اردو میں مشترکہ طور ایک مضمون لکھا اور اس میں "اندر سبھا" مصنفہ امانت لکھنوی کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کا خیال فرانسیسیوں نے پیدا کیا۔ اور انہیں کی ہدایت کے مطابق قیصر باغ میں اسٹیج تیار ہوا۔ اس کی تصنیف واجد علی شاہ کی فرمائش سے ہوئی اور خود بادشاہ نے اندر کا پارٹ کیا۔ ان حضرات کے بیان کی تردید سب سے پہلے شرر لکھنوی نے اپنے پرچے "دلگداز" بابت جنوری ۱۹۲۲ء میں کی۔ مضمون جب نور الہٰی محمد عمر کی نظر سے گذرا تو انہوں نے شرر کے جواب میں ایک مضمون لکھا جو "ہزار داستان" لاہور میں شایع ہوا۔ اس کا

اغلاط کی تصحیح کے سلسلے میں بڑا کام کیا۔ علاوہ ادبی تحقیق کے کیفی ایک خوش ذوق نقاد، ایک خوشگو شاعر، ایک سخن فہم ادیب اور ایک قادر الکلام نثر نگار تھے۔ نثر میں "کیفیہ"، "منشورات"، "خمخانۂ جاوید" کا حصہ چہارم و پنجم قابل ذکر ہیں۔ کیفی کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ (تفصیلات کے لئے "کشمیر کے غیر مسلم ادیب" مطبوعہ نیا دور ۱۹۶۱ء از اکبر حیدری ملاحظہ ہو۔

[illegible] ملک [illegible] ہے ۔ [illegible]

کیا جاتا ہے ۔

۱۔ واجد علی شاہ کا ایک فرانسیسی دربار تھا۔ ۲۔ اس فرانسیسی دربار نے فرانسیسی اوپیرا [illegible] حیثیت [illegible] میں فرانس [illegible] اوپیرا کا گوئیڈ ہو رہا تھا۔ اس لئے واجد علی شاہ کے دربار میں جس فرانسیسی [illegible] کا ذکر آیا ہے۔ وہ اوپیرا تھا جو بالکل [illegible] اور جس کی نمائش ان کی [illegible] نہیں"

۴۔ امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی اور واجد علی شاہ نے اندر کا پارٹ کیا۔

جناب مسعود حسن رضوی[1] ادیب مرحوم نے اسی سلسلے میں ایک پُر مغز اور بسیط تحقیقی مقالہ بنام "اندر سبھا اور منشی اندر سبھا" لکھا جو رسالہ "اردو" بابت جولائی ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے [illegible] پر [illegible]

---

[1] سید مسعود حسن رضوی ادیب [illegible] اور [illegible] ۔ [illegible] ۱۸۹۳ء [illegible] میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی [illegible] ۱۹۲۱ء [illegible] ہوئے ۔ ۱۹۲۲ء میں فارسی کے [illegible] اور ۱۹۲۸ء [illegible] لکچرر ۱۹۴۰ء میں شعبہ اردو فارسی کے صدر ۔ ۱۹۵۴ء [illegible] ۱۹۴۶ء [illegible] میں ۳۴ برس تک اردو [illegible] سبکدوش ہوئے ۔ مسعود صاحب کا ۱۹۷۵ء میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی تحقیق کی اور ثابت کیا کہ اندر سبھا نہ تو واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی گئی اور نہ اس کا کھیل کبھی قیصر باغ میں ہوا اور نہ بادشاہ کبھی اس میں شریک ہوئے۔ دراصل امانت نے اندر سبھا اپنے ایک شاگرد مرزا عابد علی تخلص عبادت کی فرمائش سے لکھی۔ اس کا ذکر امانت نے "شرح اندر سبھا" میں کیا ہے۔ ادیب کے بعد جناب آرزو جلیلی نے ادیب کی حمایت میں ایک مضمون "اندر سبھا کے متعلق چند غلط فہمیاں" جناب قاضی عبدالودود صاحب کے رسالہ "معیار" پٹنہ بابت جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔ انہوں نے بھی نور الٰہی محمد عمر کے بیان کی تردید کی۔

محمد عمر ڈرامہ نویسی کے فن میں ادیب مرحوم کے معنوی شاگرد تھے۔ دونوں میں غائبانہ ملاقات تھی اور کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ محمد عمر صاحب نے جون ۱۹۲۷ء میں ادیب کے ساتھ خط و کتابت کا ڈول ڈالا تھا اور پھر مراسلت کے ذریعے ہی

نگارشات ادیب، اسلاف میر انیس، امیر سلطنت واجد علی شاہ ان کی بلند پایہ تصانیف ہیں۔ ان میں سے کئی کتابوں کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ مرثیہ، ڈرامہ اور واجد علی شاہ ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ حکومت ہندوستان کی علمی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں خاص اعزاز عطا کئے۔ ۱۹۷۰ء میں صدر جمہوریہ ہند نے انہیں فاضل کی حیثیت سے انعام و اکرام سے نوازا اور تاحیات تین ہزار روپے سالانہ بطور وظیفہ مقرر کیا تھا۔ انہیں "پدم شری" کا اعزاز بھی ملا تھا۔ تصانیف کے علاوہ مسعود صاحب کے [illegible] تحقیقی تنقیدی اور دیگر مضامین ہندوستان اور پاکستان کے مختلف معیاری رسائل [illegible] چھپ چکے ہیں۔ یونیورسٹی کے اسکالر مسعود صاحب پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ انتقال سے پہلے [illegible] [illegible] "اردو" دہلی شمارہ ۸۰ میں ان کے نام سے خاص نمبر شائع کیا۔ جناب سبط محمد نقوی نے [illegible] مسعود حسن رضوی ادیب: فرد اور فنکار" کے نام سے شائع کی۔ ادیب کا انتقال [illegible] ہوا۔

۱۹۴۶ء تک وہ ادیب سے استفادہ کرتے رہے۔ محمد عمر کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے تعلقات ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھ بڑے استوار تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جون ۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر موصوف سرینگر آئے تھے اور یہاں گپکار روڈ پر قیام کرتے تھے۔ انہی کے توسل سے محمد عمر نے ادیب سے اندر سبھا کے پہلے ایڈیشن کی درخواست کی تھی۔

محمد عمر کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۴۶ء میں ڈراما کی ٹکنیک پر ایک ایک مبسوط کتاب تیار کی تھی جس کا حجم "ناٹک ساگر" کے برابر تھا۔ موصوف نے "ناٹک ساگر" کا دوسرا ایڈیشن بھی سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد مزید اضافوں کے ساتھ تیار کیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ اندر سبھا کا ایک خاص ایڈیشن بھی نکالنے والے تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ تینوں کتابیں شائع ہوئی تھیں کہ نہیں۔ غالباً ۱۹۴۷ء کے خونریز فسادات میں جموں میں یہ بیش بہا چیزیں تلف ہوئی ہونگیں۔

محمد عمر صاحب اپنے زمانے میں کشمیر کے نامور ادیب اور ممتاز نثر نگار تھے۔ اردو ڈراما ان کا خاص موضوع تھا۔ اقبال سے ان کے مراسم بڑے گہرے تھے۔ جون ۱۹۲۱ء میں جب اقبال مختصر قیام کے لئے کشمیر گئے تھے اور نسیم باغ کے آگے ڈل جھیل میں ہاؤس بوٹ میں مقیم تھے انہوں نے اقبال کے ڈل جھیل کی سیر کی کیفیت پر ایک مختصر سا مضمون لکھا جو لاہور کے رسالہ 'ہزار داستان' میں اکتوبر ۱۹۲۲ء میں چھپا تھا۔

ذیل میں ان خطوط کی نقل من و عن درج کی جاتی ہے جو عمر نے اردو ڈراما کی تحقیق سے متعلق جناب مسعود حسن رضوی صاحب کو لکھے تھے۔ یہ خطوط راقم کو مسعود صاحب کے صاحبزادے جناب ڈاکٹر نیر مسعود نے فراہم کئے جن کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر لازم آتا ہے۔

تعمیر

۹ جون ۲۷ء

دفتر جوڈیشل منسٹر، جموں (پنجاب)

محترم بندہ — تسلیم

اندر سبھا اور شرح اندر سبھا کے متعلق آپ کا مضمون رسالہ اردو بابت اپریل ۲۷ء نظر سے گذرا یہ جھگڑا مدت سے چلا آتا ہے اور غالباً آپ نے اس کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا ہے کاش آپ انہی دنوں میں توجہ فرماتے جب ہمارا مضمون اردو میں شائع ہوا تھا تو شاید صورت حال کچھ اور ہو جاتی۔ اس مضمون کے شائع کرنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ متنازعہ فی امور کا تصفیہ کتاب کی اشاعت سے ہو جائے۔ بہر حال اس وقت کسی نے توجہ نہیں کی اور ہم نے اپنی بہترین تحقیق کا ماحصل کتاب میں درج کر دیا۔ ناٹک ساگر کا دوسرا ایڈیشن تیار ہو رہا ہے نیز میں اندر سبھا کا ایک خاص ایڈیشن تیار کر رہا ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ان میں کوئی غلطی نہ رہے۔ اس لئے میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ میری تین باتوں کا جواب دے کر ممنون فرمائیں تاکہ یہ معاملہ سلجھ جائے۔

۱۔ کیا آپ وہ کتاب جسے آپ اندر سبھا کا پہلا ایڈیشن سمجھتے ہیں مجھے دو ایک دن کے لئے مستعار دے سکتے ہیں۔ اگر آپ ایک اجنبی پر اعتبار نہ کر سکیں تو بوساطت مولانا عبدالحق صاحب ایڈیٹر رسالہ اردو جن کا موجودہ پتہ درج ذیل ہے بھیج سکتے ہیں۔ اور اس طرح شاید کتاب ضائع ہونے کا احتمال کم ہو جائے۔ لیکن اگر دونوں صورتیں آپ کے لئے ناقابل عمل ہوں تو میں لکھنؤ آنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ مولانا عبدالحق صاحب، بوساطت خان عبدالمجید خان صاحب ڈائریکٹر جنرل کوآپریشن اینڈ ایگریکلچر، روزمونٹ" گپکار روڈ سری نگر کشمیر

۲۔ میرے بعض احباب جنہیں لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا بیان کرتے ہیں کہ قیصر باغ

[illegible] میں ایک بار وہ دعا ہے جو اندر سبھا کے اسٹیج کا کام دیتی تھی اور شاید اس کے متعلق کچھ [illegible]

بھی توجہ ہے کیا آپ مجھے مطلع فرمائیں گے کہ یہ روایت کہاں تک درست ہے۔

۲۔ میرے پاس جو اندر سبھا کا ایڈیشن ہے اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ:۔

(الف) یہ تیسرا ایڈیشن ہے جو ۱۲۷۰ ہجری میں شائع ہوا۔

(ب) یہ مطبع صمدی میں حسب فرمائش محمد یعقوب طبع ہوا۔

(ج) اس میں وہ تمام تاریخیں درج ہیں جو آپ نے لکھی ہیں۔

(د) یہ ایڈیشن امانت کی زندگی میں شائع ہوا اور انہوں نے اس کی صحت

کی تصدیق بہ ثبت مہر خود کی۔ فرماتے ہیں۔

گذر کر دیر میں اپنی نظر سے صحیح اندر سبھا ایسی یہ چھپی ہے

غلط اس میں نہیں ہے ایک نقطہ برائے صحت اس پر مہر کی ہے

لیکن اس کے ساتھ کوئی دیباچہ، کوئی شرح، کوئی مقدمہ نہیں ہے۔ [illegible]

میں شائع ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ بھی کوئی شرح وغیرہ نہیں ہے۔ کتب خانہ آصفیہ [illegible]

میں نے اندر سبھا کا ایک بہت ہی پرانا ایڈیشن دیکھا تھا جو غالباً مطبع [illegible] لکھنؤ میں طبع

ہوا تھا۔ مگر اس کے ساتھ بھی کوئی شرح نہیں تھی۔ کیا آپ مجھے اس کی وجہ بتا سکتے ہیں؟

امید ہے کہ آپ میری جسارت کو معاف فرمائیں گے کہ بے طلب [illegible]

ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

خاکسار

محمد عمر

تعمیر

(۲)

جموں (پنجاب)

۱۰ / جون ۱۹۲۷ء   محترمی بسلام مسنون

مکرمت نامہ کا شکریہ۔ مجھے از بس افسوس ہے کہ اپنی دُھن میں میں آپ کا وقتِ عزیز ضائع کر رہا ہوں۔ اور ایک طویل تحریر کے بعد دوسری ارسال کرتا ہوں۔ امید کہ یہ سمع خراشی بارِ خاطر نہ ہوگی۔ اور آپ ایک خبطی کو معذور سمجھیں گے۔ شرح کی نقل مطلوب نہیں کہ وہ طبع ہو چکی اور میرے پاس موجود ہے۔ میں تو اصل کتاب دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ خود مجھے اطمینان کلی ہو جائے کہ بلا خوفِ تردید یہ اصلی نسخہ ہے۔ اگر یہ شرح امانت نے لکھی ہے اور ان کے ایما سے شائع ہوئی تو روایات مروّجہ کا بیشتر حصّہ کالعدم ہوتا ہے اندر سبھا کے متعلق جو کچھ "ناٹک ساگر" میں لکھا ہے یہ جس محنت کا ماحصل ہے اُسے کچھ میرا دل ہی جانتا ہے۔ جب یہ تفحّص قابل ایراد ثابت ہو تو آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں نظریاتِ جدید کو باور کرنے میں خاص حزم و احتیاط سے کام لوں مجھے اس کا آسان علاج یہی سوجھا تھا کہ ذرا اصلی نسخہ ایک نظر دیکھ لوں کتاب مستعار مانگنے کی جرأت اس لئے ہوئی کہ پنجاب میں کتاب کا مستعار مانگنا اور دینا "روزمرہ" میں داخل ہے۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ آپ کے اصول کے خلاف ہے اور میں اپنی جسارت پہ نادم ہوں۔ میں تو اس نسخہ کی رونمائی میں شخصی اور نقدی ضمانت دینے کے لئے تیار تھا بلکہ اگر آپ لکھنؤ میں ہوتے تو شاید اس طریقہ کے بجائے خود وہاں پہنچ جاتا۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بہرحال میرے سراپا شکریہ ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ نے جواب سے ممتاز فرمایا۔

قیصر باغ میں اندر سبھا کے نام سے ایک بارہ دری کا ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے آپ لکھنو جا کر ضرور تحقیق فرمائیے گا اور جہاں آپ اس بات کو ختم فرما رہے ہیں۔ یہاں سے تو آغاز ہوتا ہے میں آپ کی تحقیقات کے نتیجہ کا منتظر ہوں۔ ممکن ہے کہ بعد کے ایڈیشنوں میں ناشروں نے خست سے کام لے کر شروع کو نکال دیا ہو۔ لیکن جو ایڈیشن میرے پاس ہے اس میں خست کے آثار نہیں پائے جاتے۔ شروع کے سوا سب کچھ موجود ہے اور حجم کو بڑھانے کے لئے غیر متعلق غزلیں اور ضمیمات درج کئے گئے ہیں۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ شروع کو کتاب سے نکالنے کی خست کے علاوہ کوئی اور وجہ ہوگی۔ آپ کا یہ قیاس کہ اندر سبھا اس وقت مبتذل سمجھی جاتی تھی غور طلب ہے۔ دیکھیئے پہلا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوتا ہے اور تیسرا ۱۲۷۶ھ میں گویا ان ایڈیشنوں کے درمیان ایک اور ایڈیشن نکلا تھا۔ اس زمانے کے لکھنو میں چار سال کے عرصے میں کسی کتاب کے تین ایڈیشنوں کا نکلنا اس بات کی دلیل ہے کہ اُسے پڑھے لکھے حضرات میں خاص وقعت حاصل تھی۔ آپ آجکل ہی دیکھیئے کہ ایک ایڈیشن نکالنے میں باوجود اشتہارات کی آسانیوں کے کتنے سال لگ جاتے ہیں۔ آپ نے پروفیسر آذر کا نام سنا ہوگا جو ایک عظیم الشان کتب خانے کے مالک ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے پاس لکھنو کے اولین پریس موسومہ مطبع سنگین [1] کا چھاپ شدہ ایک نسخہ ہے۔ جو

---

[1] اودھ میں غازی الدین حیدر (۱۲۲۹ھ — ۱۲۴۳ھ) سے قبل اردو چھاپہ خانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ انہوں نے ۱۲۳۴ھ میں موتی محل لکھنو میں زر کثیر صرف کر کے ٹائپ کا پہلا اعلیٰ درجے کا مطبع قائم کیا۔ اس میں فارسی، عربی، نجلی اور نسخ کئی طرح کا بہت عمدہ ٹائپ موجود تھا اس مطبع کی کئی کتابیں راقم کی نظر سے گذری ہیں بعض کتابیں یہ ہیں۔

ہفت قلزم۔ غازی الدین حیدر نے سات جلدوں پر مشتمل ایک فرہنگ دو سال کے عرصے میں

غالباً پہلا ایڈیشن ہے۔ مگر اس کے ساتھ بھی شرح نہیں۔ یہ کتاب دو تین روز تک میرے پاس پہنچ جائے گی۔ تو پھر اس کے متعلق مفصل عرض کروں گا۔ مزید برآں واجد علی شاہ کی ایک تصویر ۱۸۶۷ء کی بنی ہوئی مجھے ملی ہے اور یہ تصویر اس حلیہ سے لگا کھاتی ہے جو شرح میں اندر کا بیان کیا ہوا ہے۔ آپ فرمائیں تو یہ دونوں چیزیں ملاحظہ کے لئے ارسال کروں تاکہ آپ انہیں ناقدانہ نگاہ سے دیکھ سکیں۔

خود شرح میں ایک دو باتیں ایسی ہیں جو بذاتہٖ شرح طلب ہیں۔ مثلاً

۱۔ کیا اس زمانے میں کتابوں کے ساتھ اس قدر بسیط مقدمے لکھے جاتے تھے۔

۲۔ اس کا کیا مطلب ہے "کس ریاض سے ایک درخت لگایا آخر کو اس سے رنج کا پھل پایا"۔ اور

۳۔ الحمدللہ کہ بھگت کا کوئی نام نہیں لیتا ہے۔ زمانہ اندر سبھا پر جان دیتا ہے"

۱۲۲۹ھ سے ۱۲۳۰ھ تک تالیف کی اور پھر اسے "فرہنگ رفعت" کے نام سے مولوی قبول محمد کے سپرد کی۔ انہوں نے تمام جلدوں پر دیباچے لکھے۔ پانچ سال کے بعد یہ فرہنگ "مطبع شاہی لکھنؤ" میں محرم ۱۲۳۵ھ سے ذی الحجہ ۱۲۳۷ھ تک یعنی پورے دو سال میں بڑے سائز ۱۱½" × ۱۵" میں ۸۵۵ صفحات میں چھپ کر تیار ہوئی۔ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں ساتوں جلدیں محفوظ ہیں۔ جلد اول کے خاتمے پر یہ ترقیمہ درج ہے۔ "الحمد للہ کہ جلد اول از کتاب فرہنگ رفعت مسمی بہ ہفت قلزم بتاریخ پانزدہم شہر محرم الحرام سنہ یک ہزار و دو صد و سی و شش ہجری در دار السلطنت لکھنؤ بقالب طبع در آمد" ساتویں جلد کا ترقیمہ یہ ہے :-

"فرہنگ رفعت مسمی بہ ہفت قلزم روز عید سعید ماہ ذی الحجہ الحرام در سنہ

تعمیر

۴۔ "پردہ اٹھتا ہے" ۔ رہس کا ایک ہی پردہ ایک طرف کھینچا جاتا ہے۔ جیسے گھروں میں پردے لٹکتے ہیں۔ انہیں سمیٹ کر ایک طرف کھینچ لیتے ہیں۔ جو پردہ زمین سے اٹھ کر چھت کی طرف جاتا ہے یہ مغربی چیز ہے۔ اور اس سے پہلے ہندوستان میں نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح یہ فقرہ بھی محتاج توجیہہ ہے کہ "گت ناچتی ہوئی نکلتی ہے۔" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کہاں سے نکلتی ہے رہس میں تو ایکٹر گروہ سے اٹھ کر آتے ہیں۔

۵۔ لال بارہ دری جس کا ذکر صفحہ ۲۳۰ پر ہے آپ جانتے ہیں کہاں واقع ہے۔ میرے خیال میں یہ بہت بڑی علمی خدمت ہوگی اگر آپ شرح کی بنا پر مزید تحقیقات کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اخلاص کیش

دفتر جوڈیشل منسٹر جموں

یک ہزار و دو صد و سی و ہفت در دار سلطنت لکھنو ...... اختتام طبع پوشیدہ

۲۔ المناقب الحیدریہ (عربی) احمد شیروانی نے غازی الدین حیدر کی تعریف میں لکھی تھی جو ۱۲۳۵ھ میں چھپی۔

۳۔ محاورہ حیدری۔ مصنفہ محمد صادق اختر۔ ۱۲۳۶ھ میں چھپی

۴۔ گلدستہ محبت سنہ ۱۲۳۹ھ میں چھپی

۵۔ تاج اللغات۔ غازی الدین حیدر نے عرب کے علماء و فضلا سے عربی میں یہ فرہنگ ترتیب دینا شروع کی تھی جو ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر نے آٹھ جلدوں میں شائع کی۔

مطبع شاہی کے بعد مطبع بیت السلطنت لکھنؤ، مطبع مصطفائی لکھنؤ، مطبع مسیحائی لکھنؤ قابل ذکر ہیں۔ مطبع سنگین کسی بھی صورت میں اولین پریس میں نہیں تھا (اکبر حیدری)

تعمیر

(۳)

جموں، پنجاب

۱۹؍ مارچ ۱۹۴۳ء   مکرمی آداب

ایک مدت کے بعد حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں۔ یعنی سات سال ادبی دنیا سے کنارہ کش رہنے کے بعد پھر متوجہ ہوا ہوں۔ کل "آواز" میں نوٹ دیکھا کہ آپ "اودھ شاہی سٹیج" پر تقریر فرما رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس سلسلے میں میری آپ کی وہ خط و کتابت ہوئی تھی اور میں نے اپنے زاویۂ نگاہ کو بجائے رسالہ کے حوالہ کرنے کے آپ کے تصنیف کے حوالے کر دیا تھا۔ میرے پاس اس کے متعلق سوا یاد کے کچھ نہیں۔ اس آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بہت آگے نکل گئے ہیں۔ لیکن میں وہیں ہوں جہاں آپ نے چھوڑا تھا۔ اگر آپ میرے نظریات کو بھی سامنے رکھیں تو بڑا احسان ہوگا۔ آپ کی تقریر امید ہے کہ آواز میں شائع ہو جائے گی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو کیا آپ اس کی ایک نقل ارسال فرمائیں گے۔ تاکہ میں "ناٹک ساگر" کے آئندہ ایڈیشن میں اس سے بہرہ ور ہو سکوں۔

خادم ۔ محمد عمر

(۴)

محترمی آداب

میں سری نگر سے ابھی واپس آیا ہوں۔ کشمیری "بھانڈوں" کے تاریخی حالات تو کچھ معلوم ہوئے۔ مگر ان کے کارنامے کشمیری بولی سے تعلق رکھتے ہیں۔

تعمیر

پروفیسر حسن[1] نے انہیں جمع کرنے کا ذمہ لیا ہے ممکن ہے کہ میں پھر سری نگر جاؤں - یہاں جموں سے بھی کچھ مل گیا ہے - آپ بھی ذرا توجہ فرمائیں - امید ہے کہ دہلی سے کیفی بھی کچھ نکال دیں گے - اگر آپ اس کی تدوین گوارا فرمائیں گے تو یہ سب کچھ آپ کی نظر ہوگا - اودھ شاہی مقالہ مکمل ہوگیا تو پورے اطمینان سے ارسال فرمائیں - وقت مقررہ کے اندر واپس ہوگا ـــ

"ساری دنیا" پروفیسر سراج الدین آذر نے 'رفیع پیر نے ڈرامہ کے ادیب کے نام کچھ مقالے دہلی سے نشر کئے - مجھے تو سننے کا اتفاق نہیں ہوا - آپ نے سماعت فرمائے -

محمد عمر جموں - ۱۲ / اگست ۱۹۴۲ء

عرضیہ لکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ پتہ بھول گیا ہوں - اس لئے "توکل" سے کام لے رہا ہوں

محمد عمر

۵

جموں - ۳۰ / اپریل ۱۹۴۶ء

مشفقی و مکرمی - آداب

آپ تو مجھے بھول گئے - "ناٹک ساگر" کی نظر ثانی ختم ہوئی تو ہے - بنگالی، بمبئی، مرہٹی، اردو، پنجابی سٹیج درج ہو گئے - صرف اودھ سٹیج کے لئے آپ کی عنایت

---

[1] صاحب زادہ حسن شاہ - محمد عمر کے چھوٹے صاحبزادے ہیں - وہ ایس - پی - کالج میں شعبہ تاریخ کے استاد تھے - اس کے بعد ڈائرکٹر آف لائبریریز کے عہدے پر کئی سال تک رہے - ۱۹۶۲ء میں امر سنگھ کالج میں بحیثیت پرنسپل آئے - ۶۴ء میں پاکستان گئے - آج کل پاکستان میں ہیں -

نعیم

کا منتظر ہوں۔ احسن[1] کے اگر اور حالات نہیں ملتے تو کم از کم اتنا تو معلوم ہو کہ وہ کب فوت ہوئے۔ تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔

خادم محمد عمر

(۶)

سری نگر، ۲۶ جون ۱۹۴۶ء

محترمی۔ آداب

آپ کا گرامی نامہ جموں پہنچا اور دیگر خطوط کے ساتھ وہیں پڑا رہا۔ اب میں نے HOLIDAY ختم کی اور ڈاک منگوائی تو عنایت نامہ ملا۔ میں سال میں تین مہینے کام نہیں کرتا۔ آوارہ گرد ہو جاتا ہوں۔ اب " ناٹک ساگر " کا نیا ایڈیشن ذرا دیر سے شایع ہوگا۔ اپنی تصویریں آپ ذرا دو ایک ماہ تک ارسال کریں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر احسن کی تاریخ پیدائش عمر، تاریخ وفات مقام تدفین سے مطلع فرمادیں تو مین نوازش ہوگی۔

---

[1] سید مہدی حسین نام۔ احسن تخلص۔ اردو کے مشہور شاعر حکیم نواب مرزا شوق لکھنوی مصنف زہر عشق، بہار عشق، فریب عشق وغیرہ کے نواسے ہیں۔ احسن صاحب نہ صرف ایک کامل ڈرامہ نگار بلکہ ایک شاعر خوش گو اور بہت اچھے موسیقی دان بھی ہیں۔ ان کے ڈراماؤں کی زبان نہایت فصیح اور بامحاورہ ہوتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ زبان دان ہیں۔ ان کی ایک مشہور تصنیف واقعات انیس ہے جس میں میر انیس مرحوم کے حالات زندگی نہایت صحت اور عمدگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ ڈرامائی تصانیف یہ ہیں۔ فیروز گلنار، چندراولی، دلفروش، بھول بھلیاں، بکاؤلی، چلتا پرزہ " (تاریخ ادب اردو صفحہ ۵۵۱ مترجمہ مرزا محمد عسکری) راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں احسن کے

تمیر

ہاں یہ تو فرمائیے ہماری زبان کہیں آپ کو بھی تو ناگوار نہیں ہوتی۔ سنا ہے کہ آپ کی یونی ورسٹی میں کوئی غیر معروف پروفیسر صاحب ہیں جنہیں پنجاب کی اردو سُن کر متلی آتی ہے۔

خادم، محمد عمر

بہ مکان ماسٹر عبداللہ، ہفت چنار، سرینگر کشمیر

(۷)

لکھنؤ۔ (تاریخ ندارد)

مکرمی۔ تسلیمات

عنایت نامہ مورخہ ۷ / مئی۔ شکریہ

خدا کا شکر کیجیے اگر آپ کو ڈراما اور تھیٹر سے اُنس نہیں اس سے زیادہ جانکاہ شاید ہی کوئی اور فن ہو، ۱۹۰۸ء سے اس کے مطالعے میں مسلسل محو ہوں۔ مگر ہنوز طالب علم

تمام قلمی ڈراموں کے مسودے بخط مصنف مخطوطہ نمبر ۱۱ کے تحت محفوظ ہیں۔ یہ ڈرامے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں اور ان پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ بعض لوگ احسن کا نام سید مہدی حسین لکھتے ہیں۔ ان کی قبر پر بھی یہی نام درج ہے۔ ان کا ایک مضمون "میری تصنیف کا مقدمہ" مخزن لاہور بابت فروری ۱۹۰۶ء میں صفحہ ۱۹ میں چھپا تھا۔ اس پر ان کا نام "سید مہدی حسن ہے" اور یہی صحیح ہے۔ احسن کا انتقال لکھنؤ میں ۱۵ رجب ۱۳۵۸ھ مطابق ۳۱ اگست ۱۹۳۹ء بروز پنجشنبہ کو ہوا تھا۔ یہی تاریخ وفات ان کی قبر پر کندہ ہے۔ ان کی قبر آغا باقر کے امام باڑہ لکھنؤ میں پھاٹک سے داخل ہو کر داہنی جانب صحن کے احاطے کی دیوار کے قریب واقع ہے۔

۱؎ جناب ڈاکٹر نیر مسعود صاحب نے اس خط کی تاریخ "غالباً ۱۹۲۶ء" لکھی ہے۔ (دولہا صاحب عروج مرتبہ ڈاکٹر نیر مسعود مطبوعہ ۱۹۸۰ء)

تعمیر

کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھا۔ میں تو اپنے احباب کو یہی مشورہ دوں گا کہ "من نہ کردم شما حذر بکنید" میری تو یہ حالت ہے کہ "نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن"۔ اب اور سنئے ڈراما کی ٹکنیک پر ایک کتاب شروع کر دی ہے۔ چاہتا ہوں کہ مختصر ہو، مگر "ناٹک ساگر" سے کم ہونے کی امید نہیں "سٹیج کی ترکیب" کے متعلق شاید ہی میں کچھ لکھوں۔ لیکن اگر احوال و قواعد کے متعلق کوئی بات آپ نے پائی ہو، تو ضرور مطلع فرمائیں۔

آپ کو ہزار کام ہوں مگر نقالوں کو فراموش نہ کیجئے۔ میں بحالی صحت کے لئے سرینگر جا رہا ہوں۔ وہاں یہ نقال اکثر پائے جاتے ہیں اور درحقیقت یہی اصل ہیں جن کی نقل ہندوستان میں کی گئی۔ وہاں کے درباروں میں یہ کشمیری بھانڈ موجود رہتے تھے۔

کام کی کثرت سے نہ گھبرائیے۔ کئے جائیے۔ آپ سے آپ مکمل ہو جائیں گے۔ سری نگر سے اطلاع دوں گا۔ آپ بھی آجائیں تو کیا اچھا ہو۔ تعطیلیں یہاں گزاریں۔ کام بھی آسانی سے ہو جائے گا۔ کشمیر کام کرنے کی جگہ ہے۔ بہت سے لوگ اس لئے یہاں آتے ہیں۔ سکون، خاموشی، موسم خوشگوار، قلم اور دماغ اور کیا چاہتے ہیں۔

خیر اندیش

محمد عمر

موتی لال ساقی سپلا اکادمی لال منڈی سرینگر

ریاست میں ادبی انجمنیں اور رسائل

اگرچہ یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے کہ ادبی اور تمدنی ادارے ادیب اور فنکار پیدا نہیں کرتے، کیونکہ اس قبیل کے لوگ تربیت کے بل بوتے پر وجود میں نہیں آتے بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ میرا یہ عقیدہ اب بھی اٹل ہے کہ ادیب یا فنکار کی انفرادیت، تربیت اور تہذیب کے مقابلے میں زیادہ اہم اور باثر رول ادا کرتی ہے مگر اس امر کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ادبی اور تمدنی ادارے تہذیبی قدروں کے پھیلاؤ، فنکاروں اور ادیبوں کو مجتمع کرنے اور اُن کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر اُن کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنے کے معاملے میں ایک سرگرم اور سرانداز رول کو نبھانے کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس قسم کے ادارے دانشوروں کو جنم تو نہیں دے سکتے مگر دانشوروں کو آگاہ کر کے دوسروں تک پہنچانے میں ان اداروں کے کردار کو پست پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ ... پیش نظر کسی زبان کے

تہذیب یا قوم کی تمدنی تاریخ کو قلمبند کرتے وقت اس نوعیت کے اداروں کا ذکر واقعات کا ایک اہم حصہ قرار پایا ہے۔ تخلیقی ادب اجتماعی کوشش کے مقابلے انفرادی سعی کا حامل ہوتا ہے مگر تمدنی ادارے انفرادی سعی کو مناسب مقام عطا کرنے کا فرض انجام دیتے ہیں۔ برصغیر کی ادبی تاریخ میں کشمیریوں کی دین اس قدر گرانقدر ہے کہ کوئی بھی شخص اس سے آنکھیں چُرا کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سنسکرت ادب سے اگر کشمیریوں کی تخلیقات کو خارج کیا جائے تو وہاں فقط ڈھانچہ باقی رہتا ہے۔ .... فارسی کے میدان میں کشمیری قلمکاروں نے وہ جوہر دکھائے کہ وادی گلپوش کو ایران صغیر کا رتبہ مرحمت ہُوا۔

جہاں تک سنسکرت اور فارسی کا تعلق ہے۔ شواہد کی غیر موجودگی میں یہ بتانا ممکن ہے کہ ان زبانوں کے ادب کے فروغ میں مختلف اداروں کا رول کیا رہا ہے، مگر اُردو علاقائی زبان اور یہاں کی مادری زبان نہ ہونے کے باوجود گذشتہ ایک صدی سے ریاست پر چھائی ہوئی ہے اور اس لیے یہاں سرکاری زبان کا آئینی رتبہ حاصل ہے۔ اُردو گذشتہ صدی کی نویں دہائی میں کشمیر کی سرکاری زبان قرار پائی۔ چنانچہ اُردو میں لکھی ہوئی اس وقت کے شاہی دربار کی روئیداد آج بھی بعض سے تعلق رکھتی ہے اور اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ اُردو نے بیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے ہی ریاست میں اپنے قدم اچھی طرح جمائے تھے، رواں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں چونکہ کشمیر سے کوئی رسالہ وغیرہ شائع نہیں ہوتا ہے اس لئے کشمیری قلمکاروں کی نگارشات ملک کے دوسرے حصّوں سے شائع ہونے والے رسائل وغیرہ میں چھپتی تھیں، اس سلسلے میں سر تیج بہادر سپرو کا "کشمیر درپن"

تعمیر

خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے ۔ یہ رسالہ اس صدی کی پہلی دہائی میں الہ آباد سے شایع ہوتا تھا۔ رسالے میں کشمیر کے لکھنے والوں کی تخلیقات کے علاوہ کشمیر کے مسائل کو بھی زیر بحث لایا جاتا تھا۔ کشمیر درپن کے بعد اس فن میں 'بہار کشمیر' لاہور کا ذکر ناگزیر ہے ۔ یہ رسالہ لاہور میں مقیم ایک کشمیری پنڈت نکالتا تھا اور اسمیں اکثر بیشتر مضامین کشمیری قلمکاروں کے ہوتے تھے' یہ پہلا رسالہ تھا جسمیں اردو کے علاوہ کشمیری مضامین دیوناگری میں چھپتے تھے ۔ وادی میں ادبی سرگرمیوں کی نشوونما میں علامہ اقبال کے دوست میر منشی سراج الدین اور چودھری خوشی محمد ناظر کا رول تاریخ ساز رہا۔ ناظر صاحب اس صدی کے اوایل میں سرکاری افسر بن کر کشمیر آئے اور زندگی کے آخری ایام تک یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔ اس دوران وہ مختلف ممتاز سرکاری عہدوں پر فایز رہے ۔

منشی سراج الدین شعر وسخن کا ستھرا ہوا ذوق رکھتے تھے' ریذیڈنسی میں ملازمت کے دوران انہوں نے ایک ادبی حلقہ قایم کیا جس کا نام انجمن مفرح القلوب رکھا گیا۔ اس انجمن کے ساتھ ریذیڈنسی سے منسلک کچھ دوسرے لوگ بھی شامل ہوگئے' کیونکہ یہ لوگ بھی شعروسخن کے دلدادہ تھے۔ آہستہ آہستہ انجمن کا دایرہ وسیع ہوتا گیا اور باہر کے لوگ بھی انجمن مفرح القلوب کی محفلوں میں شریک ہونے لگے ۔ انجمن کے اجلاس اب ریذیڈنسی تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اس کے اجلاس منشی سراج الدین کے گھر پر بھی ہونے لگے ۔ انجمن کا دایرہ وسیع ہونے سے مقامی شعرا اور ادباء اس کی محفلوں میں شامل ہونے لگے اور اس طرح یہ انجمن ایک جاندار اور بااثر ثقافتی ادارے میں تبدیل ہوگئی۔ منشی صاحب کی مرنجاں مرنج شخصیت ایک ایسی شمع بن گئی جس کے اردگرد پروانے منڈلانے اور رقص کرنے لگے ۔ اس انجمن کے باقاعدہ شرکا

میں چودھری خوشی محمد ناظرؔ شامل تھے، جن کو بلاشبہ انجمن کی جان کہا جا سکتا تھا۔ اس انجمن کو مفرح الارواح کا نام بھی دیا گیا ہے۔ انجمن کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی محفلوں میں دوسرے لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبالؔ، سر شیخ عبدالقادر، سر محمد شفیع اور جسٹس شاہ دین ہمایوں بھی شریک ہوئے ہیں۔ انجمن بہار یہ محفلوں کا اہتمام، نسیم، نشاط اور شالہ مار کے مغل باغات میں کرتی تھی۔ کبھی کبھی مشاعروں کا اہتمام ڈونگوں اور شکاروں میں کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مشاعروں کو تیرتے مشاعروں کا نام دیا گیا ہے۔ یہ انجمن رواں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں سرگرم عمل تھی۔ ملک فضل اللہ نے انجمن کی سرگرمیوں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے[1]

• میں جاتے ہی اس انجمن کا عارضی ممبر بن گیا۔ مجھے غالبؔ، حسرتؔ اور اقبالؔ کی غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھنے کا شوق تھا اور اس انجمن کے ارکان ان کے دلدادہ تھے۔

انجمن کی گلبار محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے ملک عزیز نے لکھا ہے[2]:۔

• عید کی نماز ہم نے اس عیدگاہ میں پڑھی، جو بعد میں تحریک آزادی کشمیر کی جلسہ گاہ بن گئی اور نماز کے بعد، انجمن مفرح القلوب کا اجلاس منشی سراج الدین خان کے مکان پر منعقد ہوا۔ تفریح اور مسرت کا ہنگامہ برپا تھا، غم عشق تھا نہ غم روزگار، لطائف، نقلیں اور قہقہے جاری تھے...

انجمن نصرت الاسلام

اس انجمن کا مقصد اگرچہ تعلیمی اور سماجی تھا مگر اس کے قیام سے اردو کی ترویج اور ترقی میں خاصا فائدہ ہوا۔ اس انجمن کا قیام ۱۹۰۵ء میں عمل میں آیا۔ اس کے

---

[1] کشمیر میں اردو۔ عبدالقادر سروری، مرتب محمد یوسف ٹینگ

تعمیر

بانی مبانی میر و اسد رسول شاہ صاحب بلا مبالغہ کشمیر کے سرپرست تھے ۔ لاہور میں قائم انجمن حمایت اسلام کی طرح انجمن نصرت الاسلام کی سالانہ تقریب یادگار ہوا کرتی تھی اردو کے کچھ جانے پہچانے شعرا چونکہ اس انجمن سے وابستہ تھے اس لئے سالانہ اجلاس میں نظمیں سنانا پروگرام کا حصہ قرار پایا تھا۔ انجمن کے سالانہ اجلاس کے موقع پر منشی امیرالدین امیر اور صادق علی خان صادق اپنی پُرجوش نظمیں سنا کر داد و تحسین حاصل کرتے تھے ۔ کئی جلسوں میں مورخ محمد الدین فوق بھی شامل رہے ہیں۔ سالانہ تقریب کی ساری روئیداد نظموں وغیرہ کے سمیت ہر سال شائع کی جاتی تھی، جس کی بدولت انجمن کی کارکردگی سے زیادہ سے زیادہ لوگ آشنا ہو جاتے تھے۔ انجمن کی خصوصی تقریبات میں کشمیری پنڈتوں کے علاوہ انگریز آفیسران بھی شامل ہوتے تھے۔ انجمن کی تقریبات میں منشی غلام محمد خادم نے بھی کئی بار اپنا کلام سنایا ہے۔

بزمِ سخن

۱۹۰۴ء کے آس پاس شعر و ادب سے شغف رکھنے والے جموں کے کچھ نوجوانوں نے اس انجمن کو وجود بخشا۔ بزم کی ہفتہ وار میٹنگوں میں اکثر طرحی کلام پیش کیا جاتا تھا۔ اس انجمن کا الگ سے کوئی دفتر تو تھا نہیں۔ ابتدا میں اس کا مرکز چراغ شاہ کا مکان تھا مگر بعد میں مجالس کا اہتمام غلام حیدر خان کے مکان پر ہوتا تھا۔ بزمِ سخن کے قیام نے جموں میں لوگوں کا ذوقِ ادب نکھارنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ انجمن ہفتہ وار جلسوں کے علاوہ سالانہ مشاعروں کا اہتمام بھی کرتی تھی۔ انجمن کے مشاعروں اور جلسوں میں جن ادبی شخصیتوں نے حصہ لیا ہے اُن میں حفیظ جالندھری، سیماب اکبرآبادی،

تابور غیب آبادی، سرچند ناخوش، دیوان جوالا سہائے، مولانا علیم الدین سالک، سوہن لال ساحر، عرش صہبائی اور رعابد علی عابد شامل ہیں۔

ابتداء میں انجمن کی سرگرمیاں صرف جموں تک محدود تھیں مگر بعد میں اس کا دائرہ کثیر تک بڑھایا گیا اور اس کا نام بزم سخن کی جگہ بزم اردو جموں و کشمیر رکھا گیا۔ انجمن کے اہتمام سے بہار میں مشاعروں کا انعقاد سری نگر میں کیا جاتا تھا اور سرما میں جموں میں سالانہ صنعتی نمائش کے موقعہ پر سری نگر میں بھی انجمن مشاعرہ منظم کرتی تھی۔ انجمن ۱۹۴۷ء تک قائم تھی۔ انجمن کے پہلے کشمیری صدر پنڈت دینا ناتھ مست منتخب ہوئے تھے اور مشن سکول سری نگر کے احاطے میں ایک شاندار مشاعرہ انجمن کی کوششوں سے ہوا تھا۔

بزم مشاعرہ

بزم سخن کی طرح بزم مشاعرہ کا قیام بھی جموں کے اہل ذوق حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ یہ انجمن ۱۵۔۱۹۱۶ء میں قائم ہوئی۔ انجمن پندرہ روزہ مشاعروں کو منظم کرتی تھی اس کے اجلاس اکثر و بیشتر جموں کے عجائب گھر میں ہوتے تھے۔ مشاعروں میں پڑھا گیا کلام کتابچوں کی صورت میں شائع ہوتا تھا۔ بزم کا قیام چونکہ کچھ سرکاری آفیسروں کے دم و قدم کا مرہون منت تھا اس لئے یہ پُر وقار انجمن دو تین سال کے بعد اس وقت بکھر گئی جب سرکاری آفیسروں کا تبادلہ ادھر اُدھر ہو گیا۔

اخوان الصفا

سری نگر میں ہندوستان کی چوتھی دہائی میں اخوان الصفا کے نام سے ایک

انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ انجمن کے سرگرم اراکین میں مولانا حیرت کاملی، مولانا مبارک شاہ فطرت، عبدالحق برق وغیرہ شامل تھے۔ اردو کی ترقی میں اس انجمن نے بہت اچھا کام کیا۔ اس انجمن کے سرگرم اراکین میں ایسے لوگ شامل تھے جو صرف اردو کے شاعر نہ تھے بلکہ فارسی اور کشمیری پر بھی دسترس رکھتے تھے اور ان زبانوں میں اشعار بھی لکھتے تھے۔ اس انجمن کے اراکین روایت کے زبردست دلدادہ تھے۔ اس لئے جدت پسندوں کے تئیں انجمن کے اراکین کا رویہ معاندانہ تھا۔ اس انجمن نے کشمیر میں ادبی ذوق کو نکھارنے میں بہت اچھا کام کیا۔

کشمیر رائیٹرز لیگ

اس انجمن کا قیام اس صدی کی پانچویں دہائی میں شیام لال ولی تیرتھ کاشمیری کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ انجمن کا کوئی خاص دفتر نہیں تھا بلکہ اس کے اجلاس مختلف ادبا کے گھر پر ہوتے تھے۔ انجمن کے جلسوں میں شمولیت کرنے والوں میں غلام احمد مہجور، پریم ناتھ پردیسی، سومناتھ زتشی، رادھا کرشن جنوں، گنگا دھر بٹ دیہاتی وغیرہ شامل تھے۔ اس بات کا پتہ نہیں چل سکا ہے کہ انجمن کا شیرازہ کب بکھر گیا۔ غلام احمد مہجور نے اپنی ذاتی ڈائری میں انجمن کی سرگرمیوں کا مختصراً ذکر کیا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین

ملک میں ترقی پسند مصنفین کا قیام ۱۹۳۶ء میں عمل میں آیا، اور اس کی شاخیں ملک کے دوسرے حصوں میں بھی قائم ہوئیں۔ کشمیر میں انجمن کی شاخ ۴۳ - ۱۹۴۲ء کے دوران قائم کی گئی۔ اس کے ابتدائی ممبران میں پریم ناتھ پردیسی، رامانند ساگر

سوما ناتھ زتشی اور ل۔م۔شاد شامل تھے۔ انجمن کے ہفتہ وار اجلاس اکثر پریم ناتھ پردیسی کے گھر پر ہوا کرتے تھے۔ اس کے مختلف جلسوں میں جن برگزیدہ ادبی شخصیات نے حصہ لیا ہے اُن میں بلراج ساہنی، غلام احمد مہجور، عبدالستار عاصی، رامانند ساگر، پروفیسر ہاشمی، سہیل عظیم آبادی، دیوندر ستیارتھی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ شامل ہیں۔

ادبی ذوق کو نکھارنے میں اہلمر ریڈنگ روم کی کارکردگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس ریڈنگ روم کے روح رواں تیرتھ کشمیری تھے۔ رسائل اور اخبارات کا مطالعہ کرنے کے علاوہ اس ریڈنگ روم میں شعری اور ادبی مذاکرات کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔

اردو سبھا

یہ انجمن پہلے ایس پی کالج میں بزمِ ادب کے نام سے قائم تھی مگر محمد دین تاثیر کے پرنسپل مقرر ہونے پر اُن کے ایماء پر انجمن کا نام بزمِ ادب سے اردو سبھا رکھا گیا۔ یہ بزم باقاعدگی کے ساتھ محفلوں کا اہتمام کرنے کے علاوہ مشاعروں کا انتظام بھی کرتی تھی۔ مشاہیر کو مدعو کرنا اس کی کارکردگی کا ایک حصہ تھا۔ یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۰ اور ۱۹۴۷ کے درمیان کئی اہم مشاعرے ایس پی کالج کے آڈیٹوریم میں ہوئے۔ جن کو منظم کرنے میں اس ادبی ادارے کا بھی ہاتھ تھا۔

بزمِ ادب

یہ ادبی انجمن غلام حسن بیگ عارف نے ۱۹۴۴ء میں قائم تھی۔ بزم کا دفتر دکان سنگین فتح کدل میں تھا۔ عارف صاحب نے اس کی جانب سے رواں

صدی کی چھٹی دہائی میں 'گلریز' نام کا رسالہ جاری کیا۔ یہ رسالہ کئی سال تک ایک ماہنامہ کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ ابتداء میں رسالے کے مدیر کامل صاحب رہے مگر بعد میں یہ کام پروفیسر محی الدین حاجنی کی سرپرستی میں کئی سال تک ہوتا رہا۔ 'گلریز' اس لحاظ سے اپنی قسم کا متنوع رسالہ تھا۔ اسمیں اُردو فارسی اور کشمیری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ تخلیق سے لے کر تحقیق تک ہر قسم کے مضامین رسالے میں جگہ پاتے تھے۔ رسالے میں خطاطی کے مختلف نمونوں کو نمایاں طور پر جگہ ملتی تھی۔ بزم ادب کی سرپرستی میں کئی کتابیں بھی شائع ہوئیں جن میں کامل صاحب کی حبۂ خاتون اور رباعیات عارف قابل ذکر ہیں ۱۹۵۶ء کے بعد گلریز کو عارف صاحب نے سر نو چالو کرنے کی سعی کی اور اس کی ادارت کے فرائض غلام نبی خیال کے سپرد کئے مگر دوسری بار گلریز کے جو بھی شمارے شائع ہوئے اُن میں اردو تخلیقات کو جگہ نہیں دی گئی۔

قومی کلچرل محاذ

۱۹۴۷ء کے آخر میں قبائلی حملے کے پیش نظر سرینگر میں ایک ہنگامی تنظیم قومی کلچرل محاذ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ انجمن ادبی سے زیادہ سیاسی نوعیت کی تھی مگر اس کے تواریخی رول سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ انجمن کم و بیش ایک نیم سرکاری ادارہ تھی۔ ابتداء میں اس ادارے نے 'تعمیر' نام کا ایک رسالہ شائع کیا جس میں اردو کے ساتھ کشمیری تخلیقات بھی جگہ پاتی تھیں۔ ابتدائی دور میں اس رسالے کا مدیر مشہور صحافی دلیات برنیدر ناتھ ظفر پیامی تھا۔ ادارے کے کام میں تال میل پیدا کرنے کے لئے ہندی کے مشہور ادیب شوران سنگھ چوہان اور اداکارہ شیلا بھاٹیہ بھی اس کے ساتھ منسلک تھی۔ ۱۹۴۸ء میں اس ادارے نے 'ہمارا جاگتا کشمیر' نام کی قومی گیتوں پر مشتمل ایک کتاب شائع کی جس کے

ترتیب کار بشیر عبدالاحد ہیں۔ یہ کتاب اردو اور کشمیری کے انقلابی نغموں کا مجموعہ ہے جس میں مولانا محمد سعید مسعودی، پریم ناتھ پردیسی، مخدوم محی الدین، پریم دھون، وشوا ناتھ ماہ کے اردو نغموں کے علاوہ نادم، روشن، مہجور، ماسٹر زندہ کول، بہار وغیرہ کے کشمیری نغمے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کی اشاعت سے کشمیری میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا جس نے بعد کشمیری شاعری کے مزاج کو بدل کے رکھ دیا۔

قومی کلچرل محاذ کا دفتر نمائش گاہ میں تھا اور بعد میں اسی کا نام کلچرل کانگریس رکھا گیا جس کے مختلف شعبے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اسی انجمن کا ایک حصہ تھی۔ کشمیری کے آج کے دور کے کچھ معتبر ادیب اُس زمانے میں اردو میں لکھتے تھے، ان لوگوں میں نادم، راہی، کامل، اختر وغیرہ شامل ہیں۔ ادارے کی جانب سے 'کونگ پوش' نام کا ایک رسالہ بھی شائع ہوتا تھا۔ کبھی کبھی 'کونگ پوش' جو کہ بنیادی طور پر کشمیری کے لئے مخصوص تھا، میں اردو تخلیقات بھی جگہ پاتی تھیں۔

۱۹۵۴ء میں یہاں کلچرل کانفرنس نام کی ایک اور انجمن بنی جس کا دفتر ریگل چوک میں واقع رائل ہوٹل کی اوپری منزل میں تھا۔ انجمن کے ارکان میں نئے لکھنے والوں کے علاوہ وہ سب لوگ شامل تھے جو پہلے انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ وابستہ تھے۔ ایک اعتبار سے یہ انجمن کلچرل کانگریس کا ہی نیا روپ تھا۔ دوسری دفعہ قائم ہونے پر کلچرل کانفرنس نے اردو اور کشمیری میں کونگ پوش کا الگ الگ اجرا کیا۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے، اردو کونگ پوش کا صرف ایک ہی شمارہ شائع ہو سکا۔ اسی زمانے میں شمیم احمد شمیم نے کلچرل فورم نام کی ایک اور انجمن قائم کی۔ اس انجمن کا دفتر بھی ریگل چوک میں واقع تھا۔ اس کے ہفتہ وار جلسوں میں اردو اور کشمیری کے ادیب باقاعدگی کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔

خانیار کے حلقہ علم ادب کا ذکر نہ کرنا ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ اس انجمن سے اردو اور کشمیری کے اچھے ادیب منسلک تھے۔ اس ادارے کے ہنگامہ خیز اجلاس اب بھی یادگار ہیں جو اردو ادیب اس انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اُن میں پشکر ناتھ، برج پریمی، وجیہ احمد، وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ حلقہ علم و ادب کے زمانے میں ہی مخمور بدخشی اور حکیم منظور وغیرہ نے مل کر حلقۂ اربابِ ذوق کی بنیاد ڈالی۔ یہ انجمن کچھ دیر قائم رہی اور بہت مفید کام کیا مگر کافی دیر تک اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکی۔ گذشتہ دو دہائیوں سے اردو ہندی سنگم نے کچھ مفید کام کیا ہے مگر اس کی سرگرمیاں اب صرف انعامات اور اعزازات عطا کرنے تک ہی محدود ہو کے رہ گئی ہیں۔

اردو کی ترقی اور ترویج میں ریاستی کلچرل اکادمی کا کام سنہری حروف سے لکھے جانے کا مستحق ہے۔ اس بلند پایہ علمی و ادبی ادارے نے اپنے قیام کے پچیس سالوں میں اردو ادب کے لیے تاریخ ساز کام کیا ہے۔ درجنوں کتابیں شائع کرنے کے علاوہ اکادمی 'شیرازہ' کے نام سے اردو میں ایک ماہنامہ شائع کرتی ہے جسے ملک اور ریاست کے اہلِ قلم اور اہلِ دانش کا تعاون حاصل ہے۔ اس رسالے نے کچھ یادگار نمبر شائع کئے ہیں، جو اردو ادب کی تاریخ میں سنگ میل ہیں ایسے نمبروں میں، 'ثقافت نمبر'، 'نہرو نمبر'، 'زون نمبر'، 'شیخ العالم نمبر'، 'لل دید نمبر'، 'اقبال نمبر'، 'نوتی نمبر'، 'صادق نمبر' وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اکادمی کی مطبوعات میں ڈاکٹر گیان چند کی 'تفسیر غالب' ..... 'عبدالقادر سروری کی کشمیر میں اردو' عبدالاحد آزاد کی 'کشمیری زبان اور شاعری'، 'ریشیات'، 'برج لور'، 'فضل اقبال'، 'ڈوگری اور پہاڑی آرٹ' وغیرہ قابل قدر بھی ہیں اور قابل ذکر بھی۔ اکادمی نے میر کا جو دیوان

شائع کیا ہے، اُس کی تو سارے ملک نے داد دی ہے۔

کچھ سال پیشتر اکادمی بزمِ شیرازہ کا انعقاد کرتی تھی اور اب اُردو، کشمیری اور دیگر زبانوں کے نوجوان ادباء کی محفلوں کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے، ان محفلوں میں ادیب اپنی تخلیقات پڑھ کر سناتے ہیں اور بعد میں ان پر باقاعدہ بحث ہوتی ہے۔ نوجوان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے گذشتہ کئی سال سے شیرازہ کا ایک شمارہ اُن کی تخلیقات کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اکادمی ہر سال اُردو کی درجنوں کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی معاونت کرتی ہے۔ کشمیر سے شائع ہونے والی مختلف زبانوں کی کتابوں میں شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہوگی جس کی مالی معاونت اکادمی نے نہ کی ہو۔

کشمیر یونیورسٹی بھی اردو کی ترقی کے لئے اپنا حصہ ادا کرتی رہی ہے۔ یونیورسٹی کا اردو شعبہ ایک رسالہ شائع کرنے کے علاوہ سمیناروں کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ نے اب تک ملکی پیمانے پر اقبال پر سمیناروں اور مذاکروں کو کامیابی کے ساتھ منظم کیا ہے۔ اقبال کے بارے میں انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے کچھ کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جو کہ اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ اُردو شعبے اور اقبال انسٹی ٹیوٹ میں کئی طلبہ اور طالبات پی۔ ایچ۔ ڈی کر چکے ہیں اور دوسرے لوگ آج مصروفِ کار ہیں۔ یہ سبھی اقدامات اُردو کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں دور رس نتائج کے متحمل ہیں۔

اُردو کی ترقی اور پھیلاؤ کے سلسلے میں ریاستی حکومت کے نظامت اطلاعات کا کام کسی سے کم نہیں ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس محکمے کا کام پروپیگنڈا ہے، ادبی میدان میں جو کچھ اس محکمے نے کیا ہے اُسے نظر انداز کرنا کشمیر میں اُردو کی تاریخ کو ادھورا چھوڑنا ہے۔ اس محکمے کی جانب سے ۱۹۵۴ء میں "تعمیر" نام کا رسالہ جاری کیا گیا۔

تعمیر

جو کئی سال تک اردو کا دامن موتیوں سے بھرتا رہا۔ ابتدا میں اس رسالے کی ادارت کے فرائض شمیم احمد شمیم نے انجام دیئے، اس کے بعد یہ فرض محمد یوسف ٹینگ نے بدرجہ احسن انجام دیا۔ مسٹر انصاری بھی کچھ دیر تک اس کے مدیر رہے۔ اس دور میں تعمیر ہندوستان اور پاکستان میں شایع ہونے والے کسی بھی مقتدر ادبی رسالے سے کم نہیں تھا۔ تعمیر کے مہجور نمبر اور آزاد نمبر کو کشمیری زبان و ادب کا کوئی بھی طالب علم نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اب تعمیر گذشتہ کئی سال سے دوبارہ باقاعدگی کے ساتھ شایع ہو رہا ہے، اب جب کہ اس کی ادارت جواں سال اور جوان فکر شاعر خالد بشیر کو سونپی گئی ہے، توقع کی جاسکتی ہے کہ ملک کے ادبی سوایئے میں تعمیر ماضی کی شاندار روایت کو نئی زندگی دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گا۔ خالد کی ادارت میں تعمیر کے "پریم چند نمبر" اور "مہجور نمبر" شایع ہوتے ہیں جو کسی طرح بھلائے جانے کے مستحق نہیں۔

بہت دنوں پہلے نظامت اطلاعات نے روح غنی کے نام سے ایک خوبصورت اور یادگار کتابچہ شایع کیا ہے۔ چھٹی دہائی میں ریاستی نظامت اطلاعات میں "لالہ رخ پبلیکیشنز" نام کا ایک شعبہ تھا، جس نے بہت اچھا کام کیا مگر بعد میں یہ شعبہ بند کر دیا گیا۔

جہاں تک ریاست میں ادبی جریدوں کی اشاعت کا تعلق ہے اس ضمن میں سب سے پہلے "ہمالیہ" کا نام آتا ہے، یہ رسالہ اس صدی کی چوتھی دہائی میں ویر ویشیشور نے جاری کیا اور چند ایک شمارے شایع کر کے بند ہو گیا۔ اس کے بعد حکیم جانکی ناتھ کے "سواستکا" کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس رسالے کی ادارت ویر ویشیشور، بشمبر ناتھ کول اور گنگا دھر بٹ دیہاتی کرتے تھے۔ رسالے کے لکھنے والوں میں نازکی، پردیسی، شاہد، مبکش، نادم طاؤس، بلبل، سالک، برق، غیبری، تیرتھ وغیرہ کی تخلیقات کے ساتھ مہجور اور آزاد کی نظمیں شایع ہوئی ہیں۔ اسی رسالے کے فایل دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پنڈت

تعمیر

میر

کشپ بندھو نثر لکھنے کے علاوہ اردو شاعری بھی کرتے تھے چناں چہ اُس کی کچھ نظمیں سواستکا میں چھپی ہیں۔

۔ پریم ناتھ بزاز کا وتستا اگرچہ دیوناگری میں چھپتا تھا مگر یہاں فرق صرف رسم الخط کا تھا ورنہ اس کے مضامین اُردو میں ہوا کرتے تھے۔ اخبار ہمدرد کے ادبی ایڈیشن اتنے دل کش اور پُر مغز ہوا کرتے تھے کہ ایک مکمل ادبی جریدے کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ کشمیر میں ادبی جرائد کی کمی یہاں کے اخباروں کے ادبی ایڈیشن پورا کرتے تھے۔ اخبار خدمت کے سنڈے ایڈیشن تو اب کسی بھی اخبار کی قسمت نظر نہیں آتے۔ جموں سے شائع ہونے والے رسالوں میں 'رتن' کا ذکر اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ جریدہ سارے ملک میں اپنی نوعیت کا منفرد بچوں کا میگزین تھا۔ رتن نے جو طرح ڈالی وہ آگے چل کر ملک کے دوسرے رسالوں کی منزل بن گئی۔

۱۹۵۸ء میں سرینگر سے 'دلیش' نام کا رسالہ جاری ہوا، جس کے کچھ اچھے شمارے منظر عام پر آگئے مگر یہ رسالہ جلد ہی موت کی آغوش میں سو گیا۔ اسی طرح 'نگینہ' بھی چند ایک شمارے شائع کر کے بند ہو گیا۔ کالج میگزینوں کی صف میں 'پرتاپ' 'لالہ رخ' 'ہمپوش' اور 'زون' کا ذکر کرنا اس لئے ضروری ہے کہ ان میں لکھنے والے آگے چل کر کاروانِ ادب میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔

سری نگر سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'آزاد' کا تذکرہ میں الگ سے کرنا چاہتا ہوں یہ اردو ماہنامہ نشاط پریس کی طرف سے شائع ہوتا تھا۔ اور نشاط پریس کے مالک بدری ناتھ کول اس کے مدیر تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۵۳ء تک باقاعدگی کے ساتھ چھپتا تھا۔ رسالے میں کشمیری ادب اور تمدن سے متعلق مضامین ترجیحی طور پر شائع ہوتے تھے۔ نہالکے

تتمہ

چشمے' کے مستقل عنوان کے تحت رسالے میں کشمیری تخلیقات کے اُردو تراجم شائع ہوتے
تھے۔ چونی لال ترسل کا ناول "عزان کے پتے" اس رسالے میں بالاقساط چھپتا تھا۔
آزاد میں لکھنے والوں میں رحمان راہی، قمر دوآتی، کنول کرشن بالی، ڈاکٹر عزیز احمد،
بی۔ این۔ نثار، بنسی نردوش وغیرہ شامل رہتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں دہلی سے 'ہمپوش'
نام کا ایک رسالہ بزم ادب کی طرف سے شائع ہوا۔ جس کا اردو حصہ خاصا جاندار ہوتا تھا۔
یہ رسالہ دو سال تک جاری رہا۔ اسمیں کشمیر کے اردو لکھنے والوں کی چیزیں چھپتی رہتی تھیں

ڈاکٹر محبوبہ وانی شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی

جموں وکشمیر میں اردو

مسائل و مستقبل

لسانیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ زبان صدیوں کے طویل سفر کے بعد معرض وجود میں آتی ہے۔ زبان کی پیدائش اور نشو ونما میں بنیادی طور پر سماجی سطح پر اظہاریت کی خواہش کارفرما ہوتی ہے، صدیوں کے تہذیبی سفر میں اس کا واسطہ بہت سی قوموں اور نسلوں سے پڑتا ہے۔ اور ان کے گوناگوں تجربے اس میں شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح زبان تہذیب کی ایک علامت بن جاتی ہے۔ اس میں کئی نسلوں کا خون جگر شامل ہوتا ہے۔ ایشائی تہذیب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت وسعت اور لچک ہے۔ کسی بھی تہذیب کو قبول کرنے کے لئے اس کے تمام دریچے کھلے رہتے ہیں۔ قوموں، مذاہب اور نسلوں کے باہمی ارتباط نے یہاں کی زبانوں میں وسعت اور لچک پیدا کی ہے۔

جموں وکشمیر بھی ایشیا کا ایک ایسا ہی حصہ ہے، جہاں ہمیشہ مختلف تجربوں اور تہذیبوں کی آمیزش ہوتی رہی ہے، اور اس آمیزش کی وجہ سے یہاں کی زبان و

تعمیر

ادب میں متعدد پہلو پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں کے لوگ قدیم زمانے سے مختلف حملہ آوروں اور مطلق العنان بادشاہوں اور راجاؤں کے ظلم و تشدّد، غلامی، جہالت اور پس ماندگی کا شکار رہنے کے باوجود اپنی فطری ذہانت، قابلیت، ہوش مندی سے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک کو بھی گہرے طور پر متاثر کرتے رہے ہیں، مسلمانوں کے دورِ حکومت میں جب فارسی زبان کا رواج ہوا تو یہاں کے عالموں نے نہ صرف فارسی زبان میں مہارت پیدا کی۔ بلکہ اسے شعری اظہار کا ایسا موثر وسیلہ بنایا کہ بیسوں قابل قدر شعرا سامنے آئے جن کے کارناموں سے اہلِ ایران دنگ رہ گئے۔ ملکی سطح پر تو ہر زمانے میں کشمیری ذہن کی طباعی گہرائی اور فوقیت کا لوہا مانا گیا ہے۔ اقبال کو نہ صرف کشمیر سے قلبی اور آبائی وابستگی رہی، بلکہ اکثر مقامات پر اہلِ کشمیر کی دانش مندی، شرافت اور خوبصورتی کا اظہار کرتے رہے ۔

اقبال اہلِ کشمیر کی غیر معمولی ذہانت کے ہمیشہ معترف رہے، یہ ذہانت اُن کی تخلیقی شخصیّت کی پوشیدہ قوتوں کی غماز رہی ہے۔ اور جب بھی اُن کو جبر و تشدّد سے نجات پانے اور سر اٹھانے کا موقع ملا تو انہوں نے اپنی خلاقانہ مظاہر سے دنیا کو حیران کر دیا ہے۔ سپناں چہ علم و ادب، زبان دانی، موسیقی، طب اور علم نجوم میں خاص طور پر کشمیریوں نے وہ کمالات کر دکھائے ہیں کہ ملک کی پوری تہذیبی زندگی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہی ہے۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے کشمیر میں اردو کے آثار اُس وقت اُبھرنے لگے۔ جب فارسی کی شاہانہ قندیل اپنی آخری بھڑک دکھا رہی تھی۔ یہ صرف جانشینی کا مرحلہ ہی نہ تھا بلکہ تہذیبی پیوند کاری کا معاملہ بھی تھا کوئی چھ سو سال پہلے اس خوبصورت سرزمین پر کچھ ایسا ہی ماجرا بیت چکا تھا۔ اُس

تعمیر

وقت یہاں ایک نیم جان تہذیب کے کھنڈرات پر فارسی داں مسلمانوں نے ایک نئے اور تازہ دم معاشرے کی تعمیر اٹھانا شروع کردی تھی۔ لیکن اُس وقت بھی وہ بہت جلد اُمنگ کے باوجود سنسکرت کو ترک نہیں کرسکے۔ اب اس بات کی شہادتیں کثرت سے سامنے آرہی ہیں کہ ابتداء میں کشمیری سلاطین فارسی کے بجائے سنسکرت میں ہی دربار کا کام کاج اور امورِ سلطنت انجام دیتے رہے۔ بہر کیف مغلوں کی عظیم شاہنشاہت نے اس گومگو کا خاتمہ کرکے فارسی کی فرمانروائی یقینی بنادی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فارسی کو مقامی زبان سے آمیختہ کرنے اور اس کو ایک مقامی ریختہ تیار کرنے کی کوششوں کا آغاز ہوگیا۔

جب کشمیر میں اردو کی آمد اور اس کے اثر و رسوخ پر ایک جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عوامی سطح پر فارسی کی جگہ کب کی لے چکی تھی۔ اور سرکاری اور درباری سطح پر اس کی تصدیق محض ایک رسم پوری کرنے کے مترادف تھا۔ کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۸۷۴ء میں مشہور کشمیری صحافی اور لیڈر ہرگوپال خستہ اپنی کتاب "گلدستۂ کشمیر" میں لکھتے ہیں کہ

"بازاروں میں لوگ اُردو بولتے ہیں اور ہانجیوں
وغیرہ طائفوں کے لوگ سیاح سیلانیوں کے
ساتھ اسی زبان میں ٹوٹی پھوٹی گفتگو کرلیتے ہیں"

اس کے بعد اردو کے متعلق جو معلومات فراہم ہوتی ہیں وہ اس کے تہذیبی عمل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یعنی مہاراجہ رنبیر سنگھ نے تار برقی یعنی ٹیلی گرام کے لئے اردو الفاظ کے استعمال کا حکم دیا۔ اس طرح اُردو الفاظ کو ٹیلی گراف کی شناختی علامت بنانا ایک اہم پیش قدمی تھی۔ یہ نہ صرف یہاں کے اُردو کا ثبوت ہے بلکہ زندگی کی ضمانت

بھی بھی۔ ریاست میں پہلا پرنٹنگ پریس ۱۸۵۸ء میں سرلائی رامبیرھانی جموں میں قائم ہوا۔ اور یہاں فارسی اور سنسکرت کی طرح اردو میں بھی کچھ سرکاری فارم اور دستاویزات چھپتی رہیں۔ اس کے کوئی ڈھنگ بھگ دس سال بعد وہاں وکرم بلاس اور پھر بدیا بلاس پریس قائم ہوئے۔ بدیا بلاس پریس سے اسی نام کا ایک جریدہ شائع ہونا شروع ہوگیا۔ جس میں ایک کالم دیوناگری اور ایک اردو حروف میں رقم ہوتا تھا۔ یہ ریاست میں صحافت کی شمع روشن کرنے کا پہلا زینہ تھا۔ جس نے بعد میں سینکڑوں چراغ جلائے اور ساری ریاست اُن کی کرنوں سے جگمگا اُٹھی۔

فارسی اور اردو کا جھگڑا کشمیر کے کچھ اور فرزند کشمیر سے باہر لڑ رہے تھے۔ لیکن اس کے دور رس اثرات کشمیر کی لسانی صورت حال پر مرتب ہو رہے تھے۔ یہ وہ کشمیری پنڈت حضرات تھے جو اپنے وطن سے دور صوبہ جات متحدہ میں اپنی ذہانت کا لوہا منوا رہے تھے۔ فارسی اُس وقت طبقات عالیہ کی زبان تصور ہوتی تھی۔ لیکن فارسی اپنی تمام ظاہری شان و شوکت کے باوجود ایک کھوکھلا درخت بن کر رہ گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تھی۔ "بہارِ گلستانِ کشمیر" میں کشمیری پنڈتوں پر اس کے اثرات کا یوں ذکر ہوتا ہے۔

"فارسی اور اردو علم و ادب کی تکمیل
کشمیری قومی تہذیب ہندوستان کی
عزیز و متصور کی جاتی ہے۔ اس کی تکمیل
کی وجہ سے علمی مجالس اور مباحثات
میں پنڈتانِ کشمیر اقتدار اور امتیاز کی
نظر سے دیکھے جاتے تھے۔"

اُردو کے ریاست میں فروغ کا ایک اور منظر ریاستی دربار کے سرکاری کاموں میں کھلتا ہے۔ اور ریاست کے با اختیار ایوان یعنی ریاستی کابینہ کی ساری روئیداد اُردو میں ہی قلم بند ہوتی تھی اور ریاست کے آر کائیوز محکمے میں اب بھی نہایت خوبصورت خط اور بڑی پختہ زبان میں لکھی گئی روداروں کی یہ کتابیں اس زبان کی گذشتہ عظمت کی گواہی دے رہی ہیں۔ جموں کی ادبی تاریخ دراصل اردو کی تاریخ ہے اور جموں کی صحافت زیادہ تر اُردو صحافت کا دوسرا نام رہی ہے یہاں اردو کے مخصوص رول کی وجہ سے زبان کی اپنی خوبیاں ہی نہیں بلکہ جموں کے ثقافتی اور لسانی جغرافیہ کے مخصوص تقاضے بھی تھے۔ اُردو شاعروں، ڈراموں اور ادبی محفلوں کی جموں کی ثقافتی زندگی پر گہری چھاپ تھی۔ رام لیلا کا سکرپٹ بھی اُردو زبان میں تھا۔ رامائن، مہابھارت اور ہندوؤں کی کئی مذہبی کتابیں اکثر اردو میں پڑھی جاتی تھیں۔ بیشتر اسلامی لٹریچر بھی اردو میں ہی پڑھا جاتا تھا۔ ۱۹۲۴ء سے ریاست میں باقاعدہ صحافت کا آغاز ہوتا ہے جب جموں سے لالہ ملک راج صراف نے "رنبیر" نام سے ایک اُردو اخبار شروع کیا۔ جو آزادی کے بعد کئی سال تک ریاست کا سب سے با اثر اخبار رہا۔ ۱۹۴۷ء تک جموں سے دو تین روزنامے اور درجنوں ہفتہ وار اخبار شائع ہونے لگے۔ ۱۹۱۱ء سے جب جموں کی پہلی عوامی جماعت ڈوگرہ صدر سبھا کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تو اس کی ساری کارروائیوں، قراردادوں، خط و کتابت وغیرہ کے لئے اُردو ہی کا استعمال ہوتا رہا۔ تقسیم ہند سے پہلے جتنے بھی سیاسی سوال ابھرے اُن کا مطالعہ اُردو میں ہوتا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کا تنازعہ، مہاراجہ اور شیخ محمد عبداللہ کا ٹکراؤ، قومیت اور فرقہ واریت کا سوال یہاں تک کہ اُردو ہندی کا جھگڑا اور ہر تبادلہ خیال کی زبان اُردو تھی ـــــ

یہ امر واقعی حیران کن ہے کہ جب ریاست نے ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو کو اپنی سرکاری

سرکاری زبان تسلیم کرلیا تو اُس وقت کس طرح اُردو کی بجائے انگریزی کو سرکاری کاروائی کی زبان بنا دیا گیا۔ حالانکہ ہندوستان کے باقی صوبوں میں یہ رجحان بالکل مخالف سمت میں حاوی رہا۔ بہر کیف یہ بات بھی زیرِ نظر رکھی چاہئے کہ اردو کو ۱۹۲۰ء کے آتے آتے ریاست کی درباری سطح سے ہٹایا جانے لگا تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ سارے شمال مغربی ہندوستان میں اردو انقلابیوں اور باغیوں کی زبان بن گئی تھی۔ اور اُس کی لپک کشمیر تک پہنچ رہی تھی کشمیر کے لوگ سنگ اور انقلاب کی نجریں الہلال ہمدرد، زمیندار اور دوسرے اخبارات و جرائد میں پڑھ رہے تھے۔ اور ریاستی دربار میں جو منصر سمجھا گیا تھا وہ اردو کو اب دشمن کی زبان تصوّر کرنے لگا تھا۔ کشمیر میں تمدن پروری اور ادب نوازی کی فضا قائم کرنے میں کئی اہم اور نامور شاعروں اور ادیبوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد ملک گیر پیمانے پر ادب میں نئے موضوعات، تصوّرات اور نئی تحریکوں نے نئے انداز سے اُبھرنا شروع کیا۔ ملک بھر کے ادیب نئی سمتوں اور نئے راستوں کی تلاش میں لگ گئے ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں کشمیر کا اردو ادیب اور شاعر ان نئی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ سستی جذباتیت اور کھوکھلے نعروں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے اردو ادیب اور شعراء پر براہِ راست ان نئے تقاضوں کا اثر ہوا۔ ریاست بھر میں علاقائی زبانوں کشمیری، ڈوگری اور لداخی کی جانب خاص توجہ دی جا رہی ہے اور بہت سے ادیب اور شعراء اس وقت اپنی اپنی علاقائی زبانوں میں لکھ رہے ہیں، جو ان علاقائی زبانوں کے فروغ اور شاندار مستقبل کا پتہ دیتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اردو کی ضرورت اور اہمیت سے آنکھیں موند لینا کسی بھی حالت میں قابلِ فہم بات نہیں ہو سکتی۔ اردو ہی وہ واحد زبان ہے

تعمیر

جسے ریاست بھر کے لئے تبادلۂ خیالات کے لئے مشترک ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس زبان کی مدد سے ہم ریاست کی ثقافتی رشتوں کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ریاست کے جدید و قدیم ادب کو ریاست سے باہر روشناس کرانے کے سلسلے میں اردو ہی کا دامن تھام سکتے ہیں۔

اردو کے نئے رول کے بارے میں ریاستی کلچرل اکادمی، ریڈیو ٹیلی ویژن، اور دیگر ادبی انجمنوں کے علاوہ ایک ایسے اردو جریدہ کی اشد ضرورت ہے جو صرف مقامی زبانوں کے بہترین ادب کا اردو ترجمہ چھاپ کر ریاست کے دانشوروں کو ایک دوسرے کے تخلیقی رجحانات سے واقف رکھنے اور انہیں اردو سے دنیا سے اُن کا تعلق جوڑنے کا فریضہ ادا کرے۔ ریاست اپنے سیاسی، تمدنی اور جغرافیائی حالات کے اعتبار سے اردو کے لئے ایک انوکھی تجربہ گاہ بن سکتی ہے۔ جہاں کسی جذباتی اور مذہبی کشمکش کے بغیر اردو اپنی ضرورت محسوس کروا رہی ہے اور وقتی طور پر نظر انداز ہونے کے بعد جہاں اردو کی بحالی کا کام شروع ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے۔ نہایت ہی مفید اور کارآمد نتائج برآمد ہوں گے، کیونکہ اردو کی عالمگیر ہستی کے باوجود اس کے مستقبل کا دار مدار کسی حد تک ایسی مقامی ضرورتیں پورا کرنے کی صلاحیت پر بھی ہے ۔۔۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ بین الاقوامی سطح پر سیاسی، سائنسی اور فکری انقلابات کے نتیجے میں ملک کے ذہنی اور تہذیبی ڈھانچے میں بھی اہم اور نتیجہ خیز تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔ موجودہ صدی میں میکانکی اور صنعتی ترقی نے ہندوستانی سماجی، تہذیبی اور ذہنی مزاج کو بھی متاثر کیا ہے۔ چناں چہ تہذیبی نظریے اور ادبی قدریں تشکیلِ نو کے مرحلے سے گذر رہی ہیں۔ اس صورت حال سے شکست و ریخت کا سامنا بھی کرنا

پڑ رہا ہے۔ ادب، سماجیات، تہذیب، فکر، فنون لطیفہ میں روایت پرستی سے انحراف کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ انسانی تہذیب کی اس آفاقی صورت حال کا ساتھ جس خلوص، آگہی صداقت سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے باشعور فن کار کر رہے ہیں۔ کشمیر کے ادیب، مصوّر اور شاعر بھی کر رہے ہیں۔ ریاست میں اُردو ادب میں نئے تہذیبی تصورات، فکری میلانات اور عصری رجحانات کے اظہار پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ اور روایت کی زنجیروں کو توڑ کر تجربہ کاری اور جدت پسندی کو اپنا نظریہ بنا رہے ہیں۔ اور اپنی بے داری کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ معاصر آگہی کی تشدید اور پیچیدگی کے اظہار کے علاوہ اس ادب میں مقامیت، حب الوطنی، فطرت نگاری، انسان دوستی، قومی یکجہتی کے تصوّرات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ریاستی کلچرل اکادمی کے زیر اہتمام ۱۹۸۱ء میں جو پہلی اُردو کانفرنس منعقد ہوئی اُس کا افتتاح کرتے ہوئے مرحوم شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے فرمایا تھا۔

"کوئی بھی صاحب ذہن شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ایک صدی بھر سے اُردو ریاست کی تین اکائیوں کشمیر، جموں اور لداخ میں رابطے کی زبان کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتی آئی ہے — اور اس زبان میں آئندہ یہ فرض ادا کرنے کی اہلیت ہے۔ ایک قدم آگے یہی زبان پورے ملک کے ساتھ ہمارے رابطے کی زبان کا کام انجام دیتی رہی ہے۔ اس وقت بھی ہماری ریاست میں تناسب فیصدی اخبارات اردو میں ہی نکلتے ہیں جن کے قارئین کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہے۔ اور جو اعتماد و اتفاق کی ترسیل کے ریاست میں اب بھی سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ ایک زبان کی طور ہم

تہذیبی اور سماجی سطحوں پر بھی زبان ان اکائیوں کے ملاپ کی بنیادی
ضمانت فراہم کرتی ہے۔ اعتراف احسان کے طور پر یہ بات عرض
کرنا برمحل سمجھتا ہوں کہ ریاست کی آزادی کے خدوخال اسی زبان
کی مشاطگی کے مرہون منت رہے ہیں۔ ہمارے لئے یہ بھول جانا ممکن
ہی نہیں کہ ہماری آزادی کی تحریک میں اس زبان کا ایک زبردست
کردار رہا ہے۔"

بحوالہ "شیرازہ" ص ۱۴ اگست ستمبر ۱۹۸۱ء

اس احساس اور اعتراف کے باوصف یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس ضمن میں وہ اقدامات نہیں کئے گئے ہیں، جو سرکاری اور رابطے کی زبان ہونے کے باعث اردو کی ترویج و ترقی کے لئے لازمی ہیں۔ اس کی تعلیم و تدریس کا معیار ابتدائی سے ثانوی درجے تک قطعی غیر تسلی بخش ہے۔ اور اس کا براہ راست اثر اس زبان کے تخلیقی ادب پر بھی پڑتا ہے۔ بعض اوقات اچھی تخلیقات محض زبان کی کمزوری کے باعث وہ مقام حاصل نہیں کر پاتیں جس کی وہ مستحق ہوتی ہیں۔ اسی طرح سے طباعت اور اشاعت کے مسائل بھی ہیں۔ جو زبان کی ترویج اور ادب کے فروغ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ اچھے کاتبوں کا فقدان ہے اور سنگ سازی کا کام تسلی بخش نہیں ہے۔ چناں چہ کتابیں عام طور پر بھدّی صورت میں چھپتی ہیں۔ اور اس طرح سے ان کی اشاعت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اردو کتابوں کی کھپت کا مسئلہ ویسے ہی بہت مشکل ہے۔ لیکن بھدّی کتابوں کی فروخت اور بھی زیادہ مشکلات پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ریاستی کلچرل اکادمی کی کاوشوں کو سراہنا پڑے گا۔ جنہوں نے اپنے اہتمام سے چند برس قبل یہاں ایک خوش نویسی

کا ادارہ شروع کیا۔ جہاں کاتبوں کو خوش نویسی کی تربیت دی جاتی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس طرح سے کتابت کا معیار ریاست میں بلند ہو جائے گا۔ طباعت کے دوسرے مراحل میں بھی اکادمی مفید اقدامات کر سکتی ہے۔ لیکن ابھی تک نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ خود اکادمی کے رسائل و کتابیں باہر سے طبع ہو کر آتی ہیں۔

ریاست میں اُردو رسائل کا اجراء قریب قریب نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اکادمی کا "شیرازہ" جو اردو اور کشمیری میں شائع ہوتا ہے، واحد رسالہ ہے جو خالص ادبی ہونے کے علاوہ برابر پابندی سے نکلتا ہے۔ لیکن یہ ہماری ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ریاست سے کچھ اچھے رسائل جاری ہوں۔ جو نئے ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق ادیبوں کی نمائندگی بھی کریں۔ رسائل کو شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مارکیٹنگ کے رموز سے بھی واقف ہونا رسائل کے مدیروں کے لئے ضروری ہے۔ اُسی صورت میں رسائل کا شائع کرنا مفید ہو سکتا ہے۔

ان تمام معروضات کے باوصف اس بات میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ریاست میں اُردو زبان و ادب کا مستقبل درخشندہ و تابندہ ہے اور اُردو ادب کے روایتی اسکول بھی رہنمائی کے لئے ریاست کی طرف ہی دیکھیں گے۔ کشمیر بذات خود اُردو کے ایک نئے دبستان کی صورت میں اُبھر رہا ہے۔

●●

تتمہ

اکبر جے پوری۔ حسن آباد، رعناواری سرینگر۳

ریاست میں اردو مشاعروں کی روایت

اردو سارے ہندوستان میں مقبول تھی۔ البسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں اسے انگریزوں کی سرپرستی بھی حاصل ہوئی تھی۔ اردو مشاعرے عوامی توجہ اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتے تھے۔ خاندانِ تیموریہ کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر اور اودھ کے نواب واجد علی شاہ اختر کے علاوہ رامپور اور حیدرآباد کے حکمران بھی شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور درباروں میں اردو مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ جموں میں اگرچہ ڈوگری زبان کا چلن تھا۔ تاہم پنجاب اور وسط ہند میں مشاعروں کے ساتھ عام لوگوں کی دلچسپی کا اثر وادیٔ کشمیر سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔ اور جب بمعاہدہ امرتسر کی رو سے یہ گلپوش اور گلبار وادی ڈوگرہ حکمرانوں کے زیرنگیں آئی تو یہاں فارسی کی جگہ سرکاری دفاتر میں اردو کا رواج ہوا۔ یہاں کے شعراء جو کشمیری یا فارسی زبان میں شعر کہتے تھے رفتہ رفتہ اردو میں اظہارِ خیال کو ترجیح دینے لگے۔

مرزا اسعدالدین سعد صاحب وجاہت عالم اور شاعر تھے۔ اُن کی شاعری سے مرزا باغ

تمیر

صحبت میں ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۲ء میں جسٹس شاہ دین اُن کے پاس آکر ٹھہرے۔ انہیں سر عبدالقادر ایڈیٹر مخزن اور علامہ شبلی کی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ اقبال کشن ورزل کاک مفرح جو صاحب دیوان شاعر تھے، اُن سے بھی اُن کے دوستانہ مراسم تھے۔ اگرچہ مرزا سعد فارسی میں کہتے تھے مگر کبھی کبھی مشاعروں میں اردو کلام بھی پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے "کشمیر کا ایک دلچسپ فوٹو" ایک اردو نظم سنائی جو شائع ہو چکی ہے۔ مرزا کمال الدین شیدا اُن کے وارث جائز ہیں جو کلچرل اکیڈمی کے سیکرٹری بھی رہے ہیں اور ادبی سرگرمیوں میں ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے۔

بادام واری میں شگوفوں کی رونق اور موسم بہار کی آمد عوام کی تفریح کا سامان مہیا کرتی تھی۔ قلعہ ہاری پربت کے دامن میں بادام کے درختوں کے سایہ میں ہزاروں مرد عورت اور بچے چھٹی کے دن گزارنے جمع ہوتے تھے۔ ۱۹۲۱ء سے ہر سال اس موسم میں وہاں ادبی محفلیں بھی جمنے لگی تھیں۔ اُن شاعروں میں خواجہ امیر الدین امیر جو فارسی کے شاعر تھے اور اردو میں بھی کہتے تھے، خواجہ محمد امین طالب اور محمد اسماعیل نامی وغیرہ شاعروں کے ساتھ ذوق و شوق سے حصہ لیا کرتے تھے۔

۱۹۳۱ء میں علامہ سید مبارک شاہ فطرت نے "اخوان الصفا" نام کی ایک ادبی تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ وہ اپنے دولت کدے پر ہر سال بہاریہ مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے جن میں روشن صدیقی، احسان دانش اور حفیظ جالندھری اور کئی دوسرے عظیم شاعروں نے شرکت کی۔ مفکر کشمیر مولانا محمد سعید مسعودی اکثر اُن مشاعروں کی صدارت فرماتے تھے۔

جولائی ۱۹۲۵ء میں منشی سورج نرائن مہر کشمیر آئے تھے۔ اُن کے اعزاز میں سرینگر میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ طرحیں تھیں:

(۱) مرے آغوش میں دلدار صبح و شام آتا ہے۔

(۲) چلے تھے چاہتا ہوں کہ دیکھوں تجھے تنہا ہو کر

پروفیسر شکیل کا مقالہ۔ حشمت اللہ شاہ، ادبی ... کشمیر ... [illegible]

تمیر

نے اس میں شرکت کی۔

قیس شیروانی محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے۔ وہ جموں سے ایس پی ہائی اسکول سرینگر تبدیل ہوئے تو ہر سال ایس پی کالج کے ہال میں شاندار اردو مشاعرہ کا اہتمام کرنے لگے۔ منشی سراج الدین جو ریذیڈنسی میں میر منشی تھے بڑے ادب نواز اور سخن فہم تھے۔ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال بھی ان کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ اس زمانے میں چودھری خوشی محمد ناظر کشمیر میں گورنر اور ہیڈ ریونیو منسٹر رہے۔ ڈاکٹر عمادالدین سوز، غلام جیلانی اثر صہبائی، خورشید احمد خورشید (ہیڈ کلرک ریذیڈنسی) پنڈت وشوا ناتھ ماہ اور ملک محی الدین قمر قمرازی مشاعروں میں اپنا کلام سنایا کرتے تھے اور ناظر نے اپنی نظم "جوگی" ایسے ہی ایک مشاعرے میں سنائی۔

۱۹۳۸ء میں قیس شیروانی کے اہتمام سے ایک یادگار کل ہند مشاعرہ ہوا۔ اس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور محمد دین تاثیر نے بھی شرکت کی۔ اس مشاعرے کی صدارت سر تیج بہادر سپرو نے فرمائی۔ اور وہ تاریخی اعلان فرمایا جو آج بھی اردو والوں کا ایک باوقار نعرہ ہے "اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے۔ جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے۔" مقامی شاعروں میں میر غلام رسول نازکی، علامہ فطرت گیلانی، ماسٹر زندہ کول ثابت اور نند لال کول طالب نے اپنا کلام سنایا۔ غالباً یہی وہ مشاعرہ تھا جس میں حفیظ جالندھری نے اپنی مشہور نظم سے " اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے " سنائی تھی۔ قاضی محمد اسحاق کے بعد نند لال کول طالب ایس پی کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ دونوں حضرات کو شعر و شاعری کا ذوق تھا اور بڑے انہماک سے ادبی محفلوں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ ان مشاعروں کی صدارت منشی سراج الدین اور چودھری خوشی محمد ناظر کیا کرتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں کشمیر میں دستکاری کی نمائش کی ابتداء ہوئی۔ اور نمائش گاہ میں ہر سال چھوٹے بڑے مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ حفیظ جالندھری نے ۱۹۳۸ء کے مشاعرے میں

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا؛

نظم سنائی جس سے تحریک حریت میں نیا ولولہ اور جوش پیدا ہوا۔ ان مشاعروں میں ہندوستان کے مقبول شعراء شرکت کیا کرتے تھے اور ان کا اہتمام سرکار کی طرف سے ہوتا تھا۔ یہ رسم آج تک چلی آرہی ہے حالانکہ اب کلچرل اکادمی یا محکمۂ اطلاعات کے اہتمام سے یہ مشاعرے ہوتے ہیں اور مقامی شعراء ہی ان میں حصہ لیتے ہیں۔

جناب تنہا انصاری ضلع بارہ مولہ کے ایک گاؤں دلنہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے "اردو ادبی سنگم" کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی جس کے تحت بہت سے اردو مشاعرے ہوئے جن میں لاہور، راولپنڈی، جہلم اور مظفر آباد کے شعراء شرکت کیا کرتے تھے۔ ان کی مساعی سے اس علاقے میں شعر و ادب کا ذوق عام ہوا۔ عابد لودھی، علی رضا مسعود، جو صاحب دیوان شاعر ہیں اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں، تنہا نظامی، سیفی سوپوری اور سید محمد رضوی وغیرہ شعراء ان مشاعروں کی زینت ہوا کرتے تھے؛

۱۹۵۰ء میں نیشنل کانفرنس کے اہتمام سے شیر کشمیر پارک سرینگر میں ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرہ ہوا جس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمائی۔ آپ نے کرسی صدارت سنبھالتے ہوئے فرمایا کہ "میں نے دنیا میں بہت سے پیشے اختیار کئے مگر پہلی بار مشاعرے کی صدارت کر رہا ہوں" اس مشاعرے میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، مجاز، اختر ہوشیارپوری، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد اور بہت سے ممتاز شعراء شامل ہوئے۔ مقامی شعراء میں میر غلام رسول نازکی، شہہ زور، عبدالحق برق اور تنیمر قلندر نے شرکت کی۔ رات کے تین بجے تک یہ مشاعرہ جاری رہا۔

اسی سال انجمن ترقی اردو (ہند) کی ریاستی شاخ قائم کی گئی جس کے تحت سال بھر مختلف تقریبات پر ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے۔ دس سال کے عرصہ میں انجمن نے ۳۶ عظیم الشان مشاعروں کا اہتمام کیا۔ صالحہ عابد حسین، علامہ اے اے فیضی، جسٹس مرتضیٰ فضل علی

جمیل

پروفیسر ضیا بدایونی، فراق گورکھپوری اور سردار جعفری جیسی مشہور ہستیوں نے ان مشاعروں کی کرسیِ صدارت کو زینت بخشی۔ ۱۹۵۷ء میں ایک تمثیلی مشاعرہ کیا گیا جس میں بہادر شاہ ظفر کی صدارت میں غالب، مومن، اصغر، ذوق، حالی اور اقبال وغیرہ کو بہ حیثیت شاعر پیش کیا گیا تھا۔ مظفر شفیق نے (جو محکمۂ اطلاعات میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر فائز ہیں) ظفر اور محمد عبداللہ دلپور نے (جو محکمۂ تعلیم میں اعلیٰ افسر ہیں) اقبال کے کردار بہت خوبی سے پیش کئے تھے۔ ۵ اگست ۱۹۵۹ء کو ایک طرحی مشاعرہ بھی کیا گیا تھا جس میں ٹھہر شکوہ آبادی مہمانِ خصوصی تھے دو طرحیں دی گئی تھیں :-

(۱) نہیں دلشاد زمانے میں غزل خواں کوئی

(۲) محفلِ عشق میں پابندیِ آداب نہیں

جن پر پروفیسر شوریدہ کاشمیری، عبدالحق برق، امر چند ملی مضطر مغربی، حکیم غلام محمد جاوید، ڈاکٹر مشعل سلطانپوری، پنڈت سومناتھ وردفانی، غلام رسول کاوسہ، اکبر جے پوری، بدری ناتھ نثار دلوی، پروفیسر ابراہیم ذوق، سلطان الحق شہیدی، سید محمد رضوی اور دوسرے شعرا نے کلام پیش کیا۔ برق صاحب کی غزل حاصلِ مشاعرہ رہی۔ جسٹس مرتضیٰ فضل علی دل صدرِ محفل تھے تیسرے دور میں جو رات گئے تک جاری رہا۔ ڈاکٹر عبدالعزیز قریشی، ڈاکٹر اکبر حیدری اور صاحبِ صدر نے غیر طرحی کلام سنا کر داد حاصل کی۔ انجمن کو سرکاری سرپرستی حاصل نہ تھی اور نہ ہی عوام سے مالی معاونت کے لئے ہاتھ پھیلایا جاتا تھا بلکہ بقول ڈاکٹر برج پریمی یہ صرف اکبر جے پوری کی ذاتی کوششوں، ذوق و شوق اور ایثار کا کرشمہ تھا۔ انجمن ترقی اردو کے تحت بہت سے موضوعی مشاعرے بھی ہوئے۔ موسمِ بہار کے موضوع پر ایک انعامی مشاعرہ وزیرِ تعلیم پنڈت شام لال صراف کی صدارت میں ہوا۔ ہر سال حسینی مشاعرے کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا جن میں غیر مسلم شعرا بھی دربارِ حسینی میں خراجِ عقیدت پیش کرتے۔ اگرچہ شروع شروع میں حسینی مشاعروں کی محفلیں ادبی حیثیت رکھتی تھیں جن میں ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر حامدی اور ڈاکٹر شکیل الرحمان وغیرہ اردو ادب میں مرثیہ کے مختلف عناصر پر

تمہید

تحقیقی مقالے سبھی سنانے جاتے تھے۔ ان مشاعروں میں ادبی رنگ قائم رہتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ ان مشاعروں کی مقبولیت میں اس قدر اضافہ ہوا کہ اب نہ صرف ریڈیو اور ٹیلی ویژن محرم کے ایام میں ایسے مشاعروں کا اہتمام کرتے ہیں بلکہ بہت سی ادبی اور سماجی تنظیمیں بھی حسینی مشاعرے منعقد کرتی ہیں اور اعتقادی جذبہ کے تحت حسینی مشاعروں کا رواج عام ہو گیا۔ ڈاکٹر شکیل الرحمان، ڈاکٹر صادق، پروفیسر رحمان راہی، ڈاکٹر شوریدہ کاشمیری، ڈاکٹر مشعل سلطانپوری، پروفیسر مرزا محمد حسنین، پرنسپل بلقیس فاطمہ اور اکبر ہاشمی صاحب ہمیشہ انجمن کے مشاعروں کے اہتمام میں اپنا تعاون دیتے رہے۔ عام طور پر مشاعرے ایس پی کالج یا ٹیچرز ٹریننگ کالج کے ہال میں ہوا کرتے تھے جس سے مشاعروں کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی اور کثیر تعداد میں سامعین کا مجمع داد سخن دیا کرتا۔ اس کے علاوہ انجمن کے تحت ہونے والی محفلوں کی کارروائیوں کو کتابچوں کی صورت میں انجمن کی طرف سے شائع کر کے تقسیم کیا جاتا تھا جس سے وہ لوگ بھی مشاعروں سے واقف ہونے لگے جن کو شمولیت کا موقع نہ ملا ہو۔

سنہ ۱۹۵۶ء اور سنہ ۱۹۵۸ء دو سال ریاست میں انعقاد مشاعروں کی تاریخ میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مرحوم بخشی غلام محمد وزیر اعظم تھے۔ انہیں شعر و شاعری سے کافی لگاؤ تھا۔ ان کی شعرا نوازی اور ادب پروری کے باعث ان کے دور میں بڑے عظیم الشان مشاعرے ہوئے۔ انہوں نے جشن کشمیر منایا جس میں ہندوستان بھر کے ممتاز اور مقبول شعراء مدعو کئے گئے۔ سکندر علی وجد، روشن صدیقی، جوش ملسیانی، وامق جونپوری، نشور واحدی، ساغر نظامی، مجاز، ہری چند اختر اور سلام مچھلی شہری کے کلام کو سننے کے لئے جوق در جوق لوگ جمع ہوتے تھے نہیں بلکہ میر غلام رسول نازکی کے زیر اہتمام وادی کے مختلف علاقوں اننت ناگ، کولگام، شوپیان، بانڈی پورہ، بارہ مولہ، سوپور، ہندواڑہ اور چرار شریف وغیرہ علاقوں میں ان شعراء کرام کے کلام کو عوامی ذوق کے نکھارنے کا ذریعہ بنایا گیا۔ وادی کے طول و عرض میں تقریباً پچاس شاعروں میں ان مدعو شعراء نے بھی بھر کے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ بخشی صاحب نے چاندنی رات میں جھیل ڈل کا نظارہ کے موضوع پر محکمہ تعلیم کے اساتذہ کو جو نعتیہ سخن کے [illegible]

تعمیر

[redacted]

کی دعوت دی۔ اس مشاعرے میں چالیس سے زیادہ شعراء نے حصہ لیا۔ سیفی سوپوری نے پہلی اور نیہا انصاری نے دوسری پوزیشن حاصل کر کے انعام حاصل کیا۔

آل انڈیا ہندی اردو سنگم کی ریاستی شاخ نے شری ڈی۔ پی دھر کی پہلی برسی پر سیاحوں کے مرکز استقبالیہ کے وسیع ہال میں ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرہ منعقد کیا جس میں ہندوستان کے ممتاز اور مشہور شعراء اور شاعرات نے شرکت کی۔ ہزاروں کی تعداد میں ادب دوست حضرات اور خواتین نے شمولیت کی۔ ۱۲ جون ۱۹۸۰ء کو بیگم حضرت محل کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ویمنز کالج مولانا آزاد روڈ کے ہال میں سنگم نے دوسرا کل ہند مشاعرہ منعقد کیا جس کا افتتاح ریاست کے گورنر ایل کے جہا نے فرمایا۔ اور ۱۵ جون کو اسی سلسلے میں جموں کشمیر مجلس النساء کے اہتمام سے سوپور میں خواتین کا مشاعرہ ہوا جس کی صدارت بیگم شیر کشمیر نے فرمائی اور پرنس انجم قدر مہمان خصوصی تھے۔ تقریباً دو ہزار خواتین دوپہر سے شام تک اس محفل میں شریک رہیں۔ ہندی اردو سنگم نے یوم اقبال کے نام سے کئی بار مشاعرے کرائے جن کی صدارت سابق وزیر اعلیٰ سید میر قاسم، مرحوم شمیم احمد شمیم اور ڈاکٹر شکیل الرحمان نے کی۔ سنگم کے روح رواں نذیر احمد نظیر اور ان کے ساتھی فاروق رینزو، پریمی رومانی، امداد ساقی مختلف مقامات پر مشاعروں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ سنگم ہی کے اہتمام سے ریاست میں پہلی بار گورنمنٹ زنانہ کالج نواکدل میں خالص خواتین کا مشاعرہ ہوا جس کی نظامت جگن ناتھ آزاد نے کی اور شریمتی سکھیلا آنجہانی نے صدارت فرمائی۔ اس مشاعرے میں وادی کی پختہ کلام شاعرات نے شرکت کی۔

آنسہ منیفہ بانو، بانی صدر مجلس النساء نے بانڈی پورہ اور سوپور میں خواتین کے کئی کامیاب مشاعرے کرائے جن میں سرینگر اور وادی کے دوسرے مقامات سے بھی شاعرات کو مدعو کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر جگت موہنی نے لیڈیز کلب قائم کر کے رتن رانی ہسپتال کے ہال میں کئی بار خواتین کے مشاعرے منعقد کئے۔ محترمہ شملہ مفتی صاحبہ سابق پرنسپل ویمنز کالج بھی ایسے مشاعروں کا ذوق و شوق سے اہتمام کرتی رہیں۔ آنسہ نسیم السحر، محترمہ حجاب نیئر، مرحومہ منظور

KC تمیم

اختر فردوس رعنا، ناہجہ نسرین، پروین پاکیزہ، فہمیدہ عصمت، نسرین ہلالی، سلمٰی فردوس، فردوس ترنم، عابدہ نقاش، مدیحہ بانو، عابدہ احمد، خوش کلام شاعرات ہیں۔ جو خواتین کی محفلوں میں داد سخن حاصل کرتی ہیں۔ آنسہ رخسانہ جبین دور حاضرہ کی مقبول ترین شاعرہ ہیں جو مخلوط مشاعروں میں بھی شرکت کرتی ہیں۔

کشمیر یونیورسٹی میں مسند اقبال کے قیام کے بعد پروفیسر آل احمد سرور ہر سال ۲۱ اپریل کو محفل مباحثہ کے علاوہ مشاعرے بھی منعقد کراتے ہیں۔ شعبۂ اردو نے پچھلے سال سلور جوبلی تقریب بڑی شان سے منائی جس میں ہندوستان کے ممتاز شعراء بھی مدعو تھے، جنہوں نے مقامی شعراء کی محفل میں اپنا کلام سنایا۔ اس مشاعرہ کی صدارت وزیر تعلیم محمد شفیع صاحب کی تھی۔ کلچرل اکادمی، محکمہ اطلاعات اور مرکزی محکمہ رابطہ عامہ کی طرف سے بھی سال میں دو چار مشاعرے ہوا کرتے ہیں۔ جن میں شریک ہونے والے شعراء کو معاوضہ سے نوازا جاتا ہے۔

جموں میں وادی کشمیر کے مقابلے میں اردو کا چلن زیادہ تھا اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی حکومت کے آخری دور میں اردو کی ادبی سرگرمیوں کا سراغ "بزم ادب جموں" کے قیام سے ملتا ہے جس کے تحت بہت سے مشاعرے ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں ڈوگرہ ہال میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں الطاف مشہدی، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری مدعو تھے۔ انہوں نے اپنی نظم "چاند" اسی مشاعرے میں پیش کی۔ مقامی شعراء میں قیس شیروانی، ڈاکٹر عماد الدین سوز، شری دیا رام گنجو کشمیری اور حکیم طغرائی امرتسری کے شاگرد شری شوق کے علاوہ طغرائی کے دوسرے شاگرد ملک محی الدین قمر نے بھی اپنا کلام سنایا۔ راج ڈھکی جموں میں طرحی مشاعرہ ہوا تھا۔ طرح تھی

مصرع مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

جوش ملیح آبادی میر محفل تھے۔ پنجاب اور یو۔پی کے متعدد شعراء شریک ہوئے اور چودھری خوشی محمد ناظر نے بھی اس میں حصہ لیا تھا۔

نومبر ۱۹۲۸ء جموں میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا جس میں جوش ملیح آبادی کے

متمم

علاوہ بہت سے عظیم اردو شعراء نے شرکت کی۔ اس مشاعرے میں جموں کے ایک نوجوان لڑکے جس کا تخلص لاغر تھا۔ ایک خوبصورت نظم پڑھی۔ جو بہت پسند کی گئی۔ یہ ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ طرحی مصرعے تھے ؎

(۱) طرب زارِ جہاں میں پھر پیامِ نوبہار آیا۔

(۲) نہ بہار ہی کبھی نہ شبِ انتظار میں!

اکثر شعراء نے غیر طرحی کلام بھی سنایا۔

جموں کے مختلف اضلاع میں بھی اردو مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ غلام مصطفیٰ، عشرت کشتواڑی، رسا جاودانی، محمد دوابی، حبیب کیفوی، سید ظفر کاظمی، عرش صہبائی، عابد مناوری، کیف اسرائیلی، نرسنگھ دیو نرگس (ایڈیٹر چاند جموں) کشن سمل پوری وغیرہ مشاعروں کی زینت ہوا کرتے تھے۔ کلچرل اکادمی کے اہتمام سے موسم سرما میں ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء میں دو عظیم الشان کل ہند مشاعرے ہوئے۔ محکمہ صنعت نے بھی ایک عظیم الشان مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد جموں یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سربراہ ہوئے تو ان کے اہتمام سے اس دانش کدہ میں بھی مشاعروں نے رواج پایا ـــــــ

کشمیر میں ہندوستان کے شاعروں کے قیام کے باعث اردو شاعروں کو فروغ ملتا رہا ہے۔ چودھری خوشی محمد ناظر، نواب جعفر علی خان اثر جو مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت میں وزیر داخلہ تھے ۱۹۵۵ء میں علی جواد زیدی محکمۂ اطلاعات کے سربراہ کی حیثیت سے آئے۔ اور چھ سات برس کشمیر کی ادبی محفلوں میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کرتے رہے۔ کے نیر، ریڈیو کشمیر کے ڈائریکٹر تھے۔ زبیر رضوی، کمال احمد صدیقی اور فیاض رفعت بھی اسی ادارے سے منسلک تھے جو ریڈیو سے مشاعروں کو نشر کرانے میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ مظہر امام، ظفر احمد، اشرف[1] ساحل ٹیلی ویژن سے منسلک ہیں اور ان کی وجہ سے ٹی وی سے اردو مشاعرے ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں۔

---

[1] اشرف ساحل ریاست جموں و کشمیر کے پشتنی باشندہ ہیں (ادارہ)

آج کل اردو مشاعرے شہروں، دیہاتوں اور قصبوں میں ہوتے ہیں۔ وادیٔ کشمیر میں سب سے زیادہ جموں میں موسم سرما مشاعروں کا موسم ہوتا ہے۔ اب تو لداخ میں بھی اردو مشاعرے ہوتے ہیں اور ریاست میں اردو مشاعروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔ پہلے شعراء کرام اپنے ذوق کی تسکین کے لئے سناتے اور سخن فہموں سے دادِ سخن پاتے تھے اب معاوضہ کے لئے کہتے اور سناتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ پہلے کی نسبت مشاعرے بہت زیادہ مقبول ہیں فیملی پلاننگ اور قومی یک جہتی وغیرہ مسائل کی تبلیغ کے لئے بھی مشاعروں کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن اب مشاعروں میں سامعین کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی وساطت سے ہر شخص گھر بیٹھے مشاعروں سے محظوظ ہوتا ہے۔ پہلے بن بلائے لوگ شعر و شاعری کے شوق میں جوق در جوق جمع ہوتے تھے اب بلائے جاتے ہیں پھر بھی سامعین کا اجتماع کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن ادب کا صحیح ذوق رکھنے والے سخن فہم حضرات کا وجود مشاعروں کی عظمت و تقدس کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

ظفر احمد سمند ۱۱۔ پرتاپ پارک گورنمنٹ فلیٹس سرینگر (۱)

ریاست کے پہلے اُردو اخبار کے مُدیر

ملک راج صراف سے ایک گفتگو

ظ۔ا : آپ ریاست جموں وکشمیر میں بابائے صحافت سے موسوم ہیں اور آپ نے پہلی بار ۱۹۲۴ء میں "رنبیر" جاری کیا۔ "رنبیر" جاری کرنے کی تحریک کہاں سے ملی؟

صراف: لاہور لاء کالج میں ایک سال کی تعلیم کے بعد میں ۱۹۲۰ء میں شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے کے جاری کردہ روزنامہ "بندے ماترم" میں سب ایڈیٹر کے طور بھرتی ہو گیا۔ وہاں کام کرتے ہوئے میں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اکیلے لاہور شہر میں بہت سے اخبارات شائع ہو رہے ہیں لیکن میری وسیع ریاست جموں وکشمیر میں ایک اخبار بھی نہیں نکلتا۔ اس خیال نے مجھے اس قدر متحرک کیا کہ "بندے ماترم" کی سب ایڈیٹری کو خیرباد کہہ کر جموں آگیا اور اپنے بعض دوستوں سے صلاح مشورہ کے بعد اخبار جاری کرنے کی مہم شروع کر دی۔

ظ۔ا : اُس زمانے کی شخصی حکومت میں "رنبیر" جاری کرانے میں آپ کو یقیناً متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مختصراً اُن کا ذکر کریں تو عنایت ہوگی؟

صراف : مروّجہ قانون کے تحت صرف حکمرانِ وقت ہی ریاست میں اخبار کے اجراء کی اجازت دے سکتا تھا۔ اگرچہ آنجہانی مہاراجہ پرتاپ سنگھ ذاتی طور پر چاہتے تھے کہ ریاست میں اخبار جاری ہو۔ تاہم اُس وقت حکومت کے ایوانوں میں غیر ریاستی عنصر کا غلبہ تھا۔ اور یہ عنصر ریاست میں اخبار جاری کرنے کے خلاف تھا۔ چنانچہ میرے مقصد کی راہ میں روڑے اٹکانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ مگر میں بھی اپنی دُھن کا پکّا تھا۔ اپنی جدوجہد برابر جاری رکھی

ظ۔ا : صحافت ایک اعلیٰ مقصدیت رکھتی ہے۔ اپنا اخبار جاری کرتے ہوئے آپ کے سامنے کیا مقصد تھا؟ کیا یہ آپ کے لئے ذریعہ معاش تھا یا اس سے آپ قومی اور سیاسی مقاصد کی تکمیل کرانا چاہتے تھے۔

صراف : میں اخبار کے ذریعے عوام کی خدمت بجالانا چاہتا تھا۔ میرے سامنے محض ریاست در ریاست کے لوگوں کی بھلائی کا سوال تھا۔ میں نے اخبار ایک پیشے کے طور پر نہیں بلکہ ایک مشن کے طور پر جاری کیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مجھے نمایاں کامیابی حاصل رہی۔

ظ۔ا : صحافت اور ادب میں ایک حدِ فاصل کے باوجود دونوں میں ایک باہمی رشتہ بھی ہے۔ اچھے اخبار اور رسالے ادبی قدروں کی ترویج میں اہم حصّہ ادا کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے اخبار کے ذریعے ادبی قدروں کی توسیع کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔؟

صراف : صحافت کے علاوہ ادب کا فروغ بھی میرے اخبار کا ایک مقصد تھا۔ ادب کو مزید بڑھاوا دینے کی خاطر میں نے بچوں کا مشہور رسالہ "رتن" بھی جاری کیا۔ یہ ۱۹۳۲ کی بات ہے۔ "رتن" کے پہلے شمارے کو دیکھ کر علامہ کیفی دتاتریہ نے مجھے دہلی سے لکھا ۔ "سبحان اللہ کتنا دیدہ زیب ہے۔ حیران ہوں کہ آپ کے نقشِ اوّل "رہبر" اور نقشِ ثانی ("رتن") میں سے کس کو کس پر ترجیح دوں۔"

ادبیات کے موضوع پر اہلِ قلم کے اکثر و بیشتر بنیادی اور تنقیدی مضامین نظم و نثر "رہبر" اور "رتن" کے صفحوں کی زینت بنتے تھے۔

ظ۔ا : یہ بتائیے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ریاست میں اردو زبان کس حد تک مقبول تھی؟ اور اس کی مقبولیت کے کیا اسباب تھے۔

صراف : اُس زمانے میں اردو زبان کافی مقبول تھی۔ لوگ اسے اپنی ہی زبان سمجھتے تھے، کوئی دوسری زبان اُس کا بدل نہ تھی اردو زبان کی اپنی گوناگوں اور رنگا رنگ خوبیاں تھیں۔

ظ۔ا : اس زمانے میں آپ کے اخبار میں کون کون سے شعراء اور ادبا لکھتے تھے؟ ان میں کیا ریاست کا کوئی ایسا قلمکار تھا جو ہندوستان گیر شہرت رکھتا تھا؟

صراف : ان شاعروں اور ادیبوں میں بعض کے اسمائے گرامی ہیں؛

مہجور، رسا جاودانی، چشتی، رام کرشن غافل، پریم ناتھ پردیسی، نند لعل طالب منشی محمد طالب، عشرت کاشمیری، نشاط کشتواڑی، نشاط جوہری، پنڈت شنکر لال پنڈت گنگا ناتھ شرما، کشن سمیلپوری، متھرا داس شائق، عارف بیگ، مرزا بیگ، ماسٹر زندہ کول، محمد عمر نورالٰہی، کندن لعل، اوم پرکاش صراف، نرسنگھ سہائے

جوہان شوق، ساگر چند گورکھا، سورج مراف، کاہن سنگھ، بالادیپہ، گوسائیں تیلا چند پنڈت پریم ناتھ بزاز، اثر لکھنوی، میلا رام وفا، دلستہ پرشاد، حبیب فیروزآبادی روشن پٹیالوی، منشی محمد دین فوق، خادم، ہری چند ہری، امرناتھ شہید مرزا کمال الدین، نیسی لال سوری، راماننددساگر، وید راہی اور کرشن چند وغیرہ

کرشن چندر نے "رنبیر" کے بارے میں یوں لکھا ہے "مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب میں پونچھ کی دلفریب وادی میں بیٹھ کر "رنبیر" مزے لے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی میں داخل نہ ہوگا کہ کرشن چندر کے ...... اندر کے مصنف کو بیدار کرنے میں "رنبیر" نے اپنا حصّہ ادا کیا ہے اور اس لحاظ سے میں اپنے آپ کو "رنبیر" پریوار کا ایک ممبر تصوّر کرتا ہوں۔"

صدر جمہوریہ کی جانب سے مجھے پدم شری کا ایوارڈ ملنے پر بمبئی میں مجھ ناچیز کے اعزاز میں مبارکبادی کا جو جلسہ منعقد کیا گیا اُس میں کرشن چندر نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا "مراف ہو کر بھی آپ نے کبھی سونے چاندی کی پروا نہیں کی اور آپ ہمیشہ اُس سونے کے قائل رہے جو الفاظ میں چمکتا ہے۔"

ظ ۰ ٦ : ریاست میں موجودہ دور میں صحافت نے کافی ترقی کی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

مراف : مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے، ریاست میں صحافت نے کافی ترقی کی ہے۔ اخبارات کی تعداد میں بلا شبہ نمایاں اضافہ ہوا ہے لیکن صحافت کا معیار ماسوائے چند مستثنیات کے وہ نہیں ہے جو ہونا چاہئے۔ ابھی ہماری ریاست مجموعی طور پر اصل صحافت سے پیچھے ہے۔

ظ ۱ : کیا آپ نئی نسل کے اخبار نویسوں کے کام سے مطمئن ہیں؟

صراف : ایسے اخبار نویس جذبۂ خدمت کو رکھتے ہیں مگر اُن میں سے بیشتر اقتصادی کمزوری کی وجہ سے بے بس اور لاچار ہیں اور بعض صورتوں میں غیر صحافتی حربوں کو بروئے کار لانے سے بھی نہیں شرماتے

ظ ۱ : کیا آپ کے نزدیک اردو زبان ریاست میں ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے زندہ رہے گی؟

صراف : ریاست میں اردو کا مستقبل مخدوش نہیں ہے ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے اردو ملک میں زندہ رہے گی، ایسا میرا دعویٰ ہے ۔

ظ ۱ : بہت بہت شکریہ!

غزلیں

میر

شورش کاشمیری

نئی بستی، اننت ناگ

ہوتا ہے بحر و بر سے اظہار زندگی کا
کرتی ہے زندگی خود اصرار زندگی کا

جشنِ بہار ہو یا ہنگامۂ خزاں ہو
پھلتا ہے پھولتا ہے گلزار زندگی کا

ڈالی جو ٹوٹتی ہے کونپل بھی پھوٹتی ہے
ہوتا ہے جلوہ کیا کیا ہر بار زندگی کا

گو موت مارتی ہے شبخون زندگی پر
ہوتا ہے موت پر بھی یلغار زندگی کا

کرتے ہیں مردہ دل بس انکار زندگی سے
ہوتا ہے زندہ دل سے اقرار زندگی کا

شادی ہو یا کہ غمی ہو، کم دل نہ آدمی ہو
ساغر یہ دائمی ہو سرشار زندگی کا

سائنس اور حکمت سر کیوں نہ لاکھ ماریں
کھلتا نہیں ہے سرِ اسرار زندگی کا

انس اور آن ہے وہ انسان کہے جس کو
ہے خاک کا یہ پتلا شہکار زندگی کا

ایمان اس کی طاعت احسان اسکی الفت
مومن کی سوز گی ہے معیار زندگی کا

سردار امتوں کا ہے وہ نبی امیؐ
روشن کیا ہے جس نے کردار زندگی کا

شورش یہ رنگ لایا جذب و جنون پہ کیا
سازِ غزل پہ چھیڑا سنگ کار زندگی کا

قیصر قلندر
بی ۶۰۱—ایم، الیس، اپارٹمنٹس
کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی ۱

تم سے تو نہیں کوئی گلہ، شہر کے لوگو!
ہے درد فقط، دل کا صلہ شہر کے لوگو!

پاکیزہ تمناؤں کو چھوڑ آئے کہاں پر
کچھ دشتِ ہوس سے بھی ملا شہر کے لوگو

شاداب نظارے، نہ مہکتی ہوئی راتیں
چہروں پہ نہ کچھ رنگ کھِلا شہر کے لوگو

خوش پوش ضروری نہیں خوش بخت ہی ہونگے
آسودگی ہے کس کا صلہ، شہر کے لوگو

اب کوئی خیاباں ہے نہ مہرباں کوئی سایہ
قیصر کو بھی صحرا ہی ملا شہر کے لوگو!

حامدی کاشمیری

پروفیسر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر

پیش زانی کے لئے صد ماہ و اختر دیکھتے
کاش وہ اک بار دروازے سے باہر دیکھتے

رُک گئے تھک ہار کر، بس دو قدم کی بات تھی
پاؤں کی ٹھوکر میں گنجِ لعل و گوہر دیکھتے

ریت میں کھو جانے سے پہلے وہ پلکیں کھولتے
دشت میں بھی خواب آسودہ صنوبر دیکھتے

علاعلا نہ تھا سمندر کا بُلاوا، ورنہ ہم!
کو بہ کو آواز دیتے تم کو گھر گھر دیکھتے

نور کا سیّال ہر جانب تھا تاریکی نہ تھی
کاش آنکھوں کے چراغوں کو بجھا کر دیکھتے

آنکھ میں اپنے ہی ناخن گڑ لئے اچھا کیا
اور کتنے راہ میں بے پردہ منظر دیکھتے

اپنے بیگانے سبھی رشتوں پہ ششدر رہ گئے
اے مروت آشنا اک بار مڑ کر دیکھتے

عابد مناوری
۱۱۱/اے گاندھی نگر جموں

اپنے لئے خود آپ ہی آزار ہو گئے
ہم دشمنوں کے ہاتھ کی تلوار ہو گئے

اہلِ خطا کو عہدۂ منصف عطا ہوا
جو بے گناہ تھے وہ سزاوار ہو گئے

حیرت کدہ تھا وہ کہ تری جلوہ گاہ تھی
اہلِ نگاہ نقش بہ دیوار ہو گئے

یوں ذوقِ جستجو کو مرے دے گئے ہوا
کھل کر کچھ اور بھی وہ پُر اسرار ہو گئے

دل دار، دل نواز، دلِ آرام تھے جو لوگ
دل سرد، دل خراش، دل آزار ہو گئے

میں نے ہی پھول بوئے تھے اک ایک گام پر
میرے لئے ہی راستے پُر خار ہو گئے

کچھ پل کی تیرگی کا یہ عابد اثر ہوا
سب لوگ ظلمتوں کے پرستار ہو گئے

پرتپال سنگھ بیتاب
انڈر سیکریٹری ہیلتھ ڈپارٹمنٹ
سول سیکریٹریٹ سرینگر

میں تو بندھا ہوا تھا چھڑا لے گیا مجھے
ہمزاد میرا مجھ سے چرا لے گیا مجھے

پھر چلتے ہوئے بھی میں واپس نہ آسکا،
دریا جب اپنے ساتھ بہا لے گیا مجھے

پکا تھا راہ چلتے ہوئے اک ثمر کہیں
پھر کیا تھا سبز باغ اڑا لے گیا مجھے

میں نے تو تھک کے خیمہ لگایا تھا اک جگہ
رستہ وہ تھا کہ آگے بڑھا لے گیا مجھے

رقصاں چہار سمت تھیں رنگین ساعتیں
بے رنگ تھا جو لمحہ اڑا لے گیا مجھے

مانگا تھا ابر میں نے زمینوں کے واسطے
اور آسماں پہ دستِ دعا لے گیا مجھے

بستر پہ مجھ کو چھوڑ گیا شب ڈھلے یہ کون
وہ کون تھا جو صبح اٹھا لے گیا مجھے

بیتاب اندھے موڑ پہ رکا تھا پاؤں سے
پھر حادثہ خود آگے بڑھا لے گیا مجھے

نشاط انصاری

دلنہ بارہمولہ کشمیر

میں تھا اور پتھریلی رات
خارِ مغیلاں کی بارات
دیکھنے آئے چاندِ نگر میں
اپنے زخموں کی شبرات
شدّت دھوپ کی کاٹ چکی ہے
برف کے گالوں کی ہر بات
بدلے چہروں کی نگری میں
آئے کھو کے اپنی ذات
حدّت اتنی سوزِ نہاں کی
جلتی آگ نے کھائی مات
سہلاتے تھے رات بدن کو
زہر میں ڈوبے تھے وہ ہات

شبیب رضوی

(رعنا وارعصر نگو)

یہ غم نہیں ہے کہ میں حلقۂ گناہ میں ہوں
خوشی تو یہ ہے، صداقت کی قتلگاہ میں ہوں

خزاں رسیدہ شجر اپنا درد خود جانے
میں شاخ شاخ نئی فصل کی پناہ میں ہوں

مقابلے کا نتیجہ مجھے بھی ہے معلوم
میں جس کے چھوٹے بڑے ہاتھ اُس سپاہ میں ہوں

خبر نہیں سرِ منزل ہوں یا پسِ منزل
میں اپنے سفر سے الگ ہوں نہ اپنی راہ میں ہوں

کسی میں تابِ نظر ہو تو کھول کر پڑھ لے
ڈھکا چھپا سا حکایاتِ مہر و ماہ میں ہوں

مسعود ساموں
ڈپٹی رجسٹرار، اگری کلچرل یونیورسٹی سری نگر

فرسودہ زینے گھر کے اُترنا ہے رات بھر
پیاسا اسی جزیرے پہ مرنا ہے رات بھر

پیچھے شجر حجر کو گذرنا ہے رات بھر
ٹھنڈے سفر کو تجربہ کرنا ہے رات بھر

دن بھر ارادے کس کے سمیٹے رہے مجھے
پانی کے دائروں میں بکھرنا ہے رات بھر

انصاف ہو چکا ہے جبیں پر مری رقم
کچھ سانس گننے پھر بھی ٹھہرنا ہے رات بھر

میں نے کسی کو خوب ستایا ہے سارا دن
اب سوچتا ہوں خواب میں ڈرنا ہے رات بھر

وہ سویا سنگ سنگ ارادوں کو اوڑھ کر
اور مجھ کو آنکھ آنکھ بکھرنا ہے رات بھر

اشرف ساحل

دو دو مش کسند رتیر نیگر ۱

اپنے سُرخ ہونٹوں سے مجھ پہ لکھ گیا لالی
میرے خشک پتّوں کو دے گیا وہ ہریالی
میری بانہوں میں جیسے ہلکے ہلکے بادل ہیں
جگنوؤں کی بارش میں رُت ہے بھیگنے والی
تم مرے تصوّر میں یوں بھی جھلملاتی ہو
ننھے ننھے ہاتھوں میں جیسے دودھ کی پیالی
کوہِ قاف سے اُتری وہ کوئی پری ہوگی
میرے سبز سائے میں شب گذارنے والی
میں ازل سے ہوں اُٹھتی خوشبوؤں کا سوالی
جب بھی بھر لیا دامن ہاتھ ہو گئے خالی

رخسانہ جبیں
ریڈیو کشمیر سری نگر

ہوائے شب مرے پھولوں پہ بے گناہی لکھ
نہیں تو صبح سے پہلے ہی وہ تباہی لکھ

سزا ہے قید مری اب نہ ہونے سے جس کے
ذرا اِن آنکھوں میں اُس خواب کی دُعا ہی لکھ

جبینِ گل پہ وہ تصویر اُبھر نہیں پائی
تو لوحِ سنگ پہ اک منظرِ فنا ہی لکھ

اُداسیوں کے سیہ جنگلوں سے گزری ہے
مرے دریچے کی یہ روشنی جدا ہی لکھ

صدائے شیشہ کبھی سنگِ جاں سے ہی پھوٹے
میں ہوں تو ہونے کی میرے کوئی گواہی لکھ

کروں گی میں ہی چراغاں ترے جزیرے کو
مرے صدف کے مقدر میں تو سیاہی لکھ

خالد بشیر
مدیر ماہنامہ تعمیر سرینگر

○

ہوا پہ لکھا ہوا ہے دائم نوازشیں ہیں
سمندروں کے سفر میں بجرے کی خواہشیں ہیں

اُجاڑ کر جو یہاں کے آنگن چلا گیا ہے
نئی نئی بستیوں میں اُس کی رہائشیں ہیں

اُسے میں شاید ہلاک کر کے بھلا بھی دیتا
مگر مرے ہی لہو میں اُس کی سفارشیں ہیں

ہرے بھرے موسموں کی کس نے بشارتیں دیں
کہ چشمِ دیوار و در میں سمٹی گزارشیں ہیں

میں اپنے اندر شریر لڑکا لئے چلا ہوں
میرے قریب و جوار میں کیا نمائشیں ہیں

فاروق آفاق
کرن نگر، سرینگر

کبھی میں کُھل نہ سکا کربِ آگہی کی طرح!
گلی میں پھیلتی کمرے کی روشنی کی طرح!
وطن سے دور ہو کوئی تو ناگزیر بھی ہے
میں اپنے گھر میں بھٹکتا ہوں اجنبی کی طرح
مجھے بھی رینگتے سایوں نے آلیا ہوتا،
دعا قبول ہوئی رسمِ گمرہی کی طرح
شعاعِ لذتِ اوّل کا ناتمام نشہ
کہ چشمِ شب میں چمکتا ہے تشنگی کی طرح
گزر گئی وہ اُلجھ کر مثالِ موجِ ہوا
جھکا بھی میں تو کسی شاخِ منحنی کی طرح

منیب الرحمان
(حال) شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

○

جن سے بچھڑ کے خوش ہوں ابھی دیکھتا رہوں
رُک جائے خاک سامنے وہ قافلے نہ ہوں
یہ پھول اپنا رنگ نہ دے گا مجھے کبھی
اچھا ہے اس کی بھاگتی خوشبو ہی لے چلوں
کوئی پسِ سیاہ سے روشن چراغ سا
سب لوگ سو گئے ہیں کسے آشنا کروں
مجھ سے الگ، حقیر سا نقطہ بھی ہے مجھے
میرے قریب آئے تو وسعت دکھائی دوں
اس ہاؤ ہو کے درمیاں آتا ہوں اب نظر
پھر میں کہاں چھپوں گا کسی کو خبر نہ دوں

شافی شفائی
کلوسہ بانڈی پورہ

خواب ہوں سانس کی آہٹ سے بکھر جاؤں گا
موم ہوں ہاتھ لگاتے ہی پگھل جاؤں گا
تم وہ بادل کہ ہے بے وقت برسنا جسکو
میں تو سبزہ ہوں کڑی دھوپ میں جل جاؤں گا
زندگی ایک تمنا کے سہارے گذری
تیری آنکھوں سے گُہر بن کے ٹپک جاؤں گا
کس کو معلوم تھا کالر پہ سجاؤں جس کو
شام ہوتے ہی اُسی پھول سے ڈر جاؤں گا
لاکھ کھرچے گا زمانہ مرے قدموں کے نقوش
موسم گل ہوں درختوں سے نظر آؤں گا

کے، ڈی مینی
پونچھ، کشمیر

شہر ہے کھنڈر ہی کھنڈر اور گھر کوئی نہیں
میرے آگے دُور تک سایۂ شجر کوئی نہیں

کون دیکھے گا میرے زخموں کا منظر خونچکاں
میں سبھی کے ساتھ میرا ہمسفر کوئی نہیں

آؤ سو جائیں اندھیروں کے لبادے اُوڑھ کے
رات ہی اپنا مقدر ہے تو ڈر کوئی نہیں

رُت جگوں کے موسموں میں جانے کتنے سال سے
کوئی کہتا ہے چلے آؤ اِدھر کوئی نہیں

زندگی کے اس کنارے ڈوب جاتے ہیں سبھی
آج تک اُس پار پہنچا تیر کر کوئی نہیں

قیوم کاشمیری

بہروٹ راجوری

○

وہ زرد چہرے گلاب لکھنا
وہ سرخ آنکھیں شباب لکھنا
میں کر رہا ہوں جو نقش برپا
اسی میں دل کا حساب لکھنا
یہ شکل محسوس اس میں عریاں
وہ خط کے اوپر جناب لکھنا
مصوروں کی عجیب دنیا
ذرا سمجھ کر کتاب لکھنا
قیوم پھر لے گی وہ حکایت
اسی سے ان کا جواب لکھنا

خورشید احمد بسمل

تھنہ منڈی ۱۸۵۲۱۲

لکیریں کھینچتا رہتا ہوں اکثر
اُبھرتا ہی نہیں ہے کوئی پیکر
سمندر خامشی کا شش جہت ہے
اُبھرتا ڈوبتا رہتا ہوں اکثر
ہے سارا صحن روشن قمقموں سے
اندھیروں کا تلاطم گھر کے اندر
سوا نیزے پہ سورج آگیا ہے
ہوئی ہے زندگی تمثیلِ محشر
بکھیرے قہقہوں کے پھول میں نے
کوئی روتا رہا ہے میرے اندر

نظمیں

جگن ناتھ آزاد
صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں

ایک لمحہ

"اصل وقت از گردشِ خورشید نیست
وقت جاوید است و خور جاوید نیست" (اقبالؔ)

•

کتنی مشکل نظر آتی تھی وہ منزل آزادؔ
اور جب آسان ہوئی
تو گماں مجھ کو ہوا
اتنی آسان تو شاید کوئی منزل بھی نہ تھی

وقت انسان کا احساس جسے کہتے ہے
نہ سہی سلسلۂ روز و شب و شام و سحر
نہ سہی گردشِ خور گردشِ مہتاب، مگر
ایک لمحہ تو یقیناً ہے کہ ہے گرم سفر

اور یہی لمحہ اگر ہاتھ میں آ جائے کبھی
یعنی ٹھہر جائے کبھی
تو اسی لمحے میں آباد ہو برسوں کا نظام
نظر آئے اسی اک لمحے میں صدیوں کا خرام
اور بقول اقبال
وہ زمانہ بھی کہ اب تک نہیں جس کا کوئی نام
ایک ایسا ہی تو لمحہ تھا مرے ہاتھ میں کل
ایک لمحہ کہ رہا جب تو کئی سال کا حاصل نکلا
ایک لمحہ کہ جو برسوں کے مرے ولولۂ شوق کی تکمیل کا حامل نکلا
دھڑکنیں جس میں زمانوں کی تھیں وہ دل نکلا
ایک ذرہ کہ سمیٹے ہوئے صحراؤں کو تھا
ایک قطرہ کہ لپیٹے ہوئے دریاؤں کو تھا
اذنِ پرواز مگر میری تمناؤں کو تھا
ایک ایسا ہی تو لمحہ تھا مرے ہاتھ میں کل
کتنے گزرے ہوئے ویران زمانوں کا بدل
اپنے پھولوں ہی سے بوجھل تھی مری شاخِ امل

کتنی مشکل نظر آتی تھی وہ منزلِ آزاد
اور جب آسان ہوئی
تو گماں مجھ کو ہوا
اتنی آسان تو شاید کوئی منزل بھی نہ تھی

لو،

شہ زور کاشمیری
چوہٹہ بازار سری نگر کشمیر

جنّت کا گماں آج

●

ہیں لالہ و گل رشکِ حورانِ جناں آج
صد غیرتِ تسنیم ہے ہر جوئے رواں آج
ہر ایک شجر سدرہ و طوبیٰ ہے یہاں آج
ہر شاخِ نشیمن پہ ہے گلبانگِ جواں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنّت کا گماں آج

●

غنچوں کے لبوں پر ہے محبّت کا تبسّم
سبزے کا سراپا ہے مسرّت کا تبسّم
ہر منظرِ گلشن ہے قیامت کا تبسّم
کانٹوں نے بھی سیکھی ہے تبسّم کی زباں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنّت کا گماں آج

●

گل غنچہ ہے، گل بار ہے، گل پوش ہے کشمیر
کیفیت و تنویر کی آغوش ہے کشمیر
اک جلوۂ رنگین میں نوا جوش ہے کشمیر
کشمیر نہاں رہ کے بھی ہے خوب عیاں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

●

صبحیں جو معطر ہیں تو شامیں ہیں منور
پُرکیف جو راتیں ہیں تو دن مست ہیں یکسر
ہر لمحہ جمیل و مترنم ہے سراسر
ہر آن طربناک ہے اور بادہ چکاں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

●

مے ریز فضائیں ہیں گھٹائیں ہیں گہر بار
سرشار ہیں اشجار تو بدمست ہیں انہار
بارش کی چھما چھم ہے کہ پازیب کی جھنکار
ہے صحنِ چمن رقص گہِ زہرہ وشاں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج،

●

خاموشیٔ اشجار میں ہے جوشِ تکلم
مستانہ ہواؤں میں ہے آہنگِ ترنم

مقبول احمد
انچارج ایڈیٹر روزنامہ "ہلالِ نو" اسلام آباد

گاؤں کی گوری بہت بدنام ہے
شہر میں یہ کام کتنا عام ہے

شوق سے پڑھتا ہے لڑکا اس طرح
جیسے لڑکی شمع ہے، گلفام ہے

گاؤں میں کالج کی لڑکی کیا کرے
شہر میں اُس کو ضروری کام ہے

سب کے آگے چومتی ہے پھول کو
باغ میں تتلی بہت بدنام ہے

میں تو پردیسی ہوں یہ سچ ہے مگر
کیا ترا دل بھی کوئی آسام ہے

بے تاب جے پوری
مدیرِ فروغِ وطن مبئی

میں روز و شب کی مداین سے جو گذر جاتا،
صدائے کُن کا وہ خالق کہاں کدھر جاتا۔
اگر یہ جانتا ہوگا ادھر سے تیر اگند
غبار بن کے تیری راہ میں بکھر جاتا
ہوا کے دوش پہ اڑتا میں کتنی مدت تک
پلٹ کے آنا تھا آخر مجھے جدھر جاتا
جو ہوتے لوگ یہاں جلتے سورجوں کی طرح
اندھیرے شہر ہوتے جہاں سنور جاتا
مری انا کو جو للکارتا خدا بھی کبھی!
یا اُس کی آبرو جاتی یا اپنا سر جاتا
سمٹ چکے تھے اندھیروں میں جب اُجالے بھی
بتاؤ کس طرح سورج کسی کے گھر جاتا
ستم کی آس [illegible] بھی کر [illegible] ب
لگا کے آگ میں [illegible] گھر جاتا،

نعیم

رفیقِ ہمراز

عبدالمتین منہاج گنج بتر نگر

بکھرے جو فرصتوں میں خیالات سے اُگے
سمٹے تو نقش ہائے طلسمات سے اُگے
زخموں کی تتلیاں تو تغافل کی سلوٹیں
پیکر بھی کیسے کیسے تیری ذات سے اُگے
رفتارِ چاہتوں کی رکابوں کی تاک میں
اسپِ کرات دَدَہ سوغات سے اُگے
ہم بے ہنر تھے قافلوں کو لوٹ کیا سکے!
وہ باکمال دستِ کرامات سے اُگے
زرخیز ساعتوں کے تھرکتے لبوں پہ ہم!
دشتِ طلب میں وادیٔ ظلمات سے اُگے

راز منتوری
جے اینڈ کے نوشیلا بوزیس
پٹی برہمناں جموں

رات دن گو آئینے کے سامنے رہتا ہوں میں
پھر بھی اپنے آپ کو پہچان کم پایا ہوں میں

چلچلاتی دھوپ کا صحرا ہے تاحدِ نظر
کون گذرے گا ادھر سے منتظر کس کا ہوں میں

اپنے ہونے کا دیا کرتا ہوں لوگوں کو ثبوت
چند دروازوں پہ دستک روز دیتا ہوں میں

لفظ و معنی کی پرکھ میں منہمک سب لوگ ہیں
اور کتابوں میں بھی خالی جگہ پڑھتا ہوں میں

بند آنکھوں کی سیاہی کا سفر کاغذ پہ ہے
لیکن اس تحریر میں جانے کہاں لکھا ہوں میں

جانتا ہوں اک کنواں گہرا ہے اگلے موڑ پر
راز کیوں دانستہ آنکھیں موند کر چلتا ہوں میں

نذیر احمد نظیر

گلکار دوڈی حال کمل سرینگر ۸

ذہن کاغذ کی ہتھیلی پہ نچاتے کیوں ہو
شعلۂ فکر بلندی پہ اُٹھاتے کیوں ہو

روز آخر وہ اُتر آئے گا سب سے ملنے
روز سورج کی طرف ہاتھ بڑھاتے کیوں ہو

کچھ بھی جانے دو یہ سوکھی ہوئی تہذیب کے پیڑ
نئے آنگن میں صلیبوں کو سجاتے کیوں ہو

خون جدت کا لگائے ہوئے سوچوں اے نظیر
نام اپنا نئے لوگوں میں لکھاتے کیوں ہو

واجدہ تبسم

دوردرشن کیندر سرینگر

زبان شمشیر کی طرز ادا نشتر کی رکھی تھی
میرے قاتل نے رفتار بیاں خنجر کی رکھی تھی

تعجب تو یہ ہے تم بھی اسے تسلیم کر بیٹھے
جو قیمت اہل دنیا نے ہمارے سر کی رکھی تھی

نکل کر گھر سے دیکھا شہر کا نقشہ ہی بدلا تھا
در و دیوار پر تصویر غم آذر کی رکھی تھی

قفس کی اُن شکستہ تیلیوں کا مجھ پہ احسان ہے
جنہوں نے آبرو کچھ میرے بال و پر کی رکھی تھی

ہلا کر رکھ دیا سنگین لمحوں کے تواتر نے
تبسم نے ابھی بنیاد اپنے گھر کی رکھی تھی

یوسف سلیم
شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی سرینگر

سب کی آنکھوں میں رات ٹھہری ہے
یونہی بس کائنات ٹھہری ہے

وہ بھی ریگِ رواں میں بہہ نکلی
سانس کی لے حیات ٹھہری ہے

وہ بھی تشنہ دہن ہی لوٹ آیا
اُس کے ہونٹوں میں بات ٹھہری ہے

یہ حوادث کی دھوپ پھیلی ہے
یا کہ تفسیرِ ذات ٹھہری ہے

خامشی کا لباس اوڑھے ہوئے
ذرّے ذرّے پہ رات ٹھہری ہے

اپنے معنی میں چھپ کے بیٹھی ہے
خوب صورت سی بات ٹھہری ہے

سیّد رضا
ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو کشمیر یونی ورسٹی

چھُپا کے لمس مرا کیا سے کیا دکھائی دی
عجیب یہ سِل ہے کہ موسم ادا دکھائی دی
وہ ضرب تیشہ سے یکمشت اُڑ گئی کیونکر
اسیرِ سنگ تھی آخر صدا دکھائی دی!
اُبھر کے رہ گئی پھر جھاڑی جھاڑی ہاتھوں سے
لہو میں تر مری گھائل دُعا دکھائی دی
نہلنے کیا مرے لفظاب میں اُتر آئی
بدن صحیفہ علامت بنا دکھائی دی
یہ آنکھیں بک چکیں ساحر کے ہاتھ پل بھر کو
سیہ دھند میں اُجلی ہوا دکھائی دی

[illegible] ہے [illegible]
[illegible] آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

•

اطراف میں ہر رنگ کی مہک [illegible] کھلا ہے
ہر سمت [illegible] کی مہک [illegible] کھلا ہے
ہر [illegible] گلشن کی مہک [illegible] کھلا ہے
ہے [illegible] نامہ [illegible] فشاں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

•

والله ہیں ہندو مسلم محجوم رہے ہیں۔
الطاف و کرم مل کے بہم محجوم رہے ہیں
شاعر کی قسم، نغمہ کی قسم محجوم رہے ہیں
تاثیر مئے شوق سے ہے ناقوس و اذاں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

•

جنت کے طلب گار ادھر بھی ہیں ادھر بھی
[illegible] ادھر بھی ہیں ادھر بھی
[illegible] ادھر بھی ہیں ادھر بھی
ہر ایک روش باغ کی ہے رشکِ جناں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

تیمز

●

ہیں مست حسینانِ حیادار چمن میں
پیتی ہیں مئے ناب لگاتار چمن میں
ہیں تو پھول ازل ہی کا قدح خوار چمن میں
ہاں بادۂ سرجوش پلا پیرِ مغاں آج
ہے وادیٔ کشمیر پہ جنت کا گماں آج

نعیم

فاروق نازکی
۷۔ پرتاپ پارک فلیٹس
ریزیڈنسی روڈ سرینگر

زبورِ نو

گماں کے شہرِ اوہام کے مکانوں سے
نکل پڑے تھے کئی کارواں یقینوں کے
جمالِ صبح میں تھا قتلِ ماہتاب کا رنگ
فلک کی مانگ میں کچھ داغ تھے جبینوں کے
نظر نظر سے ٹپکتا تھا زہر کا الماس
دلوں پہ چلتے تھے جب سانپ آستینوں کے
ہمیں نے اپنا مقدر لکھا تھا پانی پر
ہمیں نے آگ لگائی تھی خود سفینوں میں
یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جن دنوں ہم تم
چھپائے پھرتے تھے اک دوسرے کو سینوں میں
ازل کی ریت پہ لکھی گئی تھیں تقدیریں
فنا کے شہر میں آئے تو جاوداں ٹھہرے
وہ جب بھی اُترے ہیں اونچائیوں سے اُترے ہیں
جو قربِ ذات کی لذت کے رازداں ٹھہرے

ہمارے سر میں نہ تھا کچھ بھی سرکشی کے سوا
اسیرِ عمرِ رواں دیکھتے کہاں ٹھہرے
یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جن دنوں ہم تم
اسیرِ تارِ نظر تارِ عنکبوت نہ تھے
دُھلی دُھلی تھی فضا آسماں تھا آئینہ
ہماری روح تھی قاصد وہ میگھ دوت تھے
شجر حجر سے بر و بحر دشت و صحرا سے
جہاں سے گذرے تھے ہم سربلند گذرے تھے
اندھیری رات سے اُٹھے تھے آفتاب بدست
فضائے دہر میں کرنوں کی طرح بکھرے تھے
روایتوں کے سیہ پانیوں میں ڈوبے تھے
نئے خیال نئے ولولوں میں اُبھرے تھے

[illegible]

ہم اپنی ذات کے معبد میں سر جھکاتے ہیں
کہ ایک بحر ہو، صحرا ہو، ایک عالم ہو
...شت آگ سے ہے پتھر سے پیار شیوہ ہے
...ایک پھول ہو، موتی ہو اور شبنم ہو
...ارا نام تو الفاظ کو ترستا ہے،
...ارا نام نہیں، تم تو اسمِ اعظم ہوا
...لم نصیب تمنا کے خشک ہونٹوں پر
...بارِ عمرِ رواں دیکھنے کی رت آئی!
نگاہِ حسن کے بے نام خواب زاروں کو،
فسردگی کے عوض بیچنے کی رت آئی!

○

لبانِ خشک پہ ہے گردِ التجا سے مراد
زمانہ برسرِ پیکار، آسماں ناشاد،

نظر میں چاند ہے آغوش میں ثریا ہے
مگر وجود ہے خاکِ آرزو برباد!
مرے شباب کے نادیدہ خواب کی حدیں
نگر سے دور کہیں کھنڈروں میں ہیں آزاد
کہاں گئے وہ تمنا کے خوش نوا پنچھی
پکارتا ہے جنہیں نامِ آرزو سے مراد

جو ہو سکے تو ہواؤں کو دو نہ اذنِ خرام
کنارِ آب رہیں ریت کے نگر آباد!

دیارِ گل سے اٹھے غسلِ آتشیں کر کے
بجھی نہ آگ تو پیراہنِ شرر پہنا
جبیں پہ راکھ ملی نامراد لمحوں کی
شبِ وصال کفن خون میں تربتر پہنا،
فرازِ دار سے ہم نے کیا سفر آغاز
لباس ملابس نہ تھا سایۂ شجر پہنا،
صبا کے ہاتھ سے زخموں کی فصل کاٹی ہے
سیاہ رات کی مٹی میں پاپ بوئے ہیں
جو دھل سکے نہ تری رحمتوں کی خوشبو سے
وہ داغ ہم نے لہو کی کرن سے دھوئے ہیں
گڑے ہیں پاؤں جہاں پہ تو لامکاں بھی نہیں
عجیب بات ہے اب سر پہ آسماں بھی نہیں

اقبال فہیم
معرفت سید حسین اندرابی گوجوارہ سرینگر

سکوتِ سنگ

دھوپ کھیلے، میں چپکے چپکے، آنگن آنگن، کوچہ کوچہ پھرتا تھا
اماں! کھڑکی سے آواز مجھے دیتی تھیں، مُن . . . . نے!
میں اُلٹے پاؤں چپکے واپس کمرے میں جب آتا تھا،

اماں! جو کڑکتی بجلی اور گرجتے بادل زور کی بارش مجھ پہ برستی تھیں
میں بھیگی بلی پچھتاوے کی چادر لے کر سہما سہما روتا تھا
رات کو اماں ابا سے یہ کہتی تھیں
لڑکا دھوپ نکلتے ہی، آنگن آنگن، کوچہ کوچہ، گاؤں گاؤں پھرتا ہے
دھوپ کا شیدائی اس کے، نس نس میں دھوپ کے ہمراہ پھیلے ہیں
ابا کہتے تھے، لڑکا دھوپ میں کھیلے اچھا ہے
دھوپ کا موسم لمحاتی ہے
لڑکا ہے تو دھوپ میں کھیلے
اِن دونوں کے بیچ میں جھگڑا اُمڈا اُبھرا بڑھتا تھا

اماں! رنجیدہ، آزردہ، پژمردہ ایک طرف ہو جاتی تھیں
اور ابّا، اٹھ کر چلے جاتے تھے
گائے کی ٹانگیں، آنکھیں اور اک لمبی دم ہوتی ہے، میں دہراتا تھا،
اس پر میرے معلّم خوش تھے
ابّا سے کہتے تھے 'لڑکا سبق میں اچھّا ہے' پر شوق زمانے میں اس کے
دھوپ کھِلے اور لڑکا بھاگے،
رفتہ رفتہ آنگن سے کوچے سے، گاؤں سے دھوپ گئی
اور مجھ پر یہ بات ہوئی جب روشن
گائے کے معنے ممتا کے ہیں
ٹانگیں، رفتارِ زمانہ
آنکھیں، فہم و بصارت
دم، اپنے ہونے کی اک واضح صورت
میں رنجیدہ، آزردہ، پژمردہ رہنے لگا
آنگن سے جب دھوپ گئی
برسوں پرانی برف کی ٹھنڈک دریاؤں میں پھیل گئی
اور دریا شہر میں رہنے آئے
مندر، مسجد الگ ہوئی

ہر دہلیز پہ سجاڑا رقصاں
میرا آنگن سُونا سُونا
ابا سرگوشی سے کہتے
تم کو سجاڑا سا لگتا ہے
کل تم دھوپ کے شیدائی تھے

نور شاہ
ہسپتال روڈ درگہ جن سرینگر

خودکشی

کل شب میں نے سپنا دیکھا
جیسے زرد یلے صحرا میں
کالے نیلے رنگوں والی تتلی
اپنے پَر پھیلائے
میرے تعاقب میں گرداں ہو
جیسے نیم شبی کا سایہ
ریت، سمندر
تشنہ لب آوازوں کا بے چہرہ جنگل
میری جانب دوڑ رہا ہو
تیز ہوا کا پاگل جھونکا
شاخِ بدن کے سوکھے پتے توڑ رہا ہو ـــــ!

فدا راجوری

بھروٹ راجوری

کاش لے مت

خدا
کالے پتوں کو
ان چھتوں پر
اور اونچا کر
کہ بنجر بستیاں
اب اور بنجر
ہو نہیں سکتیں
یہ دیکھیں
کیسے بارش اور ہوائیں
موسمی ہو کر
زمیں کو فرطِ جذبِ شوق سے
پامال کرتی ہیں
مگر ہر ایک قطرہ
ی کونپل کی صورت میں
اسی کی چھاتیوں کو روندتا ہے
ہوا میں جھومتا ہے
اور بنجر بستیاں
آباد ہوتی ہیں

ح عامر

(سائنٹفک) ریسرچ فیلو شعبۂ فلسفہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

○

جنگل

رات اترتے ہی

جنگل

چپکے چپکے سو [illegible]

شیتل شیتل [illegible]

جنگل کی باہوں میں سوتے

کلیوں کے کومل

ہونٹوں کو چھو جاتی ہیں

بے بس سی مسکان

جنگل

رات اترتے ہی جنگل

چپکے چپکے سو جاتا ہے

اب کے برس

کچھ ایسا [illegible]

[illegible]

[illegible] جگمگاتی ہیں

[illegible] چپکے

تنہا پیڑ سے

چند لمحوں کی مسکان کی

خاطر

کیا کر گذرے

چاند تو بن میں اترے گا ہی

رات اترتے ہی

جنگل چپکے چپکے سو جاتا ہے

فدا راجوری

بھروٹ راجوری

کالے بُت

خدا
کالے بُتوں کو
ان کھیتوں پر
اور اونچا کر
کہ بنجر بستیاں
اب اور بنجر
ہو نہیں سکتیں
یہ دیکھیں
کیسے بارش اور ہوائیں
موسمی ہو کر
زمین کو فرطِ جذبِ شوق سے
پامال کرتی ہیں
مگر ہر ایک قطرہ
... کونپل کی صورت میں
اسی کی چھاتیوں کو روندتا ہے
ہوا میں جھومتا ہے
اور بنجر بستیاں
آباد ہوتی ہیں

ح عامر

(سابق ریسرچ فیلو شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

جنگل
رات اترتے ہی
جنگل
چپکے چپکے سو [illegible]
شیتل شیتل [illegible]
جنگل کی باہوں میں سوتے
کلیوں کے کومل
ہونٹوں کو چومے جاتی ہیں
بے بس سی مسکان
جنگل
رات اترتے ہی جنگل
چپکے چپکے سو جاتا ہے
اب کے برس

کچھ ایسا ہو [illegible]
[illegible]
[illegible]
چپکے [illegible]
تنہا پیڑ سے
چند لمحوں کی مسکان کی
خاطر
کیا کر گذرے
چاند تو بن میں اترے گا ہی
رات اترتے ہی
جنگل چپکے چپکے سو جاتا ہے

تعمیر

پریمی رومانی

خزاں کے دو رُخ
وادیٔ کشمیر کے آئینے میں

(۱)

ہوائیں نم
میرے ہر سمت منظر بے کسی کے
یہ ننگے بے زباں سے پیڑ ہیں چاروں طرف میرے
وہ اُجڑے باغ
ٹوٹی بستیاں دیکھو
زمیں دیکھو زماں دیکھو
یہ سارا کارواں دیکھو
نہ وہ سرمستیاں ہیں اب
نہ وہ رعنائیاں باقی
فقط ویرانیاں ہر دن
فقط بے تابیاں ہر شب

یہ پردہ پوش ساری رونقیں کیوں ہیں؟
بہاریں ہوگئیں رخصت جو ہم سے تو
خزاں آئی !!

(۲)

ہوائیں سرسراتی ہیں
لئے ٹھنڈک دِشاؤں کی
اُترتی، ڈگمگاتی، پربتوں کی سیڑھیاں دیکھو
یہ ٹھنڈی کارتک کی چاندنی سے ہوگئی ہے خیمہ زن لبستی
شفق کی چادریں پھیلی ہوئی ہیں آسمانوں پر
چناروں میں لگی ہے آگ دھیمے سے
سنّاٹوں نے لیا ہے دم
دلوں کی دھڑکنیں بڑھتی ہی ہیں ہر دم
تخیّل کے پروں میں پھڑپھڑاہٹ ہے
دلِ شاعر ہے آوارہ خزاں کے جلوۂ بے رنگ سے یارو
سلامِ شوق کہتا ہے !!

تمیر

افسانه

پُشکر ناتھ: اے ۲۳ - ترِ جن داس پریم نگر منڈیلا ئے جموں

پُل نمبر صفر کے گِدھ

جہلم کے کنارے، پُل نمبر صفر کے اِس پار، بنڈ کے پاس چند بوڑھے چناروں کا قافلہ ایستادہ ہے
انہی چناروں کی اونچی پھننگوں پر سالہا سال سے گِدھوں کا ایک خاندان آباد ہے۔
کہتے ہیں، یہ گِدھ جب رات کو روتے ہیں، تو پاس ہی کلب کی خواب آگیں فضا میں
آسیبی سائے منڈلانے لگتے ہیں۔ بظاہر یہ کوئی تشویشناک بات نہیں ہے لیکن اتفاق کہیے یا شومئی
تقدیر کہ [illegible] سے کچھ ہی دور بنڈ کے نشیب میں جہلم کی چھاتی پر ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی بھی
سالہا سال سے لنگر انداز ہے۔ اور جہلم کی روانی کے ساتھ ساتھ محوِ حرکت ہے۔ اسی کشتی کے ایک
سرے پر ایک بوڑھا ملّاح، اپنی سوکھی سڑی، ٹانگوں میں کانگڑی دبائے اونگھتا رہتا ہے۔
مسلسل کانگڑی کا سینک ناپتے ناپتے اس بوڑھے ملّاح کی ٹانگوں اور چھاتیوں پر ملگجے لال
رنگ کی پپڑیاں جم گئی ہیں۔ جن کی طرف دیکھ کر لگتا ہے جیسے ان گنت زخموں پر وقت کے بے رحم کالے
ہاتھوں کی انگلیوں نے انمٹ نشان ثبت کئے ہوں۔

کلب کی عمارت کی ایک کھڑکی پہ ایک بہت پرانی دوربین نصب ہے جسے کلب کے اراکان تفریحِ طبع کے لیے کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اس دوربین کے واسطے سے کبھی کبھی یہ بوڑھا ملاح بھی نظر آتا ہے، روایت ہے کہ چند سال پہلے کسی انگریز نے بھی اِن گدھے نشانات کو دیکھا تھا اور ایک میڈیکل پیپر تحریر کیا تھا "کانگڑی اور کینسر" اس معنون نے طبی دنیا میں ایک ہلچل مچائی تھی۔ کہتے ہیں اُس رات چناروں کی اونچی پھننگوں پر بسنے والے گدھوں کا خاندان رات بھر روتا رہا تھا۔ اور کلب کی راہداریوں میں آسیب اُچھلتے کودتے رہے تھے۔

یہ گدھ اِن چناروں کی شاخوں میں کسی اجنبی کا گذر کبھی نہیں ہونے دیتے۔ بظاہر دن بھر ایک دوسرے کو چونچیں مارتے دکھائی دیتے ہیں اور اس قدر شور برپا کر دیتے ہیں کہ بنڈ پر چہل قدمی کرنے والے ملکی اور غیر ملکی سیاح لوٹ جاتے ہیں۔ مگر جونہی کوئی اجنبی گدھ غلطی سے اس طرف نکل آتا ہے تو یہ سب کے سب اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اُسے لہولہان کر دیتے ہیں۔ وقت کے اوراق پر درج ہے کہ ایسے کئی اجنبی گدھ، بوڑھے اور جوان، نر اور مادہ وقتاً فوقتاً جان بحق ہو گئے ہیں۔

کلب کی وقت زدہ راہداریوں میں گدھوں کی اس اجارہ داری پر کبھی رائے زنی نہیں ہوئی ہے، نہ کلب کی وزیٹرز بک میں اِن گدھوں کے بارے میں کسی جانے یا انجانے ٹورسٹ نے کوئی جملہ تحریر کیا ہے۔ انسان بھلا گدھوں کے بارے میں کیا تحریر کرے؟ مردار کھانے والے، بے ہنگم صدائیں بلند کرنے والے، ایک دوسرے کی چونچ سے نوالہ چھین لینے والے، کریہہ الشکل و الہیئات سے پرندے، جانے اِن سربلند، باحشمت، پُروقار، پُرشکوہ، چناروں کا پٹہ اِن کو کس نے دیا تھا۔

ہاں! وہ کشتی والی بات بیچ میں ہی کہیں کٹ گئی۔ اور اس بوڑھے ملاح کی جو اس بوسیدہ کشتی کے سرے پر ٹانگوں میں کانگڑی دبائے اونگھتا رہتا ہے۔ اس خواب آگیں گرد و نواح میں اس بوڑھے ملاح کی حیثیت تیسرے درجے کی ہے۔ کیونکہ اس کے کردار میں نہ کلب کے اراکین کی شوخی، تمکنت، امارت، ذہانت اور ظرافت ہے اور نہ ہی چناروں کے چھتناروں میں رہتے بستے گدھوں کی چھینا جھپٹی، بے قراری، مکاری، اجارہ داری اور عیاری ہے، نامراد سارا سارا دن اپنی بوسیدہ

تیمر

کشتی کے سرے پر بیٹھا اونگھتا رہتا ہے۔ کلب کی کھڑکی میں نصب پرانی دوربین سے دیکھنے پر کبھی کبھی مُردہ نظر آتا ہے۔ مگر اس دوربین کا کیا بھروسہ، یہ بھی تو اب بوڑھی ہو گئی ہے۔

چلیے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے اس دوربین کا زاویہ تبدیل کریں اور اس بوڑھے ملاح کی آنکھ سے گرد و نواح کا نظارہ کریں۔ ہے تو انہونی سی بات، مگر کیا کیجیے۔ حالات نے انہونی کو اہمیت بخشی ہے۔ اب دیکھیے نا، مسٹر جاوید کا وہ سوٹ کیس اگر پہلے ہی سفر میں پکڑا جاتا۔ تو وہ صرف دس سال کے اندر لکھ پتی نہیں بن جاتا۔ آج کی شام وہ کلب کے کارڈ روم میں ابھی تک ستر ہزار روپے ہار چکا ہے اور باہر اس کی ووکس ویگن میں بیٹھا ہوا ڈرائیور اپنے بدن سے موبل آئل پونچھ رہا ہے۔ نہیں جی۔ یہ عام اصطلاح والا موبل آئل نہیں ہے۔ کچھ پسینہ، کچھ ولایتی عطر کا خمار، کچھ لپ اسٹک کی سرخی، کچھ تیز سانسوں کا زیر و بم، اس موبل آئل کی کیمسٹری کچھ اور ہے۔ کالج کے زمانے میں مسز جاوید کا پسندیدہ مضمون کیمسٹری ہی تو تھا۔

مسز جاوید کے پارٹنروں میں ایک ڈاکٹر ہے جس کے بارے میں اب بھی زیر لب کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے موجودہ اہم عہدے تک اپنی دلکش اور دلنواز سالی کے اثر و رسوخ سے پہنچا تھا۔ ڈاکٹر آج دھڑا دھڑ نوٹ جیتے جا رہا ہے مگر جس رفتار سے وہ جیت رہا ہے، اسی رفتار سے دوسری ٹیبل پر اس کی بیوی ہار رہی ہے۔ اس دوسری ٹیبل پر کیمسٹری کا نہیں، سائیکولوجی کا سایہ ہے۔ بھلا ہو سردارنی سکھوندر کور کا، سائیکولوجی کی اس قدر ماہر ہے کہ اس کی نوٹ بک میں درج ٹیلی فون کے نمبر بولتے ہیں، ناچتے ہیں، گاتے ہیں، روتے ہیں، ماہروں کا کہنا ہے یہ نمبر زیادہ تر روتے ہی دیکھے گئے ہیں۔ مگر رونے رلانے کا کھیل تو پنڈت سروانند کا من پسند کھیل ہے، واقف کار حلقوں کا کہنا ہے، سروانند کتنی چیز ہے۔ مگر تہذیب یافتہ زبان اس لفظ کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ پنڈت سروانند کے بے شمار مہربان ہیں، دوست ہیں، واقف کار ہیں۔ آج کے زمانے میں ترقی اور خوشحالی جہاں روپے پیسے، چاپلوسی سے، اثر و رسوخ سے پشت پناہی سے حاصل ہوتی ہے، وہاں ان مرحلوں میں سفارش کا مرحلہ بھی شامل ہے۔ سروانند سفارشیں مہیا کرنے میں ماہر ہے چنانچہ

ضمانت دلوانے، میڈیکل سیٹ دلوانے، گاڑی کا پرمٹ دلوانے، فرلبک کا الاٹمنٹ دلوانے میں اس نے پبلک کی بہت خدمت کی ہے۔ نیک بندے کو منسٹر ہونا چاہیے تھا نہیں بن سکا ہے شاید اتنی کوالیفکیشن کافی نہیں تھی ـــ البتہ اس بے وقوف لڑکی کی کوالیفکیشن کافی تھی، بھلا سا نام تھا اس کا، آشا ـــ یعنی امید۔ امید؟ کس بات کی امید ـــ؟ کیا انوکھا سا لفظ ایجاد کیا ہے تہذیب نے یہ ــــ امید ــــ جانے کتنے معصوم، بے چہرہ، بے بس، بے سفارش، بے ثروت، بے رسوخ، بے دولت، بے شفقت، بے گناہ، بے ضرورت لوگ اس لفظ کا تار تار دامن تھامے اپنی زندگیاں سولی پر لٹکائے محوِ انتظار ہیں۔ آشا نام کی لڑکی بھی محوِ انتظار تھی، اچانک ایک دن قسمت کی اندھی اور بہری دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔ اسے سروانند مل گیا۔ چنانچہ سروانند کی خدمتِ خلق کی فیکٹری چالو ہو گئی۔ آشا کو اسکول ٹیچر کی ملازمت کا پروانہ مل گیا۔ پروانہ حفیظ اللہ کے پاس تھا۔ سفارش سروانند کے پاس تھی اور پاکدامنی کا دوپٹہ آشا کے پاس تھا ـــ چنانچہ اس رات اس دوپٹے کو خوب خوب ہوا میں لہرایا گیا۔ دوسرے دن پوسٹ مارٹم کرنے والی ٹیم کو وہ نوکری کا پروانہ آشا کی بند مٹھی میں ملا تھا۔ نادان لڑکی نے تیزاب کی شیشی پی ڈالی تھی۔ جو اس کی ماں اس کی ساڑی رنگنے کے لئے لائی تھی۔

یہ رنگ سازی کا فن بھی اب ترقی یافتہ معاشرے کا لازمی جز بن گیا ہے۔ چہرہ رنگیے، کپڑے رنگیے، شاعری رنگیے، لیاقت رنگیے، خاندان رنگیے، کردار رنگیے، ضمیر رنگیے، حتیٰ کہ گناہ بھی رنگے جا سکتے ہیں۔ قابل رنگساز کا ملنا شرط ہے۔ کیونکہ اس فن کے ماہر جیب کاٹنے کو اہم کہتے ہیں۔ فن کا کمال ایسا کہ پچھاڑی کو رنگوں کی کوکشِ پلک سے درست کر کے شاعر بنا دیتے ہیں۔ چاقو چلانے والی کو رنگوں کی بھول بھلیوں سے گزار کر لیڈر بنا دیتے ہیں۔ دولت کی بہتات کا ایک شرط یہ بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ خریدا جا سکے خرید لو ـــ اچھا گھر، اچھا خاندان، اچھا کردار، اچھی امیج، اچھا پبلک ریلیشن ـــ دولت شرط ہے۔ مال تو ہر طرح کے مل ہی جاتے ہیں۔

بہت بڑی غلطی ہو گئی، جو ہم نے اب تک اندھی محبت کا زاویہ نہ بدلا کیا۔ ایسا ہی

حمید

سے نپٹ کر کیسے نکلا جا سکے گا۔ مگر اس غلطی میں آپ بھی اتنے ہی شریک ہیں، جتنا میں ہوں۔ آپ بھی دلدل میں اتر گئے ہیں۔ میں بھی اتر گیا ہوں۔ کشتی کے پیرے پر بیٹھے ہوئے اس بوڑھے ملاح کا وجود ہی ایسا ہے۔ خواہ مخواہ گذرے ہوئے وقت کی یاد دلاتا ہے، ان لوگوں کی جو پیچھے تھے ان رشتوں کی جو خوشبودار تھے۔ ان غم گساروں کی جن کی پلکوں پر آنسو بھی لرزا کرتے تھے۔ اب صرف یہ شور مچاتے، لڑتے جھگڑتے، چھینا جھپٹی کرتے گدھ رہ گئے ہیں۔ جنہوں نے ان باوقار چٹانوں کا پتہ نہ جانے کہاں سے اور کیوں کر حاصل کیا تھا یا پھر کلب کی پراسرار راہداریوں میں دبے پاؤں چلنے والے یہ ہیولے، کہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ تمام کے تمام آدمی بہت پہلے مر گئے ہیں۔ اور اب صرف آسیب باقی رہ گئے ہیں۔ جن کا نہ کوئی ضمیر ہے اور نہ کوئی محبت ہے، نہ کوئی رشتہ ہے۔ نہ کوئی سخاوت ہے ـــ نہ کوئی زندگی ہے؟

زندگی۔ ؟ یہ لفظ کہاں سے گھس آیا اس تحریر میں؟ کسی دوسرے سیارے سے آیا ہوگا۔ کیا میں بھی کسی دوسرے سیارے سے آیا ہوں۔ ؟ شاید ـــ جبھی یہ اجنبیت کا احساس بار بار میرے بہت اندر کہیں سے سر اٹھاتا رہتا ہے، مگر نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے سامنے میرے آگے پیچھے میرے اریب قریب (Robots) نہیں ہیں۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں۔ جو دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، محسوس کرتے ہیں۔ کبھی کبھی رو بھی پڑتے ہیں۔ پھر ـــ ؟ پھر یہ کیفیت کیوں؟ یہ گدھوں کا شور، یہ پراسرار ہیولے، یہ ہیبت ناک مناظر، یہ دلخراش وقوعے، یہ سب کیا ہے؟ کس سے پوچھوں؟ کون بتلائے گا مجھے؟ ہٹا دو اس وقت ذرا دوربین کو۔ مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھنے دو۔ اے بوڑھے ملاح! اس کے لئے تم کچھ بولو، مگر تم کچھ نہیں بولو گے۔ تمہیں صرف دیکھا جا سکتا ہے۔ تم سے گفتگو نہیں ہو سکتی۔ تم تو فقط ماضی ہو۔

مگر ـــ یہ آواز ـــ ؟ کیسی آواز تھی یہ؟ یہ زمین کیوں ہلنے لگی ہے۔ یہ تیز ہوائیں؟ کیسی ہوائیں ہیں یہ؟ طوفان، کیسی گھن گرج، نہ بادل ہیں، نہ بارش ہے! مگر طوفان گرج رہا ہے گھٹنا ٹیک رہے ہیں چناروں کی شاخیں الجھ رہی ہیں۔ یہ کیا؟ کلب کی عمارت کی چھت ہی اڑ گئی۔

تمہ

سب کچھ [illegible] گدھے چیخ رہے ہیں۔ مردار کھانے والے بے ہنگم صدائیں بلند کرنے والے ایک دوسرے کی چونچ سے نوالہ چھیننے والے، کریہہ الشکل واہیات سے پرندے۔ ہیں۔ میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا۔ میں بندوق لے آتا ہوں۔ کلب کی دیواروں پر کئی بندوقیں آویزاں ہیں، میں ان گدھوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں گا۔ مگر ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ قہقہہ ۔۔۔؟ کون؟ کس کا قہقہہ تھا۔؟ بوڑھے ملاح کیا تم۔؟ تم تو ماضی ہو۔ تمہیں تو صرف دیکھا جا سکتا ہے؟

قہقہہ میرا نہیں، تمہارا، اپنا ہے میرے بچے ۔۔۔ مجھے دیکھ کر تمہارے اپنے شعور نے اس قہقہے کو جنم دیا ہے۔ جو تمہارے ہی ہونٹوں سے پھوٹ پڑا ہے۔

تم ۔۔۔ تم ذرا رک جاؤ بوڑھے ملاح ۔۔۔ پہلے مجھے ان گدھوں کو خاموش کرنے دو ۔۔۔ تم ایسا نہیں کر سکتے میرے بچے ۔۔۔ تم اس تصویر کو گولی نہیں مار سکتے۔

مگر کیوں؟ کیوں؟

کیونکہ یہ تمہارا اصل ہے، جسے تم نے اپنے آج سے تعمیر کیا ہے۔

کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں نے؟ میں نے تعمیر کیا ہے، اسے۔؟ اپنے آج سے؟ تم سٹھیا گئے ہو بوڑھے ملاح۔ تم خاموش ہی رہو تو اچھا ہے۔

میں تو صدیوں سے خاموش ہوں۔ مگر تم زبان رکھتے ہوئے بھی اپنی اولاد کو اور اپنی آنے والی نسلوں کو کیا جواب دو گے۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہوں۔ جواب؟ کئی جواب ہیں میرے پاس ۔۔۔ میرے پاس ترقی ہے، کمپیوٹر ہے جنگل اور جوپیٹر کا پاسپورٹ ہے، ہائیڈروجن بم اور رشوت ہے۔ میکانیکی عذر نگار ہیں۔ مصنوعی دل اور گردے ہیں۔ پلاسٹک کا گلاب اور اصلی کینسر ہے۔ جواب ہی جواب ہیں جن کے پاس

طوفان تھم چکا ہے۔ دور دور تک رات کے سائے گھر آئے ہیں۔ صرف کلب کی کھڑکیوں سے روشنی کی لکیریں چھن چھن کر باہر آ رہی ہیں۔ برف گر رہی ہے۔ اور آس پاس قریب کی تمام چیزیں برف کی تہوں میں چھپتی جا رہی ہیں۔ میں اس باوقار اور پُرحشمت چنار کی ایک ٹہنگ پر بیٹھا ہوں۔

۷۳۰۶

تمیر

میرے پیروں پہ برف دھیرے دھیرے جمع ہوتی جا رہی ہے۔ جیسے جہلم کی سطح پر ڈولتی ہوئی اُس بڑی سی، وقت زدہ سی، بوسیدہ سی کشتی کے سرے پر وہ بوڑھا ملاح حسبِ معمول بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ اُس طوفانی رات کے بعد یہ پھر کبھی نہیں بولا ہے۔ اُس طوفانی رات، جب میں بھی انسان کی شکل میں تھا۔ بول سکتا تھا۔ مگر میں نہیں بولا — بول ہی نہ سکا۔ میں نے بندوق اپنی کنپٹی سے نکال کر ٹریگر دبا دیا تھا۔ کیونکہ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں اپنی اولاد کو اور اپنی آنے والی نسلوں کو کوئی جواب نہ دے سکوں گا۔

اب میں گدھ بن کر اس چنار کی پھننگ پر بیٹھا اپنی اولاد کے سوال کا انتظار کر رہا ہوں۔

شہر کا اغواء

یہ کونسی جگہ ہے۔ یہ کیسی خاموشی ہے۔ یہ ویرانی کا عالم، یہ ڈرا دینے والی خاموشی یہ مکان، یہ دکانیں، یہ سڑکیں خالی کیوں ہیں؟ اس شہر میں رہنے والے لاکھوں لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔ یہ شہر جہاں زندگی متحرک تھی۔ جہاں اضطراب تھا۔ بھاگتی ہوئی بسیں اور موٹریں تھیں سچ تھا۔ جھوٹ تھا۔ محبت تھی، نفرت تھی، وفا تھی، دغا تھی... لوگ ہر وقت تیزی سے ادھر ادھر بھاگتے رہتے تھے۔ وہ سب کہاں ہیں؟ یہ ماجرا کیا ہوا ہے؟ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں پاگل تو نہیں ہوا ہوں... نہیں یہ خواب نہیں۔ حقیقت ہے۔ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں... میں دیناناتھ ہوں۔ ٹیلی فون منسٹری... مگر اس بڑے پھیلے ہوئے شہر کے مکین کہاں چلے گئے ہیں۔ یہ شہر خالی کیوں ہو گیا ہے؟ یہ کارخانے، یہ دفاتر، یہ سکول، یہ ہوٹل، یہ پارکیں، یہ سڑکیں خالی کیوں ہیں۔ یہ آسمان ویران، سناٹے کی چادر میں لپٹا ہوا یہ شہر۔ کہیں انسان نظر آتے ہیں نہ حیوان... نہ چرند نہ پرند۔ یہ وہی سڑک ہے نا جس پر ہر وقت بے شمار لوگ چلتے پھرتے تھے

تعمیر

وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر تو وہ زیادہ ہی شور مچایا کرتے تھے... میں کسی خطرناک بیماری کا شکار تو نہیں ہو گیا ہوں... میری آنکھوں کی روشنی تو نہیں چلی گئی ہے... نہیں اگر ایسا ہوتا تو مجھے یہ مکان، یہ دکانیں نظر نہ آتیں... پھر... یہ کیا معاملہ ہے...؟ میں اس بڑے شہر میں اکیلا کیوں رہ گیا ہوں۔ کیا میرے سوا اس شہر میں اور کوئی نہیں...؟ نہیں یہ میرا وہم ہے۔ میں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ سب اسی شہر میں ہیں۔ کوئی شہر چھوڑ کر نہیں چلا گیا ہے۔ مگر کہاں ہیں سب... مجھے نظر کیوں نہیں آتے۔ شاید وہ مجھ سے چھپے ہوئے ہیں۔ ہاں یہی بات ہے۔ لگتا ہے میں نے کوئی بدترین گناہ کیا ہے۔ لوگ میری شکل تک دیکھنا نہیں چاہتے۔ اسی وجہ سے وہ مجھ سے چھپ رہے ہیں۔ میرے سائے سے ڈر رہے ہیں۔ میرے وجود سے خوفزدہ ہیں۔ شاید میرے جسم کو کوڑھ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور اب میں درد کی چادر پھیلائے در در بھیک مانگتا پھر رہا ہوں لیکن میرے نصیب میں نفرت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسی لئے لوگ مجھ سے دور بھاگ رہے ہیں۔ مبادا کہ میری پرچھائیاں انہیں چھو لیں۔ وہ... وہ اس دیوار کے ساتھ لگ کر کوئی کھڑا ہے۔ ارے بھائی... شاید کوئی عورت ہے۔ سنو... دیوی... ماں... بیٹی، خدا کے لئے ایک منٹ رکو... دیکھو بھاگو مت... مجھ سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں... ہاں کہاں چلی گئی۔ ابھی ابھی تو یہاں تھی۔ شاید کوئی نہ تھا... وہم... سایہ۔ میرا وہم کھٹک رہا ہے۔

"لوگو... اے اس بڑے شہر کے لوگو۔ سامنے کیوں نہیں آتے باہر آؤ۔ مجھ سے ڈر کیوں رہے ہو... میں پاگل نہیں، کاٹتا نہیں۔ لوگو۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں دینا ناتھ ہوں۔ ٹیلی فون مستری — میں تمہارے ٹیلی فون ٹھیک کرتا ہوں۔ تم نہ رہے تو میں کس کے لئے ٹیلی فون ٹھیک کروں گا۔ میں تمہارے بغیر بیکار ہوں۔ جس طرح تمہارے ٹیلی فون میرے بغیر بے کار ہیں۔ لوگو... تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔"

میں مسلسل چیخ رہا ہوں۔ اس شہر میں میری آواز سننے والا کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ پہلے پہل میں انہیں نظر آیا کرتا تھا۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آتے۔ شاید سب لوگ غائب ہو گئے

ہیں۔ شاید دشمن ملک نے حملہ کر دیا ہے۔ اور اس نے بم کا استعمال کیا ہے جس سے صرف جاندار مر جاتے ہیں۔ ہوا میں ذرّے بن کر تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یا اب لگتا ہے، جیسے کسی جادوگر نے انہیں چشم زدن میں غائب کر دیا ہو۔ لیکن اس خلائی دور میں جادوگر کہاں۔ یہ کم بخت سائنس دان بھی تو جادوگر ہی ہوتے ہیں۔ ان کا کیا بھروسہ۔ ہاں شاید یہی ماجرا ہوا ہے اس شہر کا ہر شخص، ہر جاندار ہر ذی روح، ایٹمی ذرات میں تبدیل ہو چکا ہے۔ نظر نہ آنے والے ذرّوں میں۔ پہلے اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا۔ بے چہرگی کا رونا رو رہا تھا۔ اب سرے سے ہی غائب ہو گیا ہے۔ انسان... مگر میں کس طرح بچ نکلا ہوں۔ میں اس وقت کہاں تھا۔ میں دینا ناتھ، ایک معمولی ٹیلی فون مستری۔ ہاں یاد آیا شاید اس وقت زمین کے سینے میں ٹیلی فون کے تاروں میں الجھا ہوا تھا۔ ہاں شاید یہی بات ہے اسی وجہ سے میں بچ رہا۔ میرے ہاتھوں میں لگی ہوئی کالک... یہ تاروں کے جلنے کی بو۔ میرے ہاتھ کتنے گندے ہیں۔ مجھے یہ صاف کرنے چاہیں۔ بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ سامنے ایک ہوٹل نظر آ رہا ہے۔ یہ وہی ہوٹل ہے۔ جو ہر وقت لوگوں سے بھرا نظر آتا تھا۔ جسے دیکھ کر میں سوچا کرتا تھا کہ دنیا میں غم نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے۔ تو سوئمنگ پول کا بلوریں پانی ہے اور اس میں تیرتے ہوئے مرمریں بدن ہیں۔ ڈانس فلور پر تھرکتی ہوئی جوانیاں ہیں۔ سنہری دھوپ ہے نیلا آسمان ہے۔ لیکن اس وقت یہ عالی شان ہوٹل زندگی کی طرح خالی نظر آ رہا ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹل... ایک سو کمرے۔ آج یہ ہوٹل خاموش ہے۔ خالی ہے۔ نہ دربان، نہ بیرے، نہ بار ٹینڈر نہ مینیجر... ہائے اس مخملی صوفے پر بیٹھنے کی کس قدر چاہ تھی۔ بس اب میں یہ پاؤں پسار کر سو جانا چاہیے۔ ایک لمبی میٹھی نیند میں نہ جانے کب سے جاگ رہا ہوں... پہلے مجھے کھا پی لینا چاہیے۔ میں پیاسا بھی ہوں۔ اس چمکتے ہوئے فرج میں ضرور کوئی ٹھنڈا مشروب ہوگا... ہاں یہ تو نعمتوں سے بھرا پڑا ہے۔۔۔

"دینا ناتھ تو کس قدر خوش نصیب ہے۔ ہاتھ بڑھا۔ اٹھا جو کچھ تجھے پسند ہے۔ اس وقت تمہیں کوئی روکنے والا نہیں۔ بل مانگنے والا نہیں۔ یہ خوشبودار سیب جنہیں دیکھتے ہی بھوک

تیز

مٹ جاتی ہے۔ یہ رنگ دار کیک، تمہارے بچپن کے خوابوں سے بھی زیادہ حسین ۔۔۔ اٹھا ۔۔۔ ڈر کیا رہا ہے؟ زندگی بھر تو ڈر اور خوف کی دنیا میں مر کے جیا ہے ۔۔۔ آج تو اکیلا ہے۔ ہاتھ بڑھا ڈر کیوں رہا ہے!"

پیاس بڑھتی جا رہی ہے۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔ منہ سے معدے تک کانٹوں کا جال بچھا جا رہا ہے۔ کیک اس طرح نہ کھایا جا سکے گا۔ پہلے ٹھنڈے سادہ پانی کا ایک گلاس پی لینا چاہیے۔ یہ نل ہے، یہ رہا گلاس لیکن یہ پانی ۔۔۔ کیا یہ پینے کے لائق ہے۔ کہیں اس میں وہ آسیبی قوت تو نہیں جس سے اس شہر کے سب لوگ غائب ہو گئے ہیں۔ کسی کمبخت سائنس دان نے پینے کے پانی میں کچھ ملا دیا ہے۔ میں اس پانی کو کسی بھی صورت میں نہیں پی سکتا۔ میری زندگی اتنی سستی نہیں میں پانی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں۔ میری کونسی پیاس اب تک بجھ سکی ہے جو اب بجھے ــــــ میں ہمیشہ سے ہی بھوکا اور ننگا اور پیاسا ہوں ۔۔۔ آج میں اس شہر کا مالک ہوں۔ شہر خالی پڑا ہے۔ اس کی ایک ایک چیز میری ہے۔ یہ فائیو سٹار ہوٹل ۔۔۔ اس کی کیا حقیقت ہے!

یہ بو ۔۔۔ کیسی بو آ رہی ہے۔ شاید کہیں بجلی کے تاروں نے آگ پکڑ لی ہے۔ مگر نہیں ۔۔۔ یہ بو میرے کپڑوں سے آ رہی ہے۔ مجھے اپنے کپڑے تبدیل کر لینے چاہیں۔ یہ خاکی زین کی وردی ۔۔۔ کیا زندگی بھر میرے جسم سے چپکی رہے گی۔ مجھے اس ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان میں داخل ہونا چاہیے۔ کس قدر پھیلی ہوئی دکان ہے یہ۔ اس کے سامنے سے جب بھی میں گزرتا تو لگتا تھا کہ اس کے دلفریب شوکیسوں کی طرف دیکھ کر مجھ سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو رہا ہے لیکن اس وقت خالی ہے، مینیجر نہ سیلزمین۔ اب اس شہر کی سب سے بڑی اور سب سے مہنگی دکان کا مالک میں ہوں۔ یہ رہی ٹری وول، یہ پالسٹر، اسٹی ٹونٹی، یہ ہلکی گلابی رنگت لئے ہوئے قمیض اور یہ نیلی جین، میرے سائز کے ہیں ــــ " تمہارا سائز کیا ہے دینا ناتھ ــــ؟ پتلون کی لمبائی ۴۲ انچ، سینہ ۳۸ انچ اتنا بڑا ہو گیا ہے تو۔ ارے دینا ناتھ تو اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ تو تو اپنے آپ کو بہت چھوٹا آدمی سمجھتا تھا۔ تو یکایک اتنا بڑا آدمی کیسے بن گیا۔ لیکن ایک بات بتا تو اگر اس شہر کا سب سے بڑا آدمی تھا

گیا ہے تو مجھ سے چھوٹا کون ہے اب ... کوئی نہیں۔ اس شہر کے لوگ غائب ہو گئے ہیں۔ یہ شہر تو لوگوں سے خالی ہے۔ اب تو سب سے بڑا آدمی کیسے ہوا؟ یہ گلابی قمیص پہننے سے کیا فائدہ... کس کے لئے، کون ہے یہاں جسے دکھلانے کے لئے یہ خوبصورت اور قیمتی کپڑے پہنے گا۔ کسے رشک ہوگا۔ کون حسد کی آگ میں جلے گا۔ دینا ناتھ اس دنیا میں سب کچھ دکھاوے کے لئے ہوتا ہے ورنہ ضرورت تو خاک کی زمین سے بھی پوری ہوتی ہے۔

ارے ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ یہ کپڑے پہننا فضول ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ اس بینک میں داخل ہو جاؤں۔ اس میں لاکھوں کروڑوں روپے ہیں۔ لوگ تو اس شہر کے غائب ہو گئے ہیں۔ باقی دنیا تو آباد ہوگی۔ کسی دوسرے شہر میں ایک نئی زندگی شروع کی جا سکتی ہے۔ ایک نئی خوبصورت دنیا جس میں نیلا آسمان ہوگا۔ سوئمنگ پول کا بلوریں پانی ہوگا۔ اور... اور... ابھی تھوڑی دیر قبل میرا بینک بیلنس کتنا حقیر تھا۔ پانچ روپے دس پیسے اور اب ـــ! ایک ہزار ایک لاکھ، ایک کروڑ، ارب، کھرب، نیل، پدم، سنکھ اب میں اپنی ہر پیاس بجھا سکوں گا۔ میں اب نہ بھوکا ہوں گا۔ نہ پیاسا... پانی... پیاس... منہ سے معدے تک، نہیں روح کے ہر گوشے میں اور دل کے ہر ٹکڑے میں کانٹوں کا جال بچھا جا رہا ہے۔ یہ پانی... ٹھنڈا، شیریں ماں کے دودھ کی طرح، ماں... ماں... میں بہت پیاسا ہوں... میں ماں بہت تھک گیا ہوں ماں مجھے ایک بار صرف ایک بار لوری سنا دے۔ ہاں ماں میں تمہارے پاس آ رہا ہوں... ماں....

پانی پیتے ہی یکایک دینا ناتھ اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا۔ اور ریزہ ریزہ ہو کر ذرات میں تبدیل ہونے لگا۔ پہلے سو، پھر ہزار، پھر لاکھ، پھر کروڑ، پھر ارب، پھر کھرب....

پھر وہ غائب ہو گیا اور جب وہ مکمل طور ہوا میں اور کائنات میں تحلیل ہو گیا تو شہر ایک دم سے جاگ پڑا۔ وہی شور، وہی آوازیں، وہی لوگ تیزی سے بھاگتے ہوئے..... ..

شمشان گھاٹ سے واپس آتے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے کہا.... ....

بیچارا دینا ناتھ... سارا جسم کرنٹ سے جل گیا تھا۔ بھگوان ایسی موت کسی کو نہ دے!

تعمیر

آنند لہر ایڈوکیٹ ہائی کورٹ جموں

پڑوسی

کوئی ہر روز میری زندگی کے دھاگے کو گانٹھ مار دیتا ہے گو اُس کا وجود تو اتنا ہی رہتا ہے مگر دھاگا لمبائی میں کم ہو جاتا ہے۔ میں ازل سے لے کر آج تک اُس شخص کی تلاش میں ہوں۔ میں اُسے قتل کرنا چاہتا ہوں اور ایسا کرنے کے لئے میں نے اپنے ناخن بڑھا دئے ہیں۔ ہر برس جب کونپلیں پھوٹتی ہیں اور خوبصورت جسموں پر اُبھار ابھی ظاہر ہونے ہی لگتے ہیں تو کوئی گانٹھ مار کر میری عمر کی لمبائی کو کم کر دیتا ہے۔

مجھے اپنے پڑوسی پر شک ہے کہ وہ ایسا کرتا ہے۔ تاکہ میں جلد ہی مر جاؤں اور وہ میرے مکان پر بھی قبضہ کر سکے حالاں کہ اُس کا اپنا مکان اتنا زیادہ اور بڑا ہے کہ اُس کے لئے سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے اور یہ شک میرے اندر میری اپنی ہی آنکھوں نے پیدا کیا ہے جنہوں نے اپنے اندر پوری دُنیا کو سمیٹ لیا مگر بے چارے پاؤں اپنا وجود نہ بڑھا سکے اور اسی کشمکش کا نتیجہ آج یہ ہے کہ جسم اپنے ہی پاؤں پر ٹھہر نہیں سکتا اور آج یہ پاؤں پر بوجھ ہو گیا ہے اور پاؤں

ٹھمیر

کی اپنی رفتار بھی ختم ہو گئی ہے وہ ہوا میں اُڑ نہیں سکتے سمندر میں تیر نہیں سکتے۔ جسم اتنا بھاری ہے کہ پاؤں زمین کے گڑھوں میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کی جب خواہش پوری نہ ہوئی تو یہ دُشمنی پر آمادہ ہو گئیں۔

میری اپنے پڑوسی سے پُرکھوں کے وقت سے دشمنی چلی آرہی ہے اور وہ بھی مجھ سے دشمنی کرتا ہے ایک بار ایک شخص نے مجھ سے پوچھا "آپ کی ساتھ والے پڑوسی سے کیا دشمنی ہے؟" صرف یہ "وہ مجھ سے دشمنی کرتا ہے۔"

صدیوں سے یہ دُشمنیوں کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ کیونکہ تمام لوگ ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے گھروں کے اندر تیز ہتھیار جمع کر رکھے ہیں۔ ہتھیار ہمیشہ اپنی حفاظت کے لئے رکھے جاتے ہیں مگر یہ قتل دوسروں کا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہتھیاروں کی یہ خاصیت ہے کہ یہ ہتھیار رہنا چاہتے ہیں اور ہتھیار تبھی ہتھیار رہتا ہے کہ یہ کسی دوسرے کا خون بہائے۔ کسی کو قتل کرے۔ ہاتھ کبھی کسی کو قتل نہیں کرتے کیونکہ اِن کی خاصیت تو مرہم کرنا ہے۔ لیکن ہتھیار انہیں اپنا غلام بنا دیتے ہیں۔ ہتھیار آنکھوں کے اندر خون دیکھنے کی خواہش پیدا کرتے ہیں۔ کانوں کو چیخیں سننے کی عادت ڈالتے ہیں۔ ہتھیار صرف خون بہانا جانتے ہیں چاہے وہ اپنا خون ہو یا غیر کا۔ ہتھیار کسی کے دوست نہیں ہوتے وہ کسی رشتے ناطے، تہذیب، اخلاق کو نہیں مانتے۔

ایک دن ہوا کے جھونکے نے میری آنکھوں کو آنسوؤں کے شہر میں پھینک دیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے سینے کا زخم دن بدن گہرا ہو رہا ہے اور اسے مرہم کی ضرورت ہے۔ یہ زخم میرے سینے کے اندر اُس وقت پیدا ہوا تھا جب ایک روز میں نے اپنے دشمن کو مار کر دل کے اندر قبر کھودنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں نے زور سے ہتھیار پھینکے اور اپنے

تعمیر

ناخنوں کو بھی کٹوا دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری انگلیوں کو رہائی مل گئی ہے۔ میرے ہاتھ آزاد ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے پڑوسی سے پوچھا "تم مجھ سے کیوں دشمنی کرتے ہو" وہ حیران ہو گیا کیونکہ آج تک یہ سوال اُس سے کسی نے نہ پوچھا تھا اور نہ ہی یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہماری آپس میں دشمنی ہے۔ بلکہ ہم تو دوستی کا پرچار کرتے تھے۔ مگر ہتھیار بھی جمع کرتے تھے۔ میرے سوال نے اُس کے اندر جرأت پیدا کی اور اُس نے جواب دیا کہ "تم میری عمر کے دھاگے کو گانٹھ مار کر اُس کی لمبائی کم کر دیتے ہو۔ تاکہ میرے مرنے کے بعد تم میرے مکان پر قبضہ کر سکو" میں نے کہا کہ میں آج تک اُس کے بارے میں یہی سوچتا رہا۔ اس بات کا چرچہ سارے شہر میں ہوا۔ سب نے ایک دوسرے کو اپنی دشمنی کی وجہ بیان کی۔ تمام لوگوں نے اعلان کیا کہ وہ اس بار عمر کے دھاگوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر رکھیں گے اور دیکھیں گے کہ گانٹھ کون لگاتا ہے۔ تمام نے اپنی آنکھیں ہاتھوں پر مرکوز کیں مگر دیکھ کر حیران ہو گئے کہ اُن کے اپنے ہی ہاتھوں نے عمر کے دھاگوں کو گانٹھیں لگائیں۔

ویریندر پٹواری، پریم کنج، بڑی تالاب تلو، جموں (توی)

جگ بیتی

بڑھیا نے پھر کھڑکی کھول دی اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہنے لگی۔

"خدایا رحم! — مجھ بے کس پر کرم!! ترس کھا کر اپنا کوئی کرشمہ دکھا اور ایک اڑتی ہوئی مرغابی کو اس کمرے میں دھکیل دے ورنہ میری یہ ہڈیاں چٹکنے سے پہلے ٹوٹ جائیں گی"

باہر زبردست برف باری ہو رہی ہے۔ بڑھیا سردی سے ٹھٹھر رہی ہے۔ مگر پھر بھی وہ آس لگائے بیٹھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اتنا پانی بھر آیا ہے کہ وہ لہو کے ان قطروں کو دیکھ نہیں پا رہی ہے۔ جو چھت سے گرتے جا رہے ہیں۔ مگر ٹپ ٹپ کی یہ آواز چھت کے ساتھ لپٹی ہوئی ایک معصوم جان کو یوں سنائی دے رہی ہے۔ گویا ملک الموت کے قدموں کی آہٹ۔ کھلی کھڑکی دیکھ کر وہ بھاگ جانا چاہتی ہے۔ مگر اس کے ارادوں کو بے بسی کی زنجیروں نے جکڑ کر حسرتوں میں بدل دیا ہے۔ گھاس پھوس کی یہ چھت اس کا آخری سہارا ہے۔ اور یہ سہارا ابھی اس کی اپنی ہی کمزور گرفت کی وجہ سے بے سہارا چھوڑ دینے کی دھمکی دے رہا ہے۔ اپنے لہولہان جسم کو دیکھ کر اسے

تمیز

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پھانسی کا پھندہ سکڑ کر اس کی سانسیں روک رہا ہے۔ آنکھیں جب باہر نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں تب ایک منظر سامنے نظر آیا۔ ہنستے کھیلتے، رقص کرتے ہوئے اس کے پیارے پیارے ساتھی۔ مگر اچانک !! ___ آنکھوں کی حرکت کے ساتھ ہی اس کا دل کو ایک سخت برفیلے طوفان نے تتر بتر کر دیا ___ اور ایک دلکش عید ایک ڈراؤنے سناٹے میں بدل گیا۔ اپنے لہولہان بچوں کو برف کی سفید چادر پر گرتے دیکھ کر بھی اس نے زندہ رہنے کی خاطر کئی گھنٹوں کی مسلسل جنگ لڑی۔ مگر پے در پے شکست اسے دشمن کی طاقت کا یقین دلا چکی ہے۔ اس کا گھر والا، بھائی بہن، ماں باپ یا تو مارے گئے ہیں یا پھر ایک دوسرے سے بچھڑ کر جنگل میں کھو گئے ہیں۔ آنکھ بھر آئی تو وہ دائیں بائیں یوں دیکھ رہی ہے گویا کسی گھنے جنگل میں مسیحا کو تلاش کر رہی ہو۔

اچانک ایک سنسناہٹ ہوئی۔ اور ایک سرگوشی نے اس کے سانسوں کی رفتار تیز کر دی ہے۔ کسی کی موجودگی کا احساس یوں ڈرا رہا ہے گویا کسی خندق میں چھپے ہوئے کسی جنگی قیدی نے قدموں کی آہٹ سن لی ہو۔

"کون ہو تم۔!"

"تم، تم ___ کو۔ کون ہو؟"

"یہ میرا گھر ہے پہلے یہ بتاؤ۔ کیا تم یہ ٹپ ٹپ کی آواز سن رہی ہو۔"

"ہاں۔ میرے خون کی زبان ہے۔"

"گولی لگی ہے۔ کیا؟"

"ہاں۔"

"بہت درد ہو رہا ہے کیا؟"

"درد برداشت کر لوں گی۔ مگر ڈر میرے گلے کو دبوچ رہا ہے۔"

"کس سے ڈر لگ رہا ہے؟ مجھ سے!"

"نہیں۔ اس بوڑھیا سے۔ مگر جواب سن کر تم کیوں ہنس رہے ہو؟"

"کیونکہ بڑھیا کی نظر کمزور ہے۔ ہمیشہ نیچے دیکھتی رہتی ہے۔ تمہیں کہاں دیکھ پائے گی اور سنو بوڑھیا اونچا سنتی ہے گھبراؤ نہیں۔"

"یہ بوڑھیا کیا بڑبڑا رہی ہے۔"

"تم بھی اونچا سنتی ہو کیا؟"

"نہیں مگر یہ زبان سمجھ نہیں آ رہی ہے۔"

"پردیسی ہو۔"

"ہاں مگر تمہاری زبان سمجھ رہی ہوں۔"

"تم کون ہو؟ آرین۔ منگول، دراوڑین"

"معلوم نہیں۔ مگر اتنا بتا سکتی ہوں کہ ہمارے علاقہ جات میں بہت برف گرتی ہے۔"

"اچھا۔ اچھا۔ سائبیریا کی رہنے والی ہو۔ مگر تم یہاں کیسے چلی آئی۔؟" رہنے دو، رہنے دو، یہ کہانی پھر سہی۔ اس وقت اپنے لب سی لو۔ وہ دیکھو! اس شخص کے سر میں زہر ہے۔ اور نگاہوں میں زہر۔ بندوق میں بارود ہے اور اس کی انگلی گھوڑے پر۔"

"یہاں کا بادشاہ ہے۔"

"نہیں۔ اس جھونپڑی کا مالک، خالی ہاتھ آیا ہے۔ اسلئے مارے گا۔ اس بوڑھیا کو۔"

"کیوں؟ کھڑکی کھلی رکھی ہے۔ اسلئے؟ ہوا سے وہ ٹھٹھر رہا ہے۔ اسلئے"

"نہیں۔ یہ شخص برفیلے طوفانوں کا ہی انتظار کرتا رہتا ہے۔ جیسے ایک کسان پانی کا۔ جیسے قالین بننے والا بچہ اون کا۔"

"پھر اس بوڑھیا کا کیا قصور ہے۔"

"اس کی غفلت کی وجہ سے وہ جیتی بازی ہار گیا۔"

"جوا کھیلتا ہے کیا؟"

"نہیں اشکار! اس نو میں یہاں بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ آج صبح چند مرغابیاں کہر سے اندھی ہو کر کمرے میں چلی آئیں تھیں۔ بڑھیا کو ان کی حالت پر ترس آیا۔ ایک ایک کو اٹھا کر باہر نکال دیا۔ بیٹے نے دیکھا تو کوڑے برسانے۔ مگر یہ سن کر تم کیوں لڑکھڑا رہی ہو۔ کھڑکی دیکھ کر یا شکاری کی آنکھیں دیکھ کر۔"

"خون کے ان قطروں کو دیکھ کر۔ ان سے میری شناخت ہو سکتی ہے۔"

"تو پھر بھگوان کا نام"

"وہ کون ہے؟"

"مجھے کیا معلوم، مگر وہ ہے۔ جو بھی ہے مگر ہے۔ میرے ساتھیوں کو تو نہیں بچا سکا۔ مگر مجھے بچا لیا ہے اس نے"

"کس نے مار ڈالا ان کو؟"

"اسی راکھشس نے، دیکھو تو کتنی بے دردی سے پیٹ رہا ہے اپنی ماں کو۔"

"کیا یہ مرغابیوں کا تاجر ہے۔"

"کیوں تم کیا ان کے ٹریڈ ایجنٹ ہو؟"

"میں ان کی ترجمان ہوں۔ میرا خون ابل پڑا ہے۔ کیا یہ لوگ ہمارے گوشت کا سودا کرتے ہیں۔ ہم ان کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ ہمارے ہاں سب کچھ ہماری مرضی سے ہوتا ہے۔"

"کھانا ملتا ہے سب کو؟"

"ہاں۔ رہنے کو گھونسلہ بھی۔ ہم سب ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔"

"تب مجھے اپنے ساتھ لے چلو گی۔"

"تم اکیلے ہو؟"

"ہاں۔ مگر میرے کئی ساتھی تھے۔ اس راکھشس سے تنگ آکر ہم کبھی کھیتوں میں رہتے تھے اور کبھی مل کر جھٹ پٹ۔"

پرندوں کا ہاتھی ہے۔

"ایک بہت بڑی حماقت جو تم انسان کرتے ہیں، بیدار صنعتوں کا غالب بنانا ہے۔

"دوست کا نام لے کر اداس ہو کر کیوں آئی؟"

"وہ اپنے جن ننھے ننھے ہاتھوں سے بڑے بڑے قالین بناتا تھا ان سے مجھے اور میرے بچوں کو دانہ کھلاتا تھا۔ مگر اُف۔ میرے بچوں کو بارود نے اُڑا دیا اور اس دوست کو دق کی بیماری کھا گئی۔"

"اُف! تمہاری آپ بیتی سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہم دونوں مظلوم ہیں۔ شاید یہ جگ بیتی بھی ہے۔"

"ہم پرندوں کی کہانی آج کے انسان کی داستان ہے۔"

"میں تمہیں اپنا ہم سفر بنا لوں گی۔ مگر اگر؟ ایک بدیشی مرغابی اور ایک دیسی تیتر کا بندھن کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ہم پرندے ہیں۔ انسان نہیں۔ کیا ہوا خاموش کیوں ہو گئے۔ [illegible] سہارا بھی شفقت کرو۔ کیا تم اس بچے ہوئے حوصلہ کو اپنے آہنی ارادے سے روک نہیں سکتی؟"

"مگر کیسے؟ خون کا بہاؤ سانسوں کی رفتار سے تیز ہے۔ گنتی سانسوں کو پیچھے دھکیل کر بہت آگے جا چکا ہے۔ کنڈلی کھلی ہے۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ کر تم بھی سائبیریا چلے جاؤ۔ میرے ساتھیوں کو میرا سلام کہہ دو۔ پھر کچھ اپنی کہہ دو، کچھ میری سنا دو۔ اب تیز جھکڑ چل رہا ہے میں تمہارا ساتھ دے نہیں سکوں گی۔ میری سانسیں پھیلنی ہو رہی ہیں۔"

سلمٰی۔ دیکھ چکا ہوں۔ مگر کیسی نادان ہو تم۔ پھر [illegible] کی آواز سن کر کیا وہ کھلا نہیں چلے گا۔ اس بلندی میں بہت طاقت ہے۔ اُڑا دیتی ہے۔ ہر مخلوق کی [illegible] اگر [illegible] نیا سفر [illegible]

تعمیر

دھوپ کا اندھیرا کر سحر کا انتظار کرے۔

ماں سگی ہو کر نت کمزور کیوں ہوتی جاتی ہے۔

بڑھیا سوگئی۔ اس کا بیٹا بھی سوگیا۔ مگر پھر بھی خوف کے سر ظاہر میں ملفوف پہنچنے کی رگ رگ میں معلق رہے، چپ چاپ سے جھپٹنے کا کہ وہ وقت جب کبھی بھی ان کو آ کچھ محسوس کرتے رہے تب وہ اپنے ارادے کو پختہ کرتے رہے مگر شاید انداز میں وہ آنے والے کل کے بارے میں سوچتے رہے۔ جب اس کی آنکھ لگ گئی تب وہ اس نے ایک دلکش خواب کو مژگان میں سمیٹ لیا۔ مرغابی کو تھرتھراتے سے جب بھی ان کا یہ خواب لرزتا نظر آیا۔ تب تپتا اس کو سہارا دیتا رہا۔ گویا ایک دبیز جست طوفان تھا جس کو تیز اپنے کمزور ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کرتا تھا یا کہ ایک رسی تھی جس کو پکڑ کر مرغابی دلدل سے باہر نکلنے کی سعی کر رہی تھی۔

سحر کے وقت جب تیز کی آنکھ کھلی تب اپنے آپ کو تنہا پایا کہ وہ بڑا بے یار ہے۔ کچھ غصے سے کچھ دل شکستہ ہو کر —

"دھوکا دے کر بھاگ گئی مجھے تنہا چھوڑ کر، ذلیل مرغابی تم نے یہ ثابت کر دیا کہ تمہارا وجود بھی ان کتابی باتوں کے مانند ہے جو جذبات کو چھو کر خیالات کو الجھا دیتی ہیں۔"

گو اس جھونپڑی کی چھت سے اپنا منہ نکال کر جب اس نے نیچے دیکھا تب بڑھیا چولہے کے سامنے بیٹھی اپنی کمزور انگلیوں سے مرغابی کی کھال اتار رہی تھی۔ اور بیٹا چاقو کی نالی صاف کر رہا تھا —

یہ خوفناک منظر دیکھ کر تیز فرش پہ دھڑ سے ہی گر پڑا ... جیسے ایک ناکام باغی کے ہاتھ سے گرا ہوا ایک شکستہ طوفان کا جھنڈا۔

بڑھیا تیز کو دیکھ کر چونک پڑی ہے اور اس کے حلق میں اٹکی ہوئی بات باہر نکل آئی ہے —

"خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے ہم غریبوں کو تو پنہ ٹوٹنا ہے سکتے ان کاش

حمید

یہ کرشمہ کل ہوا ہوتا تو شاید ہم بھوکے نہ سوتے۔

بیٹے نے بندوق کو دور پھینک کر تیتر کو دبوچ لیا ہے اور اس کی گردن مروڑ کر وہ شہر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔

آج وہ بہت خوش ہے۔ فقط اسلئے کہ ایک مرغابی اور تیتر کے عوض اس کو بل کے مالک سے دو دن کا راشن اور دو کارتوس ملنے والے ہیں۔

واپسی

کچھ نہیں شہر کی ——— ایک بے نشاں اندھی گپھا میں دم ہے اور اُس کی

آوازیں ....

یہ ...... یہ کتاب یہ کیسی کتاب ہے

یہ ایک مقدس کتاب ہے

نہیں جھوٹ .... مقدس یہ کل تھی۔ آج یہ بالکل فریبی سی لگ رہی ——

کھوکھلی ——— بناوٹی ——— نقلی

نہیں! اور یہاں کی صداؤں کا یہ شمر

اور ننگے شمر کا ننگا رقص

ریت ریت ——— شخص ...... نہیں وہ جسم ہے بدن سا ہے

یہ کتاب ...... یہ ایک پاگل کتاب ہے

یہ امتحان ہے — یہ آتش ہے — یہ آسائش ہے — یہ آزمائش ہے — یہ سب
کچھ ہے — یہ کچھ بھی نہیں ہے — کچھ نہیں تھا کیا یہ کچھ — یہ کچھ کیا ہے — ؟
کہو — ہواؤ — جواب دو گے

تم کیا جواب دو گے — تم خود آوارہ ہو

پتھرو تم ہی کہو — تمہیں لوگ ٹھوکریں کیوں مارتے ہیں

جھیل والو — تم ہی کہو — تم میں یہ کھٹکتا ہوا کانٹا سا کیا ہے — ؟

کوئی تو جواب دو

آسمان —————

آسمان خلا ہے — اور کچھ نہیں — اور کچھ نہیں۔ جو کچھ ہے — وہ یہ زمین
ہے — اس زمین پر بستے ہوئے انسانوں کے اندر ہے ۔

مگر کیا ہے اندر — ؟

حسرتیں — خوف — وہم و گمان — آگ — اور

پاگل آوازیں .... اور آسمان پر پرچھائیاں ....

کس کی ہیں — ؟

کون کہے

میری ہی میری اپنی ہیں

کون مجھے سمجھائے — ؟

وہ .... دوسرا ...... شخص

نہیں — وہ غیر ہے — میرا دشمن ہے

ہم ایک دوسرے کے بیر دوست ہیں

قیصر

ہم ایک دوسرے کے کچھ بھی نہیں ہیں۔

ہم ایک دوسرے کے سب کچھ ہیں۔

کچھ بھی نہیں / سب کچھ / کچھ نہیں شمر کا یہ کچھ —— یہ کچھ کیا ہے

کیا ہے۔

کیا ہے یہ کچھ —— ! وہ پاگلوں کی طرح چیخا۔ اور زور زور سے چلانے لگا ——
بے ہنگم قہقہے لگانے لگا۔

قریب کھڑے اجنبی نے اپنے ہونے کا ثبوت دیا۔

پوچھا —— "بھائی کیا بات ہے۔ چیختے کیوں ہو ——"

"تم کون ہو —— ؟"

"میں —— میں ہوں" اجنبی نے جواب دیا

"تم —— تم ہو —— لیکن مجھے تو تم سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے خدا کی تلاش
ہے —— مجھے خدا سے کچھ پوچھنا ہے ——"

"کیا پوچھنا ہے۔ پوچھو —— میں ہی خدا ہوں"

"تم —— تم —— !"

"غلط مت ہو بھائی —— یوں سمجھو —— میں خدا کی آواز ہوں ——"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی آوازوں کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے ——" اس نے
قہقہہ لگا دیا —— اور پھر کہا —— "تو سنو میں اس کے ننگے شہر میں واپس
لوٹ آنا نہیں چاہتا ——"

"چاہنا اور نہ چاہنا دوسری بات ہے۔ وقت کا فیصلہ تم جانتے ہو —— تمہیں

واپس لوٹتا ہے —"

"مگر کیوں — کس لئے — مطالبوں کے لئے — شہر والوں کے شعلوں کی مادر

زاد گالیاں سننے کے لئے....؟"

اجنبی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ چپ رہا۔ خدا بھی چپ تھا —

لاتعلق اور بے نیاز سا....... وہ شخص ایک لمحہ اجنبی کو دیکھتا رہا — ایک لمحہ

آسمان کو گھورا —— اور پھر دوسرے ہی لمحے واپس شہر کی جانب دوڑنے لگنے

لگا — شاید کچھ نہیں شہر کی اندھی موت سے گھبرا کر — !

اردو کا مقبول ماہنامہ

تعمیر

جلد نمبر:- ۱۶ مارچ ۱۹۸۵ء شمارہ نمبر ۱

نگران:- یش گندوترہ

مدیر:- خالد بشیر

خط و کتابت کا پتہ:

مدیر ماہنامہ تعمیر

شعبۂ مطبوعات محکمۂ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر سرینگر ۱۹۰۰۰۱

واپس لوٹتا ہے —"

"مگر کیوں — کس لئے — مطالبوں کے لئے — شہر والوں کی شعلوں کی مادر زاد گالیاں سننے کے لئے ....؟"

اجنبی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ چپ رہا۔ خدا بھی چپ تھا — لاتعلق اور بے نیاز سا ...... وہ شخص ایک لمحہ اجنبی کو دیکھتا رہا — ایک لمحہ آسمان کو گھورا — اور پھر دوسرے ہی لمحے واپس شہر کی جانب دوڑنے لگا — شاید کچھ نہیں شہر کی اندھی موت سے گھبرا کر —!

اردو کا مقبول ماہنامہ

تعمیر

جلد نمبر:- ۱۶ مارچ سنہ ۱۹۸۵ء شمارہ نمبر ۱

نگران :- یش گنڈوترہ

مدیر :- خالد بشیر

خط و کتابت کا پتہ:

مدیر ماہنامہ تعمیر

شعبہ مطبوعات محکمہ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر سرینگر ۱۹۰۰۰۱

ماہنامہ تعمیر میں چھپنے والی نگارشات میں
ظاہر کی گئی آراء سے حکومت جموں و کشمیر
کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے!

ریاست جموں و کشمیر کے
تعلق سے ثقافت، تاریخ، ادب، فنون
لطیفہ اور تعمیر و ترقی پر مضامین
کیلئے ہم آپ کا تعاون چاہتے ہیں تعمیر
میں چھپنے والی نگارشات کا معاوضہ
ادا کیا جاتا ہے! مدیر

تعداد :- ۱۲ ہزار
کتابت :- غلام محی الدین بشیر احمد
مطبوعہ :- گورنمنٹ پریس سرینگر

ترتیب

حرف حرف

تعمیر کا یہ شمارہ ایک خاص اشاعت کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ اس میں شامل مضامین کشمیر اور لداخ کی سماجی، ثقافتی اور تمدنی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اس طرح کا ایک ضخیم جموں و کشمیر نمبر شائع کیا جائے جس میں ریاست کی تینوں اکائیوں سے متعلق مواد شامل ہو۔ لیکن بعض دشواریاں آڑے آئیں۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ مجوزہ نمبر کو دو حصوں میں منقسم کیا جائے۔ اور دوسرا شمارہ جموں خطے سے متعلق ہو۔ اس سلسلے میں ہم اہل قلم سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ جموں ڈویژن کے متعلق ہمیں اپنے مضامین روانہ کریں۔

خالد بشیر

ڈاکٹر برج پریمی
شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی سرینگر

ریاست کے تمدنی ادارے

کسی ملک کی ثقافت کو آگے لے جانے میں جہاں اس ملک کے باشعور اور صاحبِ بصیرت فن کاروں اور دانشوروں کا نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ جو وقت کی آہٹ کو اپنی دانش، اپنے قلم اور اپنے فن کے توسط سے ایک نمایاں رنگ عطا کرتے ہیں۔ وہاں بعض ادارے بھی جو انفرادی یا اجتماعی کوششوں سے متشکل ہوتے ہیں اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ یہ رول انفرادی کوششوں سے زیادہ اہم اور زیادہ با اثر ثابت ہوتا ہے۔ اور ثقافتی اقدار کی اشاعت اور ترویج میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس سے کسی ملک کی تہذیبی قدروں کی اشاعت کے سلسلے میں اپنے اداروں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ریاست جموں وکشمیر میں گذشتہ ایک صدی کے دوران ایسے کئی ادارے وقتاً فوقتاً منظرِ عام پر آئے ہیں جن کی مساعی کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ان اداروں نے اپنی کوششوں سے کشمیر کے کلچر اس کے فن اور ادب میں پلنے والی تہذیبی اقدار کو عام کرنے میں نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ کشمیر کی آواز کو دھیمے لہجے میں ہی سہی ریاست سے باہر کی دنیا میں پہنچانے کی ابتدائی کوشش انیسویں صدی کے اواخر میں ہوئیں۔ ہدایت

نعیز

سے باہر ۱۸۸۰ء اور اس کے آس پاس لاہور، دہلی، الٰہ آباد، جالندھر اور دوسرے شہروں سے اخبارات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان اخبارات میں ریاست کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین لکھے جاتے تھے اور اس طرح سے کشمیر کی ثقافت، اس کے تہذیبی معمول اور اس کے مسائل کو ریاست سے باہر کی دُنیا میں متعارف کرانے کی کوششیں ہوئیں۔ ان اخبارات میں خاص طور پر مراسلۂ کشمیر لاہور (۱۸۸۰ء) "اخبار عام لاہور (۱۸۸۱ء) خیر خواہ کشمیر لاہور (۱۸۸۲ء) کشمیر درپن (الٰہ آباد ۱۸۹۸ء) کشمیر میگزین لاہور (۱۹۰۶ء) اور صبح کشمیر لاہور، بہار کشمیر لاہور، کشمیر گزٹ لاہور، پنجہ فولاد لاہور کے نام کافی اہم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس معاملے میں چند لوگ انفرادی طور پر سرگرم عمل تھے لیکن انہوں نے مجموعی طور پر اپنا اپنا حلقہ بنا لیا تھا جس میں نہ صرف یہ کہ کشمیر سے باہر رہنے والے کشمیری بلکہ کشمیر کے پڑھے لکھے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی آواز سارے ملک میں پہنچانے کی کوشش کرتے تھے اور اسی طرح سے اپنا تشخص منوانے کی یہ ابتدائی سنجیدہ کوششیں تھیں

تہذیبی اور ادبی اقدار کو ایک ادارے کے ذریعے سے ترویج دینے اور اس سمت میں قابل ذکر سرگرمیوں کی شروعات اس صدی کے اوائل میں منشی سراج الدین احمد خان کی مساعی سے ہوئی۔ انہوں نے "مفرح القلوب" کے نام سے ایک انجمن تشکیل دی جس کے توسط سے باقاعدگی سے جلسے منعقد ہوتے تھے اور ہوتے ہوتے مشاعروں کا اہتمام ہوا مقصد ان سرگرمیوں سے یہ ادارہ آہستہ آہستہ ایک ثقافتی مرکز بن گیا تھا۔ شیخ عبدالقادر اور علامہ اقبال جیسے سربرآوردہ لوگ ان کے چند جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور چودھری خوشی محمد ناظر، محمد حسین عارف اور مرزا سعدالدین سعد نے اس ادارے میں روح پھونک دی تھی۔

انجمن نصرت اسلام دوسری انجمن تھی تحریک سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں میں مغربی تعلیم سے استفادہ کرنے کا احساس دلایا تھا کشمیر کے پڑھے لکھے مسلمانوں نے بھی

تعمیر

کے قیام سے ایک انجمن "انجمن نصرۃ الاسلام" کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام سماجی بہبود کے کئی کارنامے انجام پائے۔ مسلمانوں کو دینی اور مغربی تعلیمات سے آراستہ کرنے کے لئے مدارس قائم کئے۔ اور ادبی ذوق کو استحکام دینے کے لئے خاص جلسے اور مشاعرے منعقد کئے۔ ان جلسوں میں منشی امیر الدین آمیرؔ، صادق علی خان صادقؔ، محمد الدین فوقؔ، منشی غلام محمد صادقؔ اور منشی غلام محمد خادم اپنی تخلیقات سے سماں باندھ دیتے تھے۔ مشہور ادیب، شاعر، مورخ اور نثر نگار پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ بھی ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔

انجمن بزمِ سخن، جموں کی دلنواز فضاؤں میں پروان چڑھی۔ پنڈت دینا ناتھ چکبست کی سرپرستی میں اس بزم نے کافی اچھا کام کیا۔ ہفتہ وار نشستوں کے علاوہ اس بزم کے سالانہ اجتماع قابلِ ذکر تھے۔ ریاست کے شعراء کے علاوہ باہر سے جوشؔ، اختر شیرانی، محمد الدین تاثیرؔ، فیضؔ، احسان دانشؔ اور دوسرے شعراء اور اہلِ سخن ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ جموں کی تمدنی اور ادبی زندگی میں اس انجمن کی خاصی اہمیت تھی۔ اس کے اجلاس شروع میں صرف جموں خطے تک محدود تھے، لیکن بعد میں سری نگر میں بھی اس کے اجتماع ہوا کرتے تھے۔

"اخوان الصفا" کے نام سے ایک اور بزمِ سخن مولانا نظرت گیلانی، حیرتؔ کابلی، محمد امین داراب اور کمال الدین شیدا نے سنواری تھی۔ اس میں بھی ریاستی اور غیر ریاستی ادباء اور شعراء شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۴۲ء کے آس پاس راما نند ساگر، پریم ناتھ پردیسی کی مساعی سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی، جس کی ابتدائی نشستیں پریم ناتھ پردیسی کے گھر پر ہوتی تھیں۔ بعد میں جب اس کا حلقہ وسیع ہو گیا۔ تو ایس پی کالج ہال میں اس کے جلسے منعقد ہونے لگے۔ کشمیر میں ادبی فضا کو ایک سمت دینے میں اس انجمن کا بڑا

تعمیر

بیدی، محمود ہاشمی وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ مشہور ناقد اور شاعر ڈاکٹر محمد دین تاثیر جس زمانے میں کشمیر کے ایک مقامی کالج میں پرنسپلی فرائض انجام دے رہے تھے، انہوں نے اپنے دوران قیام اردو سبھا کے نام سے ایک انجمن تشکیل دی اور اس کے توسط سے اردو شعر و ادب کی خدمات انجام دیں۔ اس طرح مختلف وقفوں کے بعد انجمن ترقی اردو، ینگ رائیٹرس ایسوسی ایشن، انجمن ارباب ذوق، حلقہ علم و ادب، بزم شعر و ادب، کشمیر رائیٹرس لیگ، بزم [illegible] قائم ہوئیں۔ ان انجمنوں نے بڑے بڑے شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور ڈرامانگار پیدا کئے۔ جو آج ریاست میں ہی نہیں بلکہ ملک کے معتبر ادبا اور شعراء، ناقد اور محققین تسلیم کئے جاتے ہیں۔

ریاست کے تمدنی اداروں میں کلچرل فرنٹ کافی اہم ہے۔ ۱۹۴۷ء میں کشمیر میں قبائلی دراندازوں کے حملے کے دوران ریاستی ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور دوسرے فن کاروں نے ایک ادبی اور ثقافتی محاذ منظم کیا۔ اس تنظیم کی کارگزاریاں سرینگر کے کارونیشن ہوٹل سے شروع ہوئیں۔ اسی ہوٹل کے کمروں میں عوام کا لہو گرمانے والے گیت اور نظمیں تخلیق ہوئیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء کے اس پرآشوب دور میں کشمیری عوام کے حوصلوں کو بلند رکھا۔ بعد میں اس ادارے کا دفتر سرینگر کی نمائش گاہ میں منتقل ہوا۔ اور اسے کلچرل کانگریس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہاں اسے تین شاخوں میں بانٹا گیا جہاں ادب، مصوری اور ڈراما کے ذریعے سے کشمیر کی ثقافت اور ادب کے احیاء نو کا تاریخی رول ادا کیا گیا۔ اس ادارے کے ساتھ مہجور، پردیسی، ماسٹر زندہ کول، دینا ناتھ نادم، نور محمد روشن، رحمان راہی، امین کامل، اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی جیسے شعراء اور ادبا کے علاوہ خواجہ غلام محمد صادق، موتی لال مصری، پران ناتھ جلالی، غلام رسول سنتوش، ترلوک کول، کاچرو، بنسی پارمو، پران کشور، محمود ہاشمی، علی محمد لون،

اور کئی دوسرے سرکردہ دانشور، مصور، ڈراما نگار، اداکار اور ادب اور کلچر کے شعبوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے وابستہ تھے۔ ہندی کے مشہور نقاد شوودھان سنگھ چوہان اور اداکارہ شیلا بھاٹیہ اس ادارے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ یہ انجمن ہندوستان کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھی۔ اس ادارے کے زیر اہتمام کئی ڈرامے اسٹیج ہوئے جن میں خواجہ احمد عباس کی چودہ گولیاں، محمود ہاشمی کا "یہ کشمیر ہے" اور پریم ناتھ پردیسی کا "شہید شیروانی" قابل ذکر ہے۔ اس انجمن نے اردو اور کشمیری میں کونگ پوش نام کے رسالے بھی شائع کئے۔ ابتدا میں اس انجمن کا ماہنامہ "آزاد" اپنی کارگزاری کے لئے کافی اہم ہے۔

دوسرے تہذیبی اداروں میں ریاستی کلچرل اکادمی کی حیثیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس ادارے کا قیام ۱۹۵۸ء میں ہوا اور جب سے یہ ادارہ زبانوں کی ترویج و اشاعت، فن اور ثقافت سے متعلق دوسرے شعبوں میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد ہی ریاست کے مختلف خطوں کے درمیان ثقافتی رشتے کو استوار کرنا تھا۔ چنانچہ یہ ادارہ گذشتہ برسوں سے ریاست کی مختلف زبانوں کے ادب، موسیقی رقص، مصوری اور اسٹیج اور ادب اور ثقافت کے مختلف شعبوں کی آبیاری کر رہا ہے۔ چنانچہ ڈوگری، کشمیری، لداخی، گوجری، ہندی اور اردو ادب کی اشاعت کے سلسلے میں اس ادارے نے جلسوں، مشاعروں، مباحثوں اور سمیناروں کے ذریعے یہ کام انجام دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سال بہ سال سے اردو، ہندی، کشمیری اور گوجری میں اپنے ماہنامہ شیرازہ کی وساطت سے یہاں کے تمدن کے پھیلاؤ میں کافی ممد ثابت ہوا ہے۔ ہمارا ادب، سون ادب اور دوسرے رسالے بھی سارے ملک میں قدر کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اکادمی ہر سال کتابوں کی اشاعت میں مالی امداد فراہم کرتی ہے اور اچھی کتابوں پر ہر سال انعامات دیے جاتے ہیں۔ اکادمی کی دوسری ثقافتی سرگرمیاں قابل قدر ہیں۔ چنانچہ اس کے اہتمام سے ہر سال جشن تمثیل منعقد ہوتے ہیں جس میں مختلف

تعمیر

زبانوں کے ڈرامے اسٹیج کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اچھے ڈراموں پر انعامات دیے جاتے ہیں ڈرامے اور اسٹیج کے وسیلے سے ریاست کی ثقافت اور تمدن کے پھیلاؤ میں کافی مدد ملتی ہے۔ اکادمی مصوری، مجسمہ سازی، خوش نویسی، رقص اور موسیقی کی محفلوں کا اہتمام کرتی ہے۔ اور اس سلسلے میں قدیم وجدید میلانات کی عکاسی ہوتی ہے۔

اکادمی کے زیر اہتمام موسیقی اور فنون لطیفہ کا ایک انسٹی ٹیوٹ باقاعدہ طور پر سرگرم عمل ہے جہاں موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ کو بڑھاوا دینے کے لئے قابل قدر کام ہوتا ہے حق تو یہ ہے کہ اکادمی نے اپنی ہمہ جہت سرگرمیوں سے ریاست کے تمدنی اداروں میں ایک بلند مقام حاصل کیا ہے۔

ریڈیو کشمیر سرینگر ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔ ابتداء میں اس کی کارگزاری صرف اردو تک محدود تھی بعد میں کشمیری، پنجابی، گوجری، ڈوگری زبانوں میں بھی نشریات کا سلسلہ شروع ہوا کچھ عرصہ کے بعد ریڈیو جموں کے قیام نے نشریات کی تعداد میں اضافہ کیا ہے ہمارے ریڈیو کو ایک سمت اور رفتار دینے میں عظیم فنکاروں کا ہاتھ رہا ہے جن میں بیدی، عباس، پردیسی، سہیل عظیم آبادی، پریم ناتھ در، ٹھاکر پونچھی، موہن لال ایمہ، قیصر قلندر، غلام رسول نازکی، پران کشور، علی محمد لون، کمال احمد صدیقی، جتیندر ادھم پوری، عبدالغنی شیخ، سوم ناتھ سادھو، پشکر بھان، زبیر رضوی، کے، کے نیر، بکش کاشمیری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ریڈیو کی نشریات سے نہ صرف ریاست کے مختلف خطوں کی زبانوں کی اشاعت ہوئی ہے بلکہ تاریخ، تمدن اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔ ریڈیو ایک ایسا وسیلہ اظہار ہے جس کی آواز نہ صرف ریاست کے کونے کونے میں بلکہ ملک اور بیرون ملک کے باقی حصوں میں بھی پہنچتی ہے۔ اس طرح سے ریاست کے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور تہذیب و تمدن کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہل نظر کے خیالات کی ترسیل بہ آسانی ممکن ہو گئی ہے۔

اس طرح سے کشمیر کی تمدنی میراث کی توسیع ہوتی ہے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ ریڈیو کے پروگراموں کے سامعین کا حلقہ دوسرے تمام تہذیبی اداروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کی حیثیت بذاتِ خود ایک بڑے تہذیبی اور تمدنی ادارے کی ہے۔ یہ ادارہ نہ صرف پڑھے لکھے طبقے کا محبوب ہے بلکہ ان ہزاروں لاکھوں، لوگوں کا بھی محبوب ہے جو تعلیم سے ناآشنا ہیں۔ لیکن جن کے کان ریڈیو کی آواز کے منتظر رہتے ہیں۔ ریڈیو کے وسیلے سے لوگ مختلف مسائل سے متعلق آگہی حاصل کرتے ہیں اور اپنی تمدنی میراث اور اپنے عظیم ماضی کے روشن اور تابناک پہلوؤں سے بھی واقف ہوتے ہیں ریاست کی تمدنی اقدار کی اشاعت میں سرینگر، جموں اور اب لداخ کے ریڈیو اسٹیشنوں کے کارنامے کافی اہم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ریڈیو کے پروگرام بعض اوقات بعض مصلحتوں کے پیش نظر نامکمل اور نامکتفی یا ناقص بھی ہوتے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے ریڈیو کی کارگزاری کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

ٹیلی ویژن ہماری ریاست کا ایک اور ثقافتی ادارہ ہے۔ سرینگر دوردرشن کی نشریات کا آغاز ۱۹۷۳ء سے ہوا۔ اس لحاظ سے یہ ادارہ نہایت کم عمر ادارہ ہے۔ گو ابھی اس اسٹیشن کو مناسب سازوسامان سے لیس نہیں کیا گیا ہے جس کے باعث اس کی نشریات ناکافی ہیں۔ پھر بھی آہستہ آہستہ اس کے پروگرام اور نشریات کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے۔ اس میں پروگراموں کی خاصی تعداد ایسی ہے جن کا تعلق براہِ راست ہمارے کلچر سے ہے۔ ان میں خاص طور پر ایسے پروگرام اہم ہیں جو کاشتکاروں کے لئے، بچوں کے لئے، نوجوانوں کے لئے یا ادب و ثقافت سے متعلق ہوتے ہیں۔ کشمیری، ڈوگری، اور لداخی، موسیقی، رقص اور لوک سنگیت کے پروگرام بھی اس سمت میں پیش ہوتے ہیں۔ کشمیر کی زندگی سے متعلق اردو اور کشمیری میں فلمیں اور ڈرامے بھی بار بار پیش ہوتے ہیں۔ ریاست کے مختلف خطوں سے متعلق دستاویزی فلموں کی نمائش ہماری زندگی کے بعض نمایاں پہلوؤں

تعمیر

کوشش کرنے کا اچھا اقدام ہے۔ یہ پروگرام نہ صرف وادی میں بلکہ جموں اور پاکستان کے بعض حصّوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

ان اداروں کے علاوہ ریاستی محکمہ اطلاعات بھی اہم ادارہ ہے۔ جو برسہا برس سے تمدن اور ثقافت کے متعلق سے قابل قدر کام کرتا چلا آیا ہے۔ محکمہ اطلاعات کی طرف سے تعمیر (اردو) کشمیر ٹوڈے (انگریزی) یوجنا (ہندی) جیسے ماہنامے اور مکتوب (اردو) کے نام سے ایک خبرنامہ باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے جن میں دوسری باتوں کے علاوہ ریاست کی تمدنی اور ثقافتی زندگی سے متعلق مضامین، افسانے، ڈرامے، نظمیں اور دوسری اطلاعات شائع ہوتی ہیں۔ ان جرائد میں خاص طور پر ماہنامہ تعمیر کا رول قابل ذکر ہے۔ تعمیر اپنے دورِ اوّلین میں ظفر پیامی کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ لیکن اس کے صرف ایک یا دو شمارے شائع ہوئے تھے۔ دوسرے دور میں اسے شمیم احمد شمیم اور محمد یوسف ٹینگ نے نیا آہنگ بخشا۔ اسی دور میں اس کے مہجور نمبر اور آزاد نمبر شائع ہوئے تھے جن کی دستاویزی اہمیت ہے۔ تیسرے دور میں خالد بشیر کی ادارت میں اس کا جموں و کشمیر میں اردو ادب نمبر شائع ہوا ہے جو خاصے کی چیز ہے۔ مجموعی طور ان جرائد نے ریاست کے کلچر، فن، ادب اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

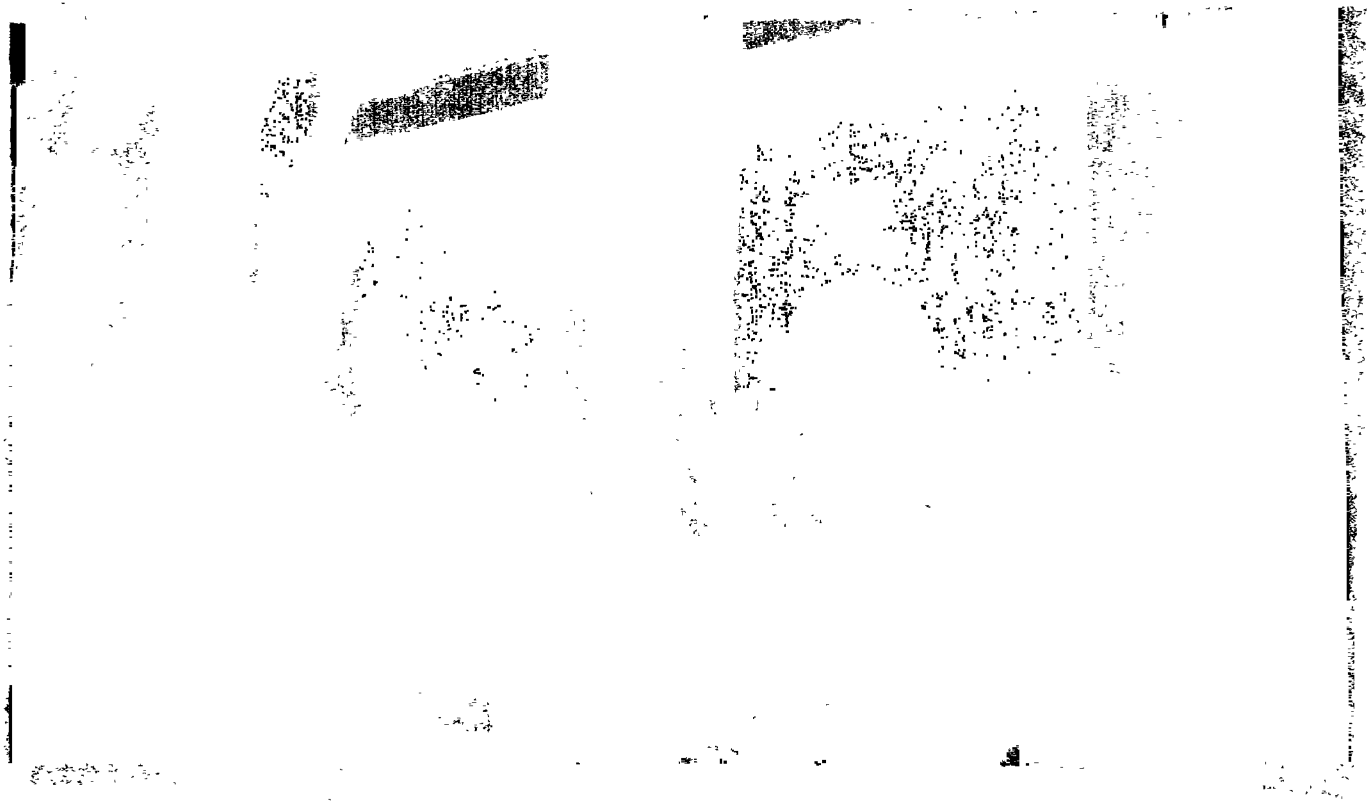
محکمہ اطلاعات کا ایک اور شعبہ فیلڈ پبلسٹی کا شعبہ بھی ہے جس کا جال ساری ریاست میں پھیلا ہوا ہے۔ اس شعبے کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً شہروں کے علاوہ دور دراز دیہاتوں میں مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ دیہاتوں میں خاص طور پر اس محکمے کی کارکردگی زود اثر ثابت ہوتی ہے کیونکہ فلموں کے ذریعے سے ان علاقوں کے ناخواندہ اور نیم پڑھے لکھے لوگوں تک نہ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے نئے دریچے کھل جاتے ہیں۔ بلکہ ریاست کی ثقافتی زندگی اور ماضی کی شاندار روایات کے تعلق سے سود مند باتیں پہنچائی جاتی ہیں اور اس طرح سے انہیں ریاست کی تمدنی زندگی سے جانکاری

ہوتی ہے۔

سرینگر اور جموں کے عجائب گھر اور جموں کی ڈوگرہ آرٹ گیلری کی حیثیت بھی تمدنی اداروں سے کم نہیں۔ ان اداروں میں زمانہ قدیم سے لے کر آج تک مختلف آثار، زبانِ حال سے اپنی حقیقت منواتے ہیں۔ یہاں پر ہندو عہد، بودھ عہد، افغانوں، مغلوں سکھوں اور ڈوگروں کے عہد کے قدیم آثار ملتے ہیں۔ جو اپنے اپنے عہد اور اپنے زمانے کی تہذیب اور تمدن کی واضح نشان دہی کرتے ہیں۔ ان اداروں میں مجسمہ سازی، مصوری اور خطاطی کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف زمانوں کے ملبوسات، سکے ہتھیار، پتھر اور روزمرہ زندگی کے دوسرے متعلقات محفوظ کئے ہیں۔ جو اس ریاست کے گذشتہ روز و شب کی داستان سناتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر چیزیں کھدائی سے دستیاب ہوئی ہیں۔ خطۂ جموں میں اکھنور اور خطۂ کشمیر میں ہاروان، برزہامہ اور دوسرے مقامات سے اکٹھا کئے ہوئے مختلف آلہ جات، ہتھیار، مورتیاں، مجسمے، مصوری کے نمونے بڑی تہذیبی اہمیت کے حامل ہیں۔ عجائب گھروں میں قدیم بادشاہوں اور مہاراجوں کے جاری کردہ سکے، مسودات، شاہی فرامین، مخطوطات، ملبوسات، چرند پرند کے ڈھانچے اپنی خاموش زبان سے تاریخ کے اوراق پر لکھی ہوئی بے شمار کہانیاں سناتی ہیں۔ یہ تمام ساز و سامان تاریخ اور تمدن پر سے اقتدارِ زمانہ کی گرد ہٹاتا ہوا ان کی واضح شکل ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ آج بھی سینکڑوں لوگ ماضی کے ان دفینوں کو جا کر اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ماضی کی یادوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ تمدن، ثقافت اور انسانی زندگی کے شب و روز کی صدیوں پرانی باتیں صرف کہانیاں نہیں رہتیں بلکہ محسوس اور مجسم پیکر اختیار کر کے سامنے آ جاتی ہیں۔ یہ ادارے ریاست کی تمدنی تاریخ میں ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو خاموشی سے ایک بہت بڑا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں ریاست کے تمام تمدنی اداروں کا احاطہ کرنا ناممکن

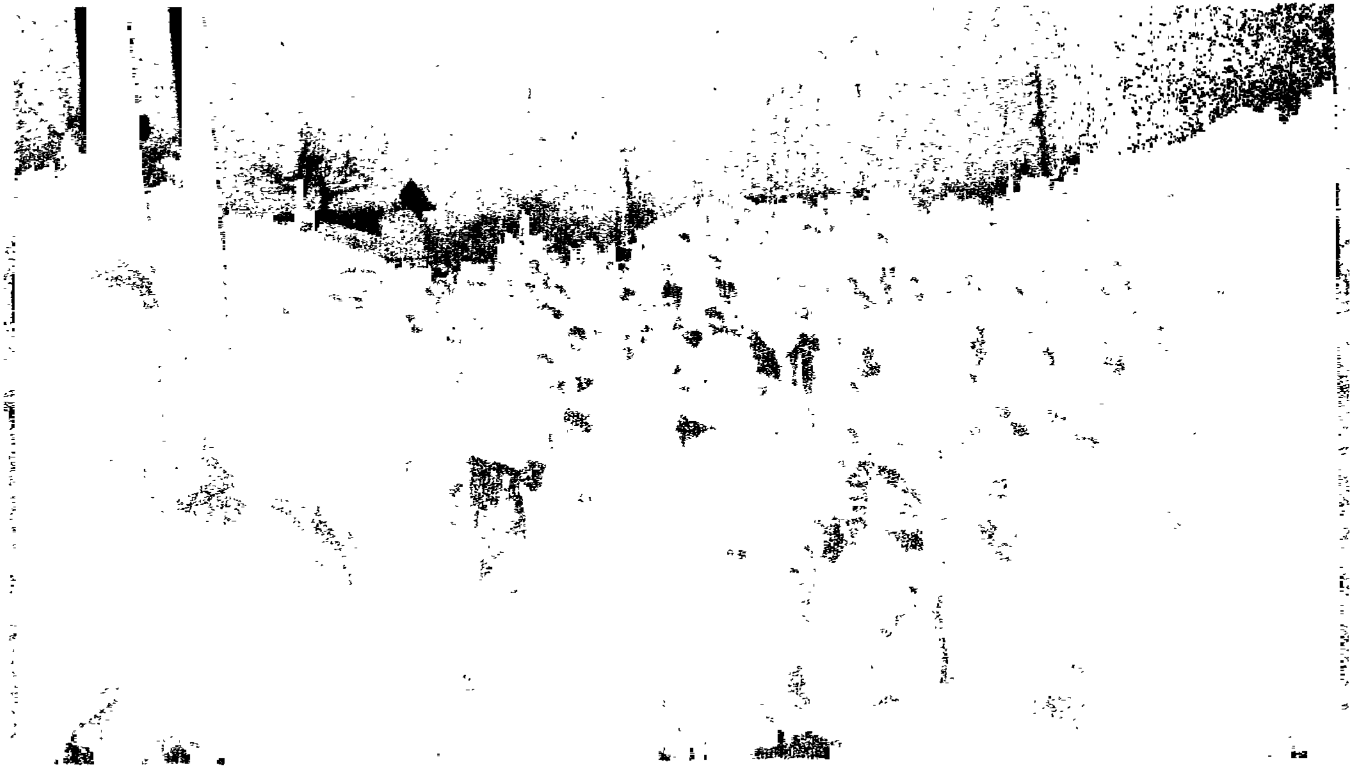
ہے۔ یہاں صرف چند نمایاں اداروں کی کارگزاری پر مختصر اشارے کئے گئے ہیں نا انصافی
ہوگی۔ اگر ان اداروں کا ذکر نہ کیا جائے جن کی عمر کم سہی اور اگرچہ ان کا براہِ راست تعلق
اور دائرۂ عمل کا ذکر نہ کیا جائے ریاست کے تمدن کے ساتھ نہیں ہے لیکن ان کی کارگزاریوں
کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ میرا اشارہ جموں اور کشمیر یونیورسٹی کی طرف ہے، جہاں ایسے
شعبے قائم ہوئے ہیں جن میں اپنے متعلقہ تدریسی خدمات کے علاوہ تمدن کے تعلق سے
خاصا کام ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں کشمیر یونیورسٹی کا شعبہ وسط ایشیائی مطالعات کا مرکز،
کشمیری، فارسی، ہندی اور اردو کے شعبہ جات اور جموں یونیورسٹی میں ڈوگری، سنسکرت
ہندی اور اردو کے شعبے بھی اپنی بساط کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ان کی توسیع سے
ریاست کی تمدنی اور تہذیبی زندگی کی ترجمانی کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔



سرگیجہ ہوائی اڈے پر وزیرِ اعلیٰ کا استقبال

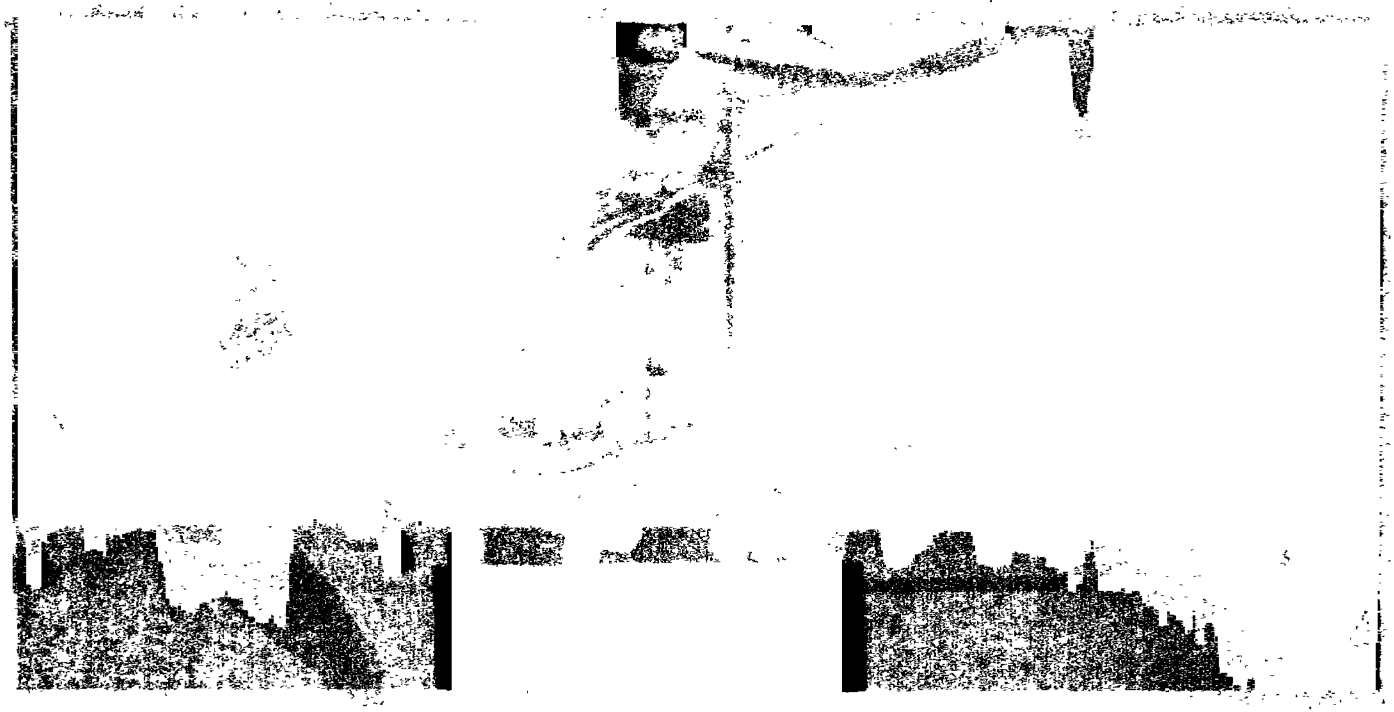


بڈگام میں ضلع افسروں کے اجلاس سے خطاب کرنے کے لئے وزیر اعلیٰ کی آمد کے موقع پر لی گئی ایک تصویر



پلوامہ میں ایک عوامی جلسے سے وزیر اعلیٰ شاہ صاحب کا خطاب

[illegible] کا ایک منظر



* موتی لال ساقی
کلچرل اکادمی لال منڈی سرینگر

ریاست میں تاریخ نویسی کی روایت

ہر مہذب سماج کی مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں تاریخی شعور کا رول ناگزیر ہے۔ تاریخ کی حیثیت زرخیز زمین کی سی ہے جس میں قومی شعور کی جڑیں پیوست ہو کر نشوونما پاتی ہیں۔ تاریخ کے بغیر تمدن کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ خانہ بدوش لوگوں کی کوئی تاریخ ہی نہیں ہوتی۔ اسلئے اُن کا کوئی تمدن بھی نہیں ہوتا۔ تاریخ نام ہے کسی قوم کی تہذیبی جدوجہد کا، جس میں جغرافیہ کا بھی ایک اہم رول ہوتا ہے۔ تاریخ کو شاہی معرکوں کی داستان قرار دینے کا تصور اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ افراد کی انفرادیت کا قائل ہونے کے باوجود میری نظر میں تاریخ کو تشکیل دینے میں عوام بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہی تاریخ ساز ہوتے ہیں اور اُن کی جدوجہد اور کد و کاوش کے سہارے تاریخ کا بہاؤ قائم رہتا ہے۔ حالانکہ تاریخ ساز شخصیات تاریخ کے رُخ کو موڑ دیتی ہیں۔ مگر اُن کو بھی کسی نہ کسی رُوپ میں عوام کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تاریخ تمدنی بہاؤ کے تسلسل کا نام ہے۔ جسے موڑ تو دیا جا سکتا ہے مگر کاٹا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ کسی مرحلے یا مقام پر اگر اس کو

لعمرا،

کاٹنے کی کوشش کی جاتی تو ایک ایسا خلاء پیدا ہوتا ہے جسے پُر نہیں کیا جاسکتا۔ تمدن کی زبان ہونے کے ناطے انسانی سماج کی ترقی کے تمام سربستہ راز تاریخ کے صفحات میں مخفی ہوتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ پڑھنے والے میں الفاظ کو معنی پہنانے کی صلاحیت موجود ہو۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اب تاریخ نے ایک باقاعدہ سائنس کا روپ دھار لیا ہے اور اُس کا دائرہ بہت ہی وسیع اور بسیط ہو گیا ہے۔ تاریخ اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کو مذہب اور عقائد سے الگ کر کے تاریخی کسوٹی پر ہی پرکھا جائے مگر ایک بے لاگ اور بے تعصب تاریخ نقطۂ نظر کی ترویج ابھی بھی ایک خواب ہی ہے۔

کشمیر گذشتہ چھ ہزار سال سے مختلف تہذیبی اور تمدنی ادوار سے گذر چکا ہے برزہوم سے لیکر سرینگر میں کرکٹ سٹیڈیم کی تعمیر تک اس جنت ارضی نے اتنے رنگ دیکھے ہیں جن کا صرف تصور کیا جاسکتا ہے۔ مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہونے کی وجہ سے کشمیر کا ذکر ہمسایہ ممالک کی تاریخی کتابوں میں بھی آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی تاریخ سے بھرپور جانکاری حاصل کرنے کے لئے مقامی تاریخی ماخذوں کے علاوہ چینی، تبتی اور یونانی مورخین کے لکھیوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اسی طرح مہابھارت، پوران اور قبیل کی دوسری کتابیں بھی ہمیں قدیم کشمیر کے بارے میں قابل قدر مواد فراہم کرتی ہیں۔ اور تو اور خود مقدس ویدوں میں بھی وِتستا، اور چندر بھاگا کا ذکر آیا ہے۔

کشمیر کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں نیل مت پوران کو اولیت حاصل ہے مگر نیل مت تاریخ سے زیادہ سماجی اور مذہبی امورات کی نشاندہی کرتا ہے۔ مگر اس کتاب کی اہمیت اس حیثیت سے مسلمہ ہے کہ کشمیر کے جغرافیہ کے بارے میں نیل مت ایک معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ موجودہ نیل مت پوران (مرتبہ: ڈاکٹر وید کماری) اُس نیل مت سے قدرے مختلف ہے جس نیل مت سے کلہن نے استفادہ کیا ہے کیونکہ جو حالات کلہن نے نیل مت سے نقل کر کے راج ترنگنی میں درج کئے ہیں۔ وہ

تعمیر

موجودہ نیل مت پوران میں درج حالات و واقعات سے قدرے طویل ہیں۔ حالانکہ راج ترنگنی کے مقابلے زیادہ تفصیل نیل مت میں ہونی چاہیے تھی کیونکہ نیل کی حیثیت ماخذ یا منبع کی ہے جبکہ راج ترنگنی منبع سے نکلی ہوئی ندی ہے۔ کلہن کو اگرچہ برصغیر کا پہلا مستند اور معتبر مورخ تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر خود کلہن نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے راج ترنگنی لکھتے وقت نیل مت کے علاوہ گیارہ تاریخی مسودوں سے استفادہ کیا ہے ان گیارہ مسودات کے مصنفین میں سے اس نے پانچ کے نام کتاب میں درج کئے ہیں۔ کلہن نے اپنے سے پہلے کے جن پانچ مورخوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ ہیں سوورت، چھولاکر، کھیشمیندر، ہیل راج اور پدم مہر۔ ان مورخین میں سے صرف کھیشمیندر کی "نروپالی" ہم تک آ پہنچی ہے اور باقی کتابیں اب ناپید ہیں۔ اس اعتبار سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ تاریخ نویسی کی روایت ہمارے یہاں کلہن سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی اور کلہن نے ایک قدیم روایت کے تسلسل کو برقرار رکھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ کھیشمیندر کی "نرپاولی" کو راج ترنگنی پر قدامت کے اعتبار سے برتری حاصل ہے۔ مہاراجہ جے پیڈ کے وزیر اعظم امودر گپت کی "کٹنی مت" کا ذکر اگرچہ کلہن نے نہیں کیا ہے۔ مگر یہ کتاب بھی کچھ تاریخی حقائق کی نشاندہی کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ منکھ پنڈت کی "شری کنٹھ چرتم" کو بھی اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر بہلر کے مطابق منکھ نے اس کتاب کو (مہا کاویہ) ۱۱۳۵ء اور ۱۱۴۵ء کے درمیان منضبط تحریر میں لایا۔ جبکہ راج ترنگنی ۱۱۴۸ء - ۴۹ء کے درمیان لکھی گئی ہے۔ "شری کنٹھ چرتم" کئی لحاظ سے ایک اہم دستاویز ہے۔ اس کے مطالعے سے جہاں ہمیں مختلف لوگوں کا عہد متعین کرنے میں مدد ملتی ہے وہاں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بارھویں صدی میں کشمیر قنوج اور کونکن کے درمیان سفارتی تعلقات قائم تھے جس کا لازمی نتیجہ تہذیبی اور اقتصادی روابط کا سلسلہ بھی تھا۔ شری کنٹھ چرتم میں کانگری کا تفصیل سے پہلی بار

تعمیر

ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ [illegible] جہاں [illegible] سے پہلے بھی مروج تھی۔ قدیم دستاویزات کا ذکر چلا ہے تو [illegible] گاندھارا کا [illegible] یاد آیا۔ ڈاکٹر بہلر کے مطابق یہ [illegible] چھٹی صدی قبل مسیح کی تخلیق ہے۔ [illegible] واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اُس زمانے میں گاندھارا کشمیر کا حصّہ تھا۔

میرے کچھ فاضل دوستوں نے کشمیر کی تاریخ کے کچھ گوشوں کے سلسلے میں چچ نامہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ایک شامی مُسلمان حمیم بن سامہ کشمیر آئے تھے اور انہوں نے یہاں ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چچ نامہ کے بیان کے مطابق سندھ کے راجہ داہر کا بیٹا جے سیا کشمیر آیا تھا۔ مگر حمیم بن سامہ کے کشمیر میں مسجد تعمیر کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔ چچ نامہ میں اس واقعہ کا ذکر یوں ہوا ہے:۔

"کشمیر کے رائے نے جے سیا کو شرفِ ملاقات بخشا جو کہ داہر کا بیٹا تھا جس دن اُن کی ملاقات ہوئی۔ رائے نے اُسے پچاس گھوڑے معہ زین و ساز کے اور افسروں کے لئے دو سو جوڑے کپڑوں کے عطا کئے۔ شام کے حمیم بن سامہ کو شاکلا کی جاگیر پر بھیج دیا گیا۔ جب وہ دوسری بار کشمیر کے رائے سے ملاقات کے لئے گیا، اُس کا خیر مقدم عزت و تکریم کے ساتھ کیا گیا۔ اور اُسے ایک چھتر کرسی اور دوسرے تحائف دیئے گئے۔ یہ وہ عزت افزائی ہے جو بڑے بادشاہوں کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اُسے توقیر کے ساتھ میدانی علاقے میں اپنی جاگیر پر بھیج دیا گیا۔ شاکلا میں کچھ دیر بعد وہ مر گیا۔ اور حمیم بن سامہ وہاں کا حکمران بن گیا جہاں پر اُس کے عزیز و اقارب اب تک ہیں۔ اُس نے وہاں مسجدیں تعمیر کیں اور عزت اور توقیر سے سرفراز ہوا۔ کشمیر کا بادشاہ اُس کی کافی عزت کرتا تھا۔"

چچ نامہ ۷۵۳ء سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اس میں واضح طور پر لکھا ہے

تعمیر

بچے نے چچ۔ (سندھ کا بادشاہ) کشمیر کے ساتھ سرحدوں کا تعین کرنے کے لئے چلا گیا اور جو علاقہ اُس کے راستے میں آیا وہ اُس کا باجگذار بن گیا۔ آخر کار وہ شاکلا کوٹ پہنچ گیا۔ یہ بلندی پر واقع جگہ ہے اور کشمیر کی سرحد پر واقع ہے۔ اس جگہ کو "کچا" کہا جاتا ہے یہاں پر راجہ ایک مہینے تک قیام پذیر رہا۔ اور آس پاس کے سرداروں کو سزا دی اور اپنی سربراہی میں فوج منظم کی۔ اس کے بعد اس نے اُس علاقے کے حکمرانوں اور سرداروں کے ساتھ معاہدے کئے اور اپنی برتری قائم کی۔ اُس نے دو بوٹے طلب کئے۔ ان میں سے ایک بوٹا سفیدے کا تھا اور دوسرا بوٹا ولپاداؤر کا یہ درخت اُس نے کشمیر کی سرحد پر ایک دریا کے کنارے پر نصب کئے۔ جو پنچ آب کہلاتا ہے اور کشمیر کے پہاڑوں کے قریب ہے؛ جہاں سے کئی جھرنے پھوٹتے ہیں۔"

میرے فاضل دوستوں کو "شاکلا" کی نشاندہی کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ شاکلا وہی ہے جو پہلی صدی میں یونانی ستراپ مناندر کا دارالخلافہ تھا۔ بعد میں مہر کل نے بھی اسی جگہ کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا۔ آج کل یہی جگہ سیالکوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ جس وقت "چچ سیا" کشمیر آیا اُس وقت یہاں ناگ کارکوٹ خاندان کی حکومت تھی۔ ہیون سوانگ کا سفرنامہ گواہ ہے کہ اُس وقت گاندھار کا سارا علاقہ کشمیر کے ماتحت تھا۔ اقتباس سے واضح ہے کہ "چچ سیا" کو جاگیر میدانی علاقے میں عطا کی گئی تھی اور کشمیر کے ماتحت میدان علاقہ سیالکوٹ کا ہی تھا۔ آخری بار جب "چچ" نے کشمیر کے راجہ سے مدد کی درخواست کی اُس وقت اصلی راجہ مر چکا تھا۔ اور اُسی جگہ اُس کا نابالغ بچہ حکمران تھا۔ قرینِ قیاس اُس وقت سنگرام پالی دوئم (۲۵-۶۴۴ء) کشمیر کا حکمران تھا۔ "چچ سیا" کو جاگیر عطا کرنے میں "چچ نامہ" کا حوالہ بالکل واضح ہے۔

"خط کشمیر کے راجے کے سامنے پڑھا گیا جس نے حکم دیا کہ کشمیر کے باجگذار علاقوں میں سے شاکلا کا علاقہ "چچ سیا" کو دیا جائے۔"

اس حوالے سے ایک اور تاثر ہو جاتی ہے کہ جیسا کہ مالکر کشمیر میں شامل کشمیر
کے ماتحت علاقے ہے پہلے دی گئی تھی تاریخ کو گڑبڑنا اور گڑبڑ کر اس کو معنی پہنانا ایک
دلچسپ اور معنی خیز کام ہے مگر جب تاریخ کی غلط تاویل کی جائے اور ایک غلطی کو بار بار دہرایا
جائے تو معاملات سلجھنے کے بدلے اُلجھ جاتے ہیں۔ میرے فاضل دوستوں نے سیالکوٹ
کو کشمیر بنا کر اچھا ہی کیا تھا مگر کیا کریں ایسا ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ ابھی تک شہروں کو ایک
جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کے لے جانے کے سامان نہیں ہو سکے ہیں۔ جمیم بن سام کو کشمیر لا کر میرے
فاضل دوستوں نے دل کی بھڑاس تو نکالی مگر تاریخ کو مسخ کرنے کا جو جرم انہوں نے
کیا ہے اُسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔

دیکھا جائے تو قدامت کے اعتبار سے "چچ نامہ" کا حوالہ زیادہ اہم ہے اور اُس
سے ہیون سانگ کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ ساتویں صدی میں کشمیر کی سلطنت
کافی وسیع تھی۔

اپنے حجم اور تفصیلات کے اعتبار سے کلہن کی "راج ترنگنی" اساطیر اور روایات کا
مجموعہ ہونے کے باوجود نہ صرف کشمیر بلکہ گرد و پیش کے علاقے کی پہلی مستند تاریخ ہے۔ کہانی
ہونے کے باوجود بھی اس میں تاریخ کا رنگ اور روپ ہر طرف نظر آتا ہے۔ یہ بے شک ہے
کہ اس تاریخ میں سنوں کا ہیر پھیر نظر آتا ہے اور کچھ راجاؤں کے ذکر میں ہیر پھیر نظر آتا ہے
مگر اس کے باوجود "راج ترنگنی" اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد کتاب ہے جس میں فاضل
مصنف نے تقریباً اُن تمام ذرائع سے استفادہ کیا ہے جن کو تاریخ نویسی کے میدان میں
آج بھی اہم مانا جاتا ہے۔ اس کتاب کے مستند ہونے کی تصدیق کشمیر کے طول و عرض میں
آباد وہ دیہات کرتے ہیں جن کا ذکر اس میں آیا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ کلہن
نے اپنی کتاب کو "تذکرہ راجگان" کا نام دیا ہے۔ اس میں جس انداز سے کشمیر کی تاریخ کے
مختلف پہلو بیان کئے گئے ہیں اُن کی اہمیت سے انکار کرنا کفر ہے۔ مختلف مذہبی

تغیرات کے علاوہ راج ترنگنی میں کشمیر کی سیاسی، سماجی اور تمدنی زندگی کی عکاسی ملتی ہے
کشمیر میں رواداری کی جو روایات آج بھی قائم ہے۔ راج ترنگنی کے مطالعے سے پتہ چلتا
ہے کہ شمع ہمارے یہاں دورِ قدیم سے فروزاں رہی ہے۔ کشمیر میں مروج انتظامیہ اور خراج
کے رتبے کے بارے میں راج ترنگنی ایک معتبر دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس حقیقت
کا اعتراف کرتے ہوئے کہ کلہن نے ابھنو گپت اور سوم آنند وغیرہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں
لکھا ہے۔ مگر کلہن کو تمام امور کا بھرپور احساس تھا۔ غلطیاں اسی سے ہوتی ہیں، جو
کچھ کرے، جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے وہ شخص نہ تو کچھ کر پائے گا۔ اور نہ ہی اس کے
ہاتھوں کوئی غلطی سرزد ہوگی۔ کلہن ہمیں بتاتا ہے ابھیمنیو اول کے دور میں چندر گومن
نے مہابھاشا کے مطالعے کا سلسلہ پھر شروع کیا۔ "چندر کش" جیسے ڈراما نویس کا ذکر بھی تو
راج ترنگنی میں ہی آیا ہے۔ جے پیڈ ایک اعلیٰ حکمران ہونے کے ساتھ ہی ایک فاضل عالم
بھی تھا۔ بھٹ ادھ بھٹ، کھشتر، دامودر گپت، آنند وردھن، رتن کار، بلہن، سوم
آنند اور اس طرح کے کئی دوسرے لوگوں کے نام کلہن کی بدولت ہی ہم تک آ پہنچے ہیں۔

کشمیر کی فوجی صلاحیتوں اور فوجی معاملات کے بارے میں بھی کلہن نے اچھا
خاصا مواد فراہم کیا ہے۔ یو۔ این۔ گھوشال کے مطابق راج ترنگنی کا سب سے حیران کن
امر یہ بات ہے کہ کلہن نے اس میں مختلف جنگی مہموں کا بہت ہی خوبصورت اور مکمل
نقشہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح آفات سماوی کا ذکر کرنا بھی کلہن نہیں بھولا ہے۔

ڈامروں کی شیطانی کا جس طرح کلہن نے بیان کیا ہے۔ وہ تو اس کا ہی حصہ
ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی کردار نگاری بھی ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

کلہن نہ ہوتا تو راج ترنگنی نہیں ہوتی۔ اور راج ترنگنی نہ ہوتی۔ تو آج ہماری
وہی حالت ہوتی جو امریکیوں کی ہے۔ جو اپنے تمدن کی تشکیل اور تعمیر کے لئے اربوں
ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی ترشنکو کی طرح آسمان اور زمین کے درمیان آویزاں ہیں۔

کلہن کے بعد ہماری تاریخ نویسی کی روایت کو جونراج نے آگے بڑھایا۔ جونراج سلطان زین العابدین (۱۴۲۰-۷۰ء) کا درباری مورخ تھا۔ کلہن بیک وقت بڑا شاعر بھی تھا اور بڑا مورخ بھی۔ مگر جونراج شاعر کم اور مورخ زیادہ ہے۔ بقول مرحوم کاشی ناتھ در:

"جونراج نے اپنے مورخانہ رتبے کو برقرار رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ حالانکہ اُس سے بھی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود سنسکرت کے اس نامور مورخ کا بیان عہد سلاطین کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔"

جونراج نے ہندو دور کے اُن راجاؤں کا ذکر بھی کیا ہے جو جے سمہا کے بعد یہاں کے حکمران بنے تھے۔ مگر اُن کا ذکر کہیں اور نہ آتا تھا۔ اُس نے کھلے بندوں اعتراف کیا ہے کہ اس کی تاریخ محض ایک خاکہ ہے۔ جونراج نے کل ملاکر ۲۲ بادشاہوں کا ذکر کیا ہے جن میں تیرہ ہندو، ایک بھوٹیہ اور نو مسلمان ہیں۔ کل ملاکر اس کی تاریخ ۲۵۹ سال کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ سلطان سکندر اور بڈشاہ کا ہم عصر تھا۔ عہد سلاطین کے ۱۴۰ برس کی روداد جونراج نے لکھی ہے۔ وہ زین العابدین کے دور میں ہی وفات پاگیا۔ اسلئے وہ اس دور کا احاطہ نہیں کر سکا۔ جونراج نے نہ تو کہیں "بلبل شاہ" کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی لل دید کا۔ وہ صرف دیوسوامن کا ذکر کرتا ہے جس نے رنچن کو ہندو بننے کی اجازت نہیں دی۔ جونراج نے عہد سلاطین سے پہلے کے تین حملوں کا پوری طرح بیان کیا ہے۔ ان میں سے پہلا حملہ ڈولچو کا، دوسرا رنچن اور تیسرا زمیلا کا تھا۔

جونراج کی راج ترنگنی ہم عصر تاریخ ہونے کے ناطے کافی اہم اور فارسی مورخین نے جو غلطیاں بعد میں کیں اُن کا ازالہ جونراج کی راج ترنگنی کے پڑھنے سے ہوتا ہے۔ یوگنیوں کے ذکر کو جس طرح بعد کے مورخین نے لل دید سے جوڑا ہے، اُس کی تصدیق جونراج سے نہیں ہوتا۔ لل دید کبھی یوگنیوں کے زمرے میں شامل نہیں تھی، وہ تو کشف و کرامات کو ادنیٰ سمجھتی تھی۔ پھر یوگنیوں کا سلسلہ کشمیر میں بہت قدیم زمانے سے چلا آیا ہے۔ آریہ راجہ

تعمیر

سدھونتی کے بارے میں لوگنیوں کا ذکر تو کلہن نے بھی کیا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ لوگنی سلسلہ جونراج کے زمانے میں بھی قائم تھا۔ جونراج نے زین العابدین کی شخصیت اور کارناموں کو خوب سراہا ہے۔ حضرت میر سید علی ہمدانی کا ذکر تو جونراج نے نہیں کیا ہے مگر حضرت میر محمد ہمدانی کا ذکر اس نے واضح طور پر کیا ہے۔ جونراج کے بعد تاریخ نویسی کا سلسلہ اس کے شاگرد شری ورنہ جاری رکھا۔ جونراج ۱۴۵۷ء میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد شری ورنہ زین العابدین کے عہد کے چودہ سال کی تاریخ لکھی۔ کل ملا کر شری ور کی تاریخ ۲۹ سال کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کی تاریخ میں بڈشاہ کے علاوہ فتح شاہ، حیدر شاہ اور حسن شاہ کے عہد حکومت کے واقعات درج ہیں۔ ترینہ راج ترنگنی سے موسوم شری ور کی تاریخ میں پہلی بار "وتستا" کا ذکر جہلم کے نام سے ہوا ہے اور ڈل کا ذکر ہے۔ یاد رہے اس سے پہلے ڈل سورشوری سر کے نام سے موسوم تھا۔

شری ور کے بعد پراجیہ بھٹ اور شکھا نے سنسکرت راج ترنگنیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ پراجیہ بھٹ کی تاریخ معدوم ہو چکی ہے۔ مگر اس کا خلاصہ شکھا نے دیا ہے۔

فارسی تاریخوں کے ضمن میں کشمیر کا ذکر سب سے پہلے تاریخ فیروز شاہی میں ہوا ہے۔ اس کے ملا احمد کی تاریخ آتی ہے۔ مگر یہ ناپید ہے۔ پھر سید علی ماگرے کا مختصر مخطوطہ ہے۔ جو ابھی چھپا نہیں مگر کئی اعتبار سے اہم ہے۔

خواجہ اعظم دیدہ مری کی تاریخ فارسی میں لکھی گئی ایک اہم تاریخ ہے جس میں اہم مذہبی واقعات کا بے لاگ اندراج موجود ہے۔ بیربل کاچرو، نرائن کول عاجز، حسن اور مسکین نے اس سلسلے کو برابر جاری رکھا۔ یہ تمام مسودات کئی اعتبار سے اہم ہیں۔ حسن کی تاریخ پہلی مبسوط کتاب ہے جو کم و بیش ایک انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف نامعلوم ہونے کے باوجود بہارستان شاہی ایک نادر تاریخی دستاویز ہے جس میں کچھ ایسے واقعات درج ہیں جو

دوسری کتابوں میں نہیں آسکے ہیں۔

تاریخ نویسی کے سلسلے میں مرزا حیدر دغلات کی تاریخ رشیدی اور ابوالفضل کی آئین اکبری کا بھی ایک اہم مقام ہے۔ کیونکہ ان کتابوں میں بھی کشمیر کے بارے میں معلومات کا انبار لگا ہوا ہے۔ اسی طرح غیر ملکی سیاحوں کے سفرنامے بھی نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ اکبر کے زمانے میں شہنشاہ کے ساتھ ایک رومن کیتھولک جرنیمو زاویر کشمیر آیا تھا جس نے لکھا ہے کہ اکبر کے زمانے میں کشمیری بھوکوں مرتے تھے اور غریبی کی وجہ سے بچوں کو گلیوں میں پھینک دیتے تھے۔ اسی طرح فارسٹر، ونے، ہیوگل، فرانسس ینگ ہسبنڈ، والٹر لارنس، برنیر، رچرڈ ٹمپل وغیرہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

محمد الدین فوق نے اگرچہ کشمیر اور کشمیریوں کے بارے میں ہزاروں صفحات سیاہ کئے ہیں۔ مگر ان کی تحریروں میں اعتبار اور مستند ہونے کا فقدان ہے، پھر بھی مؤرخین میں اس کا تذکرہ ہو سکتا ہے۔ بیسویں صدی میں کشمیر کے بارے میں جی، ایم، ڈی صوفی کی کتاب قابل قدر ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس کتاب میں ہندو عنصر کو تقریباً نظر انداز کیا گیا ہے۔ مگر بعد کے دور کے بارے میں یہ کتاب چند کوتاہیوں کے باوجود بہت اہم ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کتاب کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اسے اگرچہ ایک خاص نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے، پھر بھی اس میں جدید تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ آنند کول بامزئی نے بھی کشمیر کی تاریخ کے بارے میں کچھ کتابیں لکھیں۔ مگر اس کے فرزند پی، این، کے بامزئی نے ایک مبسوط تاریخ لکھ کر کشمیر کے تئیں اپنا فرض ادا کیا۔ حالانکہ یہ کتاب بھی الحاد اور غلطیوں سے بالکل پاک نہیں مگر بامزئی صاحب کی کوششوں کی تعریف کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ بامزئی کے بعد مورخوں کے کاروان میں شری گوشالال کول، محمد اسحاق خان، منظور فاضلی نے اس کام کو آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

پریم ناتھ بزاز نے کشمیر کی تاریخ کی جو خدمت کی ہے، وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے

تعمیر

کشمیر سے باہر رہ کر بزاز صاحب ہمیشہ کشمیر کے بارے میں لکھتے رہے۔ اُن کی درجن بھر کتابیں کشمیر کی تاریخ کی کئی کڑیوں کی تلافی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر آر۔ کے پارمو کی کتاب کشمیر عہد سلاطین میں اور ڈاکٹر محب الحسن کی کتاب کشمیر سلاطین کے زمانے میں دو اچھی اور منصفانہ روح سے لبریز کتابیں ہیں۔ تاریخ کی ضمن میں محمد یوسف ٹینگ صراف کی ضخیم کتاب KASHMIRIS FIGHT FOR FEERDOM اور رشید تاثیر کی کتاب "تاریخ حریت کشمیر" کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ کتابیں کشمیر کی تاریخ کے ایک طوفانی دور کا احاطہ کرتی ہیں۔

کشمیر کے ماہر آثار قدیمہ رام چند کاک کی کتاب (ANCIENT MONUMENTS OF KASHMIR) مختصر ہونے کے باوجود تاریخ کے ایک اور گوشے سے نقاب سرکاتی ہے۔ یہاں لفنوبوں اور غلات کی زبانی وہ کہانیاں بیان کی گئی ہیں جن کو کاغذ سمیٹ نہیں سکا تھا۔ مختصر ہونے کے باوجود کاک صاحب کی یہ کتاب درجنوں کتابوں پر بھی بھاری ہے۔ کاک نے جموں، پونچھ اور دیگر علاقوں کے آثار قدیمہ کی زبانی اُن کی علاقوں کی تاریخ کو نئی زندگی دی —— لداخ پر لکھی گئی تاریخ پر اے۔ ایچ فرانکی کی "تاریخ لداخ" اور الیگزنڈر کنگھم کی "لداخ" خاص طور اہم ہیں۔ حشمت اللہ خان کی کتاب "تاریخ، کشتواڑ، لداخ، بلتستان" اِس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ حال ہی میں "زانسکار" کی بودھی تاریخ کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا ہے مگر اس کتاب پر مذہب کا رنگ غالب ہے۔ یہ کتاب زنگ ہیون، زنگمو پو کی سوانح عمری ہے۔ لداخ کی بودھ خانقاہوں میں وہاں کی تاریخ کے بارے میں کئی نادر اور نایاب مخطوطات محفوظ ہیں مگر یہ سب مخطوطات بودھی میں لکھے ہوئے ہیں اور جب تک اُن کا ترجمہ نہیں ہوتا بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔

پروفیسر محمد ابراہیم
پرنسپل اورینٹل کالج امیراکدل سرینگر کشمیر

کشمیر کی مخلوط تمدنی روایات

تاریخ کی رو سے اسلام سرزمین کشمیر میں چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں وسط ایشیا سے تاتاری حملوں کے بعد آیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ترکمان حملہ آور اسلام اور اس کے عقاید خود مسلمان ہونے کے بعد اس وقت کی مشہور و معروف دنیا میں پھیلا رہے تھے۔ اسی مشہور و معروف دنیا میں ایک علاقہ خطۂ کشمیر جنت بے نظیر بھی تھا۔ کشمیر میں اسلام کے مؤسس (بنیاد ڈالنے والے) حضرت سید شرف الدین الملقب بہ بلبل شاہ تھے[1]۔ آج بھی کشمیر میں ان کے نام نامی پر عالی کدل اور نوا کدل، سرینگر کے مابین، ایک خانقاہ اور ایک محلہ بلبل لنکر ان سے منسوب ہے۔ اسلام نے اپنی آمد سے اہل کشمیر کو اگرچہ ذہنی اور تمدنی طور پر خاصہ متاثر کیا ہے۔ تاہم اب بھی کشمیر کی بعض رسوم و عادات قدرے اختلاف کے ساتھ کچھ ایسی ہیں۔ جو یہاں کے باشندوں کیا

---

(1) تاریخ حسن ج ۱ ص ص ۳۱۶ - ۳۱۸۔ بلبل شاہ کا اصلی نام شاہ بلال اور سید عبدالرحمٰن یا سید شرف الدین لقب تھا۔ ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) میں انتقال کر گئے۔ اپنے مرشد کی ہدایت پر بلبل شاہ نے دریائے بہت (جہلم) کے کنارے نذر کشیر کی طرف سے ایک خانقاہ تعمیر کی تھی جو کشمیر کی سب سے پہلی خانقاہ تھی۔ مسکینوں کے لئے یہاں لنگر جاری تھا۔ اسی لئے یہ محلہ بلبل لنکر ان کہلایا۔ (محمد ابراہیم)

ہندو اور کیا مسلمان دونوں میں ایک سی ہیں اور یہی امر کی غماز ہیں کہ کسی وقت ہندو و مسلم تہذیب کا سرچشمہ ایک ہی رہا ہے۔ ذیل کے مقالے میں قدرے تفصیل کے ساتھ انہیں مخلوط روایات کی نشاندہی کی جائے گی۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ مذہب باوجود ایک زبردست طاقت کے قومی خصوصیات و امتیازات کے مٹانے میں کیسر بے طاقت ثابت ہوا ہے۔

تمدن جس کا دوسرا نام تہذیب و ثقافت بھی ہے اور جسے آج کل کی اصطلاح (محاورہ) میں کلچر بھی کہا جاتا ہے کسی قوم کے رہن سہن کے مخصوص طرز اور طریقہ کو کہتے ہیں۔ اس کے ذیل میں مذہب، زبان، لباس، خوراک، طرز تعمیر، شادی بیاہ، غمی کے رسوم، میلے ٹھیلے اور تمدنی سرگرمیاں مثلاً لوک گیت، ناچ و نغمہ وغیرہ ہر قسم کی تمام چیزیں آجاتی ہیں۔ ہر قوم و ملت کے رہن سہن، رسم و رواج اور معاملات کا طریقہ چونکہ مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے تہذیب و ثقافت میں ایک قوم دوسری قوم سے واضح طور پر ممتاز ہوتی ہے اور یہی من حیث القوم اُس کی انفرادیت اور اختصاص کی دلیل ہے۔ مثال کے طور پر پنجابی افغانیوں سے اس لئے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کا طرز زندگی اور رسوم و روایات جداگانہ ہیں۔ یہی کیفیت من حیث القوم اہل کشمیر کی ہے۔ ایک کشمیری جہاں شکل و صورت اور زبان ہندوستان کے دیگر باشندوں سے مختلف ہے۔ وہیں تہذیب و ثقافت میں بھی اُس کی روش اور طور طریقہ جداگانہ ہے۔

تمدن کی اس مختصر سی تمہید کے بعد اہل کشمیر کی اُن چند مخلوط رسوم و روایات کا ذکر کیا جاتا ہے جو قدرے اختلاف کے ساتھ یہاں کے لوگوں کو کیا ہندو اور کیا مسلمان اور بودھ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔

مشترکہ زیارتیں اور آستان

برصغیر ہند و پاک کی دیگر اقوام کے برخلاف مذہبی رواداری اہل کشمیر کی تمدنی روایات کی ایک ممتاز خصوصیت رہی ہے۔ ماسوائے چند ایک ڈوکے واقعات کے یہاں کی رواداری کی روایت

تعیز

میں زمانہ قدیم سے کبھی بھی خلل نہیں آیا ہے۔ بلاشبہ اسلام نے مسلمانوں اور کشمیری برہمنوں کے مابین مغایرت کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے اس لئے کہ اسلام کا تعلق سامی اقوام و مذاہب سے ہے اور ہندو دھرم ایک خالص آریائی دین ہے۔ دونوں کے مابین جو بعد و امتیاز ہے، وہ کسی بھی دیدہ ور پر مخفی نہیں ہے۔ تاہم مذہب کا یہ اختلاف اہالیان کشمیر کے جذبہ رواداری اور وسعت قلبی کو متاثر نہ کر سکا ہے۔ رواداری انسان کے اس جذبے کو کہتے ہیں جس میں حوصلہ اور برداشت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اس جذبے کے پیش نظر انسان نہ صرف خود زندہ رہتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی زندہ رہنے دیتا ہے۔ اس جذبے کے تحت دنیا کا ہر مذہب اور دھرم اپنی اپنی جگہ درست اور برحق ہے۔ اس لئے کہ ہر مذہب صداقت و روحانیت کا سبق دیتا ہے۔ اہل کشمیر میں بلا اختلاف مذہب و ملت، مذہبی رواداری اور برداشت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اسی جذبے کے تحت سرزمین کشمیر میں جابجا مسلمان مساجد و خانقاہوں کے ساتھ ساتھ مندر و مناور اور تیرتھ بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں اگر ایک طرف ناقوس اور سنکھ کی آواز ہے تو دوسری جانب مؤذن کی اذان گونج رہی ہے اور یہ بات یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کی درخشاں علامت ہے۔

فتح کدل اور زینہ کدل، سرینگر، کشمیر کے عین وسط میں دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر واقع خانقاہ معلی، کشمیر کی اہم زیارت ہے۔ یہ خانقاہ بانی مسلمانی کشمیر میر سید علی ہمدانی قدس سرہ العزیز کے خلف الرشید میر سید محمد ہمدانی نے بہ ایماء سلطان قطب الدین ۸۰۱ھ مطابق ۱۳۹۶ء میں قائم کی تھی۔ یہ مقام مسلمانان کشمیر کے لئے آج بھی اسی طرح مقدس و محترم ہے جیسا کہ بنیاد و تاسیس کے وقت تھا۔ آج بھی مسلمان جوق در جوق اس خانقاہ فیض پناہ کی زیارت کرنا موجب خیر و برکت سمجھتے ہیں۔ تاہم اسلام اور مسلمانوں میں اتنی اہمیت اور تقدیس کے باوجود، خانقاہ مذکورہ کے ذیل میں دیوتا کالی شری کا سرخ نشان ہے۔ جہاں کشمیر کے راسخ العقیدہ پنڈت صاحبان اپنے مذہب کے مطابق پوجا پاٹ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

تعمیر

خانقاہ معلّی کے احاطے میں کالی شری دیوی کا یہ نشان کشمیر میں نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے۔ بلکہ اہم قدیم تاریخ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ پیر غلام حسن کھویہامی کے مطابق[1] کالی شری کا مندر راجہ پرورسین[2] کی تعمیرات سے تھا۔ سلطان قطب الدین نے اسی کے مقام پر موجودہ خانقاہ معلّی کی تعمیر عمل میں لائی۔ اس طرح کالی شری دیوی کا نشان باقی رہنے دیا تب سے خانقاہ معلّی ہندو مسلم عبادت و ریاضت کا سنگم ہے۔

شمالی سرینگر میں ہری پربت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک ایک مقدس مقام ہے مسلمانوں میں یہ جگہ کوہ ماران اور ہندوؤں میں شارکا پربت جو بگڑ کر ہری پربت ہو گیا ہے، کے نام سے مشہور ہے۔ اس پربت کے جنوبی سرے پر مسلمانان کشمیر کی زیارت آستان حضرت مخدوم حمزہ کشمیری علیہ الرحمتہ ہے۔ جبکہ اسی کے متصل ذرا شمال مغرب کو ہٹ کر شری شارکا دیوی کا استھان ہے۔ دونوں مقامات پر کشمیر کے ہندو مسلمان اپنے اپنے طریقوں اور مذہبی رسومات کے مطابق پوجا پاٹ اور عبادت و ریاضت کے فرائض و رسوم انجام دیتے ہیں۔ ہری پربت کشمیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے یکساں طور پر قابل تعظیم و احترام ہے۔ دونوں فرقوں کے لوگ جب بھی ہری پربت کو رُخ کرتے ہیں۔ تو دونوں کے چہرے احترام سے جھک جاتے ہیں۔

عمارہ مسجد

ہری پربت کے دامن میں جنوب کی جانب نڈ کھاہ کا طویل و عریض پست و بلند میدان ہے، یہ نشیب و فراز کا حامل میدان قبرستان ہے۔ نڈ کھاہ کے مغربی

---

[1] تاریخ حسن ج ۱، ص ۳۹۰

[2] راجہ پرورسین تاریخ کشمیر میں بانی شہر سرینگر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ اس نے ۵۴ بکرمی شتی میں شہر سرینگر کی بنیاد ڈالنے کے ساتھ ساتھ جن مشہور مندروں کی بنیاد ڈالی ان میں ایک کالی شری مندر خانقاہ معلّی کا مقام ابھی تھا۔ باقی چند مندر کے نام یہ ہیں، مہاشری سرہ بلوہ شری لوکی نور مالیشور بلیشوری وغیرہ مذکور شوالہ [illegible] تعمیر [illegible]

سے پر شکستہ حالت کی ایک مسجد ہے جس کی صرف چار دیواری اور کچھ بوسیدہ محراب ہی یادگار ہیں۔ روایتی طور پر یہ مسجد کشمیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر معزز و محترم ہے۔ مسلمان اسے مسجد اور کشمیری پنڈت اسے مارت کشور کا مندر سمجھتے ہیں۔ اسے راجہ رانا دیتہ[1] نے سنہ ۶۱۲ء میں تعمیر کروایا تھا۔ پنڈت اسے تیرتھ اور مسلمان متبرک کنج آرام لینے کا پتھر سمجھتے ہیں۔

کشمیر کا یہ تاریخی مقام خواہ وہ مسجد ہو یا مارت کشور[2] کا مندر کشمیر کے دونوں فرقوں کے مابین عزت و احترام کا مقام رکھتا ہے۔ یہیں سے ہندو و مسلمان ہری پربت کا رخ کر کے تعظیم بجا لاتے ہیں۔

ریشہ پیرؒ کا آستان

کشمیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ آستان ہے، اس کا محل وقوع سرینگر کشمیر کا محلہ بلچی مرنے جو عالی کدل کے متصل ایک محلہ ہے۔ ریشہ پیر کے والد موضع گشی پرگنہ اوتر کے باشندے تھے اور مذہباً ہندو تھے۔ ریشہ پیر باپ کی وفات کے بعد متولد ہوئے تھے۔ نانی کے پاس جو محلہ نگہ ٹینگ سرینگر کی رہنے والی تھیں پرورش پائی تھی۔ ریشہ پیر مادرزاد ولی تھے، بچپن ہی سے یادِ خدا میں مصروف رہا تھا۔ بارہ برس کی عمر میں کرشنا کار کی خدمت میں

---

[1] راجہ رنادت کشمیر کا ایک اہم راجہ تھا۔ ۱۷۴ بکرمی (۶۱۴ء) میں راجہ بجراوت کے بعد تخت نشین ہوا اور ساٹھ برس کی حکومت کر کے ۷۳۱ بکرمی (۶۷۴ء) میں عالم آخرت کو سدھار گیا۔ تاریخ کی رو سے راجہ رنادتیہ بڑا منصف مزاج اور عادل تھا، شجاعت میں ثانی نہ رکھتا تھا۔ (تاریخ حسن ج ۲، ص ص ۳، ۴۷، ۴۸) [2] مارت کشور ایک قسم کا محافظ ہے۔ روایت کے مطابق راجہ اس مقام پر بیٹھ کر تالاب کی سیر کیا کرتا تھا۔ (واقعات کشمیر از محسن دربار راجہ رانا دیتہ)

نعیم

آئے جس سے عالمِ ناسوت کے راز منکشف ہو گئے۔ کرشنہ کار اِن دنوں ملہ کھاہ میں قیام کرتے تھے۔ بعد میں کرشنہ پیر نے رلیشہ پیر کو زندہ شاہ کے سپرد کر دیا اور سلوک کے مدارجِ اعلیٰ پر پہنچا دیا۔ زندہ پیر کی وفات کے بعد ریشہ پیر مجذوب ہو کر کوچہ و بازار میں پھرنے لگے۔ خود کو رلیشہ پیر بادشاہ کہا کرتے تھے۔ لوگ جوق در جوق خدمت میں آ کر حاجات پوری کیا کرتے تھے، بالآخر محلہ پلمچی مر میں قرار کر لیا۔ اور یہیں پر داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ مسلمانوں نے دفنانا اور ہندوؤں نے جلانا چاہا۔ لیکن تختہ پر سوائے کفن کے کچھ نظر نہ آیا۔ لاش غائب ہو چکی تھی۔ محمد حیات مورخ نے رلیشہ پیر کو اہلِ صفا سے کہا ہے۔ رلیشہ پیر کا آستھان کشمیر کے دونوں فرقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے قابلِ تعظیم ہے[1]

کرشنہ پیر

یہ بزرگ بھی کشمیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ اِن کے آستھان کی نشاندہی محلہ قصاباں، رعناواری، سرینگر، کشمیر میں کی گئی ہے۔ کرشنہ پیر اہلِ ہنود سے تھے اور صاحبِ مال و دولت تھے۔ توفیقِ ازلی سے میاں مانک شاہ صاحب کی خدمت میں آئے۔ اور دوستِ خدا بن گئے۔ وفات کے بعد اُن کی لاش بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ زندہ پیر آپ کے خسر تھے۔ سکر و مستی کا اس قدر غلبہ تھا کہ مُردوں کی ہڈیاں گلے میں لٹکائے رہتے تھے، اس لئے ہندو اور مسلمان دونوں پاس پھٹکنے سے گھبراتے رہتے تھے[2]

میاں مانک شاہ

عرفِ عام میں میشا صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ جہانگیر کے وقت کے بزرگ اور

[1] تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار ص: ۳۲۸

[2] " " " " ص ۳۲۶، ۲۷،

مقام دست تھے انہوں نے سرینگر سے واپسی کے وقت جہانگیر بادشاہ کے شکارہ کو اپنے تکیہ کے پاس جانے سے روک دیا تھا۔ بلا عمر بھر اپنی خانقاہ میں رہے۔ یہ خانقاہ نائید یار معناطرو پل کے نزدیک برلب جہلم ٹل واقع ہے۔ حیشا صاحب کا عرس ہمیشہ موسم سرما دسمبر کے آخری ایام میں منعقد ہوتا ہے۔ اس موقع پر کشمیر کے پنڈت اور مسلمان گھروں میں مچھلیاں پکاتے ہیں اور مشترکہ طور پر زیارت کے لئے آتے ہیں۔

ان کے علاوہ وادی کے دیگر آستان اور خانقاہیں کشمیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے لئے قابل تعظیم ہیں۔ یہ ہیں (۱) خانقاہ شاہ جیلان واقع خانیار سرینگر، (۲) آستان بٹہ مالو صاحب (۳) آستان شیخ العالم شیخ نورالدین ولی واقع چرار شریف (۴) آستان بابا زین الدین ریشی واقع عیش مقام اور (۵) آستان بابا ہردی ریشی۔

گائے کا احترام

گائے ہندوؤں کا ایک مقدس جانور ہے۔ ہندو اسے گئو ماتا کہتے ہیں اور اس کا گوشت کھانا صرف حرام بلکہ "مہا پاپ" (گناہ عظیم) خیال کرتے ہیں۔ کشمیر میں یہی کیفیت قریب قریب مسلمانوں کی ہے۔ مسلمان اور پنڈت دونوں بھیڑ یا بکری کا گوشت کھاتے ہیں اور دونوں کے دونوں روزمرہ کی زندگی میں مسلمان قصابیوں ہی سے گوشت خریدتے رہتے ہیں۔ گائے کا احترام مسلمانوں اور پنڈتوں دونوں میں یہاں کے مخصوص اور مشترکہ تمدن کی زمانۂ قدیم سے ایک مشترکہ میراث ہے، مذہب کی زبردست طاقت بھی اس عقیدہ کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکی ہے۔

طہری کا رواج اردو میں اسے "طاہری" کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کے زرد چاول

تعزیہ [1] شمائل الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار ص، ۳۲۰

ہیں جس میں ہلدی اور نمک ڈالا جاتا ہے۔ طاری بالعموم بطور خیرات لوگوں میں بانٹی جاتی ہے اور اس کا مقصد کسی آنے والی مصیبت یا سانحہ کا ٹالنا ہوتا ہے۔ طہری کی رسم کشمیر کے پنڈتوں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر مروج ہے اور اس کی تیاری کا مقصد بھی غالباً ایک ہی ہے۔

شادی بیاہ اور موت کی رسوم میں یکسانیت

علاوہ متذکرہ صدر مخلوط روایات کے کشمیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی شادی بیاہ اور موت کی رسوم میں یکسانیت ہے، دونوں کا قدرے اختلاف کے ساتھ ایک ہی طریقہ ہے دونوں میں تنبج نور (ہتھیلی کی ڈفلی) اور گھڑا بجانے کا عام رواج ہے، دونوں فرقوں کی عورتیں رنگ برنگ کر اور بیچ میں چہل اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے شادی کے گیت گاتی ہیں دونوں میں ستارات کا قدرے اختلاف کے ساتھ رواج ہے۔ وفات کے موقع پر ماسوائے دفنانے اور جلانے کے باقی تمام رسوم قریب قریب یکساں ہیں۔ پنڈت مردہ کا دسواں، ماسولر اور وہرہ وور (برسی) وغیرہ مناتے ہیں، مسلمان انہیں رسوم کے قریب قریب چوتھا، چالیسواں اور میت کے مرنے کا سالانہ دن مناتے ہیں، ہندو شرادھ کرتے ہیں اور مسلمان ختم قرآن اور ایصال ثواب،

زیڑہ

زیڑہ جسے اردو میں "چڑ" کہتے ہیں مسلمانوں اور پنڈتوں میں بالکل یکساں ہیں، پنڈتوں میں اگر کوئی شخص کسی زمانے میں واتل جمعدار (بھنگیوں کا افسر) تھا۔ تو بعد میں اس کی اولاد اسی نام سے موسوم ہوتی ہے۔ یہی کیفیت مسلمانان کشمیر کی ہے۔ بقول پیر غلام حسن کھویہامی[1]

---

[1] تاریخ حسن ج ۱، ص ص ۲۱۰، ۲۱۲

نعیر

اگر کوئی شخص سخت مزاجی کے باعث سہہ (شیر)، ہاپت (ریچھ) کہلانے لگا یا بوجہ ایذا رسانی کے گُرُف (سانپ) اور بچھ (بچھو) قرار پایا۔ یا اپنے فطرتی امر حماقت کے باعث وانٹد (بیل) کھر (گدھا)، ہنٹد (مینڈھا) اور کگر (مرغا) ٹھہرایا چوری کے باعث ژور (چوہا) کہلایا۔ تو آئندہ چل کر اس کی نسل بھی یہی رشہ (حرف) حاصل کر لیتی ہے۔ اور سماج میں قطعاً اسے معیوب نہیں خیال کیا جاتا۔ بلکہ فخریہ طور پر نام کے ساتھ یہ القاب لکھے جاتے ہیں۔

نام کا اختصار بھی کشمیر کے ہندو مسلم معاشرہ کی مشترکہ میراث ہے۔ چنانچہ پریم ناتھ موہن لال اور ترلوکی ناتھ بطور اختصار پریم کاک، موہن لال اور تری بٹ کہلاتے ہیں۔
ناموں کا بعینہ یہی اختصار مسلمان معاشرہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ اس کی رو سے غلام رسول لسہ صاحب، غلام نبی، نبہ لال، محمد بٹ، ممہ بٹ اور محی الدین مہدہ صاحب کہلاتے ہیں

پوشاک و خوراک

لباس و پوشاک کے معاملے میں مسلمان اور پنڈت ماسوائے جزوی اختلاف کے یکساں ہیں۔ دونوں کے دونوں پھرن پہنتے ہیں اور ایک ہی قسم کی پگڑی باندھتے ہیں۔ پنجاب اور باقی ہندوستان میں پگڑی کا پٹکا عورتوں کی چٹیاؤں کی طرح پیچھے کو چھوڑا جاتا ہے۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا امتیاز نہیں ہے۔ لیکن کشمیری مسلمان اور پنڈت یہ پٹکا دستار ہی کے ساتھ اوپر کو اڑس لیتے ہیں۔ اب تو تقریباً دونوں کے دونوں دستار باندھنا چھوڑ چکے ہیں اور ان کی جگہ ننگے سر نے لی ہے۔ لیکن اب سے ۳۰، ۴۰ سال قبل ایسا نہ تھا۔ ماسوائے پنڈتوں کے تلک کے پگڑی کی بدولت ہندوؤں اور مسلمانوں کی شناخت مشکل تھی، اور اب برہنہ سری کے باعث مشکل ہو چکی ہے۔

مسلم اور ہندو خواتین دونوں پھرن اور شلوار پہنتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلم خواتین کا پھرن گھٹنوں تک اور ہندو خواتین کا ٹخنوں تک ہوتا ہے۔ اس کا رنگ بالعموم

لعیز

ہرا ہوتا ہے جس کے ارد گرد لال کپڑے کا کلابتو پیوند ہوتا ہے۔ ہندو خواتین کا پھرن کمر کے وسط میں فیتے سے بندھا ہوتا ہے۔ مسلم خواتین کو اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ البتہ ان کی آستین گراب دار ہوتی ہیں۔ مسلم خواتین شلوار بچپن سے آخر تک پہنتی ہیں۔ جبکہ ہندو خواتین میں اس کا استعمال صرف کنوارپن تک محدود رہتا ہے۔ بعد ازاں ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح ساڑھی کا استعمال شروع ہو جاتا ہے۔ سرما میں دونوں کی دونوں کانگڑیاں تاپتی ہیں۔ نمکین اور میٹھی چائے بطور مشروب استعمال کرتی ہیں۔ دونوں کی مرغوب غذا چاول اور کرم کا ساگ ہے۔ دونوں کی غذا بھیڑ بکری کا گوشت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان زیادہ گوشت کھاتے ہیں۔

بزرگوں اور ریشیوں کا اعتقاد

کشمیر زمانۂ دراز سے ریشیوں، مہنتوں، مہا پرشوں اور بزرگانِ کرام کی سرزمین رہی ہے۔ اس لئے کشمیر کی مخلوط، تمدنی روایات کے پیشِ نظر کیا ہندو اور کیا مسلمان دونوں ہی میں ریشیوں کا عقیدہ جاگزیں رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان عرصۂ دراز سے ریشیانِ کشمیر کے دل و جان سے معتقد رہے ہیں اور ان کی محبت و عظمت گھٹی میں پڑ چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے طول و عرض میں واقع ..... ریشیانِ کرام کے آستان و مزارات دونوں کے لئے باعثِ تعظیم ہیں۔ کشمیر کے ابتدائی مسلمان بیک وقت ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، مساجد کا رُخ بھی کرتے تھے اور دیوی دیوتاؤں کے استھانوں کا بھی (سلطان قطب الدین کے متعلق روایت ہے کہ باوجود مسلمان ہونے کے روزمرہ کالی شری مندر کی مورتی مہا کالی کا جہاں مہا دیو کے ایک سو بیس (۱۲۰) بت تھے طواف و عبادت کیا کرتا تھا)[1]

تعمیر ۱ تاریخ حسن، ج، ۱، ص ۳۲۳،

للہ دید کا اعتقاد

من حیث القوم کشمیری للہ دید کے شدید معتقد ہیں۔ مسلمان اسے للہ عارفہ (خداشناس) اور کشمیری پنڈت بھگوتی اور دیوی خیال کرتے ہیں۔ بہرکیف للہ عارفہ[1] ہندو تھی یا مسلمان دونوں کے لئے اس کی محبت و الفت کشمیر کے مشترکہ تمدن کی میراث ہے۔ پنڈتوں اور مسلمانوں دونوں کے لئے اس کے اشعار اشلوک کہلائے۔ جو خود مخلوط تہذیب کی غمازی کرتے ہیں۔ للہ عارفہ کے ضمن میں شیخ العالم شیخ نورالدین ولی کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ جو یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے باعث احترام ہیں۔

سبزی خوری اور گوشت سے پرہیز

زمانۂ قدیم سے سبزی خوروں اور گوشت خوروں کے مابین لفظی نزاع چلا آرہا ہے ہندو دھرم میں یہ ایمان و اعتقاد کا جزو ہے کہ انسان گوشت سے پرہیز کرے۔ کیونکہ جیو ہتیا (زندہ کی ہلاکت) کا حامل ہے۔ قدیم زمانے میں بعض مسلم فلاسفر بھی اسی عقیدہ کے معتقد رہے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ عرب کا مشہور فلسفی اور شاعر ابوالعلاء معرّی گوشت خوری سے قطعاً پرہیز کیا کرتا تھا۔ اور ہندو عقیدہ کے مطابق اسے "جیو ہتیا" سمجھتا تھا[2]۔ کشمیر میں یہی اعتقاد مسلمان ریشیوں کا تھا اور آئندہ بھی رہا ہے۔ گوشت خوری سے پرہیز ہندو سماج کا اہم عنصر ہے۔ آج بھی بعض مسلمان اس قدیم روایت کے بموجب ریشیان کرام کے اعراس (جمع عرس کی) پر مخصوص ایام میں گوشت خوری سے اجتناب کرتے ہیں۔ تاریخ کی

---

[1] للہ عارفہ کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار ص ص ٣٦١ - ٣١٨

[2] وفیات الاعیان لابن خلکان مطبوعہ مصر۔

رُو سے کشمیر کے اکثر و بیشتر ریشیان کرام ہندو راجپوت تھے۔ اِن میں سے بعض اہم خاندان کے مہنت اور پجاری تھے[1] مسلمان ہونے پر گوشت خوری سے اجتناب کا عقیدہ اُن میں برقرار رہا اور جس کے کچھ نشانات مسلمانوں کے بعض طبقوں میں آج بھی دستیاب ہیں

آثار و نشان پرستی

کشمیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی امتیازی خصوصیت آثار و نشانات پرستی ہے۔ اس چیز کے پیش نظر دونوں کے دونوں بزرگوں کی نشانیاں از قسم کھڑاؤں، عصا، دستار، بال، شلوار، قمیص، چادر، پاجامہ، تھلیا، تیر و کمان اور کشتی وغیرہ قابل نمائش و زیارت گردانتے ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام سے قبل کشمیر میں آثار پرستی کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ بقول ہیون سانگ[2] سنہ ۶۳۱ء میں جب وہ وارد کشمیر ہوا تو موجودہ نشاط باغ کے پاس ایک بودھ وہار میں اُسے مہاتما بدھ کا دانت رکھا ہوا نظر آیا تھا جس کی زیارت کے لئے دُنیا کے بودھ دور دراز سے آیا کرتے تھے۔ یہ آثار و نشانات پرستی آمد اسلام کے بعد بھی کشمیر میں جاری رہی۔ اور جس کا ثبوت وادی کے اطراف میں متعدد نشانات کی موجودگی سے ملتا ہے۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ آثار پرستی خواہ جس شکل میں یہاں کے مخصوص تمدن کی مشترکہ روایت ہے۔

کشمیری تواریخ اور مہینوں کا استعمال

موجودہ زمانہ میں اگرچہ انگریزی تواریخ تمدن و تہذیب کا جزو بن چکی ہیں اور ان سے قبل اسلامی تواریخ کا دور دورہ تھا۔ تاہم کشمیری مہینوں اور تواریخ کا استعمال اب بھی اہالیان کشمیر کے ملحوظ تمدن کو ظاہر کرتا ہے۔ مسلمانوں اور ریشیان کرام کے ملحوظ تمدن کو ظاہر کرتا

---

[1] لطائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار تحفہ دوم در بیان احوال ریشیان عالی شان ص نعیم ص ۸۷، ۱۳۶ [2] سفرنامہ ہیون سانگ ترجمہ انگریزی،

ہے۔ مسلمان میں ریشیانِ کرام کے عرس بالعموم کشمیری مہینوں اور تواریخ کی رو سے منائے جاتے ہیں اور یہی کیفیت کشمیری پنڈتوں کے بڑے دنوں اور میلوں اور تیوہاروں کی ہے۔ مسلمانوں میں بجائے اسلامی تواریخ کے اسلام آباد کے بابا ہردی ریشی کا عرس اوّل ماہ پوہ کشمیری کو منعقد ہوتا ہے۔ شیخ زین الدین کا ۱۲ ار دیکھ (ہیا کھم) کو، شیخ نور الدین کا ۲۶ ماہ پوہ کو، بابا لطیف الدین کا پانچ ماہ پھاگن کو، بابا پیام الدین کا ۲۷ ماہ پوہ کو، لال ریشی کا ۸ ماہ ملہ کو، بابا نصیب الدین غازی ۳ ماہ ملہ کو اور رضاواری سرینگر کشمیر کے حبہ صاحب کا ماہ پوہ میں منعقد ہوتا ہے۔[1]

اوقات و ساعات کا اعتقاد

دینی اور دنیوی امور میں کشمیر کے مسلمان اور ہندو ساعات و اوقات کے قائل ہیں۔ البتہ امتدادِ زمانہ اور اپنے اصلی مذہب سے دور ہو جانے کے باعث عقیدے مختلف ہو گئے ہیں۔ مسلمان ہر ماہ کی اسلامی تاریخ تین، تیرہ اور تئیس کو برا شگون سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ماہ صفر میں شادی بیاہ سے گریز کرتے ہیں، جبکہ برہمنانِ کشمیر ہر کام کے لیے ساعت ضروری سمجھتے ہیں۔ ساعات کا یہ اعتقاد کشمیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مخلوط تمدن کی نشان دہی کرتا ہے۔

فارسی کی تعلیم

اسلام سے قبل اہلِ کشمیر کی علمی زبان سنسکرت تھی اور رسم الخط شاردا تھا جو صرف اہلیانِ کشمیر کے ساتھ مخصوص تھا لیکن اسلام کے بعد اس خطہ میں تبدیلیٔ مذہب کے باعث

[1] مذکورہ تواریخ کے لئے دیکھیں قلمی نسخہ تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار، [illegible] ریشیان عالی شان از حاجی ملا محمد [illegible] مطبوعہ ۱۹۶۰ء

تعمیر

یکسر تغیر آگیا۔ مسلمان اور ہندو دونوں بجائے سنسکرت اور شاردا کے فارسی پڑھنے لگے۔ قدیم زمانے میں اگرچہ بعض مسلمان بھی سنسکرت کے عالم تھے۔ چنانچہ مُلّا احمد کشمیری کے متعلق جو عہد بڈشاہ صاحب کے زبردست عالم و شاعر تھے۔ روایت ہے کہ فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کا بھی علم رکھتے تھے۔ بادشاہ سلطان زین العابدین کے ایماء پر انہوں نے مہابھارت کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ لے بعد میں یہ روایت مفقود ہو گئی۔ البتہ ہندو فارسی پڑھنے لگے۔ فارسی تعلیم کی یہ روایت مسلمانوں کے ساتھ ساتھ پنڈتان کشمیر میں بھی موجودہ زمانہ (۱۹۸۵ء) سے کچھ قبل تک جاری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان فارسی اہلِ قلم کی فہرست میں ایک بڑی تعداد کشمیر کے پنڈت صاحبان کی بھی ملتی ہے جن میں نارائن کول عاجز، پنڈت بیربل دکاچرو، دیا رام خوش دل، منشی بھوانی داس کاچرو اور تابہ کول عرض بیگی و دیگر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

پیری و مُریدی

یہ بھی کشمیر کی مشترکہ تہذیب کی غماز ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان اولیاؤں کو پیر اور ان کے معتقدوں کو مرید کہتے ہیں۔ جبکہ کشمیر کا برہمن یا ہندو طبقہ اسی بات کو گورو اور چیلے کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔

رقص و سرود، لوک گیت اور اساطیری قصے

رقص و سرود، لوک گیت اور اساطیری قصص و حکایات مذہب کی قلمرو سے قطعاً آزاد ہیں

لے صاحب تاریخ حسن جلد دوم ص ۱۹۷ کی اس سلسلے میں روایت یوں ہے :-

"اور اکثر برہمن عالم جگت ناتھ اور کابل جوگی کو رود کھیتر (ہریانہ) سے طلب کر کے بادشاہ زین العابدین ان کی مصاحبت سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ کتب وید و شاستر ہندوستان سے منگوا کر فارسی میں ترجمہ کرا لیں خاص طور پہ مہابھارت اور راج ترنگنی جو سنسکرت میں تھی، ملا احمد سے ترجمہ کروائی تعمیر

جہاں مذہب سے زیادہ انسانی فطرت اور خواہش کام کرتی ہے تمدن و تہذیب کی یہی چیز دونوں کو قوموں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس چیز کے پیش نظر اہالیان کشمیر، کیا ہندو کیا مسلمان، اُن کا گانا بجانا، رقص و سرود، لوک گیت اور اساطیری قصے یکساں ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں میں ستار، وائلن، تمبخ نور (جھیلی کی مٹی ہوئی ڈھلی بجانا) اور گھڑا بجانے کا عام رواج ہے۔ صوفیانہ موسیقی، عباثر نغمہ، دنبالی فقیروں کا ناچ۔ کشمیر کے مخلوط تمدن کی ایک واضح علامت ہے، یہی کیفیت رُف اور ونہ وُن کی ہے جو لوک گیت کا اہم حصہ ہیں۔

اساطیری قصص و حکایات میں اکہ نندن اور ناگ رائے و بیتال کیا پنڈت، اور کیا مسلمان دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ ناگ رائے و بیتال سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اور پنڈت دونوں مشترکہ طور پر ناگوں یعنی سانپوں کے متعلق اچھا عقیدہ رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ دونوں قومیں سانپ مارنا نہایت پاپ[1] سمجھتی ہیں۔ اُن کے خیال میں ناگ کوئی بھی شکل اختیار کر سکتا ہے اور مافوق الفطرت طاقت کا حامل ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں بابا داؤد خاکی کا ناگوں کے متعلق یہی عقیدہ تھا۔ اُن کے خیال میں نالہ پہرواڑ نالہ دھوبتی ناگ ہیں۔ جو پانی کی شکل میں رہتے ہیں اور کبھی کبھار انسانی روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ اُن کی اپنی روایت ہے کہ ایک مرتبہ دو نوجوان خوبصورت لڑکے اُن کی خدمت میں آ کر رشد و ہدایت سے مستفید ہونے لگے۔ ایک مرید یہ کیفیت دیکھ رہا تھا۔ لڑکوں کے رخصت ہو جانے پر بابا سے دریافت کرنے لگا۔ پیر و مرشد یہ کون لوگ تھے؟ فرمایا ان میں ایک نالہ پہرو اور دوسرا نالہ دھوبتی تھا۔

---

[1] غالباً ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے کہ راقم العروف (محمد ابراہیم) قبرستان ملہ کھوا سے چل رہا تھا کہ ایک قبر سے ایک موٹا کالا سانپ نمودار ہوا۔ لوگ بجائے مارنے کے پیچھے پیچھے چلنے لگے اور اگر کوئی مارنے کا ارادہ کرتا تو پاپ اور گناہ لیکر روک دیتے تھے تا آنکہ کالا ناگ ایک قبر میں داخل ہو کر چھپ گیا۔ اس سے اہل کشمیر کے عقیدہ "ناگ پرستی" کا اندازہ ہوتا ہے۔

طرزِ تعمیر

خوراک و پوشاک، زبان اور عادات میں مماثلت کے کشمیر کی بعض مذہبی عمارات کا طرزِ تعمیر بجائے اسلامی فنِ تعمیر کے، بودھی طرزِ تعمیر سے ملتا ہے۔ اسلام سے قبل مسلمان کشمیر کی ایک معتد بہ تعداد بودھ مت کی پیروکار تھی۔ اسی مناسبت سے کشمیر میں ودھری اور ستوپائی طرزِ تعمیر مروج تھا۔ اس چیز کے پیشِ نظر مسلمانوں کی بڑی خانقاہیں، زیارات و مساجد اسی طرزِ تعمیر کی حامل ہیں۔ ان میں جامع مسجد سرینگر، آستانِ شہالو، خانقاہ، چرار شریف آستان، ولی جانباز صاحب، قدیم آستانِ حضرت بل اور خانقاہ نقشبندیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں

نتیجہ!

خلاصۂ کلام یہ کہ بادی النظر میں اگرچہ کشمیر کے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ عقیدوں اور تہذیبوں کے حامل لوگ ہیں، تاہم گہری نظر ڈالنے پر دونوں تمدنوں کے مابین مماثلت قریب نظر آتی ہے۔ البتہ ناموں اور طریقوں کا فرق ہے۔ رسم دراصل ایک ہی ہے جیسے نئی بوتلوں میں بھر کر نئے رنگ کا نام دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پنڈت استھانوں کا رُخ کرتے ہیں اور مسلمان زیارت و مزارات کا جو درحقیقت ایک ہی تہذیب کی کڑی ہے۔

موجودہ مغربی تمدن بڑی تیزی کے ساتھ کشمیر کے قدیم تمدن و تہذیب اور اس کی روایات کو مسمار کر رہا ہے۔ اس نے زبان، تعلیم، خوراک، پوشاک، رہن سہن، عادات و رسوم الغرض سبھی بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ اگر یہی کیفیت جاری رہی تو کشمیری تہذیب و ثقافت ماضی کی ایک گذشتہ تاریخ بن کر رہ جائے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انگریزی کے اس طوفانی حملہ کو روک کر کشمیر کا قدیم ورثہ برقرار رکھا جائے۔ اسی میں اہلِ کشمیر کی انفرادیت کا راز مضمر ہے بقول شخصے

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔

نعیم

امرناتھ کی یاترا اور مسلمان

ریاست جموں و کشمیر میں غار امرناتھ کشمیر اور بیرون کشمیر کے ہندوؤں میں ایک مقدس مقام ہے جہاں ماہ اگست میں ہر سال یاتری برف کے شیو لنگ کی زیارت کو جاتے ہیں لیکن اس تیرتھ کی دریافت کا سہرا بٹہ کوٹ کے مسلمان [illegible] کے سر ہے اس لئے تیرتھ پر چڑھاوے کا تیسرا حصہ اسی خاندان کو پہنچتا ہے۔ باقی دو حصوں میں ایک حصہ مٹن کے گوروں کو اور دوسرا حصہ رگھوناتھ مندر سرینگر کے مہنتوں کو ملتا ہے۔

اہلِ قلم سے گذارش

تعمیر کے زیر نظر شمارہ کی طرح ہم جموں خطے پر ایک علیحدہ شمارہ شائع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اہلِ قلم سے گذارش ہے کہ وہ جموں کی ثقافتی، تمدنی اور سماجی زندگی کے علاوہ فنونِ لطیفہ اور تعمیر و ترقی پر اپنے مضامین ہمیں روانہ کریں۔ تعمیر میں چھپنے والی نگارشات کا معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔

مضامین روانہ کرنے کا پتہ

[illegible] تعمیر

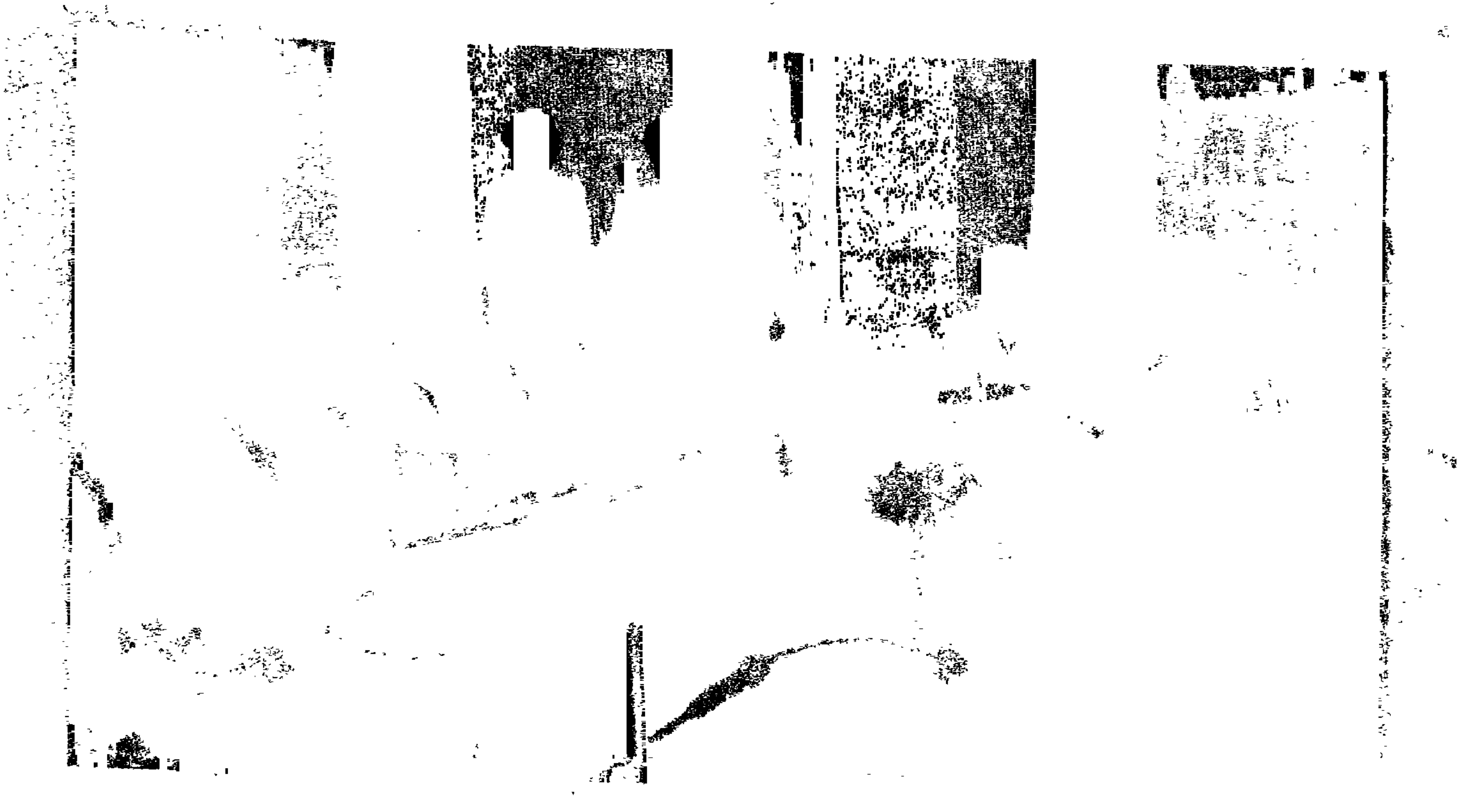
[illegible] محکمہ اطلاعات کشمیر

سرینگر - ۱۹۰۰۰۱

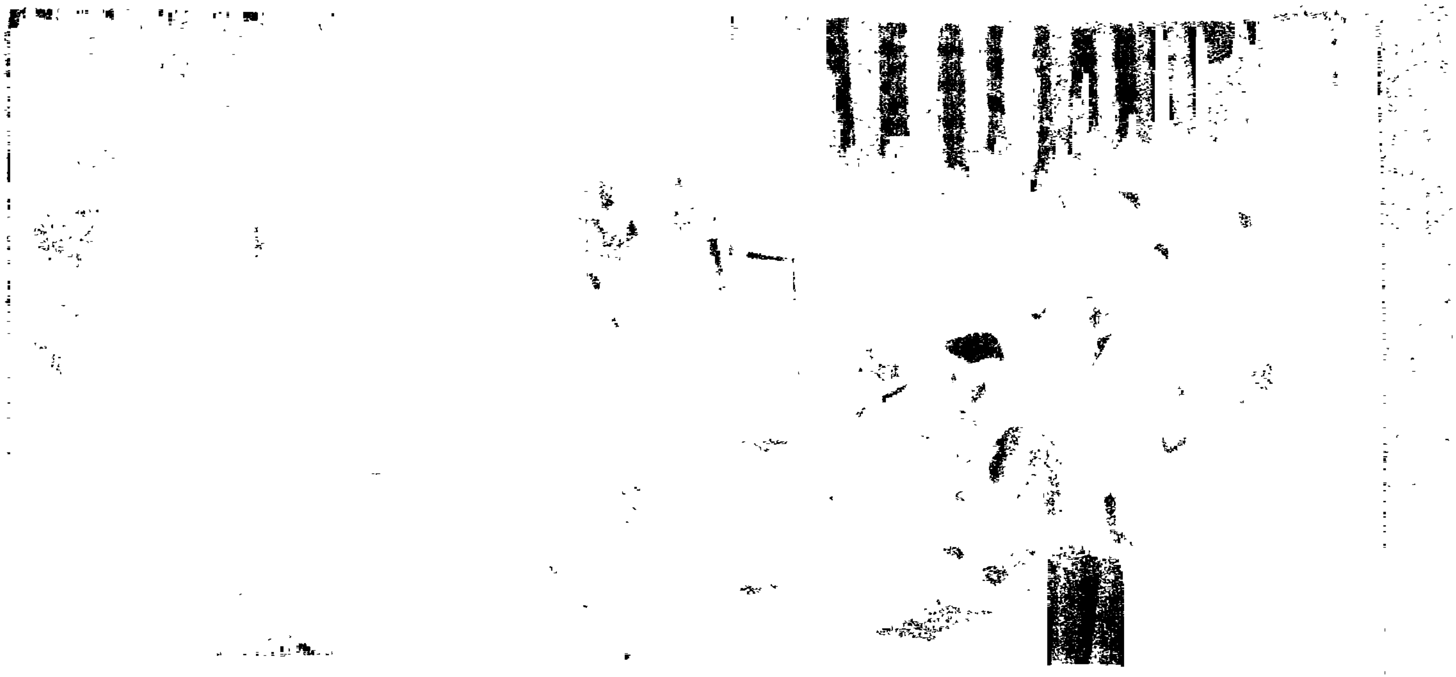
تعمیر



وزیر اعلیٰ کی قیادت میں ضلع سرینگر کے آفیسران کا اجلاس



ضلع اننت ناگ میں افسروں کے اجلاس سے وزیر اعلیٰ خطاب کر رہے ہیں۔



وزیر اعلیٰ مسٹر جی ایم شاہ سیاحوں کے استقبالیہ مرکز (سرینگر) میں ہاؤس بوٹ
مالکان سے مخاطب ہیں۔



وزیر صحت مسٹر محبوب بیگ اننت ناگ کے عوامی جلسے سے خطاب کر رہے ہیں

بشر بشیر
سرینگر

کشمیری ادب تاریخ کے آئینے میں

کشمیری ادب کی تاریخ کا سرسری مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مختلف ادوار میں جن سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات نے اس خطۂ سرزمین میں کروٹ بدلی اُن کی واضح ترجمانی اسمیں ملتی ہے ۔ گویا کشمیری ادب بذات خود یہاں کی تہذیب اور تمدن کی تاریخ کا آئینہ دار ہے ۔

کشمیر مختلف فلسفوں اور عقائد کا گہوارہ رہا ہے ۔ مختلف علوم اور مکاتبِ فکر اس سرزمین پر نشوونما پاتے رہے اور پروان چڑھے ۔ کشمیری ادب کی باقاعدہ تاریخ آج سے چھ سو سال قبل لل دید سے ملتی ہے ۔ حالانکہ لل دید سے پہلے کے چند ادبی نمونے بھی اب تک سامنے آئے ہیں جن کے متعلق ناقدین اور محققین کے ہاں ایک خاصی بحث چلتی رہی ۔ مشہور فلسفی ابھنو گپت کی " تنتر سار " نامی تصنیف میں آٹھویں اور نویں صدی عیسوی کے چھمہ پد یا چریا پد کے شعری نمونے دریافت کئے گئے ہیں ۔ انہیں بھی

اس تصنیف میں تاریخی اہمیت کے پیش نظر جگہ ملی ہے جس کا اعتراف بذات خود مصنف نے کیا ہے۔ موجودہ تحقیق کے مطابق یہی چند اشعار اب تک دریافت ہوئے کشمیری شاعری کے اولین نمونے ہیں جب کہ وہ تمام ادبی تصنیفات جن کا ذکر یہاں کی تاریخ اور نیم تاریخی دستاویزات میں ملتا ہے اب تک بالکل ناپید ہیں لیکن جہاں کہیں بھی ایسی تصنیفات کا ذکر ہوا ہے وہ کسی نہ کسی طریقے سے سیاسی واقعات سے اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ اُن کی وجہ تصنیف بظاہر صرف ان ہی واقعات سے منسوب کی گئی ہے۔ گناڈی کی "برہت کتھا" ہو، ناگ سین کی "ملند پنہہ" ہو یا شتی کنٹھ کی "مہانے پرکاش" ان تمام تصنیفات کے ادبی پہلو پر کم اور اُن کی مناسبت سے سماجی اور سیاسی حالات کے متعلق زیادہ ذکر کیا گیا ہے۔

لل دید بذات خود اپنے کلام کے ادبی پہلو سے واقف تھی یا نہیں یہ بحث نہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اُس نے اپنی شاعری میں کشمیری شیو فلسفہ کی بنیادی باتیں بیان کیں۔ لیکن ان تمام باتوں کو تجربوں کی صورت میں ڈال کر لل دید نے ایک طرف اس فلسفے کو عام کیا اور دوسری طرف اپنے تجربوں کو تخلیقی معراج سے ہم کنار کر دیا۔

لل دید اور شیخ العالم (ر) کشمیری ادب کی تاریخ کے ایک ہی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری کے موضوعات کا میلان ایک ہی طرف رہا جسے ہم خود آگہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے کہ جب کشمیری تمدن ایک اور عظیم تمدن سے اثر انداز ہو رہا تھا۔ ایرانی سادات کی آمد کے بعد کشمیری لوگوں کا ایک بھاری تعداد میں مشرف بہ اسلام ہونا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ کشمیری شیو فلسفہ کی بنیادی باتیں اسلامی اصولوں سے بہت حد تک مماثلت رکھتی ہیں جن کی بنا پر یہاں کے لوگوں نے اسے بہ خوشی اپنا لیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان دونوں شعراء کو آج تک بلا لحاظ مذہب و

تعمیر

ملت قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے اور اُن سے لوگوں کے عقائد بھی وابستہ ہیں ۔

دونوں کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں انسانی ہمدردی وحدانیت اور روحانیت کے نمایاں خدوخال اُبھرتے ہیں ۔ دونوں کی شاعری میں سنسکرت الفاظ کا کثرت اور فارسی الفاظ کا شاذونادر استعمال اُس تہذیبی سنگھم کے ابتدائی نقوش کی نشاندھی کرتا ہے جس کے واضح نتائج بعد میں ایک مخلوط تہذیب کی صورت میں اُبھر آئے ۔

اس دور کی شاعری میں اگرچہ روحانی اور فلسفیانہ موضوعات ہی غالب رہے تاہم دونوں کی شاعری میں سماجی طنز بھی موجود ہے ۔ اس ضمن میں کئی طرح کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔ لل دید اپنے وقت کے لالچی برہمنوں کے متعلق یہ نظریہ رکھتی ہے :—

پرتھ تہ لوُزتھ برہمن ژھٹن
آگر کھٹن لِندِ یِہ ستھ
ٹپنخ سَن نِتھ تھاوان مٹن
مُہتھ مَن گژھیکھ اہنکارے

ترجمہ :— (سناکے اور پڑھ کے برہمن ناپاک ہو جائیں گے
ماخذ ہی ان کی عمل سے سوکھ جائیں گے ۔
ایک جگہ کی چوری کا مال دوسری جگہ لے جا کر رکھ دیں گے
اُن کا من غرور و تکبر میں گھِر جائے گا ۔)

دلیوٹا دلو روٹا
ہیرلوُن تھی پکہ واٹھ

بۆز کُس کرکھ ہوشہِ بٹا
کرُ مُنس تہِ پۆنس سنگاٹھ

ترجمہ:- (دیوتا بھی پتھر ہے اور مندر بھی پتھر کا بنا ہے
اوپر سے نیچے تک ان میں رابطہ ہے
او چالاک پنڈت تو کس کو پوجے گا
اپنے من اور پون میں رابطہ پیدا کر)

اور شیخ العالمؒ ایسے ہی غرضمند گناؤں سے یوں مخاطب ہیں :-

عٔلِم ماںوٚر وو دو پچھ کے ہوٚسے
ژٔھلس چھِ زاگان اُکِس اَکھ
چھِچھ چھِو آمتی میٹھِ تے مسے
پوٚژھ لوٚژھ ڈیشتھ لیوان ژکھ
کرٚ چھِو گٔگانہٕ اُسی چھِ خلاصے
تتہِ ژ من کلبوسہ سپٔنز اکھ

ترجمہ:- (دنیا تمیں کمانے کے لئے تم نے علم حاصل کیا - ایک دوسرے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو - شراب اور میٹھی چیزوں سے تم وجد میں آگئے ہو - اگر مہمان تمہارے گھر آئے تو تیوریاں چڑھاتے کیوں ہو - گمان کرتے تم گنے چنوں میں سے ہو - وہاں تم میں سے ایک بھی خلاصی نہیں پائے گا -)

للہ دید اور شیخ العالمؒ کے دور کے بعد کشمیری ادب کی تاریخ میں قریباً ایک سو سال تک کوئی نمایاں آواز سامنے نہیں آئی - البتہ یہ ضرور ہے کہ اس دوران کئی شعراء ابھرے

تعمیر

ہوں لیکن زمانے کے ہاتھوں اُن کی تخلیقات ضائع ہو گئی ہوں۔ حبہ خاتون وہ پہلی کشمیری
شاعرہ ہے جس نے اپنی شاعری کی بنیاد یہاں کے لوک ادب پر رکھی حبہ خاتون نے
ایرانی غزل سے متاثر ہو کر کشمیری میں غزلیں تخلیق کیں جنہیں چند محققین
"وژن" نام سے بھی پکارتے ہیں۔ حبہ خاتون کی زندگی کے متعلق اگرچہ حقائق
لوک روایتوں سے گھل مل گئے ہیں تاہم اس بات پر اتفاق ہے کہ اُس کی زندگی
میں کئی ایسے دور وقوع پذیر ہوئے جن کی ترجمانی اُس کے کلام میں ملتی ہے۔ وہ
دیہاتی ماحول میں جوان ہوئی اور شاہی محل کی مضطرب رنگینیوں سے بھی آشنا ہوئی
اگرچہ اُس کی شاعری میں ذاتی جذبات کی ترجمانی ملتی ہے پھر بھی اُس کے کلام
میں سماجی عناصر کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ سسرال عام طور پر زنانہ
شعرا کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے لہذا حبہ خاتون کے مختلف النوع مشاہدے
نے اُس کے کلام میں ایک انوکھا رنگ بھر دیا۔

ڈاروِن سیتہ وار چھس نو
حال پکر میون مالِنو ہو
گرٕ دزالیس آ بہٕ ننِٹس
ٹوٹ میون پھٹو مالِنو ہو
یا دی تو ننِٹرٕ نو ٹا
نتہ ننِٹرِ چے ہا پہ مالِنو

ترجمہ:۔ (میں سسرال میں خیریت سے نہیں ہوں میرے میکے اس کا کچھ علاج
کرو۔ میں گھر سے پانی لانے کے لئے نکلی اور میرا گھڑا ٹوٹ گیا یا تو مجھے نیا گھڑا لا کے دے دو
یا اس کی قیمت دے دو۔)

حبہ خاتون کے تقریباً ڈھائی سو سال بعد کشمیری شاعری میں مکمل طور پر ایرانی اثرات دکھنے لگے حالانکہ حبہ خاتون کے بعد ہی کئی موضوعی تبدیلیاں کشمیری شاعری میں نظر آتی ہیں۔ کئی ہندو شعراء نے بھگتی موضوعات اور کئی شعراء نے تصوف کو اپنا موضوع بنا لیا اور چند شعراء نے حبہ خاتون کا ہی رنگ استعمال کیا جن میں ارنی مال اہم نام ہے۔

محمود گامی نے کشمیری شاعری میں پہلی بار مثنوی صنف کا آغاز کیا اور غزل کو ہیئتی اعتبار سے پورے طور ایرانی غزل کے ہم پلہ بنا دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کشمیر کی آزادی مغلوں کے ہاتھوں سلب ہو کر عنانِ حکومت پٹھانوں کے ہاتھوں میں آئی تھی۔ عوامی زبان اگرچہ کشمیری تھی لیکن حکمرانوں کے تلخ رویے اور عدم توجہی کا شکار ہو کر اس کے تخلیق کاروں کی صلاحیتیں معدوم ہو کر رہ گئیں تھیں۔ محمود گامی نے جرأت مندانہ طور اس لسانی غلامی کے خلاف علمی بغاوت شروع کی اور کئی فارسی مثنویوں کا کشمیری ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ سینکڑوں غزلیں بھی تخلیق کیں۔ یہ بات عیاں ہے کہ یہ اس زیرِ سطح پنپنے والے انفرادی شعور کا متبادل اظہار تھا کہ جو رومانی طرز کے تجربات سے ہمکنار ہوا۔ چناں چہ اکثر بزمیہ کشمیری مثنویاں اور صوفیانہ نظمیں و غزلیں اس کی ترجمان ہیں۔ اس دور میں ولی اللہ متو، مقبول شاہ کرالہ واری، ناظم وغیرہ اہم مثنوی نگاروں اور رسل میر جیسے عاشق مزاج شعراء ابھرنے کے ساتھ ساتھ رحمان ڈار، نعمہ صاحب، شمس فقیر، وہاب کھار اور واز محمود جیسے صوفی شعراء کشمیری شاعری کے آسمان پر درخشندہ ہوئے۔ مقبول شاہ کے گریسی نامہ، پہلی نامہ اور ظلمہ اس دور کے واضح سماجی شعور کی ترجمانی کرتے ہیں تاہم اس قسم کی ہزلیات

تعمیر

اور بجز دیگر ادبی کارناموں کا مقدار کے اعتبار سے مقابلہ نہ کر سکے اور کوئی جامع تحریک نہ بن سکے۔

یہ صورت حال زیادہ دیر قایم نہ رہ سکی اور جوش و جنون کے جذبات کوئی اور راہ اختیار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ جذبات بعد میں جنگناموں کی صورت میں پھوٹ پڑے۔ بزمیہ مثنوی کی طرح رزمیہ بھی دیگر زبان سے مستعار لئے گئے لیکن ان میں نمایاں کشمیری ماحول بھی جھلکنے لگا۔ اس کے ساتھ ایسے جنگی منظروں کی بھی عکاسی کی گئی جن کے ساتھ ناواقفیت کے پیش نظر تخلیق کاروں کی ایسے ماحول سے ناواقفیت واضح طور جھلکتی نظر آتی ہے۔ تاہم یہ کشمیری رزمیہ نگاروں کے اُس نفسیاتی رویّے کو سمجھنے میں اہم اشاروں کے غماز ہیں جو کئی برس تک اُن کے دلوں میں منڈلاتا رہا۔

لکھمن جو بلبل، وہاب پرے حاجنی، امیر شاہ کریری، غلام محمد حنفی اور علی شاہ ہرل نے کئی جنگ نامے تصنیف کئے۔ جس طرح کسی سمندر کی خاموشی اُس کے زیر سطح انقلاب کی نشانی ہوتی ہے اُسی طرح جنگ ناموں کی شاعری کے بعد پھر سے بزمیہ مثنویوں کا دور شروع ہوا جس میں مسکین، اسماعیل نامی حیرت، اور عزیز اللہ حقانی جیسے شعراء نے کافی مقبولیت پائی۔ اُن کے ساتھ ساتھ صمد میر اور احد زرگر وغیرہ شعراء صوفیانہ موضوعات کو منظوم اور فنی پیرایوں میں ڈھالتے رہے اور اسی دوران زیر سطح پنپنے والے انقلاب طوفانی صورت اختیار کر گئے تھے۔ چنانچہ مہجور اور آزاد، ہم عصر کشمیری شعراء کا نام کشمیری ادب کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شعراء خاص طور پر مہجور یہاں کی سیاسی فضا پر بھی حاوی ہے۔ اور اُن کا کلام عوامی سطح

تعمیر

پر برابر مقبول ہوتا رہا۔ مہجور نے اپنے انقلابی خیالات اور قوم کی کسمپرسی کو شاعری کے پیرائے میں بیان کر کے عوام پر عیاں کیا۔ اُن کی ابتدائی دور کی شاعری میں اگرچہ زیادہ تر روایتی عناصر کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں تاہم تاریخ کے وسیع مطالعے نے انہیں قومی شعور عطا کیا۔ اور وہ کشمیریوں کی حالتِ زار دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جس کے نمایاں اثرات اُس کی شاعری میں جلوہ گر ہونے لگے اور اُس نے آزادی، سنگرمالن بیو پتر اگاش، باغِ نشاط کے گُلو جیسی کامیاب علامتی نظمیں تخلیق کیں جن میں سیاسی شعور جھلکتا دکھائی دیتا ہے اس قسم کے شعور کی بدولت مہجور نے اپنی شاعری میں علامتوں کا ایک مخصوص نظام ترتیب دیا۔ باغ، بہار، بُلبُل، شبنم اُس کی شاعری میں عام طور پر علامتوں کی حیثیت سے استعمال ہو چکے ہیں۔ کشمیری شاعری کے اس دور کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہیں کہ یہ دور ایک طرف امیدوں اور دوسری طرف شک و شبہات کا دور رہا۔ ظاہری طور تو جوش و جذبات کی للکار تھی لیکن داخلی طور پر غلامی کی سختیاں جھیل کر کشمیری عوام دل برداشتہ ہو کر رہ گئے تھے۔ ایسی صورت میں حساس طبقہ لوگوں کو بالواسطہ طریقوں سے ایک انقلاب کے لئے آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوششیں کر رہے تھے۔ ایسی صورت میں عبدالاحد آزاد کی "دریاو" اگرچہ ظاہری طور دریا کی نمائندگی کرتی تھی لیکن بنیادی طور ایک صاف ستھرے اور آزادانہ سماجی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔

۱۹۴۷ء کی سیاسی تبدیلیوں کے پیچھے جو عوامی تحریکات کارفرما تھے اُن میں شعرا کی کاوشیں ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہیں۔ اُس زمانے میں مہجور کی کئی نظمیں لوگوں کا جوش و جذبہ اُبھارنے کے لئے مجلسوں کی زینت اور تعمیر

ھائی نثروں کی صورت اختیار کر گئیں ۔

ولو ہا نوجوانو نو بہارک شان پیدا کر !
پھولن گل گتھ کرن بلبل تتھی سامان پیدا کر

ترجمہ :- (آ اے نوجوان نئی بہار کی شان پیدا کر اور ایسے سامان پیدا کر کہ پھول کھلیں اور بلبلیں رقص کریں ۔)

گنٹہ ژج گاش آو گژھہ پیو لالن
سنگرمالن پیو ہیرا گاش
سنگرمالن کوہن تہ بالن
سنگرمالن پیو ہیرا گاش
باغکہ رنیزل وارلین گالن
بلبل غم تراو کتھ بکھن واش
ییمہ یور سپنے مذہب بالن
سنگرمالن پیو ہیرا گاش

ترجمہ :- (اندھیرا چھٹ گیا اور روشنی پھیل گئی ۔ پہاڑوں، اونچے پربتوں اور گلستان پر نیا نور پھیل گیا ۔ اے باغ کے بلبل تو اپنا غم بھلا دے ۔ اب باغ کے نگہبان تمہارے دشمنوں کو ختم کریں گے اور باغ میں تمہارا ہی بول بالا ہوگا کیونکہ ہر طرف نئی روشنی پھیل گئی ہے ۔)

اسی دور میں جو شعرا ابھرے اُن میں عارف، غلام رسول نازکی اور فاضل کشمیری کافی اہم ہیں ۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ شعرا اُس دور کے دیگر

تعمیر

نوجوان شعراء کی طرح وقتی آوازوں اور بعض نعرہ بازی سے اپنی تخلیقات کو بچاتے رہے ۔ ان نوجوان شعراء میں نادم ۔ راہی ۔ کامل ۔ فراق ۔ عازم ۔ خیال وغیرہ اہم نام ہیں ۔ گویا اس دور کی اکثر شاعری گو اس لحاظ سے اہم ہے کہ موضوعی اعتبار سے یہ کشمیری شاعری میں ایک نیا موڑ تھا لیکن یہ فنی معیاروں سے کہیں دور رہٹ گئے ۔ اسی دور میں ایک خوشنما تبدیلی یہ بھی واقع ہوئی کہ یہاں کے ادیبوں کا رجحان نثر کی طرف بھی مائل ہوا ۔ کشمیری نثر کی بنیاد اگرچہ اس سے قبل کے مذہبی ادب سے پڑی تھی لیکن تخلیقی نثر خاص طور پر افسانوں اور ڈراموں کو عروج حاصل ہوا ۔ ایسے نثر پاروں میں بھی ایسے ہی موضوعات غالب تھے ۔ اور یہ اُس سوچ کا عامیانہ اظہار تھے جو کہ اُن دنوں یہاں کے نیم خواندہ نسل کے دل و دماغ پر اپنی چھاپ ڈال گیا تھا ۔ ڈوگرہ راج کی غلامی سے آزادی حاصل ہونے کے بعد جو حسین تصور یہاں کے باشندوں کے دل و دماغ پر حاوی تھا وہ ٹوٹ کر چور چور ہو گیا تھا ۔ لہٰذا یہاں کے پڑھے لکھے لوگ کسی اور انقلاب کے متلاشی تھے ۔ ذہنی صبر اور تسکین قلب حاصل کرنا اولادِ آدم کی ایک دیرینہ خواہش ہے ۔ اسے حاصل کرنا ہی فرد اپنا منزل مقصود سمجھتا ہے ۔ لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کا ادیب کائنات کے بدلے ذاتی اور اندرونی کشمکش میں مبتلا ہوا ۔ جس کا اظہار ادب میں بھی ہونے لگا اور یہی ادب جو انسان کے انفرادی کردار کا مظہر ہے اُس کی بیہمانہ فطرت ، اُس کی کمزوریوں اور خامیوں کی عکاسی کرتا ہے ۔ اسے جدید ادب کا نام دیا گیا ہے جدید ادب نہ صرف نئی شعری ہیئتوں کا نام ہے بلکہ زندگی کے متعلق ایک منفرد اور مبہم اپروچ کا بھی ۔ یہاں پر میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہوں گا کہ کشمیری میں اس قسم کی کوششیں ابتداء میں محض فیشن پرستی کے طور عمل میں آئیں اور

اب بھی چند بزرگ ادیب اپنے آپ کو جدید کشمیری ادب کے معمار سمجھ کر محض نقالی سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بلا دریغ قربان کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ شاید وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اپنے رومانی طرزِ احساس کو غیر ضروری لسانی توڑ پھوڑ سے مجروح کر کے خود فریبی میں مست ہو کر شاید ہی وہ آج کے حساس قاری کو دھوکہ دے سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں چند نوجوان ادیبوں جو آج کل کی زندگی کے کٹھن مسائل سے دوچار ہیں کی تخلیقات میں جدیدیت کا وہ رجحان پنپ رہا ہے جو اس صدی کے یورپی ادب کا بھی خاصا رہا۔ اسی طرح چند ادیب مختلف ادبی اصناف میں نئے تخلیقی تجربات سامنے لانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان میں گلشن مجید، شمس الدین شمیم، رشید راشد، رخسانہ جبین، سید رضا، عزیز حاجنی وغیرہ چند اہم نام ہیں جن سے یہاں کے قارئین کافی توقعات وابستہ رکھے ہوئے ہیں۔

●●

نور محمد بٹ
سرینگر

صوفیانہ موسیقی

آواز میں گرہیں باندھنے سے موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ یہ گرہیں بندھے ٹکے حصوں پر جا پڑتی ہیں جن سے موسیقیت یا آواز کی مناسبت ٹپکتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ موسیقی تناسب کا نام ہے سات سروں کی باہمی آمیزش سے کئی میل بنتے ہیں مثلاً سارے گا، ساگارے، گاسارے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ موسیقی بھی سیدھی مشینی بندشیں ہیں گھوڑے کے دوڑنے سے اس جانور کے چلنے کی چال معلوم ہوتی ہے جو مشینی عمل ہے۔ سنگیت کی دنیا کے بادشاہ بیتھوون نے کہا تھا کہ مجھے "سروں کا شاعر" کہہ کے پکارا جائے۔ جب شاعری کو دیکھا جائے تو اگر یہ صرف بحر میں بندھی شاعری ہے تو بعض وزن کی خانہ پری سے شاعری پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس پر تخیل اور وجدان کے دلآویز پردوں نے اس کے حسن کو دوبالا کیا ہو۔ غزالہ کی دوڑ میں لہراتی بل کھاتی پھلانگیں ہوتی ہیں اور یہی موسیقی کی صحیح چال ہے۔ سروں کے جتنے بھی پلٹے بنائے جاتے ہیں یا جو موسیقی

کے ذہن میں الہامی طور وارد ہوتے ہیں وہ موسیقی کی گرہوں پر اسی طرح اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے حسین سماں پیدا کرتے ہیں۔

اس مختصر سی تمہید سے مراد یہ ہے کہ صوفیانہ موسیقی کا خاکہ کھینچنے سے پہلے موسیقی کی ہیئت ترکیبی کا تصور پیش کیا جائے۔ صوفیانہ موسیقی انسان کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس کی باضابطہ مقام بندی ہے۔ یعنی یہ راگوں میں بندھی ہوئی ہے اور ہر مقام کو وضع قطع یا اس کی تراش خراش خاص قاعدہ کلیہ کے تحت کی گئی ہے۔ اس موسیقی کا حسیاتی پہلو بھی ہے اور عقلی پہلو بھی۔ اس میں رومانویت بھی ہے اور کلاسکیت بھی۔ اس میں حسیات کے اگر سبھی نہیں تو مختلف پہلو ضرور سامنے آتے ہیں۔ لیکن حسین انداز سے اس کے خدوخال ابھارے گئے ہیں اور اس کے توسط سے بحیثیت مجموعی غزلیں پیش کی جاتی ہیں۔ اس سے عقلی پہلو باقی تمام پہلوؤں پر غالب آتا ہے اور اس سے دانشور طبقہ اور ۴۰ سال سے اوپر کے لوگ اسے سننا پسند کرتے ہیں۔ چونکہ اس کی چال آہستہ روی پر مبنی ہے اس لئے ادھیڑ عمر کے لوگوں کو اس میں میانہ روی کا رنگ نظر آتا ہے اور وہ اچھلتے کودتے نغمہ کی بجائے خراماں خراماں چلتے نغمہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ عمر کا تقاضا انہیں ایسے حسیاتی پہلو ڈھونڈنے کی طرف مائل کرتا ہے اور اس سے انہیں آسودگی مہیا ہوتی ہے۔ آدمی اپنے گرد و پیش سے علامتیں یا تسکین کا سامان ڈھونڈنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے تصور خودی کے لئے "شاہین" کی علامت اپنائی۔ اُسے محسوس ہوا کہ جب جوانوں میں عقابی روح بیدار ہو جائے گی تبھی وہ بلندیوں کی طرف دیکھنا پسند کریں گے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب پھر جنگ کے بادل آسمان پر منڈلاتے نظر آنے لگے تو امن کے متوالوں نے "فاختہ" کو امن کی علامت بنایا۔

[illegible]نہ موسیقی کا جو پہلو اوپر تراشا گیا ہے۔ اُس کو مثالوں سے سمجھنا ضروری
ہے تاکہ اس [illegible] کا وہ پہلو اجاگر ہو جائے جو اسے عام موسیقی سے ممیز کرتا ہے۔
مقام [illegible]گاہ کا یہ گیت یکہ تال میں ہے

لٹ تھوم وا اُوی مزاق کت لگو سے رسے
مت چھوائی پاری کرڈنس مترلو تلوا

[یکہ تال]

×/1	2	3	4	o/5	6	7	8	2/9	10	11	12
						گا	گاریے	گا	گاما	پا	پا
						ل	ٹ	تھا	ؤ	ن	م
دھا	دھانی	نا	رےنے	نانی	پادھا	نی	دھا	پا	ماگا	رےگا	ماپا
دا	—	دُو	پ	را	—	ق	کت	لوگ	—	سے	—
ما	ما	گا	رے	سا	سا	گا	گارے	گا	گاما	پا	پا
رے	—	—	—	—	—	مس	—	چھوہ	—	آو	—
دھا	دھانی	نا	رنے	نانی	پادھا	نی	دھا	پا	ماگا	رےگا	ماپا
پا	—	ڈی	کر	نس		مز	—	لو	—	—	تل
ما	ما	گا	رے	سا	سا						
وا	—	—	—	—	—						

یائی تاره زاُجنس   مار آوُنه نیتے
یام استه استے   گوموسوُر
مقام غزل (اوزال)
[سیکه تال]

12	11	10	ع2/9	8	7	6	ع0/5	4	3	2	×1
زے	زے	نا	نا								
—	نا	رئی	یائ								
گا زے	زے	نا	نا	S	نا	گا زے	رے	گا	نا	زے گا	زے
وُ نږ	آ	ر	عا	س	—	—	—	—	ن	زاُج	ره
پا	نی دھا	دھا	دھا	S	S	S	پا	نی دھا	دھا	نی دھا	نا
ت	—	اس	یام	—	—	—	تے	س	—	—	ت
دھانی	دھا	دھا	دھانی	دھا	پا پا	نی دھا	رے نا	زے گا	نا زے	دھانی	پا
مو	گو	مو	گو	—	—	—	—	—	—	تے	اس
				S	پا	دھا پا	دھانی	پا	پا	پا	دھا
				ر	—	—	لوُ	—	—	لوُ	—

تعمیر

مقام کلیان | چپلنا زتال

گر تو خواہی کہ بے تردد رستہ از محشر شوی

دارہی از نار دوزخ لائق کوثر شوی

۶	۵	۴	۳	۲	۱	
رے	سا	سا				
خوا	تو	گر				
سا	رے	گا	رے	گا	گا	
ر	ت	بے	-	-	ہی	
پا	پا	پا	رے	رے	رے	
از	ت	رس	-	د	دُ	
پا	دھا	لی	نا	لی	دھا	
-	شوی	شر	-	-	محم	
نا	نا	نا	سا	رے	گا	
ہی	ر	وا	-	-	-	
رنے	رنے	رنے	نا	نا	نا	
دو	ر	نا	-	-	از	
نا	نا	نا	پا	لی	نا	
ق	ی	لا	-	غ	ز	
گا	گا	گا	پا	دھا	لی	
-	شوی	شر	-	-	کو	
			سا	سا	رے	
			-	-	-	

تعمیر

مقام کوہی [ستالہ]

شین شرادن گگاج نے   لاج نسے آرنی
دسہ دسہ باغ وسو   ہیتگہ لاگوزاغل پوش
ناردو تو صاحبے   " " " "

12	11	3/10	9	8	2/7	6	5	2/4	3	2	1
دھانی	پا	گا	پاما	دھا	نی						استھائی
ن	گاج	دن	شرا	ن	شی						
ما ما	ما	پا	نی دھا	سا	سا	دھانی	دھا	نی	سا	سا	سا
را	آ	–	–	–	سے	جن	لا	–	–	–	سے
نے	نا	نا	نی	نی	نی	ی	ی	پا	ما	گا	گا
را	آ	سے	ن	ج	لا	-	-	-	-	-	نی
ما ما	ما	پا	نی دھا	نا	نا	دھا	پا	دھا	نی	نا	زسے
را	آ	–	–	–	سے	جن	لا	–	–	–	نی
						ی	ی	پا	ما	گا	گا
						–	–	–	–	–	نی
زسے	نا	نا	نی	نی	نی						انترہ
غ	با	سے	و	سر	و						
ماما	ما	پا	نی دھا	نا	نا	نی	دھا	دھا	نی	نا	زسے
غل	زا	–	گر	–	لا	گر	رہن	–	–	سر	و
دھانی	پا	گا	پاما	دھا	نی	ی	ی	پا	ما	گا	گا
صب	ھا	تو	د	ر	زا	–	–	ش	–	–	نا
ما ما	ما	پا	نی دھا	سا	سا	دھانی	دھا	نی	سا	سا	سا
را	آ	–	–	–	سے	جن	لا	–	–	–	سے
						ی	ی	پا	ما	گا	گا
						–	–	–	–	–	نی

تعمیر

لوک موسیقی کے گیت اور ان کے طرزیں یوں ہیں :

لالس دون تہ چھپس سوال   سالس انتخ بلئے

دره چھپس از چھم کمال   اوه نے روزیم کالئے

وده تارا ویم جمال   سالس انتخ بلئے

1	2	3	4	5	6	7	8
تا	تا	تا	نا	تِي	دھا	پا	پا
لا	لس	دن	-	تے	-	چھپس	س
دھا	تِي	دھا	پا	دھا	دھا	دھا	دھا
دا	-	ل	سا	ئ	س	-	اَن
تِي	نا	نا	رے	نا	تا	تِي	دھا
ت	نے	-	-	یا	-	لِ	لے
دھا	-	-	-	-	-	-	-
انترہ							
رے	رے	رے	رے	گا	رے	تا	تا
م	د	چھ	س	از	چھم	-	ک
تا	تا	تا	تا	تی	دھا	دھا	دھا
ما	-	ل	-	اوه	نے	-	-
تِي	تا	تا	رے	تا	سا	تِي	دھا
رو	زیم	-	-	کا	-	لے	-

تعمیر

۳۔ والا عشق کیاہ چھکھو دلدار ہے
جلوہ چلانے گو وجنت بیدار ہے
حال منصور تن میانے چھوئی گومت
تانہ پیٹھ چھم شرعی تلوار ہے [تال دادرا]

×	2	3	٥	5	6
سا	سا	سا	رے	گا	ما
و	لا	عش	ق	-	-
گا	گا	رے	سا	سا	رے
کیاہ	چھ	کھو	دل	-	-
رے	سا	سا	-	-	-
دا	ر	ہے	-	-	-
انترہ دھا	نی	دھا	پا	پا	دھا
حا	ل	من	صو	-	ر
پا	ما	گا	رے	رے	گا
ت	ن	میا	نے	-	-
رے	سا	سا	سا	سا	سا
چھوئی	گو	مُت	-	-	-
رے	سا	سا	رے	گا	ما
تا	نہ	پیٹھ	چھ	-	م
گا	گا	رے	سا	سا	رے
شر	ع	پی	ت	لی	-
سا	سا	سا	-	-	-
وا	ر	ہے	-	-	-

تعمیر

شالہ مار باغس پھیرو لوشہ لولو سیل ڈل کرنے نیرو لوشہ لولو

تال دادرا

6	5	4°	3	2	1x
رے	سا	سا	سا	سا	سا
غس	-	با	مار	لہ	شا
سا	رے	رے	گا	ما	ما
لو	-	لو	شہ	لو	پھیرو
پا	دھا	دھا	پا	دھا	پا
نے	-	کر	ڈل	ل	سے
سا	رے	رے	گا	ما	ما
لو	-	لو	شہ	لو	نیرو
رے	سا	سا	سا	سا	سا
غس	-	با	مار	لہ	شا
سا	رے	رے	گا	ما	ما
لو	-	لو	شہ	لو	پھیرو

صوفیانہ موسیقی اور کلاسیکی موسیقی کو ساتھ ساتھ پیش کرنے سے اس کا تقابلی مطالعہ ہو سکتا ہے۔ صوفیانہ موسیقی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مختلف تالوں میں گائی جاتی ہے۔ تالوں کے نام ہیں۔ مخمس، ثقیل، نیم ثقیل، نیم دور، چتیر، جھمز، دورویہ، یکہ، سہ تالہ، دو یکہ، ضرب الفتح، ضرب فاختہ، چہار ضرب اور [illegible]۔ ان میں سے مخمس، ثقیل، نیم ثقیل اور نیم دور اب ناپید ہو چکی ہیں۔ البتہ غلام محمد ستار نواز نیم دور تال میں گانا گاتے ہیں کیوں کہ انہیں یہ فن ورثہ میں ملا ہے۔ نیم ثقیل تال ۲۴ ماتروں کی تال ہے اور نیم دور بھی جھمز اور دورویہ چودہ چودہ ماتروں کے تال ہیں۔ جب کہ چپ انداز ۶ ماتروں کی۔ جو تال ان میں ماتراؤں کے لحاظ سے ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں وہ دراصل اپنی الگ الگ انفرادیت رکھتے ہیں اور سامعین تالوں کے تنوع سے محظوظ ہوتا ہے۔

صوفیانہ موسیقی میں گانا ہو بہو اپنی اصلی شکل میں گایا اور بجایا جاتا ہے۔ اس میں نہ تو آکار میں اور نہ سرگم کی تانوں میں گانا گایا جاتا ہے۔ چوں کہ گانا بجانے والا ایک ہی ہوتا ہے لہٰذا تان پلٹوں کے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس سے سامعین کے ذوق سماع میں نغمہ بکھرنے سے خلل پیدا نہیں ہوتا۔ اور ایک ایسا آدمی بھی محظوظ ہوتا ہے جس کو پہلی بار ایسی محفلوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہو۔

اس موسیقی کے مقام مقررہ اوقات پر گائے جاتے ہیں۔ مثلاً "چہار گاہ، نوروز صبا وغیرہ صبح کے مقام ہیں انہیں شام کو یا دن ڈھلے نہیں بجایا جاسکتا۔ اسی طرح نوا اور آسا دری کو صبح کے وقت نہیں گایا جاسکتا یہ سورج ڈھلنے کے بعد یعنی دوپہر کے بعد گائے جاتے ہیں اور رات کی درمیانی شب کو بھی وہ اس لئے کیونکہ ان دونوں مقاموں کے دو سُر کومل ہیں یعنی گا اور نی۔ یہی انداز ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کا بھی ہے۔ صوفیانہ موسیقی کا مقام شہانی سورج غروب ہونے کے بعد گایا جاتا ہے۔ چونکہ اس میں

تعمیر

پنجم سُر ودھیت ہے (آروہی میں) لہٰذا وقت کی تعین نے اسے شام کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ بات کسی کی مقاموں میں "دھا" سُر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ مقام کے سفر میں اہم پڑاؤ کا کام دیتا ہے۔ کہیں کہیں "ما" سُر کو یا تو ترک کرنا پڑتا ہے یا اس کو آس پاس کے سروں کے ساتھ ملا کر گایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک خاص قاعدہ کلیہ کے تحت کیا گیا ہے۔

جہاں تک اس موسیقی کی ابتدا کا تعلق ہے کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی۔ ممکن ہے کہ یونانیوں کے توسط سے یہ یہاں پہنچی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیریوں کا ایک قبیلہ یونان میں آباد تھا اور انہوں نے ہی کشمیر واپس لوٹتے وقت اس موسیقی کو یہاں رائج کیا ہو۔ یا جس وقت سکندر اعظم ہندستان پر حملہ آور ہوا تو اسی دور میں اسے یہاں فروغ ملا ہو۔ یونانی سائنس دان فیثاغورث (۵۸۲ تا ۵۰۰ قبل مسیح) نے سُروں کے وقفوں کی نسبت ریاضی کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا۔ اور اس کی توجیہہ کو رومیوں اور عہد وسطیٰ کے موسیقاروں نے بھی تسلیم کیا۔ کچھ لوگ اس موسیقی کو ایرانی یا وسط ایشائی موسیقی کہتے ہیں اس لحاظ سے سلاطین کشمیر کے عہد میں اس کو یہاں رائج کیا گیا ہوگا۔ قیصر قلندر نے اپنے ایک مضمون "کشمیری موسیقی — ایک مطالعہ" میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر خالقی کا کہنا ہے کہ قدیم موسیقی ایران کے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور اس کی اصلی صورت کشمیر میں موجود ہے۔ انہوں نے چند ایسے مقام سُنے جن کے متبادل روپ ایرانی موسیقی میں بھی ہیں —"

اس موسیقی نے کشمیر میں بڑے بڑے استاد پیدا کئے ہیں۔ اُستاد رمضان جو اور استاد صمد جو کا گھرانہ خالق جو اور پھر استاد محمد عبداللہ تبت بقال اور کمال بٹ اور آج کے موسیقاروں میں غلام محمد قالین باف نے اس فن کی آبیاری کی ہے۔ ساز بجانے والوں میں امر جو نے ساز کو ایک نیا افق عطا کیا تھا —

اس موسیقی میں بجائے جانے والے ساز یہ ہیں۔ سنطور، کشمیری ستار۔ مدہم (ہندوستانی ستار) ساز اور طبلہ۔ سنطور اپنی ساخت کے لحاظ سے صوفیانہ موسیقار کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ سنطور کے تاروں کی آواز کو ساز اور کشمیری ستار کی آواز پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ موخرالذکر دو سازوں کی آواز سنطور کی آواز کے سامنے دب جاتی ہے۔ البتہ مدہم کی آواز سنطور سے زیادہ اونچی ہے۔ اسی لئے صوفیانہ موسیقار مدہم بجانے والے پر زور دیتا ہے کہ وہ ستار کے دو بولوں یعنی دا اور را میں سے صرف دا بول ہی بجائے تاکہ سنطور کی آواز کا اونچا پن قائم رہے۔ ایسی محفلوں میں چونکہ جگہ تنگ ہوتی ہے ورنہ ستاریئے کو چند قدم دور بٹھا کر سنطور کی آواز کو دبنے نہ دیا جاتا۔ آج کل ساز بجانے والا کوئی نہیں رہا ہے حالانکہ ساز کو صوفیانہ موسیقی میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ ساز ہے جو گز سے بجایا جاتا ہے اور اس میں تاروں کی آواز کا تسلسل ختم نہیں ہوتا۔ مشہور ساز نواز امر جو سنے ملی قہرلون کو ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وقت آئے گا جب صوفیانہ موسیقی کی محفلوں میں ساز بجانے والا کوئی نہ ہوگا۔ وہ ساز کے بغیر ان محفلوں کو آراستہ کریں گے لیکن ان میں وہ عنصر نہ رہے گا جو ساز بجانے سے ان محفلوں کو عطا ہوتا ہے۔

صوفیانہ موسیقی کا ایک اہم پہلو اس سے چھین لیا گیا ہے اور وہ ہے رقص — حصول آزادی سے قبل یعنی ۱۹۴۷ء سے پہلے رقاصائیں جنہیں کشمیر میں حافظہ کہا جاتا تھا اس موسیقی کی تزئین و آرائش اور اس کے حسن کو دوبالا کرتی تھیں۔ ان کی موجودگی سے محفل سماع پر رومانوی رنگ چھا جاتا۔ لیکن آج وہ ماحول نہیں رہا۔ کشمیری بچہ نغمہ ختم ہونے سے بھی چھکری کا رومانوی پہلو ختم ہو گیا۔

صوفیانہ موسیقی کے مقاموں کی انفرادیت نمایاں ہے۔ ان مقاموں کا

تعمیر

خود بھی ارتقاء نہیں ہوا ہے جس سے کبھی کبھی انسان کو چند پرانے گیت سننے سے اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے یا ان کے سروں کے نت نئے میل نہ سننے سے جل پیپی کا دائرہ محدود ہوکے رہ گیا ہے۔ صوفیانہ موسیقار اسے اپنی عظمت رفتہ کے اصلی پیکر میں موجود رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ یہ تمام فنون لطیفہ کی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ارتقائی مدارج طے کرے۔ اس موسیقی کو ترقی دینے کے کافی امکانات موجود ہیں۔ اس میں ہر مقام کے لئے موجودہ طرزوں کو ترک کئے بغیر نئی طرزیں بنائی جاسکتی ہیں نئی طرزوں میں نئے گیت کھپائے جاسکتے ہیں اور فارسی اشعار کے بدلے کشمیری گیتوں کو فوقیت دی جاسکتی ہے تاکہ عام لوگ بھی اسے محظوظ ہوسکیں اس موسیقی کے کئی مقام ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ مثلاً آسا وری، نٹے کلیان، بلاولگندار، توڑی، جھنجوٹی وغیرہ۔ ہندوستانی موسیقار کو ان مقاموں کو سن کر اپنی موسیقی کے ساتھ ان کی کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ صوفیانہ موسیقی کے مقاموں میں کچھ ایسے مقام بھی ہیں جن کی شوخی نمایاں نظر آتی ہے اور کچھ ایسے بھی جو زیادہ سنجیدہ پہلو پر مبنی ہیں۔ مثلاً جھنجوٹی میں شوخی ہے اور پوربی میں سنجیدہ پن۔ وسط ایشیا کے ممالک تاجکستان، ازبکستان اور یہاں منگولیا کے خطے میں اردگرد بھی انہی ناموں کی موسیقی گائی جاتی ہے مثلاً دوگاہ، سہ گاہ، نوا وغیرہ۔ یہ موسیقی اور صوفیانہ موسیقی کہاں تک ایک دوسرے سے میل کھاتی ہے اس پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ آج سے ایک دو دہائیاں قبل کشمیر کے مشہور افسانہ نویس اختر محی الدین نے سوویت روس سے مقام نوا کی ریکارڈنگ اور سٹاف نوٹیشن میں صدابند اس موسیقی کی ایک کتاب اپنے ساتھ لائی تھی جو کلچرل اکادمی کی لائبریری میں رکھی گئی تھی لیکن اب وہ وہاں موجود نہیں۔

●●

محمد شفیع سنبلی

اقبال انسٹی چیوٹ کشمیر یونی ورسٹی سرینگر

کشمیری زبان کا ارتقاء

کشمیری زبان کا خاندانی رشتہ آریائی زبانوں کے اُس خاندان سے ہے جسے "دردی" خاندان کہتے ہیں کشمیری زبان کی بنیاد اصل میں پشاچوں کی زبان پر ہے جو خود کشمیری تھے۔ پشاچ کون تھے اس پر تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔

کشمیر کے سب سے پرانے باشندے ناگ تھے۔ ناگوں کے بعد یہاں پشاچ آئے۔ پشاچ اصل میں آریہ ہیں۔ آریہ جب ایران پہنچے تو وہاں سے وہ مختلف جماعتوں کی صورت میں زمین پر بکھر گئے اور کچھ ہندوستان آگئے ایران میں کچھ وقت قیام کرنے کے بعد آریوں کی ایک جماعت ہندوکش اور پامیر کے راستے سے دردستان میں داخل ہوگئی۔ انہی آریاؤں کو پشاچ کہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر پشاچ اور ناگ آپس میں گھل مل گئے اور انہوں نے ایک نئے فلسفے کو جنم دیا جسے نیل مت کہتے

ہیں۔ بعد میں ناگ آہستہ آہستہ یہاں سے جانے لگے اور وہ گلگت کے اس علاقے میں بسنے لگے جیسے ہنزا اور نگر کہتے ہیں۔ گریرسن اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ گلگت کے ہنزا اور نگر میں بسنے والے لوگ ممکن ہے اُن لوگوں کے اجداد میں سے ہوں جو قدیم کشمیر کے باشندے تھے اور جو آجکل ایک غیر آریائی زبان بروشسکی بولتے ہیں۔ غرض پشاچ ہر لحاظ سے ناگوں پر غالب آگئے اور پشاچوں کی زبان آگے بڑھتی گئی۔ پشاچوں کا زمانہ ۱۵۰۰ ق م سے پہلے کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کشمیری زبان کی تاریخ اُتنی ہی قدیم ہے جتنی سنسکرت کی تاریخ ہے اور اس طرح سنسکرت اور کشمیری زبان ایک دوسرے کے متوازی چلی آ رہی ہیں:

"THAT THE DARDIC LANGUAGES ARE OF ARYAN STOCK IS ABSOLUTELY CERTAIN, THE QUESTION IS WHETHER WE ARE TO CLASS THEM AS IRANIAN OR INDIAN, OR AS FORMING A SEPARATE THIRD BRANCH BY THEMSELVES. I BELIEVE THAT THE LAST IS THE ONLY CLASSIFICATION WHICH WE ARE AT LIBERTY TO ADOPT."[1]

چونکہ پشاچوں کی زبان کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں اس لئے یہ معلوم نہیں کہ وہ زبان کیسی تھی لیکن تاریخی لحاظ سے یہ بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کشمیری زبان کا اصل پشاچ زبان ہی ہے۔

---

[1] لنگوسٹک سروے آف انڈیا جلد ۸ باب ۲ سر جارج ابراہیم گریرسن

اکثر ہند آریائی زبانیں "پراکرت" دور میں وجود میں آگئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کشمیری بھی "پراکرت" ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے البتہ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح دوسری ہند آریائی زبانیں پراکرت دور میں ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ گئیں اسی طرح کشمیری زبان نے بھی پراکرت دور کا خاصا اثر قبول کیا۔

قومی تاریخ کا جائزہ لیتے وقت اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ پشاچ جب درستان میں آباد ہوگئے تو جو آریا ایران سے براہ راست ہندوستان آئے تھے انہوں نے ہندوستان میں ویدک تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ انہی آریاؤں کی زبان کو سنسکرت کہا جاتا ہے۔ ہندوستانی آریہ مختلف وجوہات کی بنا پر کشمیر آنے لگے اور کچھ دیر کے بعد ان میں سے کیشپوں نے نیل مت قبول کیا اور یہیں کے ہوگئے۔ رفتہ رفتہ ان ہندوستانی آریاؤں کا غلبہ پشاچوں پر بڑھتا گیا۔ چوں کہ ہندوستانی آریاؤں کی زبان سنسکرت تھی اس لئے اس کا پشاچوں کی زبان پر خاصا اثر پڑ گیا۔ حتیٰ کہ "پراکرت" دور میں یہ اثر اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ کشمیری زبان کے بارے میں کہا گیا کہ یہ سنسکرت سے نکلی ہے جو حقیقت نہیں ہے۔

ہند آریائی زبانوں کے پراکرت دور اور کشمیری کے پراکرت دور میں بڑا فرق ہے۔ ہند آریائی زبانیں پراکرت دور میں ہی وجود میں آگئیں جب کہ کشمیری صرف اس دور میں دوسری زبانوں اور خاص کر سنسکرت سے متاثر ہوگئی۔ پراکرت علم لسانیات میں اس دور کو کہا جاتا ہے جب ہندوستان میں نئی زبانیں وجود میں آگئیں۔ پراکرت دور میں وجود میں آنے والی نئی زبانوں میں ادب تخلیق نہیں ہوا بلکہ یہ صرف بولی جانے لگی تھیں لیکن تاریخی شواہد گواہ ہیں کہ پراکرت دور سے قبل اور اس دور میں بھی کشمیری زبان اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے تھی

اور اس میں ادب تخلیق ہوا تھا۔ اس کی مثالیں "گند پتھہ" برہت کتھا وغیرہ کتابیں ہیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ پشاچی زبان میں لکھی گئی ہیں گریرسن اس بارے میں صحیح توضیح کرنے کے بعد لکھتے ہے،

"THE PISACHI WAS NOT A PRAKRIT IN THE USUAL SENSE OF THE WORD. IT WAS VERY ANCIENT LANGUAGE, A SISTER AND NOT A DAUGHTER OF THE FORM OF SPEECH WHICH ULTIMATELY DEVELOPED AS LITERARY SANSKRIT." [1]

پراکرتوں کا زمانہ ۵۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک کا مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہندوستانی زبانوں میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے "اپ بھرنش" کہا جاتا ہے۔ "اپ بھرنش" اُس دور کو کہا جاتا ہے جو ۱۰۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک کا ہے۔ قوی قیاس یہی ہے کہ دوسری ہند آریائی زبانوں کے مقابلے میں "اپ بھرنش" دور میں کشمیری میں خاصا ادب تخلیق ہوا ہوگا لیکن اس دور کے ادب کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک ہوا جیسا کہ پشاچوں کے وقت ہوا تھا کشمیری ادیبوں کو تحقیر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور اس کے علاوہ حکام کی عدم توجہی بھی کشمیری ادب کے محفوظ نہ ہونے کی ایک خاص وجہ بنی یہی وجہ ہے کہ اس دور کی کشمیری زبان کے خط و خال ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ کشمیر کی مستند تاریخ "راج ترنگنی" میں بھی کشمیری زبان اور کشمیری ادب کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ دوسری بات ہے کہ خود اس طرح یا میں بھی

---

[1] لنگوسٹک سروے آف انڈیا۔ جلد VIII پارٹ II سر جارج ابراہم گریرسن

تعمیر

کچھ کشمیری الفاظ ملتے ہیں۔ جن سے کشمیری زبان کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔

بہر حال کشمیری زبان کا پہلا مستند ثبوت ہمارے پاس تیرھویں صدی کا ہے۔ یہ ثبوت ایک کشمیری شاعر "شتی کنٹھ" کا شعری مجموعہ "مہانے پرکاش" ہے۔ شتی کنٹھ کی اس کتاب کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں چھپ گئی ہیں۔ البتہ غالب رائے یہی ہے کہ یہ اُس وقت کی کشمیری میں لکھی گئی ہے۔ 'شتی کنٹھ' کی شاعری پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت کی کشمیری زبان پر سنسکرت کا کتنا زیادہ غلبہ تھا۔ اس کتاب کی ساری زبان سنسکرت معلوم ہوتی ہے صرف کہیں کہیں کوئی لفظ کشمیری معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کی زبان ایسی ہے کہ اس پر مشکل سے ہی کشمیری کا گمان ہوتا ہے۔ اس طرح یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ بارھویں اور تیرھویں صدی کی کشمیری زبان زبردست سنسکرت آمیز تھی وہ آج کی کشمیری زبان سے بالکل مختلف ہوگی۔ جیسا کہ 'شتی کنٹھ' کی 'مہانے پرکاش' سے معلوم ہوتا ہے۔

اس کتاب میں جو سنسکرت آمیز عنصر ہے وہ بھی قدیم سنسکرت زبان ہے جو آج قریب قریب متروک ہو چکی ہے۔

'شتی کنٹھ' کے بعد کشمیری شاعری کا مستند ثبوت للہ عارفہ اور شیخ نور الدین نورانی کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ تیرھویں اور چودھویں صدی میں کشمیری زبان کی ساخت کیسی تھی ان کی شاعری اس بات کا بیّن ثبوت پیش کرتا ہے کہ تیرھویں اور چودھویں صدی کی کشمیری زبان کم و بیش ویسی ہی تھی جیسی کہ آج کی کشمیری زبان ہے۔ حالانکہ ان دونوں ہم عصر شعراء کی زبان میں بھی تھوڑا سا فرق ہے۔ للہ عارفہ شیو لوگنی تھی اس لئے اُن کے کلام میں سنسکرت آمیزی قدرے زیادہ ہی ہے۔ شیومت کی اصطلاحات جو للہ دید کے کلام میں

تھی جس میں زیادہ تر سنسکرت اصطلاحات ہوتی ہیں۔ شیخ العالمؒ کے زمانے میں[1] مسلمان کشمیر میں آنے لگے تھے اور یہاں قومیت کی جگہ ایک نیا فلسفہ "تصوّف" لے رہا تھا۔ تصوّف اسلامی فلسفہ ہے مسلمانوں کی وجہ سے یہاں فارسی کا رواج ہونے لگا۔ اس لئے شیخ العالم کی زبان پر سنسکرت کا زیادہ غلبہ نہیں ہے شیخ العالم کی زبان ایک ایسے مقام کی نشاندہی کرتی ہے جہاں سے سنسکرت کا اثر کم ہو جاتا اور فارسی کا اثر بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ لل دید اور شیخ العالم کی زبان اور موجودہ کشمیری زبان میں اگرچہ فرق ضرور ہے لیکن یہ زبان آج کی کشمیری زبان سے بہت مشابہ ہے۔

اس طرح یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ چودھویں صدی کی جو عوامی زبان تھی اُس پر فارسی کا غلبہ بڑھ رہا تھا اور اُس میں ایسے الفاظ کثرت سے آنے لگے تھے جو آج کی کشمیری زبان میں بھی موجود ہیں۔

ان دونوں شعراء کے بعد کشمیری زبان آہستہ آہستہ ارتقاء پذیر ہوئی۔

بڈشاہی دور میں کشمیری زبان اور زیادہ ترقی کر گئی۔ بڈشاہ چونکہ ادب نواز بادشاہ تھا اس لئے اُس نے سبھی ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح کشمیری ادیبوں کی رغبت کشمیری کی طرف ہوئی۔ کشمیری میں ادب لکھا گیا اور اس طرح زبان کو بھی مضبوطی عطا ہوئی۔ کوئی بھی زبان تب تک مضبوط اور پائیدار نہیں بن سکتی ہے جب تک اس میں قابل قدر ادبی سرمایہ موجود نہ ہو۔ اس وقت کی

---

1 گو کہ شیخ العالم اور لل دید کے زمانے میں کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں شعراء ہم عصر تھیں۔ لیکن فلسفے کی حد تک دونوں کے کلام میں نمایاں فرق نظر آتا ہے اس لئے ان کی زبان میں بھی تھوڑا فرق ہے۔

تعمیر

کشمیری زبان پر سنسکرت کے بدلے فارسی کا غلبہ بڑھ رہا تھا۔ فارسی زبان کا غلبہ اُس وقت اُکتا دینے والی حد تک کشمیری زبان پر ہو گیا جب صوفی شعراء نے کشمیری کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ڈوگرہ دور میں اردو چونکہ سرکاری زبان بن گئی اس لئے اردو کا رواج عام ہوا۔ اردو نے بھی کشمیری کو ایک خاص حد تک متاثر کیا اور اردو زبان کے الفاظ کشمیری میں آنے لگے۔

مہجور اور آزاد نے پہلی دفعہ اُس فارسی غلبے کو کم کرنے کی شعوری کوشش کی جس نے کشمیری زبان کو بوجھل بنا دیا تھا۔ انہوں نے صاف کشمیری زبان کو رواج دیا۔ مہجور اور آزاد کی زبان موجودہ کشمیری زبان کا روپ ہے۔ موجودہ کشمیری زبان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوگی کہ اس میں فارسی، اردو، انگریزی اور ہندی وغیرہ زبانوں کے الفاظ کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ زبانوں میں رد و قبول کا عمل فطری ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زبان خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی دوسری زبانوں کا اثر قبول کئے بنا نہیں رہ سکتی ہے اور یہی حال کشمیری زبان کا بھی ہے۔

میں نے کشمیری زبان کے ارتقائی منازل ادبی زبان کو بنیاد بنا کر متعین کئے کیونکہ کسی بھی زبان کی شناخت اُس کے ادبی سرمایے سے ہی کی جا سکتی ہے۔ ادبی زبان لکھی ہوئی ہوتی ہے اور زبان کی شناخت کا سب سے مستند ثبوت فراہم کرتی ہے کیونکہ ادیب بھی وہی زبان لکھتا ہے جو عام لوگوں کی زبان ہو۔ ہاں اتنا تو ضرور ہے کہ ادیب کی زبان میں تھوڑی سی لچک اور نفاست ہوتی ہے لیکن اُس کی زبان بھی عوامی زبان ہی ہوتی ہے۔

رشید راغب
درسو پلوامہ کشمیر

کشمیر —— رہن سہن اور رسم و رواج

قدیم زمانے سے کشمیریوں کے رسم و رواج اور رہن سہن میں جو انفرادیت قائم ہے اس کے نقوش اب بھی یہاں کے مختلف طور طریقوں اور طرز زندگی میں کسی نہ کسی طرح نمایاں ہیں۔ دوسرے اقوام کے وارد کشمیر ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں کی زندگی اور طریقہ کار میں اگرچہ تبدیلی آہی گئی پھر بھی کچھ خالص اور کشمیری الاصل تمدنی آثار یہاں کے لوگوں کے رہن سہن میں بلا لحاظ مذہب اب بھی ملتے ہیں۔ ایرانی آریوں کا خوردنی میں گوشت کا استعمال کرنا ہو یا ہند آریوں کی پوشاک کا طرز، بعد میں آنے والے ایرانیوں کا طرز زندگی میں گہرے چھاپ کا اثر ہو یا آج کل کے ہندی و مغربی رہن سہن کا یہاں کے رہن سہن میں دخل ہو پھر بھی کشمیریوں کی زندگی میں کچھ ایسی چیزیں نمایاں طور پر اب بھی موجود ہیں جو یہاں کے قدیم رسم و رواج اور طرز زندگی کی منعکس ہیں

پشاچوں اور ناگوں کی مڈبھیڑ کے دوران ہی یہاں کے باشندوں کی گھریلو

زندگی میں مختلط طریقے سے کچھ ایسی تبدیلیاں آئی تھیں جن کا انکشاف نیل مت پران کے قدیم تاریخی شہادتوں سے ہوتا ہے۔ نیل ناگ کی مدد سے جب قدماء نے عبوتوں اور راکھشسوں سے چھٹکارا پایا تو ان کا تصور پھر بھی ان کے دلوں میں قائم رہا اور انہیں راکھشسوں کی خوشنودی کے لئے کچھ رسوم اپنی زندگی میں لانے پڑے تاکہ اپنی زندگی آرام و آسائش سے گزاریں۔ کھیچڑ ماوس، گاڈ بتہ، کاو پُنیم وغیرہ رسمیں انہی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اب بھی منائی جاتی ہیں۔ یہ تینوں چیزیں ہندوؤں کے رسوم میں اب بھی موجود ہیں اور موسم سرما کے دوران ادا کی جاتی ہیں۔ ان رسوم کا مختلف ادوار کے گزرنے کے بعد بھی موجود رہنا لوگوں کی توہم پرستی، ان کے نفسیاتی رویے کا غماز ہے۔ لوگوں کے اسی نفسیاتی رویے اور ان کے معتقدات کو مد نظر رکھتے ہوئے جب قدیم کشمیری رسوم و رواج پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ بھی صاف طور پر عیاں ہے کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لئے ان توہمات میں کچھ اضافہ ہی کیا جس کی بنا پر لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں اب بھی ان کا زبردست اثر ہے۔ اگرچہ شہروں کی تیز رفتار زندگی میں ان توہمات کا اثر قدرے کم ہوا ہے پھر بھی یہاں کی دیہی زندگی کو اس ضمن میں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

"THE PANDIT AND THE PEER HAVE STRIVEN HARD TO MAKE HIM SUPERSITITIOUS AS WELL. THE RESULT IS THAT MYSTICISM AND SUPERSITITIONS ARE NOW INGRAINED IN THE NATURE OF KASHMIRI." G.M. SOFI — "KASHEER" PAGE 191

تعمیر

بیماری یا ناگہانی آفتوں سے چھٹکارا پانے کے لئے بھیڑ کی قربانی دینا، کام پر نکلتے وقت کسی ایسے شخص کا منہ دیکھ کر واپس موڑنا جس کے متعلق بدشگون ہونے کا وہم ہو ـــ انہی لوگوں کی دین ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کشمیری پہلے سے "الو" کوا اور چیل جیسے قدرت کے بنائے ہوئے پرندوں کو بدشگون سمجھتے تھے جب کہ بلبل جیسے کچھ پرندوں کو نیک شگون ہونے کی علامت تصور کرتے تھے۔ لیکن آج اس سائنسی دور نے ان چیزوں کو معدوم کر رکھا ہے۔

کشمیر ایک بالائی علاقہ ہے۔ جس کی بنا پر ابھی تک یہاں کا ماحول فطری حسن کا دیرپا منظر پیش کرتا ہے۔ کڑاکے کی سردی نے گرم کپڑوں کانگڑی اور پلہور کے افادی پہلوؤں کی سالمیت کو برقرار رکھا۔ پلہور (شالی کے گھاس کی بنی ہوئی جوتی) کا رواج اگرچہ اب دقیانوسی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ کشمیریوں کی پسماندگی اور سادگی کی نشانی بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان دنوں پلہور کشمیر کے بالائی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے ہاں شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ البتہ سرینگر کے آرٹ دوکانوں کی زینت میں ان کی اصلی صورت باقی ہے۔ کانگڑی نے یہاں کے رہن سہن میں اپنی جڑیں مستحکم کر رکھی ہیں۔ کانگڑی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ مغل دور حکومت میں ہی یہاں ایجاد کی گئی ہے لیکن جب ہم تاریخ اور کشمیری ماحول کا مطالعہ کرتے ہیں یہ خیال محض قیاس آرائی ثابت ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے اس کی ہیئت میں وقتاً فوقتاً تبدیلی لائی گئی ہو۔ کیونکہ کانگڑی کا ایک ابتدائی روپ اب بھی ہمارے پاس "منن" کی صورت میں موجود ہے جو صرف مٹی کے خام مواد سے تیار کی جاتی ہے۔ "منن" کا دوسرا نام کنگ بھی ہے جو لفظ کانگڑی سے قربت رکھتا ہے۔ 'کھراو' کو بھی اس ضمن میں فراموش نہیں کیا جا سکتا

کھڑاو (کلاہی کی بنائی ہوئی چپل جو دو ڈھائی انچ سے لیکر پانچ انچ تک بھی موٹی ہوتی ہے)
کی نزاکت دیکھ کر کشمیری شاعروں نے اسے استعاراتی معنوں میں استعمال کیا ہے۔
کشمیر کے رہن سہن میں پھیرن کا اپنا حق اب بھی محفوظ ہے پھیرن دراصل پیرہن کے
ہم پلہ بن کر اپنا وطن ایمان جتاتا ہے پھر بھی پھیرن کی انفرادی ساخت اور ہیئت اسے
پیرہن سے مختلف بنا دیتی ہے۔ پیرہن سے ملتا جلتا سا چوغہ کشمیریوں کے پوشاک میں ڈ
نچکا ہے۔ ساتھ ہی دوسرے کپڑے جو استعمال میں لائے جاتے تھے۔ لنگی، کرتہ اور کھب
تھیں۔ جو زیادہ تر ہندو لوگ استعمال کرتے تھے۔ وضع کے اعتبار سے پنڈتانیوں کے
پیرہن میں ذرا سا فرق رہا ہے جو اب بھی یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ قدیم زمانے
سے جو لباس کشمیریوں میں عام تھا اس کا ذکر تاریخ حسن میں یوں درج ہے:۔

در دور دیرینہ مردمان کشمیر در تابستان
و زمستان سراپا کسوت پٹو پنج لباس می
پوشیدند۔ کرتہ۔ پاجامہ۔ درمہ۔ کاشن۔ لنگی

صفحہ ۴۵۲ جلد اول

قدیم زمانے سے لوگ چھت والے مکانوں کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ اگرچہ ہمارے سامنے زمانہ قدیم کے مکان یا اُن کے آثار موجود نہیں ہیں پھر بھی قدیم مندر اور خانقاہوں پر ایسے چھتوں کے آثار اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ دو طرفہ یا چہار طرفہ چھت کی تعمیر کے ساتھ غریب طبقہ یک طرفہ اور دو طرفہ چھت بناتے تھے جن پر صرف گھاس ہوتی تھی اور کہیں یک طرفہ چھتوں پر مٹی کی موٹی تہہ ہوتی تھی جس پر گھاس کے بیج لیٹے جاتے تھے تاکہ پودوں کی جڑیں زمین کو مضبوط بنائے رکھیں۔
عام طور پر دو منزلہ سہ منزلہ اور یک منزلہ مکان تعمیر ہوتے تھے۔ ان کی تعمیر

تعمیر

میں ملاوی کا خاصا استعمال ہوتا تھا۔ دیہات کے مکانوں کی طرز پر حسن کھویہامی رقم طراز ہیں۔

• در اطراف دہات خانہای دو طبقی و سہ طبقی از خشت خام اکثر تعمیر می سازند کہ در طبقہ سفلی چہارپاو در طبقہ اوسط بود وباش شود و در طبقہ بالا اسباب زمستانی واثاثات می گذارند وبام ہا راخس و پوش می سازند "۔

صفحہ ۳۸۲ جلد اول

صنعت و حرفت کے لحاظ سے لوگ طبقوں میں بٹے ہوئے تھے اور قومی زندگی میں برابر کے شریک تھے۔ صنعت و حرفت میں لوگ دو طبقوں میں منقسم تھے۔ ہندوستانی رسم و رواج کے اثرات کی بنا پر یہاں کی ہندو آبادی میں ذاتوں کا تصور اُجاگر ہونے لگا۔ جب کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس تصور میں خاصی کمی واقع ہوئی کسان۔ ملا۔ کاروباری لوگوں کو چھوڑ کر نجار، آہنگر، گلکار، کمہار، قصاب، زرگر، شیر گوجری ایک ہی طبقے میں گنے جاتے تھے۔ اور دوسرے طبقے میں ہانجی، گاوان، چوپان وغیرہ شمار کئے جاتے تھے۔ ان پیشہ وروں کی طرز زندگی کسی حد تک جزوی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ میل نہ کھاتے ہوئے بھی ایک ہی ہے۔

رقص و موسیقی کشمیریوں کے رگ وپے میں پہلے ہی سرایت کر چکی ہے تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہم ایسے ٹائیلوں اور پتھروں پر کندہ تصویروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ جن پر رقاصوں اور موسیقاروں یا گلوکاروں کی تصاویر کندہ ہیں۔ خاص طور پر رقص کشمیر کے قدیم مذہبی رسوم میں باقاعدہ طور پر تعمیر

شامل تھی ۔ دورِ سلاطین میں اس کا عام ہونا خود اس کی ضمانت ہے ۔ اگر ہم آج بھی رہن سہن میں ناچ کو دیکھیں تو دمالی (لوک ناچ) قدم لڑکھڑاتے دکھائی دے گی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسم و رواج اور رہن سہن ہی وہ چیزیں ہیں جو قوموں کو ورثے میں ملتی ہیں لیکن اس سائنسی دور میں جب مغرب اور مشرق کا ایک دوسرے کے نزدیک کھڑا کیا جا رہا ہے اور قوموں کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا ہے ۔ مغرب میں رہنے والا مشرقی کے تمدن و رنگ پر رشک کر رہا ہے اور مشرقی مغرب کے سامنے پہیلیاں بجھوا رہا ہے ـــــ رہن سہن اور رسم و رواج میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ۔ آج کشمیر میں وہ توہم پرستی نہیں ہے جس کا یہاں کبھی بول بالا تھا ۔ سائنس نے اُن پر کب کا پانی پھیر دیا ۔ رہن سہن کے پُرانے طریقے معدوم ہو چکے ہیں کیونکہ اقتصادی ترقی نے کایا ہی پلٹ دی ہے ـــــ مگر پھر بھی رہن سہن میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو تبدیلی کے ساتھ ساتھ متبادل صورت اختیار کر کے کسی اور روپ میں ظاہر ہوئی ہیں یا آہنی فصیلوں کی طرح اپنی جگہ قائم و دائم ہیں ۔ کشمیری رہن سہن میں موجود ایسی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ پیرہن کا مختلف وضع اختیار کر کے بھی زندہ رہنا، ہر لیسہ کا اپنی حیثیت برقرار رکھنا، موسم بہار میں بادام واری کی پُر فضا جگہ پر رقص و سرود اور روایتی تفریحی محفلیں منعقد کرنا، سرمائی کھیل جو کبھی صرف یہاں کے لوگوں کی تفریح کا باعث تھے اب بھی اجتماعی اور قومی سطح پر کھیلے جانے کا روپ دھارنا وغیرہ وغیرہ اس ضمن میں کچھ اہم مثالیں ہیں ۔ اس طرح کشمیریوں کے رسم و رواج اور رہن سہن میں اگر کوئی تبدیلی آج دکھائی دے رہی ہے وہ جزوی ہے کلی نہیں ۔

کاچو سکندر خان

لداخ ـــ ریاست کی ایک تہذیبی اکائی

جب کسی ملک یا خطۂ ملک کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک تہذیبی اکائی ہے۔ تو ذہن بآسانی فرض یہ کرلیتا ہے کہ اُس ملک میں انسانوں کی ایک ایسی جماعت بستی ہے جو اپنے قومی کردار اور اپنی نمایاں قومی خصوصیات سے پہچانی جاتی ہے اور وہ ملک جو نامعلوم زمانوں سے اُس قوم کے فکر و عمل کی جولانگاہ رہا ہے۔ جغرافیائی حدود سے محدود ہے۔

اس تعریف کے رُو سے لداخ ـــ سطح مرتفع تبت کا وسیع مغربی خطہ جسے نائٹ نے "ویسٹری امپائرس ہیٹ" کا اور اُنیسویں صدی عیسوی کے بعد کے تمام یورپی محققین نے مغربی تبت کا نام دیا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کی متعدد تہذیبی اکائیوں میں سے ایک ممتاز اکائی ہے۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ کیونکہ خود لداخ کے شکم میں کچھ تہذیبیں ایسی موجود ہیں۔ جو عام لداخی تہذیب سے مختلف ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہونی چاہیئے کہ دُنیا کی دوسری بڑی تہذیبوں کی طرح لداخی تہذیب بھی بہت قدیم اور بہت متنوع ہے۔ لداخیوں کی قومی تاریخ تخمیناً ڈھائی ہزار سال کے زمانے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور یہی عمر ان کی تہذیب کی بھی ہونی چاہیئے۔ جس کے خمیر میں بے شمار تحریکوں اور انقلابوں بے شمار تواریخی واقعات اور تعمیر

بے شمار انسانوں کے جذبات و احساسات کے زیر و بم اور مخصوص جغرافیائی حالات کا
اثر پوشیدہ ہے۔ ان حقائق کو سمجھنے کے لئے اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس تہذیب
کو موجودہ شکل تک پہنچنے کے لئے تعمیر و تشکیل کے کن پُر پیچ راستوں سے گذرنا پڑا ہے
لداخ کی قدیم تاریخ کا جاننا ضروری ہے۔

آثار و قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ لداخ آج سے ڈھائی تین ہزار
سال پہلے غیر آباد جنگل تھا جب کہ اس کے پڑوسی ملک ـــــ مشرق میں تبت
مغرب میں دردستان (گلگت) شمال میں سلسلۂ کوہ قراقرم کے آر پار ترکستان اور پامیر
کے علاقے اور جنوب میں مغربی ہمالیہ کے دامن میں واقع مونوں کی بستیاں اور ہماچل کے
علاقے ــ آباد تھے۔ جب ان ملکوں میں زرعی زمین اور چراگاہوں پر انسانی آبادی کا بوجھ
بڑھنے لگا۔ تو وہاں کے کچھ باشندے بہتر زمین اور بہتر ذرائع معاش کی تلاش میں (اکا دکا
یا قبیلوں میں) وطن سے ہجرت کر کے مختلف سمتوں سے اطراف میں پھیلنے لگے۔ اور
پھرتے پھراتے مغربی تبت کی طرف آ نکلے اور اس کی غیر آباد وادیوں یعنی موجودہ زانسکار،
پوریگ، بلتستان وغیرہ میں بس گئے۔ کچھ آگے، لداخ خاص (ستوت مرول اور شم) کی
طرف بڑھے اور وہاں آباد ہو گئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں سب سے پہلے دردستان کے
لوگ (یعنی درد قوم کے لوگ) آئے۔ جو آریہ نسل سے تھے۔ ان کا مذہب غالباً بون مت
تھا جو تبت کا قدیم ترین مذہب تھا اور تبت سمیت کئی ملکوں (گلگت، ترکستان)
میں رائج تھا۔ یہ لوگ درد تہذیب کے علمبردار تھے۔ جو قدیم دردستان کی قومی تہذیب
تھی اور جس میں آریائی تہذیب کی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ زبان ان کی "شنا"
کی ایک قسم تھی جس میں فارسی اور سنسکرت کے بہت سے الفاظ شامل تھے۔ مثلاً خر،
اسپ، گھی، دودھ وغیرہ۔ یہ لوگ قبائلی زندگی بسر کرتے تھے اور قبائل میں منقسم تھے
انہوں نے بہت سی بستیاں بسائیں اور دفاعی اغراض کے لئے پہاڑوں کے اوپر قلعے

بھی

بنانے۔ رفتہ رفتہ ان کے بہت سارے طائفے یہاں پہنچنا شروع ہوئے اور یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ چنانچہ ان کا آخری قافلہ اس زمانے میں وارد ہوا جب کہ اسکردو (بلتستان) میں مقپون خاندان کی حکومت کو قائم ہوئے بہت عرصہ گزر چکا تھا جس کا بانی سلطان ابراہیم (تیرہویں صدی عیسوی) تھا۔ یہ لوگ موجودہ دیہات داہ ہنو، گرکون درچکس، گتسونغ وغیرہ میں آباد ہوئے۔ ان کا مذہب بھی بون مت جو لہا چھوس یعنی چھوس یا لنگ چھوس وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ تھا۔ یہ لوگ آج تک اپنی آبائی تہذیب پر ہیں۔ جو عام لداخی تہذیب سے کافی مختلف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد دردستان کے خطہ بولور (بلور) میں آباد تھے جس پر مرزا حیدر گورگان سپہ سالارِ سلطان سعید خانی کاشغر (سولہویں صدی عیسوی) نے حملہ کیا تھا۔ اسی طرح دراس کے لوگوں جن کے اسلاف دردستان کے علاقہ چیلاس (متصل ننگا پربت) سے بتلائے جاتے ہیں۔ کی تہذیب بھی تمام لداخی تہذیب سے کسی قدر مختلف ہے۔ اگرچہ ان کے اسلاف کو دردستان سے ہجرت کیے۔ بارہ سو سال سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے۔

جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا۔ موخر الذکر دو قبائل کو چھوڑ کر باقی تمام درد قبائل (ابتدائی مہاجرین) جو بہت پہلے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ تبتی اور مون نسلوں کے لوگوں میں گھل مل گئے۔ اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتوں میں منسلک ہوتے گئے جس کے نتیجے میں ان کی تہذیب بھی بدلتی گئی۔

ابتدائی درد قبائل کے بعد بالتقریب ساتھ ساتھ مغربی ہمالیہ کے دامن میں بسنے والی مون قوم اور تبتیوں (منگول نسل کے لوگوں) سے بھی بہت سے قبیلے ستوت مریول (بالائی لداخ) اور زانسکار میں آکر آباد ہوئے۔ مون قوم کے لوگ نسلاً آریہ اور مذہباً بودھ تھے۔ انہوں نے قدیم ہندوستانی بدھ ازم کا پرچار کیا۔ جگہ جگہ معبد تعمیر کیے اور سٹوپ

تعمیر

پر کئے گئے جبکہ تبتیوں نے زیادہ تر بالائی لداخ کے بالائی حصوں اور پوریگ میں بستیاں بسائیں اور رفتہ رفتہ واکھا، ملیک اور سورو کرچے میں اپنی حکومت قائم کی جس کا مرکز سوکر تھا۔ نیاگون گیاپوئے پوراتگ کا اثر لداخ تک پہنچا۔ اس کی اولاد نے شے میں حکومت قائم کی اور لداخ بشمول شم پر حکومت کرنے لگی۔

لداخ اور پوریگ میں مونوں اور تبتیوں کا دردوں سے مسابقہ پڑا۔ ابتداء میں قومیت کے جذبے کے تحت تینوں اقوام ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کی فکر میں رہنے لگیں۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ چراگاہوں اور زرعی زمینوں کی تقسیم سے متعلق جھگڑوں کے نمٹانے اور معیشت کی تمام ترقی کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنے کی ضرورت کے احساس نے انہیں ایک دوسرے کے قریب آنے اور باقاعدہ تمدنی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا اور تینوں اقوام کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے اور دوسری قومیت کے تعلقات قبول کرنے لگے اور اس طرح باہم نسلی اختلاط شروع ہوا ـــــــ موجودہ لداخی نسل اسی نسلی اختلاط کے نتیجے میں ایک نئی نسل کے روپ میں وجود میں آئی ہے۔ چنانچہ اس کی رگوں میں دنیا کی تین بڑی نسلوں یعنی مون، منگول اور آریہ نسلوں کا خون دوڑ رہا۔ اور اس کے دل و دماغ میں تین بڑی تہذیبوں کی روح کارفرما ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتداء میں تہذیبوں کا ٹکراؤ رہا ہوگا۔ لیکن نسلی اختلاط نے اسے بہت حد تک مٹا دیا ہوگا۔ اور جو اختلافات باقی رہے ہوں گے۔ انہیں تعلق ہم مذہبی نے ایک دوسرے کے لئے گوارا اور قابل قبول بنا دیا ہوگا۔ دردوں اور تبتیوں کا ابتدائی مذہب بون مت تھا۔ لیکن بون مت کا اثر چند صدیوں میں ختم ہوا اور اس کی جگہ بدھ ازم نے لے لی۔ مون قوم کے لوگ ابتداء سے بدھ ازم کے پیرو تھے۔ چنانچہ بون مت کے خاتمے کے بعد پورا لداخ بدھ ازم (کی مختلف شکلوں) کا پیرو تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے لداخ کو جب ہم اس پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ تو اس کے تمام خطوں

بحیثیت قومی، مذہبی اور تاریخی وحدت کا ارتقا الگ الگ ہے۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ چودہویں صدی اور پندرہویں صدی عیسوی میں جب حضرت شاہ ہمدان رح حضرت سید محمد نور بخش اور حضرت میر عراقی اور ان کے بعد کے مبلغین کی کاوشوں سے بلتستان میں اور پوریگ و لداخ خاص کے بعض حصوں میں مذہب اسلام پھیلا تو اس انقلاب نے ان خطوں کی تہذیب سے لامائیت کا عنصر بہت حد تک زائل کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے عرب و عجم کی تہذیب سے روشناس کر کے اس کمی کا ازالہ بھی کر دیا۔ باایں ہمہ علم تہذیبی وحدت تمام خطوں ـــ بلتستان، پوریگ، زانسکار و لداخ خاص ـــ کی بدستور قائم رہی اور آج تک قائم ہے۔ مذہبی انقلابات اور مذہبی تحریکیں خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے رہا ہو، انہیں ان کے قومی ورثہ ـــ رسم و رواج، ادب، دیومالاؤں قصے کہانیوں، گیتوں، رقص و سرود کی روایات، فنون لطیفہ، لباس، خوراک، پیشوں قومی روایات، تاریخ، باہمی رشتوں، میلوں، تہواروں، کھیل تماشوں، سماجی ڈھانچوں اور قدروں جو کسی ملک کی تہذیب کے خطوط بنیادی ہیں ـــ سے محروم نہ کر سکیں۔

تبتیوں کی بلتستان میں آبادی کے ضمن میں، میں یہ کہنا بھول گیا ہوں کہ جہاں تک بلتستان کا تعلق ہے بعض محققوں کا خیال ہے کہ اس خطے کے باشندوں یعنی بلتی قوم کا تعلق اس بڑے نسلی اور لسانی گروہ سے ہے۔ جو بہت قدیم زمانوں میں ملک چین کے آس پاس تانگیوت نامی خطے میں آباد تھا اور وہاں سے ہجرت کر کے ترکستان میں آباد ہوا تھا۔ بعد ازاں ترکستان سے بھی ہجرت کر کے دو گروہوں میں تقسیم ہو کر آگے بڑھا۔ ایک گروہ تبت کی طرف چلا اور تبت میں آباد ہوا اور دوسرا گروہ قراقرم کو عبور کر کے بلتستان میں وارد ہوا۔ بلتیوں کا تعلق موخر الذکر گروہ سے ہے۔ زبان دونوں گروہوں کی تبتی تھی۔ یہ واقعہ بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بلتیوں کی تہذیب قدیم تبتی تہذیب سے ہم آہنگ ہے اور زبان بھی تبتی ہے۔ موجودہ لداخی تہذیب جس میں تبتی تہذیب کا عنصر غالب ہے

تبتی تہذیب سے غالباً اسی بنا پر ہم آہنگ ہے۔

لداخی تہذیب میں جو جزوی علاقائی اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ بعد کی پیداوار ہے اور زیادہ تر بیرونی اثرات کا نتیجہ ہے۔ جو قدیم راجگان و سلاطین کشمیر اور مغل بادشاہوں کے حملوں، ترکمانوں اور تبتیوں کی یورشوں، ہندوستانی و کشمیری بدھ بھکشوں کی مذہبی تحریکوں، شاہ ہمدان رح اور ان کے رفقاء اور شاگردوں کی تبلیغی سرگرمیوں اور قدیم لداخ کے ہمسایہ ممالک کے ساتھ سیاسی، مذہبی اور تجارتی تعلقات کے نتیجے میں اس ملک میں پہنچتے رہے ہیں۔ اسی طرح بون مت نے بھی اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ بون مت کی قدیم کتابوں میں مہابھارت کی لڑائی کا ذکر ہے۔ اس طرح لداخ متعدد بڑی تہذیبوں کا خوشہ چین بنا۔ چنانچہ لداخی اپنے گیتوں میں جہاں خود اپنے اسلاف کے کارناموں اور عروج و زوال کی داستان سنتے ہیں۔ وہاں ہندوستان کے موروں، ہاتھیوں اور سمندروں کشمیر کی جھیلوں، جنگلوں، چناروں اور کشتیوں اور رشیوں اور ولیوں، دردستان کے قدیم قومی ہیروؤں اور جنگجو قبائل، تبت کے گمپوں، لاماؤں، خانہ بدوشوں، جنگلی یاکوں گورخروں، غزالوں اور صحراؤں اور ترکستان کے گھوڑوں، قالینوں اور تاجروں کے تذکرے بھی سنتے ہیں۔ ایسی ہی وسعت ان کے قصے کہانیوں اور دیومالاؤں میں بھی ہے قصے کہانیوں میں زیادہ تر ملکی ماحول ہے۔ تاہم ایسی کہانیوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ جن میں نامانوس ملکوں مثلاً مصر، ایران، یونان، بدخشان، گیاغر (ہندوستان) وغیرہ کا ماحول پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رزمیہ داستانوں اور ساگاؤں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ مثلاً کیسر ساگا کا ماحول قدیم تبت و لداخ ہے۔ "لوالی سو" کا ماحول قدیم بلتستان و دردستان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں بہت کم قومیں ایسی ہوں گی جنہیں ایسی رنگین تہذیب ورثے میں پانے کا اتفاق حاصل ہوا ہو جیسی کہ لداخی تہذیب۔

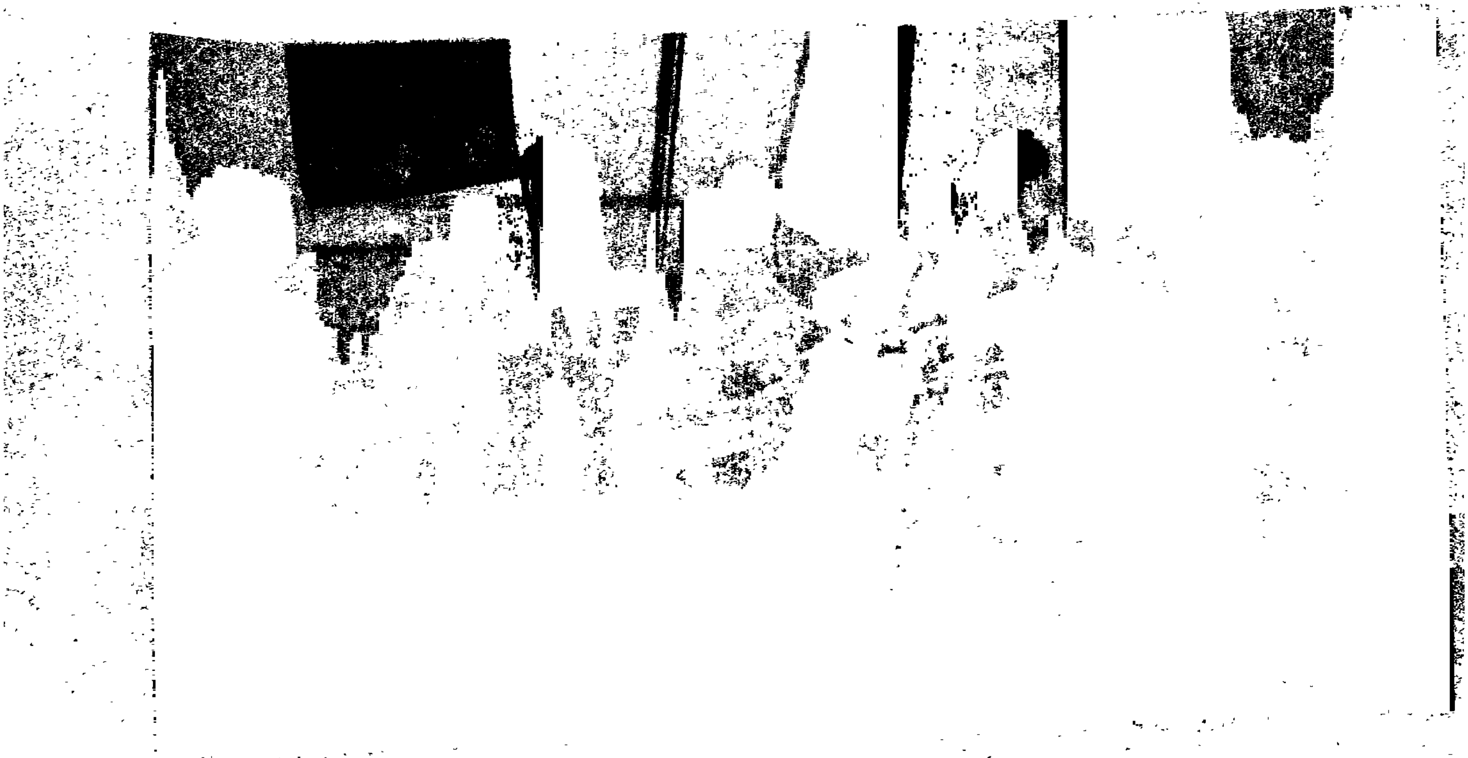
آج لداخ کے بارے میں ریڈیو سے جو کچھ نشر ہوتا، ٹیلی وژن پر جو کچھ دکھایا

تعمیر

جاتا۔ اور اخبار و جرائد اور کتابوں میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اور ملکی و غیر ملکی ادیبوں، سیاحوں اور مورخوں اور محققوں کی زبان و قلم سے جو فقرے نکلتے اور مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر اس کی اسی مشترک تہذیب کی گونج اور اسی نگینے کے تراشے ہوتے ہیں دنیا اسے لداخی تہذیب کے نام سے یاد کرتی ہے اور اس بات کی معترف ہے کہ برف پوش پہاڑوں کے دامن میں پلنے والی یہ رنگین تہذیب صدیوں سے دنیا کو اخلاص و محبت سادگی، ایمان و دوستی، مذہبی رواداری اور قومی یک جہتی کا درس دیتی آئی ہے جس کی بدولت عظیم بھارت کی سینکڑوں تہذیبی اکائیوں میں اس نے اونچا مقام حاصل کیا۔ ہے۔ اتنا اونچا جتنا اس کا جنم بھومی (لداخ) سطح سمندر سے اونچا ہے۔



وزیر تعلیم مسٹر علی محمد نائک، گورنمنٹ گرلز ہائی سکول گاندھی نگر جموں کے سالانہ دن پر



سرینگر میں شہریوں کی مشاورتی کمیٹی کا اجلاس۔ تصویر میں وزیر اعلیٰ کے ساتھ وزیر خوراک مسٹر حسام الدین بانڈے
ڈویژنل کمشنر کشمیر اور ڈائریکٹر جنرل پولیس بھی دیکھے جا سکتے ہیں

عبدالغنی شیخ

معرفت عبدالعزیز بٹھو کا منزل، لیہ (لداخ)

لداخی زبان تاریخ اور تخلیق کے موڑ پر

لداخی زبان اور ادب کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری ہے کہ لداخ میں بھوٹی سے مراد کلاسیکی تبتی زبان بھی لی جاتی ہے۔ لداخ میں کلاسیکل تبتی کو بودھی کہا جاتا ہے۔ یہاں تبتی اور لداخی دونوں زبانیں مُروّج ہیں۔ تاہم کلاسیکل تبتی کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کبھی سنسکرت کو تھی۔ یہ خواص اور لاموں تک محدود ہے جبکہ لداخی عوام کی زبان ہے۔ ان دونوں زبانوں کا فرق جاننا ضروری ہے۔

صدیوں پہلے کلاسیکل تبتی لداخیوں نے ادبی، علمی اور تہذیبی زبان کی حیثیت سے قبول کی تھی اور آج بھی کم وبیش اس پر قائم ہیں۔ اس زبان کا مذہبی، ادبی اور علمی سرمایہ تبت اور لداخ کے علاوہ سکم اور بھوٹان کی مشترکہ میراث ہے۔

لداخی زبان لداخیوں کی مادری اور بول چال کی زبان ہے۔ یہ زبان گھر کی چار دیواری، بس سٹینڈ، دکانوں، گلی کوچوں اور ہر جگہ بولی جاتی ہے۔ اس کا اپنا لوک ادب ہے

میڈیائی ذرائع، بات چیت اور دوسرے پروگرام لیہہ ریڈیو اسٹیشن سے ایسی زبان میں نشر ہوتے ہیں۔

لداخ میں دردی، ڈروپا اور تبتی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ ان کی اپنی بولیاں DIALECTS ہیں تاہم سبھی لداخی سمجھتے اور بولتے ہیں۔ تبتی اور لداخی زبان میں گہری مماثلت ہے۔

کلاسیکل تبتی اور بول چال لداخی کے علاوہ لداخی کی تحریری زبان کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ کلاسیکل تبتی اور لداخی کا معجون مرکب ہے۔ اکثر لداخی ادیب اس زبان میں لکھتے ہیں اور لداخی درسی کتابیں اس زبان میں شائع ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر سنیوگتا کوسل کے الفاظ میں یہ نہ خالص لداخی ہے اور نہ کلاسیکل تبتی بلکہ A KIND OF TIBETAN INFLUENCE LADAKHI یعنی تبتی سے اثر پذیر زبان ہے۔

ڈاکٹر سنیوگتا پہلی محقق خاتون ہیں جنہوں نے بول چال لداخی کا سیر حاصل ریسرچ اور تجزیہ کیا ہے اور اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں بول چال لداخی کی لغت اور گرامر شامل ہیں۔

مصنفہ نے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز میسور کے اہتمام سے ۱۹۷۰ کی دہائی میں قبیلوں اور سرحدی علاقوں کی زبانیں سیکھنے کے پروگرام کے تحت لیہہ میں لداخی بول چال کی زبان پر ریسرچ کیا۔ اس سے پہلے رمزے، فرانکی اور دوسرے کئی یورپیوں نے بول چال لداخی کا سرسری طور تجزیہ کیا ہے۔

اب ہم مذکورہ لسانی مسائل کے تینوں پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔

تعمیر

لداخ میں کلاسیکل تبتی کیونکر مروج ہوئی۔ اس کے لئے لداخ اور تبت کی تاریخ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

تبت اور لداخ کے درمیان زمانہ قدیم سے تعلقات رہے ہیں۔ خاص طور پر پچھلے ایک ہزار سال میں تبت نے مذہبی اور ثقافتی معاملوں میں لداخ کی رہبری کی ہے۔ لوگوں کے رہن سہن، پوشاک اور خوراک پر تبت کا گہرا اثر پڑا ہے۔ تبت میں وقتاً فوقتاً جو مذہبی تحریکیں چلیں۔ لداخ نے براہ راست ان کا اثر لیا ہے لداخ سے لامے مذہبی تعلیم کے حصول کے لئے تبت جاتے تھے۔ تجارت میں تبتی حکومت نے لداخ کو خاص مراعات دی تھیں۔ ان تمام اثرات میں کلاسیکی تبتی کا اثر نمایاں ہے۔ کلاسیکل تبتی، لداخی اور بول چال تبتی کا ایک ہی رسم الخط ہے۔ جیسے ساتویں صدی میں ایک تبتی عالم تھونمی سمبھوٹا نے سنسکرت رسم الخط سے لیا تھا اور تبتی ماحول اور زبان کے مزاج کے مطابق اس میں ردو بدل اور اضافہ کیا تھا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تبتی بول چال اور لداخی بول چال ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دونوں میں متعدد مشترک الفاظ بھی ہیں لیکن یہ زبان ایک دوسرے کو سمجھ نہیں آتی۔

کلاسیکل تبتی کا اثر ادیبوں اور مذہبی حلقوں تک محدود رہا۔ اور یہ عوام میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکی۔ اس کے باوجود اس زبان کو لداخ کی تمدنی اور مذہبی زندگی میں گہری افادیت حاصل ہے خاص طور پر لداخ کے بودھوں کا مذہبی اور علمی خزینہ اسی میں محفوظ ہے۔

سنسکرت کی سینکڑوں ہزاروں کتابوں کا کلاسیکل تبتی میں ترجمہ ہوا ہے۔ ان میں مذہبی صحیفے شامل ہیں جو تبت، سکم، بھوٹان اور لداخ کے بودھوں

کا ذخیرہ شدہ ہیں۔ ان صحیفوں میں کنگیور (دینیا) کی ۱۰۸ جلدیں اور ستنگیور (شرح) کی ۲۲۵ جلدیں ہیں۔ جو تمام گنپوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ فلسفہ، طب، جیوتش، علم نجوم وغیرہ پر کلاسیکل تبتی میں متعدد کتابیں ہیں۔ جن میں اکثر کتابیں سنسکرت سے مترجم ہیں۔ تاہم بہت ہی کم لوگ ان کے مفہوم سمجھتے ہیں۔ جس طرح بعض مسلمان مفہوم سمجھے بغیر قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں اسی طرح بودھوں کی بھاری اکثریت ان مذہبی کتابوں کا مطلب سمجھے بغیر ورد کرتی ہے۔

لداخی حکیم جو امچی کہلاتے ہیں، انہی کتابوں سے براہ راست استفادہ حاصل کرتے ہیں لداخی جیوتشیوں کے لئے یہی کتابیں علم و عمل کی ماخذ ہیں۔

پچھلے ایک ہزار سال کی لداخی تاریخ بتاتی ہے کہ اکثر لداخی اور لداخ میں رہنے والے غیر لداخی عالموں نے کلاسیکل تبتی میں تخلیقی کام کئے اور سنسکرت کی کتابوں کا کلاسیکل تبتی میں ترجمے کا کام کیا۔ ان میں گیارہویں صدی میں گذرے ہوئے نامور مذہبی عالم اور مترجم لوڑاوا رینچن زنگپو، بارہویں صدی کے لوڑاوا چھیقسپا شیرپ اور سولہویں صدی کے عالم ستسن سنگی راسپا کے نام قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر کی تصنیفات میں خود نوشت سوانح حیات، سفرنامہ اور گیتوں کا مجموعہ شامل ہے۔

لداخ آنے والے یورپی سکالروں کے لئے بھی کلاسیکل تبتی میں کشش رہی ہے۔ ہنگری کے ایک محقق سوما ڈی کروس نے زانسکار کے کرشا اور پھوکتل گنپوں میں تبتی زبان سیکھی اور پہلی مرتبہ تبتی۔ انگریزی کا ایک مبسوط لغت مرتب کی۔ تبتی گرامر اور بدھ مت سے دنیا کو روشناس کیا۔ وہ ۱۸۲۰ء میں لداخ آیا تھا —

جے۔ این۔ جیشکے (J.N. JASCHKE) نے بھی یہاں زبان سیکھی۔

[illegible]

تیر

ان کی تبتی سے انگریزی لغت اہم ہے۔

اس صدی کے اوائل میں موراوین مشن کے پادری اور سکالر ڈاکٹر کارل مارکس اور ڈاکٹر فرانکی نے یہی زبان سیکھی۔ ایک اطالوی مورخ توسینو پٹیک نے یہاں تیس کے دہے میں کلاسیکل تبتی سیکھی اور بعد میں لداخ پر اہم تحقیقی کتابیں لکھیں۔

آج کل سکول آف بدھسٹ فلاسفی لیہہ اور کئی پرائیویٹ سکولوں میں تبتی سکھائی جاتی ہے۔ لداخی بودھ سکالر، مذہبی اور سیاسی رہنما یہ مطالبہ کرتے آئے ہیں کہ کشمیر یونیورسٹی میں کلاسیکل تبتی کے درس و تدریس کے لئے ایک شعبہ کھولا جائے (ملک اور بیرون ملک کی متعدد یونیورسٹیوں میں تبتی پڑھانے کا انتظام ہے)

کئی لداخی سکالر اور ادیب سیمناروں میں کلاسیکل تبتی میں اپنا مقالہ پڑھتے ہیں۔ سامعین میں چند ہی لوگ یہ زبان سمجھ سکتے ہیں۔ ان میں وہ لداخی ادیب بھی شامل ہیں جن کو لداخی زبان میں تو ملکہ حاصل ہے لیکن کلاسیکل تبتی سے نابلد ہیں۔

لداخی بودھ عالموں کو تشویش ہے کہ اگر وہ کلاسیکل تبتی کو نظر انداز کریں گے تو نئی نسل مذہبی علوم سے بے بہرہ ہوگی۔ اور ماضی کے ادب سے بیگانہ رہے گی۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے اور اندیشہ بھی حق بجانب ہے لیکن موجودہ حالات میں اس زبان کو قبول عام بننا دو بھر معلوم ہوتا ہے۔ سرکاری سکولوں میں تین زبانیں یعنی ہندی، انگریزی اور اردو لازمی طور پڑھائی جاتی ہیں۔ وسیلہ معاش کے لئے بھی ان زبانوں کا سیکھنا ضروری ہے۔ اور سبھی اسی طرف مائل ہیں۔ پھر مادری زبان لداخی بھی ہے۔ ان حالات میں تبتی زبان کو لداخ میں ہمہ گیر بننا ناممکن ہے۔ پچھلے ایک ہزار سال میں انیسویں صدی کے نصف تک جب لداخ میں صرف لداخی بول چال کی زبان مروج تھی۔ تبتی پنپ نہیں سکی۔ نئے حالات میں یہ زیادہ مشکل ہے۔ ماضی میں بہت

تعمیر

سارے لداخی ترکی بولتے تھے - یہ زبان سینٹرل ایشیا سے تجارتی تعلقات کی دین تھی - جبکہ تبتی بولنے والے خال خال ہی تھے -

لداخ میں سب سے مقبول بول چال کی زبان یا لداخی ہے اور غالباً اس کا مستقبل اس خطے میں سب سے تابناک ہے - بول چال کی زبان کا ادب زبانی (ORALLY) تک آیا ہے - ان میں لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کے علاوہ کئی مشہور داستانیں ہیں ان میں گیالم کیسر کی مقبول عام داستان شامل ہے جو طویل اور دلچسپ ہے — ماضی میں سردیوں کی لمبی راتوں میں داستان گو الاؤ کے گرد بیٹھے سامعین کو قسطوں میں یہ داستان سنایا کرتا تھا -

گیالم کیسر کا اب جرمنی زبان میں ترجمہ ہوا ہے

کلچرل اکادمی لیہہ نے لداخی لوک گیتوں کے چھ اور لوک کہانیوں کے تین مجموعے شائع کئے ہیں - تاریخ لداخ کے مصنف ڈاکٹر اے - ایچ - فرانکی نے لداخی زبان کے کئی پرانے گیتوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے - ان کا خیال ہے کہ ان میں چند گیت لداخ میں بدھ مت کی آمد سے پہلے سے متعلق ہیں - لداخ میں بدھ مت اشوک کے زمانے میں ۲۴۱ قبل مسیح پہنچا تھا —

ڈاکٹر سینوگپتا لکھتے ہیں کہ بول چال لداخی کا ماخذ تبتی زبان ہے - اور یہ چینی خاندان کی زبانوں کے چینی - تبت گروپ سے تعلق رکھتی ہے - تاہم کئی یورپی محققوں کا خیال ہے کہ بول چال لداخی تبتی سے بالکل جدا گانہ ہے اور یہ اس خطے میں تبتیوں کی آمد سے بہت پہلے مروج تھی -

بول چال لداخی ایک زرخیز زبان ہے اس میں حلاوت، مٹھاس اور جاذبیت ہے - غالباً یہ احساس و ادراک مادری زبان ہونے کے ناطے اور روزمرہ کے استعمال کی بنا

ڈاکٹر سیفو گنتہ نے بول چال لداخی سے متعلق ان الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا: "یہ اپنی جگہ ایک مکمل زبان ہے اس میں تخلیق کی اپج اور صلاحیت ہے۔ ہر قسم کا ادب اس میں تخلیق ہوسکتا ہے اور کسی دوسرے زبان کے سہارے کی اسے ضرورت نہیں ہے۔"

انہوں نے لداخی زبان دانوں اور ادیبوں کے تئیں جدید چیزوں کے لئے دوسری زبانوں کے مروجہ الفاظ کی جگہ لداخی میں متبادل الفاظ وضع کرنے کے رجحان کی بھی نکتہ چینی کی۔

راقم الحروف نے مقامی ادبی تنظیم لداخ پبلک فورم کے ایک ممبر کی حیثیت سے آسانی، عام فہم اور عام مستعمل لداخی میں لکھنے کے لئے کئی دفعہ اپنی آواز بلند کی لیکن یہ آواز عام طور پر نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی ہے۔

ڈاکٹر فرانکی نے ماضی کے لداخی شاعری سے متعلق لکھا ہے۔

"لداخ کے لوگوں میں شاعری کی فطری صلاحیت ہے۔ لداخ کے لوک ادب کے بلند معیار سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ شاعرانہ صلاحیت والے قلم کاروں کو تخلیقی عمل کے لئے آزادانہ اور موزوں مواقع فراہم ہوتے تو وہ بلند مقام حاصل کرسکتے تھے۔ لداخ کے حکمرانوں نے لداخی شاعری اور قومی ادب کو مناسب طور سے پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں دی۔"

آج کل کئی قلم کار بول چال لداخی میں لکھتے ہیں۔ لداخی شاعر لُشی ونگیل نے ٹیگور کے ڈرامہ، "قربانی" کا لداخی بول چال میں ترجمہ کیا ہے۔ اور بول چال کی زبان میں گیت اور نظمیں کہی ہیں جو لوگوں نے بہت پسند کی ہیں۔ اسی طرح سورو پ نمگیل، محمد شفیع دیلی، چھوانگ دورجے اور کئی لداخی ادیبوں اور شاعروں نے بول چال کی زبان میں گیت، مضامین، نظمیں اور نعتیں لکھی ہیں اور لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔

تعمیر

جہاں تک لداخی بول چال کی زبان میں متبادل لفظ - جو ایک اچھا کا تلفظ ہے۔

یہ تمام لداخی میں پہلے اور آخری تامل ہیں۔

لداخی زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر چیز اور ان گنت مجرد الفاظ کے لئے HONORIFIC تعظیمی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً ناک، کان، آنکھیں، بال، زبان، ہاتھ، دودھ، کپڑے وغیرہ کے لئے عام الفاظ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے لئے متبادل تعظیمی اور تہذیبی الفاظ بھی وضع کئے گئے ہیں۔ کہتے ہیں اس فن میں لداخی اور فرانسیسی میں یکسانیت ہے۔

اب ہم تحریری لداخی زبان پر کچھ تبصرہ کرتے ہیں جیسا کہ پہلے تذکرہ ہوا ہے کہ تحریری لداخی اور بول چال کی زبان میں کچھ فرق تو ہر زبان میں ہوتا ہے لیکن لداخی میں یہ فرق بہت زیادہ ہے۔ اردو، ہندی یا انگریزی میں ایک خواندہ آدمی، ادبی اور علمی زبان میں گفتگو کر سکتا ہے لیکن لداخی میں مروجہ تحریری زبان میں یہ ممکن نہیں۔ اس تحریری لداخی سے متعلق بے کم و کاست یہ کہا جا سکتا ہے کہ لداخی عوام اس زبان سے کلی طور کبھی مانوس نہیں ہوں گے۔

لداخی تحریری زبان جتنی گرامر کے قواعد کی پابند ہے۔ کسی بھی ماہر لسانیات کی نظر میں گرامر کے قواعد اور ہجے پیچیدہ اور گنجلک ہیں اور وہ اس میں ترمیم کا مشورہ دے گا لیکن بودھ سکالروں کو یہ تشویش ہے کہ اس میں ترمیم کی گئی تو ان دھارمک کتابوں اور کلاسیکل ادب کا کیا ہوگا جو اسی ہجے میں لکھا گیا ہے اور گرامر کے یہی قواعد اختیار کئے گئے ہیں۔ اس لئے کلاسیکل ادب کی بقا اور اس کی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی ترمیم نہیں ہو سکتی۔ لداخ کی نصف آبادی کو یہ زبان تحریری طور سیکھنے کا شوق نہیں ہے اور بقایا نصف آبادی میں گنے چنے چند ہی افراد ہیں جو یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ انہیں اس زبان میں مہارت حاصل ہے۔

لداخی ادیب اور شاعر مزاجاً "مشکل پسند اور" دقیق گو" ہیں۔ وہ زبان میں

تعمیر

صفائی اور خالص پن کے حامی ہیں وہ نئی چیزوں کے لیے لداکھی PURIFICATION
تبتی سے متبادل الفاظ ڈھونڈتے ہیں یا نئے الفاظ تلمیحیں اور اصطلاحیں وضع کرتے
ہیں لیکن ان میں بہت سارے الفاظ مشکل اور گنجلک ہونے کے پیش نظر قبول عام
کی سند حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ ٹی وی۔ سینما۔ فلم۔ ریڈیو۔ راکٹ، سٹیلائٹ
جیسے الفاظ تک ان سے نہیں بچے ہیں۔ وہ عوام کی کثرت استعمال کی وجہ سے بگڑے
ہوئے مروجہ الفاظ بھی درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو لسانی اصول کے منافی ہیں۔

لداخی زبان کی ترکیب، ساخت، صوتیات اور مزاج الیاہے کہ وہ تبتی الفاظ
نسبتاً آسانی سے قبول کر لیتی ہے لیکن صدیوں کے میل جول کی وجہ سے بہت سارے کشمیری،
ترکی، انگریزی، اردو، فارسی وغیرہ کے الفاظ اصل یا بگڑی صورتوں میں اس میں
رچ بس گئے ہیں اور یہ بھی لداخی زبان کے اہم جزبن گئے ہیں۔

ان قباحتوں کے باوجود اس تحریری زبان کو لداخی ہی کہا جائے گا۔ اور آج
اکثر لداخی ادیب اور شاعر اس زبان اور اسلوب بیان کو اپنا رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے
کہ کسی کی زبان میں تبتیت زیادہ ہے اور کسی میں کم۔ جس طرح کسی کی اردو میں زیادہ
فارسیت یا کسی کی ہندی میں سنسکرت کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔

انیسویں صدی میں ریزونگ گنپہ کے بانی لاما چھولیتم نیما نے اپنی سوانح حیات اسی
زبان میں لکھی۔ عیسائی پادریوں نے اسی زبان میں بائبل کا ترجمہ کیا۔ پادری کارل
مارکس نے ۱۹۰۴ء میں لیہہ سے لداخی میں ایک اخبار نکالا اور لگ بھگ یہی زبان استعمال
کی اور یہی طرز بیان اختیار کیا۔ آج درسی کتابوں میں یہی زبان استعمال کی گئی ہے

بہرحال لداخی زبان میں تخلیقات کا سوتا پھوٹ رہا ہے۔ اس سلسلے میں

..... ثقافتی اکادمی لیہہ کی علمی ادبی سرگرمیاں اور انعامات فرکات رہتے ہیں۔

- لداخ کلچرل فورم ایک فعال ادبی

اور کلچرل تنظیم ثابت ہوئی ہے۔

۱۹۷۶ء سے اکادمی نے لداخی میں سالانہ مطبوعات منظرِ عام پر لائی ہیں۔ ۱۹۷۹ سے اب تک لداخی شیرازہ کے بارہ شمارے نکالے۔ جن میں خاص نمبرات شامل ہیں۔ ان میں لداخی شاعروں، ادیبوں اور گیت کاروں کی تخلیقات ہیں۔

اکادمی وقتاً فوقتاً لداخی ادب، کلچر، زبان اور تاریخ پر سمینار منعقد کرتی ہے۔

پچھلے کئی برس سے لداخی ادیب اپنی تصنیفات اور ڈراموں پر بلاناغہ اکادمی کے انعامات حاصل کر رہے ہیں۔ ان ادیبوں میں جمیانگ گیالچن، ٹشی ربگیس، چھوانگ گرین، چھرنگ نرلو، لیشے چھرنگ، ارگین ڈاڈول، گیلونگ پلان، چھوانگ تولدن اور گیرگن عنم کے نام آتے ہیں۔ ....

... - اسی طرح ہر سال کوئی نہ کوئی لداخی ادیب اپنی کتاب کی طباعت کے لئے سبسڈی پاتا ہے۔

یہ کتابیں مضامین، ڈرامے، تاریخ اور شاعری پر مشتمل ہیں۔

لیہہ ریڈیو سٹیشن نے بول چال لداخی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

پچھلے کئی برس میں تاریخی موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں ایس ایس گیرگن کی "تاریخ لداخ"، ٹشی ربگیس کی "تاریخ لداخ"، نوانگ چھرنگ اور کاچین لوبزانگ زوپتا کی "تاریخ زنسکار" اور "تاریخ نوبرا" شامل ہیں۔

فلسفہ، تنقید، سائینس وغیرہ پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ایک بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ لداخی میں ناول لکھے نہیں جاتے اور نہ نئے طرز کا کوئی

تعمیر

افسانہ تخلیق ہوتا ہے۔ لداخ میں جدید ادبی تحریکوں اور تجربوں کا کوئی جھونکا نہیں پہنچا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ماسوائے ایک دو ادیبوں کے اردو، ہندی یا غیر ملکی ادب پر لداخی ادیبوں کی گہری نظر نہیں ہے۔

لداخی مطبوعات بھی بہت کم فروخت ہوتی ہیں۔ لداخی پڑھنے والے اکثر وہی لوگ ہیں جن کو لداخی کے بغیر دوسری کوئی زبان نہیں آتی۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مشکل زبان اور اچھے لٹریچر اور تخلیقات کا فقدان۔

آج کا لداخ زبان کے معاملے میں ایک اہم دوراہے پر کھڑا ہے اور یہاں کی زبانیں ایک EVOLUTION چاہتی ہیں۔ زبان ہمیشہ تغیر پذیر اور ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ کبھی نہ کبھی اس ضمن میں لداخ میں بھی دور رس انقلاب آئیگا۔

آج کل کچھ لوگ تبتی میں لکھ رہے ہیں۔ کچھ ادیب بول چال لداخی میں اپنی علمی اور ادبی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اور اکثر تبتی سے اثر پذیر زبان میں لکھ رہے ہیں۔ زبان کے مسئلے پر لداخی ادیبوں، زبان دانوں، دانشوروں اور سیاست کاروں میں ایک CONFUSION (ذہنی انتشار) پایا جاتا ہے۔

آخرکار اُسی زبان کی گرفت سب سے مضبوط ہوگی جسے لوگ سمجھتے اور بولتے ہیں اور جو ان کی روزمرّہ کی زندگی اور فکر و ذہن میں رچی بسی ہے —

●●

مرتضیٰ سنگھو مسافر
معرفت کشمیر بیورو آف انفارمیشن جالندھر

لداخ

دنیا کا واحد پُرسکون مقام

لداخ کی دھرتی چاند کی سطح زمین سے عین مطابقت رکھتی ہے۔ امریکہ کی پہلی خلائی ٹیم چاند سے چٹانوں، پہاڑوں اور سطح زمین کے جو نمونے لائی تھی۔ اُن کی تحقیقات کی ایک کڑی کے سلسلے میں ایک سروے رپورٹ کے مطابق واحد لداخ کا ہی علاقہ ایسا ہے جس کی سطح زمین تقریباً چاند جیسی ہے۔ گو فرق صرف اتنا ہے کہ لداخ کے علاقہ میں کشش (-۴۸۸۷ء اتنا کم نہیں جتنی چاند پر ہے۔ لداخ کے کئی علاقوں میں آکسیجن کی کمی ضرور محسوس کی جاتی ہے۔ رپورٹ ہذا کی اخبارات میں اشاعت کے فوراً بعد تقریباً ۵۰۰ غیر ملکی سیاحوں نے اس علاقہ کی سیاحت کے لئے پہلی بار اجازت مانگی تھی۔ اس کے بعد ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ملکی اور غیر ملکی سیاح لداخ پہنچ رہے ہیں۔ آسمان کا یہ چاند پہ بھی دھرتی والے چاند کا ہی سیر ہی رہی۔ یہاں آباد سادہ لوح لوگ سالہا سال تک بیرونی دُنیا کی مداخلت کے اثرات سے پاک و صاف رہے ہیں۔ اس وقت دُنیا کے تمام پُرسکون مقامات میں لداخ پہلے نمبر پہ ہے۔ یہاں خالص قدرتی حُسن موجود ہے۔ لاماؤں اور گمپاؤں کی سرزمین کو

تعمیر

ہم دوسرے الفاظ میں دلفریب پہاڑوں کی ایک جنت کہہ کر پکارتے ہیں۔ مگر ایک
ٹورسٹ سروے کے مطابق لداخ کی سیاحت پر آنے والے سیاحوں میں ۴۰ فیصدی سیاح کوہ
پیمائی اور ٹریکنگ اور مہم جوئی کے لئے آتے ہیں۔ ۳۰ فیصد سیاح اس پرسکون دلفریب
علاقہ میں جو دنیا کے شور و غل سے بالکل الگ تھلگ ہے میں جا کر دلی سکون حاصل
کرتے ہیں۔ تقریباً دس فیصد یا باشعور سیاح لداخ کے ثقافتی ورثے کی جانکاری حاصل
کرنے کے لئے آتے ہیں جن میں ترقی یافتہ ملکوں کی یونیورسٹیوں کے پروفیسر صاحبان اور طلباء کی
کافی بڑی تعداد شامل ہوتی ہے۔ لداخ کی سیاحت کو بڑھاوا دینے کی غرض سے ریاستی سرکار
اور انڈیا ٹورازم ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے ترجیحی بنیاد پر توجہ دینی شروع کر دی ہے۔
کارپوریشن ہذا کی طرف سے تقریباً ۱۵۰ مقامی نوجوانوں کو کوہ پیمائی کی تربیت اُترکاشی
(یو، پی) کے ایک مشہور تربیتی مرکز میں دلائی گئی۔ پورے لداخ علاقہ کے نقشہ جات تیار
کر لئے گئے ہیں اور سیاحوں کی بنیادی جانکاری کے لئے ان کو لداخ پہنچنے پر مفت مہیا کئے
جاتے ہیں۔

ضلع لداخ میں پنڈراس اور دراس میں ۴۳ کلومیٹر علاقہ میں پھیلی ہوئی ایک
حسین وادی دنیا بھر میں دوسرے درجہ کی ٹھنڈی جگہ ہے۔ یہ وادی سال میں چھ ماہ تک
۱۰ سے ۱۴ فٹ تک برف کے نیچے دبی رہتی ہے۔ لداخ میں بارش بہت ہی کم ہوتی ہے۔
کئی سیاحوں نے لداخ کی سیر کے بارے میں ان کے تاثرات پوچھنے پر انہوں نے بتلایا کہ ان کو
ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ چاند کے کسی علاقہ کی سیر کر کے واپس جا رہے ہیں جہاں ان کو آفتاب
کا طلوع ہونا اور غروب ہونا بھی بہت عجیب اور پیارا لگا۔ ان کو ایسا گمان ہوا کہ جیسے
چاند پر کھڑے ہیں اور یہ نظارہ دیکھ رہے ہیں۔ ٹورسٹ نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے ان
دنوں کرگل کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ چار گاؤں کے جھرمٹ میں پوان، گروا، کرگل
اور یارو شامل ہیں اور یہ مقامات دراس اور دروگا نامی دو ندیوں کے سنگم پر واقع ہے

تعمیر

اب کا لالا پانی سمت کے سفید گپ چاندنی ہے۔ بڑگو لائی کی ایک اہم تجارتی مرکز بن گیا ہے — لداخ کے علاوہ یہاں چار زبانیں کشیری، دردی، تبتی اور اُردو بولی جاتی ہیں۔ لوگ بڑے مذہبی ہیں۔ یہاں بدھ مذہب اور اسلام کو ماننے والے لوگ آباد ہیں۔ یہاں آبادی کا پھیلاؤ فی مربع میل صرف دو آدمیوں کا تناسب ہے۔ جو کہ ملک کے دیگر اضلاع کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کا لداخ وہ واحد ضلع ہے جو رقبہ کے لحاظ سے نہ صرف سب سے بڑا ہے بلکہ تمام ہندوستان میں سب سے بڑا ضلع ہے۔ لیہہ سے منالی (ہماچل پردیش) تک سڑک مکمل ہو جانے پر ضلع لداخ سال میں چھ ماہ کشمیر اور منالی سے ملا رہے گا۔ اس سے سیاحت کو اور بھی زیادہ فروغ حاصل ہوگا۔ لداخ کی خوبانی دنیا میں مشہور ہے۔

لداخ کو گمپھوں کا دیش بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں تقریباً ہر گاؤں میں گمپا ہے۔ گمپا کا مطلب ہے تنہائی کی جگہ جہاں بیٹھ کر عبادت کی جاتی ہے۔ لداخ میں سولہ بڑی گمپائیں ہیں جن میں آرٹ کا بیش قیمت خزانہ محفوظ رکھا گیا ہے۔ ان کی دیواروں پر مصوری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ان تمام گمپھوں میں سالانہ میلے لگتے ہیں اور ان میلوں میں شرکت کرنے سے لداخ کے پورے کلچر کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اردو کا مقبول ماہنامہ

تعمیر

جلد نمبر:- ۲۶ جولائی سنہ ۱۹۸۵ء شمارہ نمبر ۲

نگران :- یش گنڈوترہ

مدیر :- خالد بشیر

خط و کتابت کا پتہ :

مدیر ماہنامہ تعمیر

شعبۂ مطبوعات محکمۂ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر سرینگر-۱۹۰۰۱

ماہنامہ تعمیر میں چھپنے والی نگارشات میں
ظاہر کی گئی آراء سے حکومت جموں وکشمیر
کا متفق ہونا ضروری نہیں!

ریاست جموں وکشمیر کے
متعلق ثقافت، تاریخ، ادب، فنون
لطیفہ اور تعمیر وترقی پر مضامین کے
لئے ہم آپ کا تعاون چاہتے ہیں۔ تعمیر
میں چھپنے والی نگارشات کا معاوضہ
ادا کیا جاتا ہے! مدیر

تعداد :- ۲ ہزار
کتابت :- غلام محی الدین بشیر احمد
مطبوعہ :- گورنمنٹ پریس سرینگر

ترتیب

تخلیقات روانہ ہونے والے خیال رکھیں کہ

مطبوعہ اور نشر شدہ تخلیقات قبول نہیں ہوں گی۔

حرف حرف

اس ماہ وزیر اعلیٰ جناب غلام محمد شاہ کی قیادت میں حکومت نے اقتدار کا ایک سال پورا کر لیا۔ حکومت کی کارکردگی اور کامیابی سے متعلق "ایک سال پر ایک نظر" کے زیرِ عنوان مضمون اس عرصہ کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ معیشت کے دیگر شعبوں آبپاشی اور رہائشی سہولیات کے بارے میں بھی تفصیلی مضامین اس اشاعت میں شامل ہیں۔

ادبی حصہ میں راجندر سنگھ بیدی، رسا جاودانی اور عابد مناوری سے متعلق اُن کے فن و شخصیت پر تین تاثراتی مضامین کے علاوہ غزلیں بھی شامل ہیں۔

خالد بشیر

غلام محمد شاہ
وزیر اعظم جموں و کشمیر

ایک سال پر ایک نظر

گزشتہ ایک برس کے دوران جب سے کہ ریاست جموں و کشمیر میں میری حکومت برسر اقتدار ہے ہم نے اپنی تمام تر توجہ ریاست کی انتظامی، ترقیاتی اور اقتصادی نظام کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے پر مرکوز کی ہے۔ یہ کام فوری توجہ کا متقاضی تھا کیونکہ سابق حکومت کی ناعاقبت اندیشی اور ناقص پالیسیوں کی وجہ سے یہ تمام شعبے انتہائی ابتر حالت میں تھے۔ تناؤ کی سی کیفیت اور ناگفتہ بہ صورت حال ترقیاتی عمل کی رفتار تشویشناک حد تک سست پڑ گئی تھی۔ بلکہ ہر سطح پر جمود طاری تھا۔ غیر پیداواری شعبوں پر رقومات کے بے دریغ استعمال نے حالات بہت بدتر کر دیئے تھے لوگوں کے جذبات اور احساسات کو ٹھیس دے کر پُرامن اور پُرسکون حالات زندگی کو درہم برہم کر دیا گیا تھا جس کا خمیازہ بڑی حد تک ریاستی معیشت کے سب سے بڑے ستون یعنی سیاحت کی صنعت کو اٹھانا پڑا۔ عوام خاص کر غریب طبقوں کی حالت انتہائی خراب ہو گئی تھی اور وہ اس صورت حال کا فوری خاتمہ چاہتے تھے۔

ان حالات کے پیش نظر [illegible] کا [illegible] ریاست کے [illegible] شعبوں [illegible] اور [illegible]

تعمیر

[illegible] حکومت [illegible] بعد
[illegible] اقتدار [illegible] جمہوریت اور حکومت کی تبدیلی کی صورت میں سامنے آگئی۔

یہ [illegible] ریاست [illegible] چنانچہ ۱۹۷۷ء کو میری جماعت [illegible] مسلم لیگ کی بنیاد پر حکومت نے اقتدار سنبھالا۔ اس طرح ایک بار پھر ریاست میں مسلم لیگ [illegible] اور قوم دشمن [illegible] خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے سیکولر جمہوریت اور قوم پرست قوتیں یکجا ہوگئیں۔ آزادی کے لیکن تاریخ کہ اس نازک موقعہ پر [illegible] جس کی [illegible] ایک دیرینہ روایت ہے نے نئی حکومت کا ساتھ دیا بلکہ اس نازک صورت حال [illegible] میں اپنا تعاون بھی دیا۔ مخالفین کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کئے جانے کے باوجود نئی حکومت نے ابتر حالات کو چیلنج سے روکنے اور [illegible] ان مسائل کے حل پر فوری توجہ دی جن کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا گیا تھا اس ضمن میں میری حکومت نے کئی ایسے اقدامات کئے ہیں جن کا مقصد ریاست کو اس اقتصادی، انتظامی اور سیاسی [illegible] حالت سے نکال کر ایک ترقیاتی اور خوشگوار ماحول کی فراہمی ہے۔ سماجی اور معاشی انصاف اور تمام شعبہ جات میں ترقی کے حصول کے لئے حکومت نے ترجیحات کا تعین کیا اور قومی تعمیر نو میں تمام لوگوں کی مساوی شرکت اور وسائل کے حصول کو یقینی بنانے کے لئے حقیقت پسندانہ اور عملی طریقہ کار اپنایا۔ انتظامیہ کو سماجی اور اقتصادی تبدیلی کا موثر ذریعہ بنانے کے لئے اسے پوری طرح مستعد کیا گیا اور اقتصادیات کی شیرازہ بندی کی گئی۔

اقتصادی، انتظامی اور منصوبہ سازی کے سرکردہ ماہرین پر مشتمل ایک سات رکنی کونسل کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے جس کے ساتھ وقتاً فوقتاً حکومت اقتصادی پالیسی سے متعلق امور اور ترقیاتی پروگراموں کی تشکیل اور عملدرآمد پر مشاورت کیا کرے گی۔ [illegible]

ے

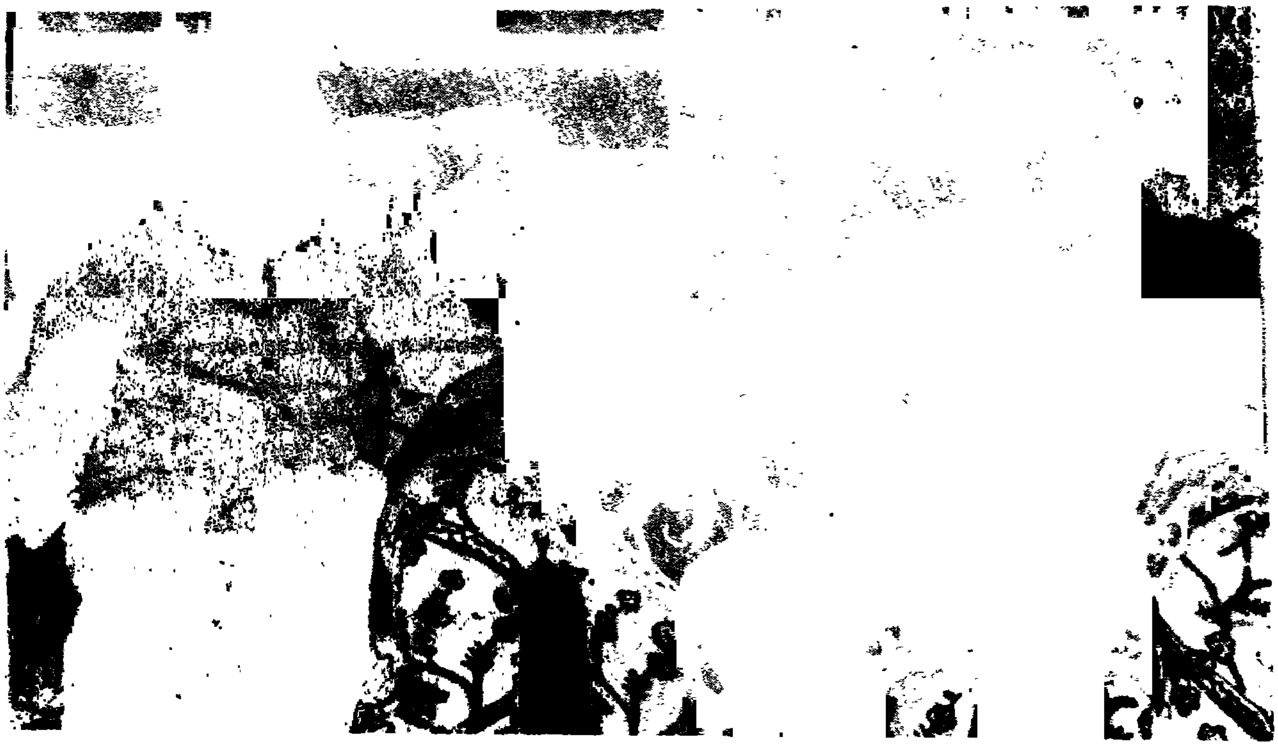
ہے کہ مذکورہ کمیٹی کے ماہرانہ مشوروں کی بُنیاد پر ریاست میں سماجی اور اقتصادی ترقی کو ایک نئی جہت ملے گی۔ انتظامیہ میں سُدھار کے لئے مختلف سرکاری محکموں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے اقدامات کئے گئے۔ اس سلسلے میں چھ اعلیٰ سطحی ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں ۔

میری حکومت پسماندہ اور دُور دراز علاقوں کی ترقی اور وہاں کے لوگوں کی بہبودی کے لئے کوشاں ہے اور گذشتہ ایک برس میں اس ضمن میں کئی اقدامات کئے گئے ہیں۔ جموں اور کشمیر ڈویژنوں کے پانچ پانچ انتہائی پسماندہ علاقوں کی نشاندہی کی جا چکی ہے اور ان علاقوں پر خصوصی انتظامی توجہ دی جائے گی۔ چنانچہ ان علاقوں میں درجہ چہارم اور درجہ سوئم کی تمام دستیاب اسامیاں مثلاً پرائمری اور مڈل سکول اساتذہ، پیرا میڈیکل سٹاف وغیرہ مقامی طور پُر کی جائیں گی اور یہ ملازمین معمول کے حالات میں اپنے متعلقہ علاقوں سے تبدیل نہیں کئے جائیں گے۔ یہ علاقے ہیں گریز، تلیل، مڑھل، کرن، کرناہ، ڈوڈو بسنت گڑھ، پاڈر، مارواہ، دچھن اور بنی۔ ان علاقوں میں بجلی اور صحت عامہ کی سہولیات کی طرف بھی توجہ دی جا رہی ہے۔

بیروزگاری ایک سنگین مسئلہ ہے اور میری حکومت اس مسئلہ کے حل کے لئے حتی المقدور کوشش کر رہی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری کا معاملہ خصوصاً فوری توجہ کا مستحق ہے۔ چنانچہ مختلف شعبوں میں نو ہزار خالی اسامیوں کی نشاندہی کی گئی جنہیں فوری طور پُر کیا جا رہا ہے۔ دریں اثنا حکومت نے اس بات کو محسوس کیا کہ بھرتی کے قواعد کچھ اس قسم کے ہیں جن سے اسامیاں پُر کرنے میں بلاوجہ تاخیر ہو جاتی ہے اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے بھرتی قواعد آسان بنائے گئے اور محکمانہ بھرتی بورڈ تشکیل دیئے گئے۔ اس نئے طریقہ کار کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے اور تمام خالی اسامیاں پُر کی جا رہی تھیں



وزیراعلےٰ جناب غلام محمد شاہ، مرحوم مرزا محمد افضل بیگ کی قبر پر پھول برسا رہے ہیں



سری نگر میں اپنے قیام کے دوران ہند میں مقیم آسٹریلیا کے سفیر نے وزیر اعلیٰ
سے ملاقات کی۔

ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آج کل حصولِ تعلیم کے دوران ہی اکثر طالب علم سرکاری ملازمت کے لئے مقررشدہ عمر کی زیادہ سے زیادہ حد پار کر جاتے ہیں۔ میری حکومت نے اس طرف بھی توجہ کی۔ چنانچہ یہ حد ۳۰ سال سے بڑھا کر ۳۲ سال کر دی گئی۔ اس سے بے شمار تعلیم یافتہ نوجوانوں کو حصولِ روزگار میں مدد ملے گی۔ دیہی علاقوں میں روزگار کے مزید وسائل پیدا کرنے کے لئے پانچ کروڑ روپے مختص کئے گئے۔ یہ رقم ریاست کے ۱۱۹ بلاکوں میں چار لاکھ بیس ہزار روپے فی بلاک کے حساب سے تقسیم کی گئی تاکہ بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے علاوہ مقامی آبادی کے لئے نفع بخش اثاثے قائم ہوں۔ اس کے علاوہ حکومت نے جونیئر انجینیروں کی ۱۱۹ اسامیاں معرضِ وجود میں لائی ہیں تاکہ دیہات میں ترقیاتی عمل میں سرعت پیدا ہو۔

زرعی پیداوار کو بڑھانے کی خاطر حکومت نے کئی عملی اقدامات کئے ہیں۔ کسانوں کو زیادہ پیداوار دینے والے بیج اور کیمیاوی کھاد رعایتی نرخوں پر فراہم کی جا رہی ہے۔ جدید سائینسی طریقوں کو روبہ عمل لا کر زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے عالمی بنک کی امداد سے نیشنل ایگریکلچر ایکسٹینشن پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے۔ اس پروجیکٹ کی مدد سے جدید زرعی سائینسی تحقیق کو تجربہ گاہوں سے کھیتوں تک منتقل کیا جائے گا۔ چنانچہ ایگریکلچر گریجویٹوں پر مشتمل بنیادی سطح پر ایک ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے جو متذکرہ بالا مقصد حاصل کرنے کے علاوہ بڑی تعداد میں ایگریکلچر گریجویٹوں کو روزگار فراہم کرے گا۔ یومیہ اجرت پر کام کرنے والے افراد کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے حکومت نے ایسے پندرہ ہزار ڈیلی ویجر اور ورک چارج ملازمین کی نوکری مستقل کر دی جنہوں نے پانچ سال سے زائد عرصہ تک کام ہو۔ اس کے علاوہ ڈیلی ویجر اور پہلگام اور گلمرگ میں کام کرنے والے سیزنل مزدوروں کی یومیہ اجرت یکم جولائی ۱۹۸۴ء سے ۱۰ روپے ۷۰ پیسے سے بڑھا کر ساڑھے گیارہ روپے

تمیر

کردی گئی۔

جنگلات کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ حد تک بروئے کار لانے اور ریاست کے مالی وسائل میں اضافہ کرنے کی غرض سے حکومت نے دسمبر ۱۹۸۰ء تک تمام جنگل ٹھیکے بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنگلات کا تحفظ انتہائی ضروری ہے۔ گذشتہ برسوں میں اس طرف جو غیر ذمہ دارانہ رویہ اپنایا گیا تھا اُس کی وجہ سے وہ دن قریب آگیا تھا جب ہم خداداد اس عظیم دولت سے محروم ہو جاتے۔ میں نے اور حکومت میں میرے ساتھیوں نے اس صورت حال کا جائزہ لیا۔ چنانچہ پبلک سیفٹی ایکٹ میں ایسی ترمیم کی گئی کہ اس کی زد میں بدنام جنگل سمگلر بھی آسکیں۔

کم آمدنی والے طبقوں کو غذائی اجناس پر دی جانے والی پندرہ پیسے فی کلوگرام سبسڈی جو گذشتہ مالی سال کے اختتام پر ختم ہونے والی تھی کو فی الحال بحال رکھا گیا۔ کنڈی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کا راشن سات کلوگرام سے دس کلوگرام فی کس تک بڑھا دیا گیا۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ ریاست کو ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی بنیاد پر غذائی اجناس فراہم کرے۔ یہی نہیں ریاست کے دور دراز علاقوں میں ایک سو نئے فیئر پرائس دکانیں کھولی گئی ہیں۔

ریاست میں تمام بے سہارا بیواؤں کو بڑھاپے کی پنشن کا حقدار بنایا گیا ہے۔ اور اس کے لئے عمر کی قید اٹھا دی گئی۔ اس پنشن کی رقم .... بڑھا کر سو روپے ماہوار کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ۶۰ سال سے زیادہ عمر کے بے سہارا افراد کے لئے پنشن کی سکیم جاری رہے گی۔

سابق دور حکومت میں سیاحت کی صنعت کو جس شدید بحران کا سامنا کرنا پڑا اُس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ سیاحوں کی آمد میں کمی کے باعث اس صنعت سے وابستہ افراد زبردست مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔ میری حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی فوری

تعمیر

نوعیت کے اقدامات کئے تاکہ سیاحوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں یہاں آنے کی ترغیب ملے۔
اس سلسلے میں گزشتہ سیزن بڑا بہتر رہا ہے۔ سیاحوں کو فراہم کی جانے والی سہولیات میں
بڑا اضافہ کیا جا رہا ہے اور سیاحتی مراکز کی خوبصورتی کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ پچھلے دنوں
جھیل ڈل میں ایک تیرتے ہوئے ریسٹورنٹ گنگا پوش کا افتتاح اسی سلسلے کی کڑی ہے
سیاحت کی صنعت میں مندے کی وجہ سے متاثرہ طبقوں کو راحت پہنچانے کے لئے متعدد
اقدامات کئے گئے جن میں ہاؤس بوٹ، کیبن، ہوٹل اور شکارا مالکان اور ٹیکسی آپریٹروں
ٹور مالکان اور ٹورسٹ مزدوروں کے قرضوں پر طویل المیعاد قرضوں اور وظیفہ کی فراہمی شامل
ہے۔ ان طبقوں کی طرف سے مختلف مالیاتی اداروں کو سال ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران
جن قرضوں کی اقساط واجب الادا تھیں ان پر سبسڈی دی گئی۔ یہ سبسڈی ایسے
افراد یا اداروں کو دی گئی جنہوں نے ۵ لاکھ روپے تک کے قرضے حاصل کئے تھے۔ اس
کے علاوہ تیرہ سو کیبنوں کو ۴ لاکھ روپے کی امداد دی گئی۔ اسی طرح گلمرگ، پہلگام اور
دیگر سیاحتی مقامات کے ٹور مالکان کو بھی ۱۳ لاکھ روپے کی امداد دی جا رہی ہے۔ اس
سلسلے میں بینکوں سے رابطہ قائم کیا گیا تاکہ ان کے ذمہ رواں سال کے دوران قرضوں
کی اقساط کی ادائیگی پر دو برس کے لئے التوا کیا جائے۔

سیاحوں کی آمد میں کمی کے باعث دستکاری کا شعبہ بھی بری طرح متاثر ہوا۔
اس شعبہ سے وابستہ افراد کی مالی معاونت کے لئے حکومت نے ان کی دستکاری مصنوعات
خریدیں۔ چنانچہ صرف دو مہینوں میں اڑھائی کروڑ روپے کی مالیت کی مصنوعات ان
سے خریدی گئیں تاکہ دستکار اپنا مال اونے پونے داموں بیچنے پر مجبور نہ ہوں۔
ان اقدامات سے دستکاریوں سے وابستہ چھوٹے پیمانے کے ایک ہزار یونٹ
مالکان اور دیگر دستکار کاریگر مستفید ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ دستکاری

تعمیر

مراکز میں تربیت پانے والوں کا ماہانہ مشاہرہ ساٹھ روپے سے ایک سو روپے تک بڑھا دیا گیا۔

ساتویں پنچسالہ منصوبے میں حکومت نے بجلی کی پیداوار بڑھانے کو اولین ترجیح دی ہے ریاست میں دستیاب وسائل کو زیادہ سے زیادہ حد تک بروئے کار لاکر بجلی کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے گا۔ دریں اثنا حکومت نے کم اور متوسط آمدن والے طبقوں کے لئے بجلی فیس کی شرحوں میں معقولیت لائی۔ چھوٹے کسانوں کو پیداوار بڑھانے کے لئے سبسڈی پر کھاد فراہم کی گئی اور ژالہ باری اور زبردست بارشوں سے متاثرہ کسانوں کو امداد دی گئی۔

درجہ فہرست ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کے لئے ایک سال کے دوران سب سے زیادہ یعنی پچھتر لاکھ روپے مختص کئے گئے اور جسمانی لحاظ سے معذور ۴۳۵ افراد کو وظیفے دئے گئے گذشتہ ایک سال کے دوران ۱۲۷ نئے پرائمری سکول کھولے گئے اور ایسے سکولوں کے لئے مزید پانچ سو اساتذہ کا تقرر عمل میں لایا گیا جن میں اساتذہ کی تعداد نامکتفی تھی۔ حکومت جموں میں ایک علیحدہ انجینئرنگ کالج کے قیام پر غور کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ سرینگر اور جموں میں خواتین کے لئے دو پالی ٹیکنیک کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ترقیاتی عمل میں لوگوں کے زیادہ سے زیادہ اشتراک کا جو عمل شیر کشمیر جناب شیخ محمد عبداللہ نے شروع کیا تھا۔ میری حکومت نے اس عمل کو مزید وسعت دی ہے۔ نئے پنچسالہ منصوبہ بندی کا عمل اب بلاک سطح سے شروع ہوگا اور اس طرح عوام کو ریاست کے ترقیاتی عمل میں زیادہ سے زیادہ شرکت کا موقع فراہم ہوگا۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہر علاقہ متوازن طریقے پر ترقی کرے گا۔

یہ اُن اقدامات کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جو گذشتہ ایک برس میں میری حکومت نے عوام کی بہبودی اور معیشت کے استحکام کے لئے کئے ہیں۔ ریاستی عوام کو ایک صاف ستھرا انتظامیہ فراہم کرنے کے ساتھ پُرامن اور خوشگوار ماحول فراہم کرنا میری حکومت کا

تعمیر



نماز عید کا ایک منظر ـــــ تصویر میں وزیر اعلیٰ جی ایم شاہ بھی دیکھے جا سکتے ہیں



گورنر مسٹر جگموہن، بیگم جگموہن، چیف جسٹس ڈاکٹر آدرش سین آنند، بیگم آنند اور وزیر اطلاعات
سردار رفیق حسین خان وزیر اعلیٰ جناب غلام محمد شاہ کو عید الفطر کے موقعہ پر مبارکباد دینے کے لئے
اُن کی رہائش گاہ پر گئے۔

نصب العین ہے۔ چناں چہ اس طرف بھی توجہ دی گئی ہے - اور حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسے تمام سرکاری افسروں کو نوکری سے قبل از وقت سبکدوش کر دیا جائے گا - جن کی شہرت اچھی نہ ہو اور جو کورپٹ ہوں۔ اس سلسلے میں پہلے ہی ابتدائی کام شروع کیا جا چکا ہے۔ پُرامن فضا برقرار رکھنے اور شہریوں کے جان و مال کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے انسداد انتہا پسندی کے مرکزی قانون کو ریاستی حکومت کی سفارش پر صدرِ جمہوریہ کے حکم کے تحت جموں و کشمیر پر بھی لاگو کیا گیا ہے۔ ملک میں تشدد کی بڑھتی ہوئی لہر کے نتیجے میں اس قانون کا ریاست پر اطلاق بے حد ضروری تھا -

ایک سال کا عرصہ حکومتوں کی کامیابیاں اور کارکردگی جانچنے کے لئے بہت ہی قلیل عرصہ ہے لیکن میری حکومت نے اس مختصر سی مدت میں بھی بڑی اہم کامیابیاں حاصل کیں اور نہایت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے لیے میں عوام کی شرکت اور تعاون کے لئے اُن کا مشکور ہوں اور پُرامید ہوں کہ اُن کا تعاون مجھے اور میری حکومت کو بدستور حاصل رہے گا۔ تاکہ ہم اس ریاست کو ایک فلاحی اور نمونے کی ریاست بنانے میں کامیاب ہوں —

ڈاکٹر برج پریمی

راجندر سنگھ بیدی اور ہندوستانی فلم

اردو افسانے کی کائنات کا تیسرا زاویہ بھی ٹوٹ گیا ہے۔

منٹو اور کرشن چندر کے بعد اب بیدی بھی نہیں رہے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ لوگ اردو افسانے کی آبرو سمجھے جاتے تھے اور ان کی تثلیث باعثِ افتخار۔ راجندر سنگھ بیدی کے چلے جانے کے بعد اردو افسانے کی سب سے بڑی اور صحت مند آواز اب روایت کا حصّہ بن گئی ہے۔ بیدی جب تک لکھتے رہے، ان کا بنیادی موضوع انسان کا بے کل باطن تھا۔ اُنہوں نے ہندوستانی معاشرے کو اپنے زبردست اور عمیق مشاہدے کی نظر سے دیکھ کر انتہائی بے باکی، دیانت داری اور فن کارانہ خلوص کے ساتھ پیش کیا۔ انسانی سرشت کی تہہ در تہہ پیچیدگیوں کو کفایتِ الفاظ کے ساتھ بیان کرنے میں منٹو کے علاوہ پورے افسانوی ادب میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں۔ وہ نہ غیر معمولی واقعات کا سہارا لے کر ہیجان پیدا کرتے ہیں اور نہ الفاظ کے طلسم کا جادو جگاتے ہیں۔ بلکہ انسان کی ازل تا ابد سرشت اور اس کی بے چین روح کے درد کو کہانی میں ڈھالتے ہیں۔ اردو ادب کے اس عظیم فن کار نے نہ صرف ادب کے وسیلے سے اپنے فن کی ہمہ گیری کا اظہار کیا، بلکہ فلم کے میڈیم سے بھی اسے زبان بخشی۔ اگرچہ ادبی کارناموں کی طرح ان کے فلمی کارنامے بھی نمایاں نہ رہ سکے۔ یہ کارنامے ایسے ہیں جن کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں سعادت حسن منٹو نے بیدی کی کہانیوں سے بے حد متاثر ہو کر اپنے دوست، اور کہانی کار احمد ندیم قاسمی کو ایک خط میں لکھا تھا۔

کیا راجندر سنگھ بیدی کوئی فلمی افسانہ نہیں لکھ سکتے ؟ "

یہ وہ زمانہ تھا جب منٹو مشہور فلمی رسالے "مصور" کو بھی بمبئی سے ایڈٹ کر رہے تھے اور فلمی دنیا میں ایک منشی کی حیثیت سے داخل ہو چکے تھے ان کی زبردست خواہش تھی کہ اردو کے معروف اور باصلاحیت فن کار اس چمکتی ہوئی دنیا سے فائدہ اٹھائیں اور فلم کے میڈیم سے کھری اور حقیقت آمیز باتیں عوام تک پہنچائیں۔ لہذا اس استفسار میں دراصل ان کی پُرخلوص آرزو تھی جو اس وقت بارآور نہ ہو سکی۔ برسوں بعد ۱۹۴۹ء میں جب بیدی گلیمر کے اس بظاہر جگمگاتے ہوئے ایوان میں داخل ہوئے تو سعادت حسن منٹو سینے میں حسرتیں چھپائے پاکستان ہجرت کر چکے تھے

بمبئی کی طرف رخ کرنے سے پیشتر بیدی نے حصول معاش کے لئے کئی پاپڑ بیلے تھے ڈاک خانے کی کلرکی کی، آل انڈیا ریڈیو میں قسمت آزمائی، دوسری جنگ عظیم کے بعد لاہور میں فلم کی چمچماتی دنیا میں داخل ہوئے اور کچھ عرصہ "مہیشوری فلمز" میں کام کیا۔ اور فلم "کہاں گئے" کے مکالمے تحریر کئے۔ سنگم پبلشرز کا اشاعتی ادارہ کھولا لیکن یہ سب وقتی منتظر تھا۔ وہ کوئی بڑا تجربہ، کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا چاہتے تھے اور فلم کی دنیا میں انہیں پھر اپنی بانہوں میں لینا چاہ رہی تھی۔

۱۹۴۹ء میں بیدی نے بمبئی کا رخ کیا۔ وہ اس عرصے تک اپنے فن کی تہہ داری اپنی رمزیت اور اپنے اظہار کی خلوص سے اردو فکشن میں اپنی دھاک بٹھا چکے تھے اس لئے بمبئی کی فلمی دنیا میں آتے ہی انہیں اسی طرح ہاتھوں ہاتھ لے لیا گیا جس طرح اردو کے دوسرے کہانی کاروں جیسے پریم چند، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو کو لیا گیا تھا چنانچہ ہدایت کار شانتا رام کے ایک وقت کے معاون ڈی ڈی کشیپ نے انہیں اپنی فلم "بڑی بہن" میں پرکھا۔ انہیں اسی فلم کے لئے سکرپٹ لکھنے اور مکالمے تحریر کرنے کا کام سونپا گیا۔ "بڑی بہن" اپنے زمانے کی کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس کے ریلیز ہوتے ہی بیدی ایک فلمی ادیب کی حیثیت

سے کافی نامور ہوئے۔ اور اسی طرح سے ادب کے میدان میں نام کمانے کے بعد فلم کے میدان میں بیدی نے اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ "بڑی بہن" کی کامیابی نے بیدی کے حوصلے بلند کئے اور دوسرے فلم سازوں کی نظریں ان پر جم گئیں۔ چنانچہ انہوں نے امیہ چکرورتی کی فلم "داغ" کے مکالمے تحریر کئے۔ اس فلم کے مرکزی رول دلیپ کمار ادا کر رہے تھے اس بات کے باوصف کہ بیدی کے مکالمے ان کی کہانیوں کی طرح عام روش سے ہٹ کر تھے "داغ" کامیاب ہوئی۔ اور بیدی کا نام مکالمہ نویس کی حیثیت سے صف اول کے ادیبوں میں شمار ہونے لگا۔ ان کی صلاحیت اور شہرت سے متاثر ہو کر ایک دوسرے بنگالی ہدایت کار بمل رائے اپنی آرزو دبا نہ سکے، وہ اس زمانہ میں شرت چند چٹرجی کے ناول "دیوداس" کو دوسری بار سلولائیڈ کے پردے پر اتارنے کے لئے پر تول رہے تھے جس میں ایک بار سہگل اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ بمل رائے کی اس فلم میں سہگل کے بجائے دلیپ کمار دیوداس کا رول کر رہے تھے چنانچہ ان کی نظر انتخاب بیدی پر پڑی۔ بمل رائے کی ہدایت کاری دلیپ کمار کی اداکاری اور بیدی کی جذبات میں ڈوبی ہوئی مکالمہ نگاری نے فلم بینوں نے دل کھول کر داد دی اور بیدی کے مکالمے اور چبھتے ہوئے فقرے زبان زد عام ہو گئے۔ اس فلم کے ریلیز ہوتے ہی شہرت اور دولت دونوں نے بیدی کے قدم چوم لئے۔ اس کے بعد بیدی نے ایک اور فلم "انجمان" کے مکالمے تحریر کئے۔ اور شہرت کی بلندیاں زینہ بہ زینہ طے کیں۔

اسی دور میں ایک اور شہرۂ آفاق فلم سامنے آئی "مرزا غالب"۔ اس فلم پر برسوں پہلے سعادت حسن منٹو نے ریاضت کی تھی۔ غالب منٹو کی ایک بڑی کمزوری تھی۔ انہوں نے برسوں غالب کا مطالعہ کیا تھا۔ اور آخر اس صدی کے چوتھے دہے میں غالب کی شخصیت پر ایک اچھی کہانی لکھی تھی لیکن یہ کہانی بعض وجوہ کی بنا پر ان کے قیام ہندوستان کے دوران نہ بن سکی۔ بعد میں اس کہانی پر ہدایت کار سہراب مودی نے کام کیا۔ اور برسوں بعد جب منٹو پاکستان جا چکے تھے اس کہانی کو فلمانے کا کام شروع ہوا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس بڑے کہانی کار کی اس عظیم کہانی کے مکالمے منٹو کے دوست راجندر سنگھ بیدی نے لکھے

نعیم



وزیر اعلےٰ، وزیر صحت اور وزیر مال، مرحوم مرزا افضل بیگ کی تیسری برسی پر
اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔



وزیراعلیٰ کی طرف سے دی گئی عید ملن پارٹی میں گورنر مسٹر جگموہن کی تشریف آوری

غالب جیسی شخصیت سہراب مودی جیسے ہدایت کار، منٹو جیسے کہانی کار اور بیدی جیسے مکالمہ نگار۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ فلم اپنے دور کی اہم اور کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔ مکالمہ نگار کی حیثیت سے بیدی کامیابی کی نئی منزلیں پانے لگے۔

بمل رائے بیدی کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے چنانچہ ۱۹۵۸ء میں جب انہوں نے "مدھومتی" جیسی جذبات میں ڈوبی ہوئی بے حد رومانی فلم بنانے کا فیصلہ کیا تو پہلی بار کہانی لکھنے کا قرعۂ فال بیدی کے سر آن پڑا۔ اس فلم کو دلیپ کمار کی ماہرانہ اور جذباتی اداکاری نے چار چاند لگا دیئے۔ جو اس فلم میں مرکزی رول کر رہے تھے۔ بیدی نے نہ صرف اس فلم کی کہانی لکھی، بلکہ اس کے مکالمے بھی تحریر کئے اور اس فلم میں ایک اعلیٰ ادبی معیار قائم رکھا۔ یہ دراصل بیدی کی خوب سے خوب تر کی تلاش تھی جس نے فلم انڈسٹری میں نئے گوشوں کی بازیافت کی ـــــ اس دوران بمل رائے کے معاون رشی کیش مکرجی نے علیحدہ ہو کر اپنے طور سے فلمیں بنانا شروع کیا۔ بیدی کے تخلیقی جوہر سے بھرپور فائدہ اٹھا کر مکرجی نے کئی کامیاب فلمیں بنائیں چنانچہ ستیہ کام، انوپما، انورادھا جیسی فلمیں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ ان کے پس پشت جہاں ایک طرف رشی کیش مکرجی کی ذہانت تھی تو دوسری طرف بیدی کا سدا بہار قلم تھا۔ ان فلموں نے مکرجی کو ایک کامیاب ہدایت کار کی سند عطا کی اور بیدی کو نئی کامیابیاں دیں۔

بیدی نے اپنی طویل فلمی زندگی میں تجارت اور پیسے کو اپنی منزل نہیں سمجھا۔ اس بات کے باوصف کہ ان کی کئی فلمیں سلور جوبلی منانے میں کامیاب ہوئیں، بیدی نے چاندی کے کھنکتے ہوئے سکوں کے عوض اپنا فن نہیں بیچا۔ ان کے مکالمے ہوں، کہانیاں ہوں یا منظرنامے بیدی نے ہمیشہ ادبی وقار کا تحفظ کیا۔ اپنے جگری دوست کہانی کار اوپندر ناتھ اشک کو کھنڈالہ سے ۱۹۵۷ء میں لکھا:-

"میرا فلموں کا کاروبار ایسا ویسا ہی ہے۔ فلمی پروڈیوسر ہو گیا ہوں لیکن بینک بیلنس سو روپے سے تجاوز نہ کر سکا۔ امداد باہمی کا ایک یونٹ قائم کیا ہے۔ منافع بٹ

تعمیر

جائے گا۔ لیکن اگر تصویر کامیاب ہو گئی تو کم از کم ایک ایسا ادارہ ہوگا جس میں عزت کی روٹی مل سکے گی اور سال میں ایک دو تصویریں لکھنے کے بعد ادبی کام کر سکوں گا۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فلم کا کام بیدی کے لئے محض روٹی کمانے کا مشغلہ تھا۔ وہ اسے مستقل پیشہ بنانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ مالی مشکلات سے آسودگی پاکر اپنے ادبی کام میں جٹ جانا چاہتے تھے کہ یہی ان کا اصل عشق تھا۔ اس سلسلے میں ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ایک اور خط سے ہوتی ہے۔ یہ خط بھی اشک کے نام ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"میں نے فلمی کام کو کبھی اپنا ملجا نہیں سمجھا، یہ ایک بہانہ ہے طور ادب پر پہنچنے کا۔ اگر تمہیں بھی میری بات صدق دکھائی نہیں دیتی تو مجھے افسوس ہوگا۔ ان دنوں میری کچھ تصویریں کامیاب ہوئیں۔ مجھے درجنوں کانٹریکٹ آفر ہوئے لیکن میں نے موڑ دیئے۔ بس اپنے ادارے کے لئے لکھوں گا اور کسی کے لئے نہیں۔"

یہی سبب ہے کہ اس موڑ تک آتے آتے بیدی نے اپنی ادبی دلچسپیاں ختم نہیں کیں۔ درجنوں کانٹریکٹ رد کر دیئے اور اپنے آپ کو پیسوں کا غلام نہیں بنایا۔ بیدی نے حسب سابق بہت کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا، اس میں ان کے مشاہدے کا خلوص اور ضمیر کی ماںتا کی شامل تھی۔ انہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور طاقتور کہانیاں لکھیں لیکن یہ بیدی کی کم نصیبی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کے ناخداؤں کی کور ذوقی تھی کہ ان کی طبع زاد کہانیاں جنہوں نے ایک دنیا سے خراج حاصل کر لیا تھا، نظر انداز ہو گئیں۔ اور تجارتی مقاصد کے پیش نظر ان کو فلمانے کا خطرہ کسی بھی صاحب نظر نے مول نہیں لیا۔ بہت بعد کے دنوں میں مشہور فلم اداکارہ گیتا بالی نے ان کے مشہور ناولٹ "ایک چادر میلی سی" کو اپنے مرنے سے سلولائیڈ کے پردے پر اتارنا چاہا۔ لیکن موت نے اس کی اس آرزو کو پورا ہونے نہیں دیا۔ اور یہ فلم رہ گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پاکستان میں اس کہانی کو فلمایا گیا۔

۱۹۵۵ء کے آس پاس بیدی نے اپنی مشہور کہانی "گرم کوٹ" کو فلمی روپ دینے کا تجربہ

لعمیر

کیا۔ چنانچہ بلراج ساہنی، نروپا رائے اور جینت جیسے مشہور ستاروں کو لے کر یہ فلم بنائی گئی۔ اس فلم نے سنجیدہ فلم بین طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ گرم کوٹ کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی حالانکہ فلم حقیقت آمیز تھی۔ اس تجربے نے مالی لحاظ سے بیدی کو مفلوج کر دیا۔ اس کا ذکر اوپندر ناتھ اشک کے نام ایک خط میں یوں بیان کرتے ہیں:۔

"گرم کوٹ کی وجہ سے اپنے ادارے کو ستر ہزار کا گھاٹا پڑا ہے۔ لمیٹڈ ادارہ ہونے کی وجہ سے مجھے ذاتی طور پر کوئی خسارہ نہیں ہوا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اپنی محنت رائیگاں گئی۔"

اس فلم کی ناکامی سے بیدی بددل ضرور ہوئے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ عام لوگوں نے اس فلم کو رد کر دیا لیکن سنجیدہ حلقوں میں اسے سراہا گیا۔ اور اس نے سینما کے لیے ایک فضا تیار کی۔ بیدی کی اس ناکامی سے انہیں کافی حد تک فلمی مشاغل سے دور رکھا لیکن روزی روٹی کے مسئلے نے انہیں پھر اس طرف کھینچ لیا۔ ایک اور جگہ اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

"فلمی دنیا کو تم جانتے ہو۔ گرتے کو اور لاتیں لگا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں کام کرتا ہوں لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں اور پیسے روک لیتے ہیں۔ اچھی تصویر بنانے چلے تھے، الٹا اگلے کام سے بھی گئے۔ اب تو جائے رفتن نہ پائے ماندن" والی بات ہے۔ اگر میں ادبی کاروبار کرنے کی کوشش کروں بھی تو اس کے لیے پیسے چاہییں۔ کاروبار کے لیے نہیں تو کم سے کم اپنے آپ کو اور بال بچوں کو سپورٹ کرنے کیلئے۔"

بیدی نے اپنے ریڈیو ڈراموں کو فلمانے کا تجربہ بھی کیا۔ "دستک" ایک ایسی ہی فلم ہے جو ان کے مشہور ریڈیو ڈرامے "نقل مکانی" کا فلمی روپ ہے۔ اس فلم میں بیدی کہانی کار کے ساتھ ساتھ ہدایت کار اور فلم ساز کی حیثیت سے بھی سامنے آئے۔ یہ فلم نئے سینما کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ نئے سینما میں فرد کی داخلی کیفیات اور انسانی رشتوں کی باریکیوں کو محوری حیثیت حاصل ہے۔ اس کے توسط سے انسان کی محرومیوں

تعمیر

اس کی آرزومندیوں، اس کی کوتاہیوں اور دبے ہوئے احساسات کو داخلی اور خارجی طور پر سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ اس طرز کی فلموں میں غیر روایتی طرز اظہار پایا جاتا ہے۔ اس لئے ایسی فلمیں ایک آزادانہ اور غیر رسمی انداز نظر کی حامل ہونے کے ساتھ ایک نئے آہنگ کو پیش کرتی ہیں۔ ہندوستانی صنعت فلمسازی میں یہ نئی آواز مشہور بنگالی ہدایت کار مرنال سین نے اپنی فلم "بھون شوم" نے ۱۹۶۸ء میں دی۔ یہ آپ فلم کا جادوئی اثر تھا کہ اس کے بعد کئی فلمیں اس طرز پر بنیں اور ہندوستانی فلم کی دنیا میں ایک تحریک کا آغاز ہوا۔ لیکن اس نئی فضا کے لئے بیدی کے گرم کوٹ نے بنیادی رول کیا تھا۔ "دستک" اس سلسلے کی اہم کڑی ثابت ہوئی۔ دستک نے انسانی رشتوں کے پس منظر میں انسانی کردار کے اعلیٰ اور ارفع پہلوؤں کا تجرباتی مطالعہ پیش کیا۔ خواجہ احمد عباس کے مطابق یہ ایک چونکا دینے والی تجرباتی فلم تھی، جس میں نہ گلیمر بولائے تھا۔ اور نہ بڑے چہرے لوگ، اس میں کئی نئے چہرے سامنے آئے، خاص طور پر سنجیو کمار اور ریحانہ سلطان جیسے نئے چہروں نے پوری فلم انڈسٹری میں ہلچل مچادی بیدی نے خود اس فلم پر یوں اظہار خیال کیا۔

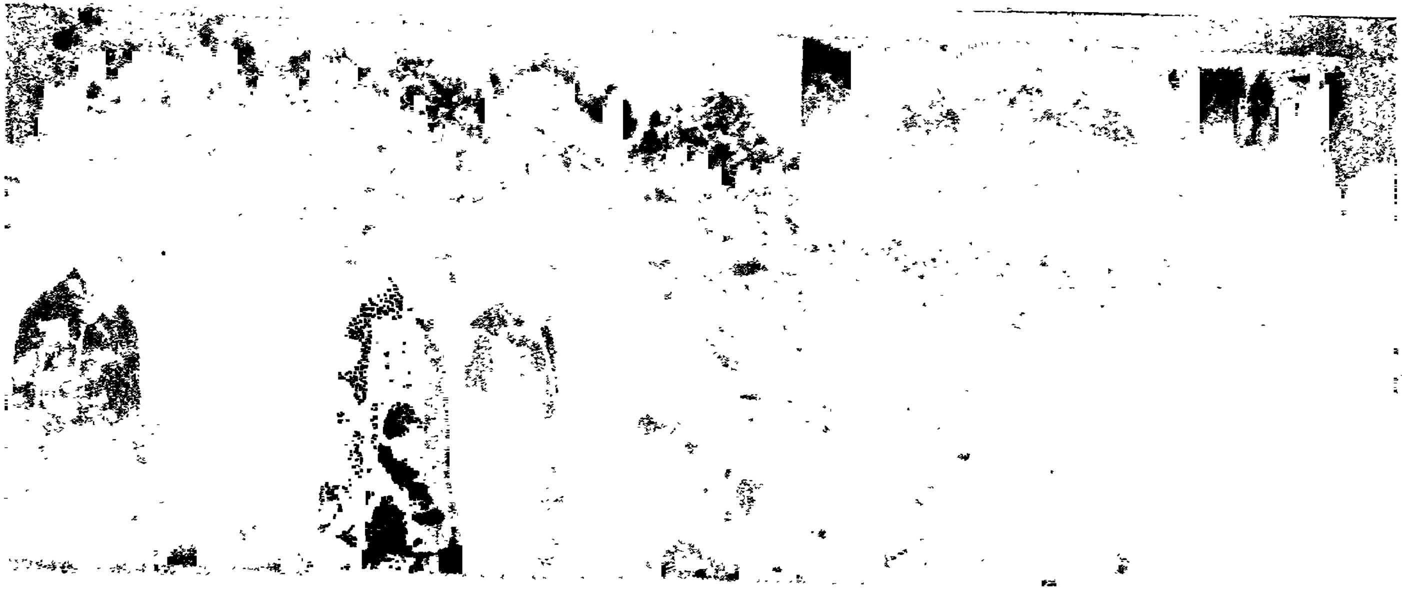
> "اپنی فلم دستک کے ذریعے میں نے لوگوں کے روایتی سماجی اقدار کے دروازے پر دستک دی ہے، ان کے ضمیر کو جگایا ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں ناظرین کو اچھی فلمیں پسند کرنے کے لئے تیار کرسکوں، میرے نزدیک ان کی فلم دیکھنے کی سطح ایک اینچ بھی اٹھتی ہے تو میری فلم کامیاب ہے۔"

اس اقتباس سے دستک فلمانے کا مقصد واضح ہے کہ وہ تجارتی مفاد کو بنیادی اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ فلم بین طبقے میں "فلم شناسی" پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ دستک نے بیدی کو شہرت کی اونچی منزلوں سے ہمکنار کیا۔ ان کی صلاحیتوں کے اعتراف میں سرکار نے انہیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ اس کے بعد بیدی نے رنگولی، پھاگن اور آنکھیں دیکھی جیسی فلمیں لکھیں۔ آخری فلم غالباً ابھی تک ریلیز نہیں ہوئی یہ سب فلمیں زیادہ کامیاب نہ رہیں،

لیکن



ماحولیات سے متعلق عالمی دن کے موقع پر وزیر صنعت مسٹر ثناء اللہ ڈار
گورنمنٹ ہائی سکول امیرا کدل میں منعقدہ ایک سیمینار سے خطاب کر رہے ہیں۔



وزیر جنگلات منشی حبیب اللہ بانڈی پورہ میں سوشل فارسٹری کی ایک نرسری
کا معائینہ کر رہے ہیں۔

بیدی نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کو کم و بیش پچاس فلمیں دیں۔ اور یہ بات بذاتِ خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

بیدی کا ادب اور بیدی کی فلم ایک دوسرے میں پیوست ہے، ادب سے بیدی نے فلم کو بہت کچھ دیا لیکن فلم سے بھی ادب کے لئے سوغات لے آئے۔ اس کا اعتراف بیدی خود کھلے بندوں کرتے ہیں:۔

"اب میں نے مفرس اور معرب الفاظ کا دامن شعوری طور پر چھوڑ دیا ہے جس کے لئے مجھے فلم کا ممنون ہونا چاہیئے۔"

ایک اور جگہ اعتراف کرتے ہیں:۔

"اس کے علاوہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا کرنے کا ہنر میں نے فلم سے سیکھا۔"

اس اعتراف سے کہانی کار بیدی کی اختصار پسندی کی طرف نظر جاتی ہے جس نے انہیں اردو کا عظیم کہانی کار بنایا۔ اختصار سے تاثر کی وحدت قائم کرنے میں منٹو کے بغیر پوری اردو دنیا میں ان کا کوئی ہم سر نہیں۔"

آج اردو کا یہ عظیم فن کار جس نے ادب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فلم کو بہت کچھ دیا۔ ہمارے درمیان میں سے اٹھ گیا ہے، لیکن ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کے فلمی کارناموں کو بھی مدتوں تک یاد کیا جاتا رہے گا۔

ڈاکٹر منتظر اعظمی
شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں توی

شعری افق کا روشن تارہ ° عابد مناوری

کسی نے پوچھا جموں و کشمیر کے آج کے ایسے شاعروں کا نام بتلایئے جن کا ذکر اردو کی کسی بھی ادبی محفل میں فخر اور مسرت سے کیا جا سکے۔ میں نے کہا حکیم منظور۔ اس نے کہا 'اور' میں نے کہا عابد مناوری۔ اس نے کہا 'ثبوت' میں نے کہا اس کے اشعار۔ اس نے کہا تفصیل۔ میں نے کہا جو عابد مناوری کو نہ جانتا ہو مجھے اس کے علم کی وسعت پر شک ہے۔ اس نے کہا آپ ہی کچھ فرمایئے۔ میں نے کہا وہ ایک چوتھائی صدی سے شعر کہہ رہا ہے۔ مگر اس عرصے میں اس کے شعروں نے خواہش کرنا شروع کر دیا ہے کہ مجھے ضرور کہو۔ ۱۹۵۸ء میں اس کا سفر شروع ہوا اور تین ہی سال کی مدت میں 'بہار غزل' وجود میں آگئی۔ اس مجموعے کے شعروں میں جوش ملسیانی کی کلاسیکی اور استادانہ روش شعر کی پرچھائیاں روشن تھیں۔ اس کی فکر کے خط مستقیم کے دوسرے رومانس اور خمریات تھے۔ سادہ شعروں میں پیار کے چوچلے اور تغزل سے چھیڑیں لڑانا ہی ان کا امتیاز تھا —

مگر ۶ سال بعد جب ۱۹۶۷ء میں 'شمیم گل' نے فکر کی یادِ حیا کے ساتھ اٹھکھیلیاں کیں تو شاگرد میں اُستادانہ پختگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ وہ ریاست کا ایک بڑا شاعر تھا۔ ریاست کے صفِ اوّل کے شعرا میں اس کا شمار تھا۔ اس کے باوجود وہ اُستادی شاگردی والی شاعری اور لفظی اصلاح کی گرفت سے آزاد نہ تھا۔ اس کی دو ڈراب بھی ہے غلانے تک تھی۔ مگر ~~جیسے جیسے~~ شعر کی معنوی جہتوں کی مختلف تہوں کا شعور بڑھتا گیا اس کے شعروں میں 'اس کے لب و لہجے میں' اس کے ڈکشن میں فکر انگیز تبدیلیاں رونما ہوئیں اور سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے والا عابد 'لکیر پیٹنے سے پہلے ہی سانپوں کے سروں کو مٹھی میں دبائے نظر آیا۔ اس کے یہاں ایک نیا انداز' فکر کی نئی لو' الفاظ کا روشن اور مسرت بخش استعمال نظر آیا اور وہ نہ صرف جوش اسکول کے لفظیاتی کنوئیں سے نکل آیا بلکہ جدید عصری حسیت اور نئے اندازِ فکر کے ساحلِ سمندر پہ کھڑا دکھائی دیا اور اس طرح کہ یہ وہاں تنہا تھا۔ صفِ اوّل کے ہم انداز دوسرے شاعر پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ حیرت سے میرا منہ دیکھتے رہ گئے اور میں نے شعری مجموعہ "برجستہ" ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

کیوں نہ ہو درخورِ سزا عابد
اس کا ہر طور باغیانہ ملا

ابتدا میں بلکہ "برجستہ" تک کے کئی شعروں میں جلسیانی اسکول کا کلاسیکی رنگ چوکھا تھا۔ جس میں شعر کے سولہ سنگھار اور نک سک پر زیادہ زور ہوتا تھا۔ فکر کی گرمی سے عموماً بچا جاتا تھا اس لئے کہ آبگینہ ہی کہیں پگھل نہ جائے۔ بصیرت کی کمی کو بصارت کی شوخی سے پورا کر لیا جاتا تھا۔ زندگی کی معمولی اور سطحی سچائیاں شعروں کے چہروں پر مہاسوں کی طرح نظر آتی تھیں جن کو عموماً اسلوب کی چاشنی اور لفظوں کے حسنِ استعمال کے انگوچھوں سے چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس وقت وہ ایسے ہی اسکول

تعمیر

اور انسانی لوگوں میں گھرا ابھی ہوا تھا مگر جب سے اس نے باغی اور منحرف اہل علم کی صحبت اختیار کی اس کے شعروں کی گلی بنائی ہوئی بتیاں بھڑک کر لو دینے لگیں اور اب وہ زندگی کی معمولی سچائیوں کو بھی سچائیوں کی مختلف جہتوں اور پرتوں کو اُلٹنے پلٹنے میں منہمک نظر آتا ہے۔ اس کے یہاں آج کے انتشار زدہ سماج، اس کی بخشی ہوئی محرومیوں، دوپہر کی جھلستی ہوئی دھوپ میں حقیقت کا سنولائے ہوئے چہروں کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ اب اس کی رومانیت میں بھی عصری حسیت کا پرتو سایہ گستر ملتا ہے ۔

یوں خیال آتا ہے اس کا، یاد آئے جس طرح
گرمیوں کی دوپہر میں شام کی ٹھنڈی ہوا
اور ابھی سُلگیں گے ہم کمرے کے آتش دان میں
اور ابھی کہسار سے اترے گی برفیلی ہوا

عابد مناوری کے شعری ارتقا کے سفر کی دو تین تبدیلیوں کا ذکر خاص طور سے کروں گا
بہار غزل' اور شمیم گل' کے عابد میں اور 'برجستہ' کے عابد مناوری میں نمایاں فرق ہے۔ اس کے یہاں پیار کے سطحی ناز و نخرے والے اور خمریات کے مضحک شعر خال خال ہی ملتے ہیں۔ اب پیار کی گرمی کو سماجی حقیقتوں کی یخ بستگی نے راکھ بنا کر گوندھ ڈالا ہے۔ جس نے شعر کی پہلے والی الھڑ دوشیزہ کو سنجیدہ گرہستن بنا دیا ہے ۔

کھیت بنجر، پیڑ ننگے، سب کنوئیں بے آب ہیں
جب سے پکے ہو گئے گاؤں کے کچے راستے
گم رہی کا بے جہت صحرا ہے تا حدِ نظر
کر دیئے ہیں بے نشاں تند آندھیوں نے راستے



قانون ساز اسمبلی کے سپیکر مسٹر منگت رام شرما ایک اخباری کانفرنس سے
خطاب کر رہے ہیں -



جیالوجی، مائننگ اور اطلاعات کے وزیر سردار رفیق حسین خان افسروں کے
اجلاس سے خطاب کر رہے ہیں۔

ہم عشق تجھے بہت کال پہ لیکن خبر نہ تھی
پوشیدہ بجلیاں بھی ہیں کالی گھٹاؤں میں

تنہا بدل چکا ہوں میں اتنا تو جان لوں
پھر آج میرا روپ تو پھر کر دکھا سکے تجھے

کی کلی بھی پھول ہمیلیوں سے کم نہ تھی
میرا حسین سمجھ کر میں کیوں کر پلٹ گیا

سماجی نابرابری … ناانصافی، محرومی اور آشفتگی، ظلم اور دھاندلی، کیڑا الجھ گئی، مشینوں کی غلامی اور موت کے دبے قدموں کی دستکوں کے اندیشے بھی سے اس کے حساس ذہن کی لرزشوں کا پتہ چلتا ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ … "معشوق" میں الجھا رہنے والا شخص اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گیا ہے۔ کیا دہشت کے لمحوں نے یادوں کے عشق کے تار و پود کو بکھیر دیا ہے۔۔

صرف اس جرم پہ دکھا گیا پیار … مجھ کو
میں نے چاہا تھا کہ ہر ہاتھ میں ساغر پھول

وہ شہر کا رئیس ہے مجھ کو ہو اعتبار
سب کو حساب اور اپنے عمال حساب لکھ

کس میں ہمت تھی بیان دیتا جو سچ کے خلاف
رات کے ساتھ ہی الزام دن کے قتل کا

میں ہوں مجبور کہ ہوں تحصیل کا قصبہ ورنہ
موت در موت جو اترا ہوا بہت … اور

کر دیا سب کو اپاہج دوپہر کی دھوپ نے

کس کی انگلی تھام کر چلتی یہ بے چاری ہوا!

اپنا خالی چہرہ لے کر پھر رہا ہوں شہر میں

وہ مری پہچان بھی مجھ سے جُدا کر لے گیا

دن میں سورج کی شعاعوں سے بدن جھلسیں گے

رات کو چاند بھی یخ بستہ بچھونے دے گا

آسمان سے آسمان اُگے سورج

میرے آنگن میں تیرگی ہی رہی!

بے عملی کی جگہ عمل کی عظمت کا احساس، راہبانہ کنڈلیوں میں مہنت بن کر بیٹھنے کے بجائے مذہبی استحصال سے نفرت بلکہ خدا بیزاری، عشق کے گھروندوں کی تعمیر کے محل میں ماحول اور ارد گرد کے حالات کا احساس، شیخ سے جنگ کے بدلے صلح کل کی کیفیت، محبوب کے سنگِ آستان سے سر پھوڑنے کے بجائے احساس ذات اور خودداری سے تعلق ذات اور خودداری سے تعلق، یہ وہ تبدیلی ہے جس کا احساس اس کی 'برجستہ' کی شاعری سے ہوتا ہے۔

کچھ عجب لذت عذابِ آبلہ پائی میں ہے

ورنہ ہم کیوں منتخب کرتے کٹیلے راستے

کیا نئے کیا ان گنت صدیوں پرانے راستے

اُس کا گھر اُجڑا ہے اور اندھے ہیں سارے راستے

میں اسی دن کے لئے زندہ تھا شاید

خود کو اپنے گھر میں بے گھر دیکھتا تھا

جب سے ہمارے شہر میں سورج مقیم ہے

ہم روشنی کی ایک کرن کو ترس گئے

تغیر

کئی برس سے ہم ایک آنگن میں رہ رہے تھے
یہ آج دیوار آ گئی درمیان کیسی

دشت بلا میں گھوم بگولوں کے ساتھ ساتھ
چلتا ہے کیسے وقت کا چکر بھی دیکھ لے

سچ بات کہنے کے لئے اپنی زبان کھول
پھر کس طرح سے آتے ہیں پتھر بھی دیکھ لے

آفتاب اپنی انا کا ہوں میں
اپنی ہی آگ میں جلتا ہوں میں

یوں تو میرے ساتھ تھے کئی میدان میں
میں اکیلا ہی مگر دشمن کے لشکر سے لڑا

عابد خاوری صاف ستھرے ذہن اور سادہ زندگی کا قائل ہی نہیں عامل بھی ہے اس کا تعلق مادر سے ہے مگر اس کی پرورش شہروں میں ہوئی۔ پھر بھی وہ دیہات کی سادہ زندگی سادہ [illegible] معصوم محبت اور پیپل کی ٹھنڈی ہواؤں کو نہیں بھولا یہ اس کا تحت الشعوری عمل ہی ہے کہ وہ پیپل کے درخت کا ذکر بار بار کرتا ہے۔

اس نے لکھ بھیجا ہے یہ پیپل کے پتے پر مجھے
کیا تجھے راس آ گئی بجلی کے پنکھے کی ہوا

سرسبز کھیتوں، کبھی پیپل کی چھاؤں میں
ہم گاؤں میں تھے جیسے ہوں پنچھی فضاؤں میں

جہاں کل تھا آسیبوں کا مسکن
اس پیپل پر اب جھولے پڑے ہیں

کوئی جھولا نہ پڑا پیپل پر
اب کے بے رنگ ہی گزرا ساون

مگر شہر کی پُر فریب اور متعدد چہروں والی زندگی اسے کشمکش ہی میں مبتلا نہیں کرتی اس کے وجود تک کو بے وجود کر ڈالتی ہے۔

ہر لحظہ تشنگی مری بڑھتی چلی گئی
میں قطرہ قطرہ کر کے سمندر نگل گیا

اپنے ہونے کا تجھے احساس اگر ہو جائیگا
معتبر نظروں میں تو نا معتبر ہو جائیگا

بے جہت صحرا میں اے عابد نہ ہاتھ آئیگا کچھ
رفتہ رفتہ خود بھی تو گردِ سفر ہو جائیگا

چاروں طرف فضا میں ہے بکھرا ہوا دھواں
اس چمنیوں کے شہر میں تازہ ہوا کہاں

تم آج پہلی بار میاں آئے ہو یہاں
صحراؤں میں تو روز ہی چلتی ہیں آندھیاں

عصری حسّیت کے اس شدید احساس نے ان کے شعروں کے مزاج، لب و لہجے اور ڈکشن کو بھی بدل ڈالا۔ اور اس طرح کے شعر کہنے والا شاعر

وہ جو زحمت اٹھائیں آنے کی
جاگے قسمت غریب خانے کی

بڑھ گئی اور بے قراریِ دل !
جب خبر آئی ان کے آنے کی

ساری دنیا تھی نظر سے اوجھل
سامنے تیرا سراپا تھا فقط
تم یہ کیا سوچ رہے ہو عابد
اس نے تو نام ہی پوچھا تھا فقط

گردوں میں برف کی مانند جلتے سورج پر
زمین کا کرب وہاں بھی اتار کر دیکھوں
کتابیں، ریڈیو، اخبار، گھر کے ہنگامے
کب اپنے ساتھ میں کچھ پل گزار کر دیکھوں

شہر کی بھیڑ میں کھو بیٹھوں نہ میں اپنا وجود
خود کو گھر ہی میں رکھوں، باہر اکیلا جاؤں

میں ایک بے نام سی اذیت میں مبتلا تھا
تھا برف سارا بدن مگر ذہن جل رہا تھا

دوپہر کی لو سے کمرے کو بچانے کے لئے
"صبح کی ٹھنڈی ہوا" سب کھڑکیوں پر رکھ دیا

پیروی گوتم کی کرنا اس قدر آساں نہیں
زندگی کو چشم عبرت سے کبھی دیکھا نہ کر

جس کے یہاں بیشتر زاہد کے سر پر ایک جھلسانے والی بات تھی اور گردش دوران کے راہ روکنے کے سبب میکدے میں ٹھہرنا مزدری تھا۔ اس کو عصری حیثیت اور سماجی حقائق کے شعلوں نے اس کی روح تک کو جھلسا کے رکھ دیا ہے۔

ہے عجب کربِ قلم اے عابد
جو نہ لکھنا ہو وہ اکثر لکھنا!

ایسا موسم کبھی نہ دیکھا تھا
شاخ سرسبز، پھول زرد ہوئے

ہم آپس میں مزاجاً مختلف تھے
یہی اک بات تھی جو مشترک تھی

اپنی ہی نظروں سے تو خود بھی گر گئے ہیں
اس قدر نزدیک سے ہر شخص کو دیکھا کر

دشت در دشت دوڑتی سڑکیں
شہر در شہر پھیلتا جنگل

عابد مناوری زندگی اور اس کی صداقتوں کا شاعر ہے۔ پہلے اس کی شاعری میں زندگی کی سطحی اور معمول کی سچائیاں تھیں مگر اب حقیقت کی گہرائیوں تک اس کی رسائی ہونے لگی ہے۔ اسے زندگی اور اردو شاعری دونوں کی تبدیلی کا احساس ہے اس لئے تو اس کا قول ہے کہ

عابد لغت پہ جمتی گئیں گرد کی تہیں
ہر لفظ اپنے رشتۂ معنی سے کٹ گیا

اور
ذہن فرسودہ دائروں کا اسیر
آنکھ تازہ مشاہدات میں ہے

اسے اس کا بھی احساس ہے کہ وہ جس ماحول اور جس دائرہ علم سے آیا ہے وہاں قدامت زندگی کی حکمرانی تھی مگر زندگی کے تنوع اور تازہ مشاہدات نے اسے اپنا

تعیر

راستہ بدلنے پر مجبور کر دیا ـــــ

اُتنی دشوار نہ تھی منزلِ مقصود مگر

ہم نے دانستہ بدل ڈالا ہے رستا اپنا

اس کے یہاں علامتوں کا اکہرا استعمال ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سادہ گوئی اور سادگی کا قائل ہے ـــ اس بات کا بھی احساس ہے کہ حالات اور ماحول نے اسے نصابی علم اور مطالعے کی وسعتوں سے ہم کنار نہ ہونے دیا۔ جس کے سبب اس کے سخن کو معنیوں کی دھوپ ہی ملی ـــ لفظِ سایہ دار اس کے قبضے میں نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں بے جہتی، صحرا، سمندر، تنہائی، کرب، آذر، پتھر، وجود، آندھی، شاخ اور پھول جیسے لفظوں کا اکہرا ہی استعمال ملتا ہے۔ مگر اس کی سادگی میں بھی ایک طرح کی پُرکاری کا احساس ہوتا ہے وہ اگر پیچیدہ ترکیبوں کو استعمال بھی کرتا ہے تو معنیوں کی دھوپ اس کے قدموں کی زنجیر بن جاتی ہے اور ریتیلے پتھر، صحرائے خامشی اور تیشۂ آذر جیسے مرکب الفاظ میں معانی کی جہتیں پوری طرح روشن نہیں ہو پاتیں۔ کہیں کہیں لفظوں کا عجیب استعمال گراں بھی گزرنے لگتا ہے۔ مثلاً

ناموسِ عشق پر کبھی آنے دیا نہ حرف

گو روز پیلنا پڑا کوہِ گراں مجھے

نگل چکا ہوں میں خود ہی تمام قوسِ قزح

تباہ کر گیا رنگوں کا کاروبار مجھے

عجیب شور ہر سو ہے پھیلا ہوا

سناٹا سنا ایک جیسا ہوا

کوہِ گراں پیلنا، رنگوں کا کاروبار اور شور کا پھیلا ہوا ہونا اپنے سیاق و سباق

تیمر

میں بے معنی ہو کے رہ گئے ہیں پھر بھی اس کے یہاں تبدیلی کے نتیجے میں لب و لہجہ بھی خوشگوار ہوا ہے اور لفظیات کی معنویت بھی۔ بجلی کے پنکھے، کتابیں، ریڈیو، اخبار گھر کے ہنگامے، زندگی کے مسائل، حالات کا جبر، نا الفاقی، نابرابری اور اسی طرح کی دوسری صداقتیں اس کے شعروں میں زہر غم کی طرح رواں دواں ملتی ہیں۔ جو اس کا احساس دلاتی ہیں۔ کہ عابد مناوری کہاں سے کہاں اگر پہنچا بھی ہے تو اس میں اس کی اپنی صلاحیتوں کا دخل زیادہ ہے۔ کسی استاد یا کسی اسکول کا فیض نہیں۔ آج وہ ریاست ہی نہیں بیرون ریاست کے بھی اہم شاعروں میں شمار ہوتا ہے اور اردو شعروں کے کسی بھی انتخاب میں اس کے شعر ضرور جگہ پا جاتے ہیں اور اب تو ہر ایک کی زبان پر ہے۔ ؎

ہم تو کچھ اور ہی سمجھتے تھے
عابد اک صاحب قلم نکلا

●●



نائب وزیراعلیٰ مسٹر دیوی داس ٹھاکر یوم آزادی منانے کے سلسلے میں
کیے جانے والے اقدامات سے متعلق اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں۔



مرکزی وزیر صحت مسز محسنہ قدوائی سری نگر میں ایک اخباری کانفرنس سے خطاب کر رہی ہیں

ملا محمد امیر کشتواڑی
اکاؤنٹس آفیسر مکینیکل ٹرانسپورٹ آفس و سرا دس جموں (توی)

رسا جاودانی کی شاعری

جہانگیر نے وادیٔ کشمیر کو فردوس کا نام دیا۔ اگر میں بھدرواہ کی خوبصورت وادی کو کشمیر صغیر یا چھوٹا کشمیر کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ بھدرواہ کی قدرتی خوبصورتی سے زیادہ مجھے گلستانِ ادب کے وہ خوش نما پھول پسند ہیں جو رسا جاودانی مرحوم نے اپنی غزلیات اور منظومات کی شکل میں باقی رکھے ہیں۔ رسا صاحب نے بقول مرحوم شیخ محمد عبداللہ ـــ "اردو اور کشمیری شاعری میں فکر کے نئے چراغ روشن کئے ہیں۔" انہیں رسول میر ثانی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اس شاعر کے رنگ کو انتہائی پسند کرتے تھے اور انہوں نے خود بھی میر کے رنگ میں شعر کہنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ نیرنگ غزل ان کے کشمیری شعروں کا ایک مقبول ترین مجموعہ ہے۔ جناب عبدالغنی مشتور بانہالی صاحب نیرنگ غزل پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ـــ "نیرنگ غزل ۱۹۴۷ء کے بعد پیر پنچال کے اس طرف کی کشمیری غزل کی ایک نرالی اور پیار بھری آواز ہے جسے ریاست جموں و کشمیر کے کشمیری بولنے والے حلقوں میں زبردست

تعمیر

داد و تحسین نصیب ہوئی ہے۔" رسا صاحب کی اردو شاعری کی کتاب "نظم ثریا" کے نام
سے ۱۹۶۴ء میں چھپ گئی جس کی بدولت انھیں ملکی سطح پر شہرت کا شرف حاصل ہو گیا۔

رسا جاودانی ۱۹۰۱ء میں بھدرواہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد صاحب کا نام خواجہ محمد منور تھا۔ رسا صاحب کے جد اعلیٰ اسلام آباد (اننت ناگ) سے تجارت کے سلسلے میں بھدرواہ آئے تھے۔ آب و ہوا کی موافقت اور تجارت میں ترقی کے سبب اُنھوں نے وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ رسا صاحب نے گھر پر ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اُن ہی دنوں بھدرواہ میں پہلا مڈل سکول قائم ہوا۔ اُنھوں نے اس مڈل سکول میں آٹھویں جماعت تک پڑھائی کی۔ اس کے بعد اُنھوں نے بحیثیت پرائیویٹ امیدوار پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا امتحان پاس کیا ۱۹۷۵ء بکرمی میں رسا صاحب نے لکڑی کا کاروبار شروع کیا جو چھ سال تک جاری رہا لیکن تجربہ کم ہونے کے نتیجے میں انھیں تیس ہزار روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ آخرکار مرحوم نے ۱۹۸۲-۸۳ء بکرمی میں مقامی ہائی سکول میں بیس (۲۰) روپے ماہوار پر فارسی مدرس کی حیثیت سے سرکاری ملازمت کا آغاز کیا۔ انھیں کسی اور سکول میں تبادلہ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۵ء میں وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر پنشن پر چلے گئے۔ اس کے بعد بھی رسا صاحب کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں اور کافی علالت کے بعد ۲۷ مئی ۱۹۷۹ء میں بھدرواہ میں انتقال کر گئے۔ انھیں قصبہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا اور ہزار ہا شیدائی نماز جنازہ میں شامل ہوئے۔ اس موقع پر ریاستی کلچرل اکادمی نے اپنے اردو رسالہ "شیرازہ" کا رسا نمبر جاری کر کے مرحوم کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

رسا صاحب اردو شاعری کی دنیا میں ایک زبردست نازک خیال اور صاحب زبان قلم کار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اردو شاعری ہی سے اپنا ادبی سفر شروع کیا اور ۱۹۲۴ء میں اُن کا کلام جموں کے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتا رہا

تعمیر

جب کہ لاہور کے رسالہ "مخزن" میں بھی اُن کا کچھ کلام چھپتا رہا۔ وہ اردو زبان سے
اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ایک کشمیری غزل کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

چھُہ رسا ہس دسگاہ یوّدٕ کاشرس منز
زبان محبوب چھُس ہندوستانی

(یعنی رسا کو کشمیری زبان پر خاصی دسترس حاصل ہے لیکن اُس کی محبوب
زبان اُردو ہی ہے)

"نظم ثریا" میں شامل اُن کی نظم "اردو" اُس محبت کو ظاہر کرتی ہے جو اُن کے دل
میں اس میٹھی زبان کے لئے موجزن تھی۔ نظم اُردو کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

کیسی پیاری زبان ہے اردو
ہے ادب جسم، جان ہے اردو
لعل و گوہر کا یہ خزانہ ہے
یا جواہر کی کان ہے اردو
نثر میں گلستان ہے یکسر
نظم میں بوستان ہے اردو
ناز اس دیس کو اسی پر ہے
فخرِ ہندوستان ہے اردو

رسا صاحب کی نظموں کا ایک عمیق مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم کو
فطرت کے ساتھ زبردست لگاؤ تھا اور اُن کا حساس دل بات بات پر تڑپ اُٹھتا
تھا۔ کبھی انہیں بچپن کی یادیں مانوس کرتی ہیں اور کبھی برف باری اور ساون کے مناظر
دل کشی کے باعث بنتے ہیں۔ وہ واقعہ نگاری، جذبات نگاری اور منظر نگاری بہ

غاصی مہارت رکھتے تھے ۔ زبان کی سادگی، سلاست، روانی اور جاذبیت ایسی نمایاں خصوصیات ہیں جو عام شاعروں کی قسمت کی بات نہیں ہے ۔ اُن کی نظموں میں بچپن کی یاد، ساون، صبح زندگی، برف باری اور طوفان وغیرہ قارئین کو کافی متاثر کرتی ہیں ۔ نظم "طوفان" پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد اسداللہ وانی لکھتے ہیں ۔ " اس نظم کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے وقت شاعر جیسے ہیلی کاپٹر میں بیٹھا تمام واقعات دور بین سے دیکھ رہا ہے اور ایک ذمہ دار اور حساس مصور کی طرح تصویریں کھینچ رہا ہے ۔"

لیجئے ان نظموں کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں ۔

" بچپن کی یاد "

لڑکپن گیا ہمیں جوانی کے دن
کہاں اب فراغت کے وہ سال وسن
وہ بچپن کی معصوم تھی زندگی
کہ ہر وقت رہتی تھی فرسندگی
نہ تھا مجھ کو کھانے کا پینے کا غم
مگر اب تو ہے اک زمانے کا غم
ستاتی نہ تھی کوئی دُنیا کی بات
تھی مکتب سے گھر تک مری کائنات

•

"ساون"

ساون کی رُت ہے آئی
کالی گھٹا ہے چھائی
ٹھنڈی ہوا
کیا دل فزا
ہے اسے سما
تسکین دل نے پائی
ساون کی رُت ہے آئی

•

"صبحِ زندگی"

ایک بچے نے خواب کیا دیکھا
کہ وہ بچے سے ہوگیا بوڑھا
زندگانی کے سب مراحل سے
ایک لمحے میں رات کے گذرا
اب وہ رو رو کے یاد کرتا ہے
سن لڑکپن کا دن جوانی کے
ہائے خواب و خیال تھے گویا
دور دونوں یہ زندگانی کے

•

"برف باری"

دو دن سے جاری
ہے برف باری
یہ شان باری
یہ کوہ گار ے
وادی ہماری
چاندی کی ساری
گُن سُسر کے بن میں
میرے وطن میں
ہے برف باری
دو دن سے جاری

•

"طوفان"

اک کم نصیب بڑھیا
اک غم نصیب بڑھیا
ہے ہے غریب بڑھیا

باہر کا شور سُن کر
نکلی جو گھر سے باہر
آغوش میں تھی دُختر

نکل تھی بھاگ جا کے

غم سے نجات پا کے

معصوم کو بچا کے

لہروں نے آ کے گھیرا

لو چھا گیا اندھیرا

یہ لوہے کو پیج ڈیرا

٥

رساصاحب نے کچھ گیت بھی لکھے ہیں ۔" صحرائی پھول بیچنے والی لڑکی کا گیت " کے کچھ اشعار پڑھیئے تو پتہ چلے گا کہ شاعر کو فطرت کے ساتھ کس قدر اٹوٹ نسبت تھی ۔

لے لو یہ صحرائی پھول

لے لو یہ صحرائی پھول

توڑ کے ان کو لائی بن سے

دور ہیں یہ مجبور وطن سے

ان پہ پڑی ہے غربت کی دھول

لے لو یہ صحرائی پھول

صحرا ہے خندوں کی دنیا

شہر مگر دھندوں کی دنیا

دھندوں میں پڑنا ہے بھول

لے لو یہ صحرائی پھول

•

رسا جاودانی عالم انسانیت کے کافی دلدادہ تھے وہ کس بہترین انداز میں انسانوں کی درجہ بندی کرتے ہیں ؎

نسلِ آدم سے ہے جہاں معمور
آدمی اس جہاں میں تھوڑے ہیں
آدمیت کے روپ میں اکثر
ریچھ، بندر، گدھے ہیں، گھوڑے ہیں

رسا کو زندگی کے اتار چڑھاؤ کے اصول تجربات حاصل تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ کامیابی سے دوچار ہونے پر انسان تمام گزشتہ پریشانیوں کو بھول جاتا ہے۔ جو منازل عشق طے کر سکتا ہے وہ عقل کی بدولت ہاتھ نہیں آتے۔

ہر پریشانی میں جمعیت کی صورت ہے نہاں
دوش پر زلفیں بکھرتی ہیں سنورنے کے لئے
کام کچھ آتی نہیں راہِ محبت میں خرد
ہے جنون درکار منزل سے گزرنے کے لئے

رسا صاحب کی نظموں اور گیتوں سے اُن کی شاعرانہ عظمت ٹپکتی ہے اور اُن کی شہرت میں ان اصنافِ سخن کا بھی خاص حصہ ہے۔ اس حقیقت سے بھی شاید کسی کو انحراف نہیں ہے کہ مرحوم کو جس صنفِ سخن نے جاودانی بنا دیا ہے وہ غزل ہے۔ ان غزلوں میں حسن و عشق، رند، شیخ حرم، وفاداری، انتظار، ظلم و جفا، ساقی اور دیگر واردات قلبی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ عشق کے میدان میں رسا صاحب قیس سے بھی سبقت لے گئے ہیں چناں چہ وہ کہتے ہیں ؎

جا کے کیوں بیٹھوں میں دشتِ نجد میں
قیس کی منزل مری منزل نہیں

تعیر



مرکزی وزیر صحت مسز محسنہ قدوائی شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ صورہ میں ایک
مریضہ کی عیادت کر رہی ہیں۔ پاس ہی ریاست کے وزیر صحت ڈاکٹر محبوب بیگ کھڑے ہیں۔



عیدالفطر کے موقع پر وزیراعلیٰ پولو گراؤنڈ میں ایک اجتماع سے خطاب کر رہے ہیں

عشق کا مقام طے حسین نے کیا
قیس اس کی اولین منزل میں ہے

وہ عاشق کی نماز اور شیخِ حرم کی نماز کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جہاں تیرا نقشِ قدم ملا وہیں سر بسجدہ پڑا ہے
یہاں عاشقوں کی نماز میں نہ رکوع کوئی نہ قیام ہے

رسا صاحب اپنے محبوب کو سروِ خراماں کہہ کر یوں فرماتے ہیں:

سرو سے تجھ کو تو دوں تشبیہ
حق نے تجھ کو مگر خرام کیا

انتظار کی گھڑیاں عاشق کے لئے موت سے بھی سخت ہوتی ہیں۔ دردِ فراق عشق کو بڑھاوا دینے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جدائی کے عالم میں ہمارا محبوب شاعر یوں ترنم طراز ہے:

ستارہ رات بیتی جا رہی ہے
وہ میرا مستِ خواب آئے نہ آئے
لکھے جاؤں گا اُن کو نامۂ شوق
کبھی خط کا جواب آئے نہ آئے

شیخِ حرم اور آزاد منش شاعروں کے درمیان ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ رسا صاحب ایک آزاد خیال شاعر ہونے کے سبب مذہبی ظاہرداری اور فریب کاری کے زبردست مخالف رہے ہیں۔ وہ انسان کے ظاہر و باطن میں یکسانیت دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

مجھے ایسے مذہب سے اے رسا نہ ہے واسطہ نہ ہے رابطہ
جہاں خونِ مردم حلال ہے، جہاں سرخ پانی حرام ہے

باہر نہ کہیں تجھے اللہ نظر آیا
اے شیخ حرم ہم نے دیکھی تیری بینائی

ارباب مسجد کو رسا سے یہ گلہ ہے
مسجد سے کبھی عاشق اصنام نہ آیا

رسا کہتے ہیں: رند ظاہر و باطن میں ایک ہوتا ہے۔ شراب انسان کے غم دھوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے یہ اشعار ملاحظے کے قابل ہیں ؎

ہے مے سے پرہیز نہیں رسا پرہیز کہاں تک کوئی کرے
ساون کی گھٹائیں چھائی ہیں تو اکثر پیتے رہتے ہیں

شب کو شراب کی بوتل پی کر
صبح کو اٹھتا ہوں پارسا ہو کر

رسا صاحب اپنے معشوق کے زلف و عارض کی تعریف کس بہترین انداز سے کرتے ہیں ؎

زلف و عارض کے سب کرشمے ہیں
ورنہ یہ شام کیا' سحر کیا ہے

مرحوم روایتی شاعری کے علمبردار تھے۔ البتہ ان کی نظمیں انھیں جدید نظموں کے قریب لاتی ہیں۔ وہ آخری دم تک جدید شاعری کی اس قسم سے بیزار تھے جس میں اشعار حسین الفاظ کے پیکروں کے باوجود گورکھ دھندا بن جاتے ہیں۔ بزم ادب کی اکثر مجالس میں وہ ان باتوں پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے۔ وہ اپنی شاعری کو امن و آشتی کا پیام سمجھ کر کہتے ہیں ؎

کلام اپنا پیام آشتی ہے
جہاں میں انقلاب آئے نہ آئے

مرحوم ایک خود دار انسان ہونے کے موجب چاپلوسی کے بل بوتے پر حاصل ہونے والی شہرت کو بالکل ناپسند کرتے تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ آئندہ نسلیں اُن کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کریں گی۔ اور اُن کے روشن کئے ہوئے ادبی چراغ گمراہ انسانوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔ وہ اس مفہوم کو کس بہترین انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

نہ قدر پہچانی دوستوں نے رسا کی کچھ اُس کی زندگی میں
بنائیں گے خاک کا وہ سرمہ مگر وہ خاکِ مزار ہوگا

"نظمِ ثریا" کے پیش لفظ میں رسا صاحب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین زور لکھتے ہیں۔ "رسا صاحب کی غزلیں مجھے اُن کی نظموں سے زیادہ پسند ہیں ان کی غزل زیادہ تر سادگی اور سلاست کی آئینہ دار ہے۔ خواجہ میر درد اور مصحفی کا رنگ ان کے اشعار میں جھلک دکھائی دیتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اپنے اسی رنگ میں لکھتے رہیں تو عہدِ حاضر کی اردو شاعری میں ایک مفید اضافے کا باعث بن سکیں گے اور کشمیر کے موجودہ تابناک دور کے اردو شاعروں میں ان کو جو امتیاز حاصل ہے وہ صحیح معنوں میں جاودانی بن جائے گا۔"

جناب نشاط کشتواڑی رسا کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔"

رسا جاودانی مرحوم و مغفور علم و ادب کے ایک بڑے سرمایہ دار اور مملکتِ شعر و سخن کے ایک تاجدار بھی تھے۔ آپ اپنی فنی مہارت اور ادبی صلاحیت میں ایک بلند مقام رکھتے تھے اور ادبی حلقوں میں کافی مشہور تھے۔"

نظمِ ثریا کے ایک گہرے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ رسا صاحب کی شاعری میں حقیقت و رومان کا ایک حسین اور دلکش امتزاج موجود ہے۔ انہوں نے فارسی کی متناسب تراکیب کا اس مہارت کے ساتھ استعمال کیا کہ وہ اردو زبان کا ایک

تغیر

اردو صحافت بن گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کے لکھے ہوئے اشعار کسی بہترین کارخانے سے تیار ہوئے ہیں۔ بناوٹ اور آورد کا مادہ بہت کم نظر آتا ہے۔ چھوٹی اور بڑی دونوں قسم کی بحروں میں کامیابی کے ساتھ غزل لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُن کے اشعار پڑھنے سے ایسا لگتا ہے جیسے شاعر نے پڑھنے والے ہی کے حالات بیان کئے ہیں۔ رسا صاحب کے شعر حیدرآباد کی تر و تازہ سرزمین اور سہاونی ہواؤں کے ماحول کی پیداوار ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ذہین انسان زمین کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر اپنی ذہانت کے طفیل ایک ممتاز مقام حاصل کر سکتا ہے۔

بہر کیف رسا صاحب ایک عظیم اور مقبول ترین شاعر گذرے ہیں۔ اردو شعر و ادب میں اُن کا نام جاوداں ہو گیا ہے۔ آج کے اس مادی دور میں جب کہ انسان مال و دولت اور جاہ و حشمت کے لالچ میں اپنی عزت تک داؤ پر لگانے پر آمادہ نظر آتا ہے رسا صاحب جیسے انسان دوست اور ادبی دنیا کے روشن میناروں کا اُبھرنا بعید از امکان بات لگ رہی ہے۔ نت ؔ طاؔ کشتواڑی کو بھی اس بات کا احساس ہے وہ رسا مرحوم کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

کانِ ادب کا گوہرِ تاباں کہاں گیا
یعنی وہ رسا صاحبِ دیواں کہاں گیا
ڈھونڈیں کہاں نت ؔ طاؔ ملیگا وہ اب کہاں
نالاں ہے دل رسائے جاوداں کہاں گیا

٥

غزل

شجاع خاور
ایس، پی، سی، آئی، ڈی۔ پولیس ہیڈکوارٹرس
پناجی — گوا۔

یہ کیسا وقت مجھ پر آگیا ہے
سفر باقی ہے اور گھر آگیا ہے

الٰہی خیر ہو بیمارِ غم کی
مسیحا بھی دعا پر آگیا ہے

جو وعدے کرتے تھے اب سامنے ہیں
یقیناً روزِ محشر آگیا ہے

کبھی دامن سے اونچا تھا گریبان
مگر اب تو برابر آگیا ہے

شجاع پہلے جہاں قطرہ نہیں تھا
ان آنکھوں میں سمندر آگیا ہے

غزل

فریدہ پربتی سنگین دروازہ، رعناواری
سرینگر ۱۹۰۰۰۳

حرفِ امکاں منجمد ہے پتھروں کے درمیاں
اک زمرد پوش منظر بنجروں کے درمیاں

چل دیا کس سمت وہ اسپِ ضیا کا شہسوار
کرکے مجھ کو قید تیرہ منظروں کے درمیاں

بھول بیٹھا ہوں میں اب خارہ شگافی کا مزاج
ہے اقامت مدتوں سے زرگروں کے درمیاں

بے کسی کی اہمیت شاید سمجھ میں آگئی
ڈھونڈتا ہوں اب میں گھر اجڑے گھروں کے درمیاں

ٹوٹتی دیوار کا سایہ بھی آخر چھن گیا
زندگی ستا رہی ہے خنجروں کے درمیاں

شفق سوپوری
محلہ عشہ بیر سوپور کشمیر

غزل

تری بات سے پھول جھڑتے نہیں اب
سمندر میں وہ گیت بجرے نہیں اب

جو آتے کسی یاد کی لوریوں سے
وہی نیند ہے، پر وہ سپنے نہیں اب

کسے شوق گر کے بکھر جانے کا ہے
پہاڑوں سے گرتے وہ جھرنے نہیں اب

ابھی بوجھ سے دب رہا ہے مرا دل
یہ آنسو کسی طرح بہتے نہیں اب

اُسے دیکھ کر مجھ کو ہوا ہی نہیں دکھ
مجھے غم کہ آنسو نکلتے نہیں اب

اُسی نے شمع کو جلایا سرِ رہ
انہیں ضد کہ وہ شخص دیکھے نہیں اب

کبھی تو سنی نہ، ہوئے چپ تو بولے
شفق جی کوئی بات کرتے نہیں اب

زیڈ-یو-انجم اعلیٰ پوری
معرفت سہ ماہی کھیل کھلونے امام باڑہ اعلیٰ پور (بدایوں)

غزل

عجیب حسرت تھی اس عرضِ بیاں میں
خراشیں پڑ گئیں میری زباں میں
بس اک جنبش نگاہِ معتبر کی
ہُوا میں قید آنکھوں کے مکاں میں
یہ کس رستے میں اپنا کارواں ہے
سُلگتے ہیں بدن اب سائباں میں
فصیلِ شب پہ دن جلنے لگا ہے
لگی ہے آگ سی اک آسماں میں
نیا سورج اُگانا چاہتا ہوں
اندھیرا ہے بہت وہم و گماں میں
مری آوارگی میرا مقدر
اماں ملتی نہیں جلتے اماں میں
تمنا کس سے ملنے کی ہے انجمؔ
کوئی اپنا نہیں اس کارواں میں



وزیر تعمیرات چودھری طالب حسین ماحولیات کے تحفظ سے متعلق ... تصویروں کی
نمائش کا معائنہ کرتے ہوئے —



وزیر اعلیٰ نیو سیکرٹریٹ میں تمام اضلاع کے ڈیولپمنٹ کمشنروں اور پولیس سپرانٹنڈنٹوں
کے اجلاس سے خطاب کر رہے ہیں۔

سب کے لئے ___ رہائشی سہولیات

شیخ غلام محمد بھدرواہی
وزیر مکانات و شہری ترقی جموں و کشمیر

موجودہ حکومت نے قومی پالیسی کے مطابق ریاست میں بے زمین اور بے گھر لوگوں کو رہائشی سہولیات فراہم کرنے کا مصمم ارادہ کیا ہے۔ مکان کے لئے جگہ کی فراہمی زندگی کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ اس بات کے پیش نظر مختلف رہائشی بستیوں کے قیام کے سلسلے میں کئی ایک اقدام کئے گئے۔ تاکہ لوگ اپنے مکانات تعمیر کرسکیں۔ عوام کی ترقی اور ان کے معیار حیات کو بہتر بنانے کے لئے بے گھر لوگوں کی رہائشی سہولت کی فراہمی نہایت ضروری ہے۔ اس لئے جموں و کشمیر میں ہاؤسنگ سیکٹر کو مناسب اہمیت دی گئی ہے۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست میں مکانوں کی مجموعی تعداد ۱۵ لاکھ ۵۵ ہزار تھی۔ جن میں سے صرف ۷ لاکھ ۲ ہزار مکان مکمل یا جزوی طور پر رہائشی مقاصد کے لئے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ ریاست میں ۱۹۷۱ء اور ۱۹۸۱ء کے دوران ہوئی۔ دو مردم شماریوں کے اعداد و شمار کی جانچ پڑتال سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں رہائشی مکانوں کی تعداد میں ۱۲ء۱۳ فیصد کا اضافہ ہوا ہے جبکہ اس عرصہ کے دوران آبادی میں اضافہ کی شرح ۲۸ء۹۷ فیصد سے بہت کم ہے۔ علاوہ ازیں ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۹ لاکھ ۴۰ ہزار کنبے ۷ لاکھ ۲ ہزار

تعمیر

رہائشی مکانوں میں رہتے تھے۔ جو ۲ لاکھ ۳۸ ہزار کے قریب رہائشی مکانوں کی کمی کو ظاہر کرتی ہے (دیہی علاقوں میں ۲ لاکھ اور شہری علاقوں میں ۳۸ ہزار) اس کے ساتھ ہی ساتھ ۶۷ء۲۴ فیصد دیہی اور ۷۰ء۲۳ فیصد شہری کنبے ایک کمرہ والے مکانات میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جو حالات کو مزید پریشان کن بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح ساتویں پلان کے شروع میں تیار کئے گئے ایک تخمینہ کے مطابق ریاست میں دیہی بے زمین اور بے گھر کنبوں کی تعداد ۲۰۱۲۰ تھی۔

یو، این۔ ڈیکلریشن

یو، این، او کی ڈیکلریشن اور حکومت ہند کی پالیسی کے مطابق سال ۱۹۸۷ء بے گھروں کے لئے مکانیت کا عالمی سال ہوگا۔ ریاست جموں و کشمیر نے ساتویں پلان کے دوران گھاس پھوس کی جھگیوں کو سی، جی، آئی شیٹوں میں بدلنے اور ایسے مکانوں کی موجودہ رہائشی گنجائش کو بڑھانے جیسی سکیموں کو مکمل کرنا تجویز کیا ہے۔ جہاں اس وقت تمام کنبے چھوٹے چھوٹے کمروں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اگرچہ ریاست میں چھٹے پانچسالہ منصوبے کے دوران بے گھر کنبوں کو زیادہ سے زیادہ فوائد پہنچانے کے لئے متعدد ترقیاتی اقدام کئے گئے ہیں۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وافر مالی ذرائع کی کمی کی وجہ سے اس مسئلہ کے حسب منشاء حل کے لئے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکا۔ ریاستی سرکار کو صرف بجٹ کی رقوم سے ہی سوشل ہاؤسنگ پروگرام کو فروغ دینے کا عمل جاری رکھنا پڑا اور ہڈکو، ایل، آئی سی اور جی آئی سی جیسے مالی اداروں نے ہاؤسنگ پروگرام کے لئے کوئی زیادہ امداد نہ دی۔ اس میں شک نہیں کہ ایل آئی جی، ایم آئی جی اور ایچ پی اے سکیموں کے تحت تقریباً ۳۲۵۰ بے گھر کنبوں کو مالی قرضوں کی صورت میں امداد فراہم کی گئی اقتصادی طور پر کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے لگ بھگ ۳۲۰۶ کنبوں کو رہائشی پلاٹ اور ۷ ہزار کنبوں کو مکانات کے لئے جگہیں اور نقد امداد فراہم کی گئی
تعمیر

بیس ۲۰ نکاتی پروگرام

دیہات میں بے گھر اور بے زمین کنبوں سے متعلقہ سکیموں کے سلسلے میں جو ۲۰ نکاتی پروگرام کا ایک حصہ ہیں۔ ریاست چھٹے منصوبہ کے دوران تمام بے گھر کنبوں کو ضروری رہائش فراہم کرنے کے لئے اپنا نشانہ سے ابھی بہت پیچھے ہے۔ چھٹے منصوبہ (۸۵-۱۹۸۰ء) کے دوران مختلف سوشل ہاؤسنگ سکیموں کے لئے منظور شدہ ۱۷۱ء۱۷ لاکھ روپے کی رقم کے مقابلہ میں ۱۸۹ء۳۲ لاکھ روپے کی لاگت آنے کا اندازہ ہے۔

آج سرمایہ کاری کی وجہ سے کچھ بے گھر لوگوں کو مکانات کی سہولت کی فراہمی کے علاوہ شہر سرینگر اور جموں کے دو شہروں میں بلکہ دیگر چھوٹے بڑے قصبوں میں بھی مختلف رہائشی بستیوں کو ترقی دینا ممکن ہو سکا ہے۔ وادی کشمیر میں باغ مہتاب، بمنہ، بریقصنہ اور ادم پورہ اور جموں میں چھنی ہمت، بھالی پورہ اور روپ نگر میں لوگوں کو رہائشی سہولت کی فراہمی کے لئے بستیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں سماج کے اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی ہے جن کے لئے نگروٹہ میں اندرا کالونی، قلعہ باہو کے نزدیک مایہ کالونی اور گوجر اور بکروالوں کے لئے سنجواں ہاؤسنگ کالونی قائم کی گئی ہے۔ یہ کام جموں ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے سپرد کیا گیا ہے۔ ان کالونیوں کی تکمیل سے تقریباً ۱۲۵۰۰ رہائشی پلاٹ حاصل ہونگے۔

ساتویں منصوبہ کے مقاصد

مالی مجبوریوں اور مکانات کے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ریاستی سرکار نے ساتویں منصوبہ (۹۰-۱۹۸۵ء) کے دوران اس مسئلہ سے جنگی سطح پر نمٹنے کے لئے بجٹ کی اپنی رقوم کے علاوہ انسٹی ٹیوشنل فائنانس کو راغب کرنے کے لئے اقدام کرنا تجویز کیا ہے۔ ساتویں

تعمیر

منصوبہ کے دوران مختلف کالونیوں میں ۲۰ ہزار سے زائد پلاٹوں کے قیام کے علاوہ ۲۰ نکاتی
پروگرام کے تحت میں ...۱۰، بے گھر اور بے زمین کنبوں کو امداد فراہم کرنے کی تجویز ہے۔ تاکہ
وہ اپنے مکان تعمیر کر سکیں۔ ان وہی کنبوں کو نہ صرف مکانات کے لئے جگہیں اور نقد امداد
بلکہ امدادی قرضہ کی ایک معقول رقم بھی فراہم کی جائے گی۔ یہ دونوں سہولتیں ریاستی سرکار کے
مالی ذرائع اور دیگر مالی اداروں سے فراہم کی جائیں گی۔ تاکہ وہ رہنے کے لئے اپنے مکان کا دیرینہ
خواب شرمندہ تعبیر کرنے کے قابل بن سکیں۔

سلیف فائنانسنگ سکیم کے تحت ۲۵۰۰ فلیٹ تعمیر کرنے کی تجویز بھی ہے۔ اسی طرح
ساتویں منصوبہ کے دوران ای، ڈبلیو، ایس، ایل، آئی، جی، ایم، آئی، جی و دیگر زمروں کے
۵۰۴۷ کنبوں کو مکانات کی تعمیر کے لئے ضروری قرضوں کی سہولیات فراہم کرنا تجویز کیا گیا ہے۔
اس عرصہ کے دوران ریاست میں رینٹل ہاؤسنگ سکیم کے تحت مختلف مقامات پر سرکاری
ملازمین کے لئے ۲۰ ہزار رہائشی پلاٹ تعمیر کرنا بھی زیر غور ہے۔ ان تمام اقدامات سے ریاست میں
لازمی طور پر رہائش کا مسئلہ بہت حد تک کم ہو جائے گا۔

دراصل بے گھر لوگوں کو رہائشی سہولیات کی فراہمی کا ایک بہت بڑا کام ہے
اور اس کے لئے رہائش کی سہولت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تمام لوگوں کے تعاون کی
ضرورت ہے۔

حکیم محمد یٰسین

وزیر برائے آب پاشی و فلڈ کنٹرول جموں و کشمیر

بہتر آب پاشی ـــ زیادہ فصل

غذائی پیداوار میں خود کفالت حاصل کرنے کے لئے زرعی زمین کے لئے آب پاشی سے بڑھ کر کوئی اور موثر ذریعہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہماری ریاست میں جہاں آب پاشی کے کافی وسائل موجود ہیں۔ اس شعبہ کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ اس ضمن میں حکومت کی کوششوں کے پیش نظر وہ دن دور نہیں جب بنجر زمین بھی لہلہاتے زرعی کھیتوں میں تبدیل ہو جائیں گے اور اس طرح خوش حالی کی منزل تک پہونچنے کے علاوہ زرعی شعبہ میں خود کفالت حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

شعبۂ زراعت کو فروغ دینے کے لئے بھرپور توجہ کے نتیجے میں غذائی پیداوار میں اضافہ ہوا تب ہی ممکن بن گیا ہے جب زیادہ سے زیادہ زمین کو آب پاشی کی سہولیت فراہم کی گئیں۔ گوناگوں جغرافیائی اور موسمی حالات کے پیش نظر ریاست میں آب پاشی کا مسئلہ میدانی علاقوں کے مقابلے میں پیچیدہ ہے۔ ان مسائل سے نمٹنے کے لئے اور کنڈی، خشک، کرلوہ دور افتادہ اور پسماندہ علاقوں کو آب پاشی

سے مارچ ۱۹۸۵ء تک ۱۲ کروڑ ۸۴ لاکھ روپے کے مصارف آنے کی توقع ہے۔ مارچ ۱۹۸۴ء کے اختتام تک ۱۷ ہزار ہیکٹر اراضی سیراب کی گئی ہے۔ جب کہ رواں مالی برس کے آخر تک یہ سہولیات ۲۰۳۰۰ ہیکٹر اراضی رقبہ تک بہم پہونچانے کی توقع ہے۔

چھوٹی آب پاشی کی اسکیمیں

ریاست میں اس وقت ۷۴۵ چھوٹے درجے کی آب پاشی کی اسکیمیں زیر تکمیل ہیں۔ سال رواں کے دوران ان اسکیموں پر ۱۴ کروڑ ۵۶ لاکھ روپے صرف ہونے کی توقع ہے۔ ان اسکیموں کے طفیل اب تک ۱۶۴۴۳۰ ہیکٹر کے لئے آب پاشی کی صلاحیت پیدا کی گئی جب کہ ۱۹۸۴ء کے آخر تک ۱۱۴۴۶۰ ہیکٹر اراضی کو یہ سہولیت بہم پہنچائی گئی۔

زراعت کو فروغ دینے کے لئے آب پاشی کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت اس شعبہ کو ساتویں منصوبہ کے دوران اعلیٰ ترجیح دے رہی ہے۔